
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
جنوری 2017
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
نیا سال مبارک

سسپنس ڈائجسٹ

Happy New Year 2017

جلد 47 • شمارہ 01 جنوری 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون (021)35895313 فیکس (021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

CPNE
MEMBER APNS

Happy New Year 2017

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

جون ایلیا

نیا سال

نئے سال اور پرانے سال کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ زمانے میں نہ لمحے ہیں، نہ ساعتیں، نہ دن ہیں، نہ ہفتے، نہ مہینے ہیں اور نہ سال۔ زمانہ، ایک لحہ بھی ہے اور لمحے کا ہزارواں حصہ بھی۔ زمانہ ازل بھی ہے اور ابد بھی۔ زمانہ ہی وہ سب کچھ ہے، جو ہے۔

زمانہ وجود اور عدم کا ایک سمندر ہے۔ ایک بے کنار اور بے کراں سمندر، جس میں ہم بہہ رہے ہیں، ڈوب رہے ہیں اور ابھر رہے ہیں پھر بھی ہمارا جسم ہے کہ نہیں بھیگتا۔ ہمارے کپڑے ہیں کہ خشک رہتے ہیں۔

زمانہ ہمارے دائیں بھی ہے اور بائیں بھی۔ زمانہ ہمارے سامنے بھی ہے اور پیچھے بھی۔ زمانہ ہمارے اوپر بھی ہے اور نیچے بھی۔ زمانہ ہمارے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ ہمارا بدن اور ہماری روح زمانے کے سوا اور کیا ہیں؟ وہ جو مل رہے ہیں اور وہ جو بچھڑ گئے ہیں۔ وہ کون ہیں، وہ کون تھے؟ میں اور تم، جو ایک دوسرے میں سانس لے رہے ہیں اور تم جو ایک دوسرے کا سکھ بھی ہیں اور دکھ بھی۔ آخر ہم کون ہیں؟ وہ جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں، وہ جو ایک دوسرے کے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتے تھے، وہ جو ایک دوسرے کی جدائی میں مر جاتے تھے اور رسائی میں جی اٹھتے تھے، وہ کون تھے؟ کون تھے وہ، کیا وہ زمانے کے سوا کچھ اور تھے؟

زمانہ ہی تو ہے جو ہمیں مارتا ہے اور ہمیں جلاتا ہے۔ زمانہ ہی تو ہے جو ہمارے ساتھ رہتا ہے اور ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ زمانہ ہی تو ہے جو گزرتا ہے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور زمانہ ہی تو ہے جو کبھی نہیں گزرتا۔ ہاں، زمانہ کبھی نہیں گزرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ستارے ہیں اور ہیں۔ کہکشاں ہے اور ہے۔ پہاڑ ہیں اور ہیں اور سمندر ہے اور ہے۔ کیا تم کائنات کو بدلتے ہوئے دیکھتے ہو؟ کیا سورج کبھی نکلتا ہے اور کبھی نہیں نکلتا؟ کیا چاند کبھی ڈوبتا ہے اور کبھی نہیں ڈوبتا؟ یہی تو زمانہ ہے جو ہے اور سب کچھ ہے۔ یہی تو زمانہ ہے جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

جب تم سب کچھ کہنا چاہو اور بس ایک ہی لفظ کہہ سکو تو کہہ دو، زمانہ اور جب تم کچھ بھی نہ کہنا چاہو اور سب کچھ کہہ سکو تو بس ایک لفظ کہہ دو، زمانہ۔ ہماری اور تمہاری ساری زباں دانی اور نکتہ سامانی، اس ایک لفظ کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہے؟

ہم جو لحہ بھی گزار رہے ہیں وہ آخری لحہ ہے۔ زندگی اور آرزومندی کا آخری لحہ اور یوں تو لمحوں کا حساب اور شمار کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ہم گزرتے رہیں گے اور گزر جائیں گے اور لحہ پھر بھی باقی رہے گا۔

کیا تم مجھے ایک بات بتاؤ گے، تمہارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ سوچو اور سوچ کر جواب دو کہ ہمارے ہونے اور نہ ہونے کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ حقیقت کیا ہے جو نہ ہمارے ہونے سے بدلتی ہے اور نہ ہمارے نہ ہونے سے؟

تمہارے دانش مندانہ سکوت نے میرے سوال کا جواب دے دیا اور اس کے سوا اس سوال کا کوئی اور جواب تھا بھی نہیں۔ ہے بھی نہیں۔ وہ سب سے بڑی حقیقت گزرنا، گزرتے رہنا اور گزر جانا ہے۔ کیا ہمارے دکھوں میں سب سے بڑا دکھ یہ نہیں ہے کہ ہم گزر رہے ہیں، گزرتے جا رہے ہیں اور گزر چکے ہیں؟

ہمارے پاس دن، رات، ہفتے، مہینے اور برس نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس تو بس ایک لحہ ہوتا ہے اور یہی ایک لحہ ہمارے لیے دن، رات، ہفتہ، مہینا اور برس ہوتا ہے۔ ہم زمانے ہی میں ہوتے ہیں اور زمانے ہی میں نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس ایک ہی تو پونجی ہے اور وہ خود ہم ہیں۔ اس گھڑی، اس لمحے اور اس پل کے ہم۔

اس گھڑی، اس لمحے اور اس پل کے ہم، نیا سال منانے والے ہیں۔ وہ دن اور پہلے کے وہ ہم، گزر گئے ہیں۔ اب ہم اپنے ہونے کا نیا پن بسر کرنا چاہتے ہیں۔ نئی خواہشوں، نئے خیالوں اور نئے خوابوں کے ساتھ گزر کرنا چاہتے ہیں اور دیکھو، خواہش کے بعد نئی خواہش، خیال کے بعد نئے خیال اور خواب کے بعد نئے خواب کے ساتھ گزر بسر کرنا ہی زندگی ہے۔

اور اب تو پہلے سے زیادہ اچھا موسم ہے۔ اب تو پہلے سے زیادہ اچھے دن ہیں۔ ہم نے تو بہت برے دن گزارے ہیں۔ کیا نہیں گزارے؟ ہم نے تو ان برے دنوں میں بھی اپنی امیدیں نہیں ہاریں۔ وہ ساری امیدیں ہمارے وجود میں مہک رہی ہیں۔ وہ ساری تمنائیں، ہماری نمود میں دمک رہی ہیں۔ اب ہمیں نئی امیدوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ نئے جذبے گنگنانا چاہئیں تاکہ جمہوریت زندہ رہے، پاکستان تابندہ رہے۔

☆☆☆

محترم قارئین!
السلام علیکم!

جنوری 2017ء...... نئے سال کا پہلا شمارہ دیرینہ ساتھ کا احساس لیے حاضر ہے۔ گزشتہ ماہ تعلیم اور تعلیمی درس گاہوں کے ماحول اور معیار کے حوالے سے انتہائی تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اگلے ماہ اسی حوالے سے ایک اور واقعہ دلی صدمہ پہنچائے گا۔ لاڑکانہ کے کیڈٹ کالج میں ایک ذہین بچے کے ساتھ استاد کا اتنا جارحانہ رویہ کہ ہنستی کھیلتی زندگی ویران ہوگئی...... آخر کیوں؟ ایک یہی نہیں بلکہ آئے روز ایسی کتنی ہی درسگاہوں میں اساتذہ کا رویہ طالب علموں کے ساتھ اتنا اذیت ناک ہوتا ہے کہ بچے پڑھنے سے گھبرانے لگے ہیں۔ ذرا سوچیے...... یہ لمحہ فکریہ ہے اور وقت کی ضرورت بھی کہ اساتذہ کی تربیت کس قدر اہم نقطہ ہے۔ اس سلسلے میں باقاعدہ اصول اور قوانین مرتب کرکے ان پر کاربند ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے...... آج ہم نئی پود کے ساتھ جو کر رہے ہیں کیا آنے والے کل میں ان کے مزاج اور مضبوط کردار کی کوئی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ بات معمولی سی ہے مگر اس کے اثرات انتہائی غیر معمولی لہٰذا وقت کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے ہمیں سنجیدگی سے اس طرف سوچنے کی ضرورت ہے۔ نہ صرف عوام کو بلکہ سیاسی اور بااختیار طبقے کو بھی عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔ کیا اس میدان میں بھی عسکری قیادت کے تعاون کی ضرورت ہوگی؟ عسکری قیادت...... جو بخیر و خوبی تبدیلی کے ایک خوشگوار ماحول میں تبدیل ہوچکی ہے۔ جانے والے کو خوش دلی کے ساتھ الوداع کہتے ہوئے نئے سربراہ کو ہم گرمجوشی سے خوش آمدید کہتے ہیں...... کہ آنے والے سنہری کل کے لیے ہم سب کو اپنے آج پر محنت کرنا ہوگی لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ یہ نئی نسل، یہ طالب علم، تعلیمی درسگاہیں اور اساتذہ ہمارا قیمتی خزانہ ہیں اور خزانے کی دل و جان سے حفاظت کی جاتی ہے اسے بے دردی سے ختم نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ 2017ء ہم سب کے لیے خوشی، امن اور ترقی کا سال ثابت ہو (الٰہی آمین) اتنی تلخ باتوں اور دعاؤں کے بعد اب ہم چلتے ہیں اپنی میٹھی محفل کی جانب۔

✠ رانا بشیر احمد ایاز، احسان پور، ضلع رحیم یار خان سے شریک محفل ہیں ”سسپنس کے اس شمارے کے لیے 14 تاریخ سے ہی بک اسٹال پر یلغار شروع کردی۔ اس یلغار کا مقصد حکام اعلیٰ یعنی ابا حضور کا از خود نوٹس تھا کیونکہ غلام بادشاہ کی اگلی قسط کا انتظار شدت سے جاری تھا۔ تین دن کے مسلسل انتظار کے بعد 17 کو سسپنس موصول ہوگیا۔ سال کے آخر میں ٹائٹل گرل شاید جاتے دسمبر کے لیے اداس تھی۔ درخت پہ ایک عدد تیر پیوستہ شدہ دل کو بڑی بے تابی سے چومتے ہوئے آنکھوں سے لگا رہی تھی۔ ویری نائس۔ اشتہاروں کو نظر انداز کرتے ہوئے فہرست کا بغور جائزہ لینے کے بعد انشائیہ میں جون ایلیا کے پاس پہنچے جو ہمہ رخ پر لیکچر دے رہے تھے۔ بہت ہی عمدہ انشائیہ رہا اس دفعہ۔ خاص طور پر مغربی دانشور کا وہ قول ”اگر کسی کو بولنا نہیں آتا تو اسے بولنا سکھاؤ۔ اس توقع کے ساتھ کہ سب سے پہلے وہ تمہیں گالی دے گا۔“ اپنی محفل میں دستک دی تو محمد صفدر معاویہ کو کرسی صدارت کا بوجھ اٹھاتے پایا۔ مبارکاں جی۔ نگران کے والد صاحب کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور آپ کو صحت کے ساتھ صبر جمیل عطا فرمائے۔ اشفاق شاہین مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائے۔ مرحا گل کا تبصرہ بہت کیوٹ اور سویٹ رہا۔ بینش صدیقی بھی ٹاپ پوزیشن حاصل کرنے پر خوش نظر آئیں۔ خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اچھا تبصرہ کیا اور مسز صدیقی کے کیا کہنے۔ حسب معمول ابتدا شیش محل سے کی۔ ربن دادا نے علاقے کے سرکردہ لوگوں سے ملاقات کرکے انہیں اپنے حق میں گواہ بنالیا تو فاروق کو بملا بھابیہ نے اغوا کرالیا۔ جولیٹ نہ صرف حویلی میں بلکہ نواب اسد اللہ کے دل میں اپنا مقام بنا چکی ہے۔ عشرت جہاں سے اس کی بالکل نہیں بن رہی اور عالیہ بیگم کی اس پر محبتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ شاید نواب زادی عالیہ اپنے کیے کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ آصف خان کے پروپوزل کو جولیٹ نے سکون سے سن کر مسترد کردیا ہے۔ فاروق کی بازیابی کے لیے ربن دادا سرگرم ہے اور انسپکٹر وکرم کو ٹھکانے لگادیا ہے۔ بھابیہ سیٹھ کے پٹ سن کے گودام کو جلانے کے باوجود بھی فاروق نہیں مل سکا ہے۔ ادھر بملا نے عجیب صورت حال پیدا کردی ہے۔ علی اختر تصویر لے کر آئے۔ اچھی تحریر تھی۔ واصل ہاشمی کا چھوٹے بھائی سے پیار اچھا لگا۔ مگر علی اختر صاحب کہانی کا اینڈ کچھ خاص نہیں کرسکے۔ کہانی کا اینڈ کچھ غیر واضح تھا۔ غلام بادشاہ الیاس سیتاپوری کے قلم کا شاہکار۔ رکن الدین بیبرس شجاعت و دلیری کے پیکر کے طور پر سامنے آیا۔ سلطان سیف الدین قطز انتہائی سست اور بزدل نکلا۔ بیبرس نے منگول سردار قطلو بوغا کو انتہائی عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ منگولوں کو منگول طریقہ جنگ سے دھول چٹادی۔ اس کو کہتے ہیں ان کو ان ہی کے سکوں میں ادائیگی۔ ملک صفدر حیات پشت پناہ میں ڈاکوؤں اور مجرموں کے پشت پناہ کی کرتوتیں نظر آئے۔ ملک صاحب کو داغ دینے کے لیے سلطانہ عرف شادو آئی اور فائل اڑا کر لے گئی۔ ہمیں پہلے ہی شک ہوگیا تھا کہ رات کے اس وقت آنے اور ٹھنڈے ٹھار موسم میں پانی کا گلاس منگوانا خالی از مقصد نہیں ہے۔ کانسٹیبل اشتیاق نے محکمے سے غداری کی اور اس کا صلہ بھی پالیا۔ سلطانہ چودھری رب نواز کا کام کرنے کے باوجود بھی بے موت ماری گئی۔ چودھری بھی آخر ملک صاحب کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا۔ ثمر عباس کی پھندا بھی خوب رہی۔ ڈاکٹر ولیم نے این سے بالکل غیر محسوس انداز میں بدلہ لیا۔ این کو ڈایا موکس میڈیسن کی جگہ نقلی دوا دیتا رہا اور آکسیجن سلنڈر کا والیم بالکل کم رکھا اور طوفان کی آمد کی غلط اطلاع دے کر اونچائی کی جانب سفر جاری رکھنے پر مجبور کیا لیکن سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ آخر میں ڈاکٹر کی گرل فرینڈ جینی سارے راز سے آگاہ ہوگئی اور پولیس کو ڈاکٹر صاحب کے کرتوتوں سے آگاہ کردیا۔ شوق میں پروفیسر تھامسن کے عجیب و غریب شوق پڑھنے کو ملے۔

تھا سن سارے شوق چھوڑ کر آخر میں سانپ پالنے لگا۔ مارٹن کی ساری پلاننگ زبردست تھی مگر پروفیسر کے موجودہ شوق سے ناواقفیت اس کی جان لینے کا سبب بن گئی۔ منظر امام کی مشعل کہانی شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کی نظم ماں کا خواب سے ماخوذ تھی۔ گڑیا جو سب کی آنکھ کا تارا تھی سب کو روتا چھوڑ کر چلی گئی۔ اچھی کہانی تھی۔ ماروی میں نئے کرداروں کی آمد اچھی لگی۔ افریقی جادوگر زوسی گا ننا آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح چلا گیا۔ کالیا ماروی کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔ چلو خس کم جہاں پاک۔ عابی کے تیز و تند حملے جاری ہیں۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ مستقبل کا مصور نسیم اقبال کے قلم سے ایک بہترین اور شاندار تحریر۔ فوسٹر دنیا بھر کے دھندے کرنے کے بعد منشیات کی اسمگلنگ کرتے ہوئے پکڑا گیا تو عقلمندی کا مظاہرہ کر کے سلطانی گواہ بن گیا۔ حیران کن طور پر تصویروں کے ذریعے جو بھی پیش گوئی اس نے کی، وہ بالکل درست ثابت ہوئی۔ کہانی کو اگر اسٹوری آف دی منتھ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ شاہ دولہ، اللہ کے پیارے انسان کی داستان حیات۔ لودھی خاندان سے تعلق اور پرورش کس انداز میں ہوئی۔ کافی عرصہ ہندو میاں بیوی کی خدمت کرتے رہے اور آخر کار ولایت عطا ہوئی تو ایک جہان ان کا مرید ہو گیا۔ سچ ہے اللہ پاک اپنے بندوں کو ایسے ہی نوازتا ہے۔ شاہ نو تمینہ میں نریندر نے ظلم اور درندگی کی انتہا کر دی۔ بعد میں اسے فریحہ کے ساتھ کی گئی زیادتی کا خیال آیا تو ہر ممکن طریقے سے اس کا مداوا کرنے کی کوشش کی اور اپنی زمینوں اور جائداد سے بھی دستبردار ہو گیا۔ فریحہ نے جو بدلہ نریندر سے لیا، وہ اس کی سوچ سے بھی دور تھا۔ بچے کو اپنے ہاتھ سے مار کر فریحہ جیت کر بھی ہار گئی۔ وادی کشمیر کے تناظر میں لکھی گئی کہانی دل کو چھو لینے والی تھی۔ اکیلی عورت میں ناہید سلطانہ اختر عورت کے دکھ اور مسائل سے پردہ اٹھاتی نظر آئیں۔ ثمینہ کا شوہر نکھٹو اور آوارہ ثابت ہوا اور ثمینہ کے ساتھ نگینہ اور آئینہ کی زندگی کو بھی جہنم بنائے رکھا۔ مرینہ کی طرح ثمینہ بھی خاموشی سے اگلے جہان سدھار گئی۔ نگینہ نے ساری زندگی تنہا گزار دی۔ آئینہ شادی کر کے انگلینڈ چلی گئی تو صفدر بے یار و مددگار کرائے کے گھر میں ہی مر گیا۔ اچھی اور نصیحت آموز کہانی رہی۔ محفل شعر و سخن میں اس دفعہ سارے ہی اشعار بہترین تھے لیکن مرحا گل، زوہیب احمد، عالیہ خان، مدحت، کمال انور، زرین آفریدی اور عبدالجبار رومی کا انتخاب سپرہٹ رہا۔ اس بات کی خوشی ہوئی کہ سال کا آخری شمارہ بالکل پرفیکٹ رہا۔‘‘ (بہت شکریہ، اتنی دلچسپی اور محبت سے رسالے کا مطالعہ آپ نے کیا اور اپنی رائے سے آگاہ کیا)

✠ **حکیم سید محمد رضا شاہ نورنگہ بخاری**، میانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ’’سب سے پہلے خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملک کے سیاسی اور سرحدی حالات بہتر ہوں۔ انڈیا مقبوضہ کشمیر میں ظلم بند کرے۔ برادرم بابر عباس کھاریاں نے پرانے محفل کے ساتھیوں کو یاد کیا اور خاص کر خاکسار کو یاد فرمایا، مہربانی۔ جو غیر حاضر ہیں ان سب کی خدمت میں عرض ہے کہ محفل سسپنس ڈائجسٹ میں واپس آئیں۔ نئے لکھاریوں کے خطوط بھی بہتر ہیں۔ کہانیوں میں غلام بادشاہ الیاس سیتاپوری کی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ مصری جرنل بیبرس کے شاندار کارناموں پر محیط ہے۔ اسما قادری کی شیش محل ایک خوش رنگ تحریر ہے۔ حیدرآباد (انڈیا) کے نوابین کے مخصوص ماحول بمبئی کے دادا پر سیر حاصل تحریر۔ اب اسما صاحبہ سے کہیں کہ جولیٹ صاحب اور فاروق صاحب کو ملا دیں اور ان کی علیحدگی اور تنہائی کو ختم کریں۔ ملک صفدر حیات کی پشت پناہ ایک اچھی تحریر ہے اور غلط لوگوں کے قانون کے شکنجے میں آنے کے لیے ملک صاحب نے بہترین کاوش کی ہے۔ محی الدین نواب کی ماروی ایک مخصوص ڈگر کی کہانی، جس میں دیوتا کا عکس نظر آتا ہے۔ وہی نیلی چھتری کی کرشمہ سازیاں اور نیکی اور بدی کی جنگ کو مصنف نے خوب اجاگر کیا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی شاہ دولہ بھی نیک اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے کمالات پر محیط تحریر ہے اور اب آخری کہانی اکیلی عورت جس کو ناہید سلطانہ اختر نے تحریر کیا ہے۔ عورت کی مجبوریوں کو اجاگر کیا۔ ناہید سلطانہ اختر ایک معاشرتی مسئلے کو زیر بحث لائی ہیں۔ عورت کے لیے مرد کا سائبان ضروری ہے۔ جو عورتیں مرد کے بغیر زندگی کا تصور رکھتی ہیں، نگینہ کی طرح دکھی زندگی گزارتی ہیں۔ ہاں ایک معاشرتی قباحت ضرور موجود ہے کہ مرد حضرات بھی عورت کو جو کہ ان کی زندگی کی ساتھی بن جاتی ہیں۔ نکاح کے بعد ان سے بعض اوقات برا سلوک کرنا شروع کر دیتے ہیں اور انہیں اپنا ساتھی بنانے کے بجائے اپنا محکوم سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کو جسمانی اور ذہنی اذیت پہنچاتے ہیں۔ ایسا کرنے کی ہمیں اسلام اجازت نہیں دیتا۔ میں نے اپنی میڈیکل پریکٹس کے دوران کافی واقعات دیکھے ہیں کہ جن پر دل کڑھتا ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا عقل سلیم دے اور صنف نازک اور خاص کر اپنی بیویوں سے اچھا حسنِ سلوک رکھنے کی توفیق دے۔ آمین۔‘‘

✠ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں ’’سب سے پہلے ماروی پڑھنا شروع کی، اس میں حالات و واقعات ایسے تھے کہ وقفہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ چائے پڑی پڑی آئس کریم بن گئی۔ یہ ہے ماروی کی اس قسط کی تعریف۔ شیش محل نے بھی کچھ ایسے ہی سماں باندھا..... غیر ملکی کہانیوں میں سب سے بہتر مجھے شوق پسند آئی۔ مارٹن کی ساری محنت اور جان اکارت گئی۔ منظر امام نے ہمیشہ ہنسایا ہی ہے مگر اس بار رلا دیا۔ مستقبل کا مصور میں دلچسپی کے لیے کافی مواد موجود تھا۔ رقابت خاصی الجھی ہوئی اور گنجلک کہانی تھی، تبصرہ کیا کروں؟ پھندا بہت پسند آئی۔ پشت پناہ ملک صاحب اپنی روایت سے سرمو نہیں ہٹے۔ یہ کہانی بھی شاندار تھی۔ شاہ دولہ کے بارے میں پہلے کچھ حالات سنے تھے، جو کہ غیر عقلی تھے۔ اب یہ مضمون پڑھ کر سچی اور حقیقی باتیں معلوم ہوئیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحبہ کا شکریہ۔ تصویر اچھی نہیں تھی، بجھی بجھی سی۔ شکست فاتحانہ یہ تو سرے سے کوئی کہانی ہی نہ تھی۔ یہ تو ایک حقیقی واقعہ ہے جسے کہانی کے روپ میں ڈھالا ہے (جناب واقعات ہی کہانی کا روپ دھارتے ہیں) اکیلی عورت اس ماہ کی بہترین کہانی۔ اشعار کی محفل میں ماہین فاطمہ، ریاض بٹ، محمد خواجہ، زرین آفریدی کے اشعار قابل داد تھے۔ زوہیب احمد ملک کا قطعہ بھی دل کو بھایا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے صفدر بھائی کو مبارکباد۔ موصوف کا طویل و عریض تبصرہ شاندار تھا۔ اشفاق شاہین آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپنے تبصرے میں میرا بھی ذکر کیا۔ بینش صدیقی صاحبہ آپ کے مشورے کا شکریہ۔‘‘

✠ **عبدالجبار رومی انصاری**، چوہنگ، نیو لاہور سے تبصرہ کر رہے ہیں ’’خوب صورت دوشیزہ کا انداز اور درد دل سے بھرا سرورق بہت اچھا

لگا۔ فہرست میں شیش محل، مشعل اور شکست فاتحانہ کہانیوں کے نام زبردست لگے۔ انسانیت زمانوں میں زندہ تھی ہے یا ہوگی؟ جون ایلیا نے ہمدرخ میں موجودہ حالات کا بہت عمدہ آئینہ دکھایا ہے اور آنے والے نئے سال میں اچھے کی امید رکھنے کو فرما رہے ہیں اور ہمارے ملک میں جو ہر نیا سال آتا ہے، وہ سب لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ کتنی اچھائیاں لے کے آتا ہے۔ بہرحال جون ایلیا کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جو آنے والے دور کی باتیں پیشگی کر گئے ہیں۔ میری طرف سے تمام قارئین کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ تعلیمی اداروں میں منشیات جیسی چیزوں کا آنا یقیناً خطرناک بات ہے اور اس پر اربابِ اختیار کا توجہ دینا لازمی ہے تاکہ ہمارا مستقبل کا طبقہ صحت مند اور روشن دماغ ہو۔ محمد صفدر معاویہ اللہ تعالیٰ آپ کے ابو کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ محبوب سومرو حاضری لگ گئی؟ مبارک ہو، رانا بشیر احمد ایاز بھرپور تبصرے کے ساتھ عمدہ، اشفاق شاہین کی شرکت بھی لاجواب۔ 22 سالہ ساتھی دوست محمد ویلڈن۔ مرزا طاہر الدین، کچھ بعید نہیں، سوچنا کیا؟ بس عبرت حاصل کریں۔ شکریہ بینش صدیقی آپ کی باتیں قابلِ تعریف ہیں۔ بے شک جو سیکھتے ہیں وہ آگے بھی بڑھتے ہیں۔ لیجیے وکرم کی شامت بھی آخر آہی گئی۔ بے چارہ دم ہی توڑ گیا۔ یہ آصف خان تو جولیٹ کے پیچھے ہی پڑ گیا اور جولیٹ کا پہلوتہی کرنا اچھا ہے۔ بملا نے چاقو کو حرکت دی، لگتا ہے؟ پتا نہیں اگلی قسط میں دیکھیں گے، شیش محل میں کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے بھائی ای ای...... درد تو خود ایک تصویر ہے۔ محبت سے گندھی چھوٹے اور بڑے بھائی نما دوستوں کی کہانی بہت اچھی لگی۔ اسی طرح معصومیت سے بھرپور گڑیا کی کہانی مشعل کی صورت میں صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہوئے بہت عمدہ لگی۔ پشت پناہ جو خود تو پیچھے رہتا ہے مگر جرم کو آگے ہی آگے پھیلاتا ہے اور وہی اصل مجرم ہوتا ہے جو اپنے آلۂ کاروں سے جرم کرواتا ہے۔ ملک صاحب نے بہت اچھے طریقے سے ہاتھ ڈالا رب نواز جنجوعہ پر۔ وقت تو ظالم ہے اگر صرف منفی پہلو کو دیکھیں تو تب دکھ درد ہی ملیں گے۔ اکیلی عورت نگینہ بندہ علی کی طرح اگر اس نے مثبت پہلو پہ بھی غور کیا ہوتا کہ تمام مرد صفدر کی طرح کے نہیں ہوتے، اچھے بھی ہوتے ہیں تو آخر دم تک اسے بھی کسی کا سہارا میسر ہوتا۔ شکست فاتحانہ فریحہ نے بدلہ تو ضرور لے لیا مگر انسانیت کے آگے ہار گئی۔ اگر بچے کو نو ماہ پیٹ میں رکھ لیا تھا تو اسے دنیا میں بھی جینے کا حق دیتی۔ بس حالات کی ستم ظریفی کے آگے بھی بے بس ہوتے ہیں، چاہے وہ کشمیر کی سلگتی وادی ہو یا کوئی اور خطہ۔ جب تک اندھیروں کا راج ہوگا تو وہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔...... "میں ہلاکو خان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا بہادروں اور اہلِ تدبیر سے خالی نہیں ہوگئی۔" سلطان رکن الدین الظاہر بیبرس واقعی مدبر اور سلطان کے عہدے کا اہل شخص تھا جو بھیس بدل کر لمحوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا تھا جس نے عام لوگوں کو اکٹھا کر کے سپاہ گری سکھائی اور منگولوں کو تہ تیغ کر کے زبردست فتح حاصل کی۔ غلام بادشاہ نے اس دفعہ بہت محظوظ کیا۔ شاہ دولہؒ نے پیر فقیر ہو کر لوگوں کے لیے عظیم کام کیے۔ جب تک ہندو کے گھر میں رہے تو ان کی ہر بات پہ سر جھکائے رکھا اور جب ولایت کو پہنچے تو حق بات کے لیے ڈٹ گئے اور لوگوں کی راہنمائی میں پیش پیش رہے۔ محفل شعر و سخن میں زوہیب احمد ملک، صائمہ غزل اور بلقیس خان کے شعر اچھے لگے۔"

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے تشریف لائے ہیں "دسمبر کا شمارہ بہترین سرورق کے ساتھ۔ ایک حسینہ کا عالم بے خودی۔ بہت پراثر انداز۔ انشائیہ، بڑا دلسوز اور پُرمغز کالم۔ لفظ بہ لفظ سچے موتی۔ یہ سال تو رو دھو کر گزرنے والا ہے۔ خون آشام، کبھی بم دھماکے، گولیاں، ایک طرف ہماری مضبوط افواج۔ ایٹمی طاقت رکھنے والا ملک، فوج، رینجرز اور ساری فورسز ہمہ تن مشغول ہیں۔ لیکن کیا دہشت گرد ختم ہی نہیں ہو رہے اور اپنے عزائم میں کامیاب بھی۔ ہم کب تک دل تھام کے آہ و زاری کریں۔ ہم مذہبی رسومات پر خوف سے کانپ رہے ہیں۔ نورانی کا واقعہ کیا کم اندوہناک۔ ہر نئے سال پر ہماری آنکھیں امید سے امن اور زندگی کی راہ دیکھتی ہیں۔ روح تک تھک گئی ہے۔ وعدے سب جھوٹ، اندھیرے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم نے پڑوسی ملک کی مہمان نوازی کی لیکن جون ایلیا نے صحیح لکھا کہ انہوں نے ہمارے سینوں میں خنجر اتار کر اسی کمبل میں لپیٹ دیا جو ہم نے ان کو سردی سے بچنے کے لیے اوڑھایا تھا۔ اس سال مہنگائی بڑھی، بلوں میں اضافہ، قرض بڑھتا رہا۔ بینک بے فائدہ ہم عوام کے لیے۔ حکومت کے لیے فائدہ مند۔ اپنی عمر میں ہر سال تباہی کو بڑھتے دیکھا، اب اگلے سال کی کیا آس لگائیں۔ خطوط کی محفل، یہ محفل کہکشاں کی طرح جگمگاتی ہے۔ پیارے دوست دل کھول کر لکھتے ہیں۔ کھٹی میٹھی چاٹ۔ ہر خط میں کوئی نہ کوئی خاص جملہ یا لائن اتنی لاجواب ہوتی ہے جو پورے خط پر چھائی ہوتی ہے۔ محمد صفدر معاویہ نے میدان مار لیا اور صدارت پر براجمان ہیں۔ بہت مبارک۔ ادارے کا کمال ہے کہ اچھے خطوط کو چھانٹنا اور فیصلہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ بینش صدیقی بیٹا آپ نے میرے نام کے ساتھ اور تمام کے ساتھ "سر" لکھ کر ہماری عزت افزائی کی، آپ اچھا لکھتی ہیں اللہ آپ کے قلم میں اور طاقت اور جلا بخشے۔ آمین۔ غلام بادشاہ، بہت بہترین تاریخی کہانی۔ بادشاہ بزدل لیکن ایک سپہ سالار کی دور نظری شجاعت اور عزم نے خونی منگولوں کو انہی کی جنگی حکمتِ عملی کو اپنا کر شکست دی اور مسلمان امہ کی شان بڑھائی۔ شیش محل، ایک دلچسپ کہانی۔ واقعات کی سنسنی خیزی۔ کہانی میں مختلف کردار و واقعات کو یکجا کرنا، کہانی کی دلچسپی اور تسلسل کو برقرار رکھنا، یہ لکھاری کا کمال فن ہے۔ تصویر، ایک چھوٹی سی کہانی صرف دو کرداروں پر مشتمل۔ بچوں کی نفسیات اور خواہشاتِ نامکمل کیا کیا اثر دکھاتی ہے۔ پشت پناہ، ایک ایماندار تھانے دار کی حشر سامانی لیے ہوئے بڑی گمبھیر کہانی۔ قاتل کی انتہائی مکمل منصوبہ بندی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے تھانے دار کی غیبی مدد کی اور واردات کا سرا آخر ہاتھ آ گیا۔ پھندا، جرم و سزا کی ایک کہانی جس میں ڈاکٹر کی اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کا غلط استعمال اور جرم کی کوشش ایک لڑکی کی سمجھ بوجھ نے ساری قلعی کھول دی۔ شوق، ایک تنہا شخص اپنی دلچسپی اور زندگی کا سہارا کچھ عجیب عجیب شوق سے پورا کرتا ہے۔ یہی شوق اس کو نقصان پہنچانے والے کی موت کا سامان بن جاتا ہے۔ محفل شعر و سخن، ایک رنگارنگ اور مختلف اشعار کو یکجا کیے ہوئے۔ سارے اشعار اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ لیکن کچھ خاص، رانا بشیر، رمضان پاشا، سحر حاگل، ظفر اقبال، احمد علی، زوہیب احمد ملک، ادریس احمد خان۔ مشعل، ایک چھوٹے سے خاندان کی بڑی دکھ بھری کہانی۔ یہ کیسا دکھ ملا تھا ان کو کہ رونے پر بھی پابندی۔ مستقبل کا مصور، اس کو ایک طلسماتی یا تصوراتی کہانی کہنا چاہیے۔ ایک تصویر کے لیے ایک شخص قاتلانہ حملہ کر کے جیل جاتا ہے لیکن تصویر کا حصول اس کی زندگی بن جاتا ہے۔ لیکن وہ مصور تھا، جادوگر تھا یا کوئی آفت کہ وہ مستقبل کو اپنے کینوس پر

نقل کرتا رہتا ہے۔ شاہ دولہ کے متعلق سنا بھی اور شاہ دولہ کے چوہے بھی دیکھے۔ لیکن یہ قصہ بہت ہی معلوماتی ہے اور یہ بھی علم میں آیا کہ وہ ولی مغلیہ دور میں تھے لیکن ان کی کرامات کا ذکر بھی بڑا مفصل ہے۔ شکست فاتحانہ، کشمیر کے اس علاقے کی داستان جہاں ہندوستان کی جارحیت کا روز احوال سنتے اور دیکھتے ہیں لیکن ایک ہندو فوجی کا اپنی غلطی پر پشیمان ہونا اور کشمیری لڑکی کا غصہ اور ضدی طبیعت بڑی عجیب کہانی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اکیلی عورت، ایک مہذب معاشرے اور بھری پری دنیا میں رہنے والی دو بہنوں کی انتہائی الم ناک داستان۔ ایک کو شادی نے برباد کر دیا۔ دوسری کو شادی نہ ہونے نے برباد کر دیا۔ نگینہ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر ملازمت کے باوجود کوئی مرد نہ مل سکا۔ اس کو اپنی بہن کی دردناک زندگی کے خوف نے کسی بھی مرد کے نزدیک نہ ہونے دیا۔ بہرحال کہانی بہت عمدگی سے تحریر کی گئی۔“

✠ سسپنس کا دیوانہ **محمد شہباز ناز**، گجر کالونی، سرگودھا سے محفل میں حاضر ہیں ”میری طرف سے تمام دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔ اس دفعہ ٹائٹل گرل نے میرے دل کو خوش کر دیا۔ کیا حسین چہرہ، سنہری بال، فیروزی کپڑے۔ اسے دیکھ کر دل سے ایک آہ نکلی کہ کاش! یہ مجھے مل جاتی۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا جس میں ہمیشہ کی طرح اچھی اچھی باتیں کیں۔ سب سے پہلے منظر امام کی کہانی مشعل پڑھی۔ زندگی اور موت رب کے ہاتھ میں ہے۔ انسان لاکھ کوشش بھی کر لے مگر کسی کو نہیں بچا سکتا جس طرح بانو اور اس کے شوہر نے بہت علاج کروایا لیکن نہیں بچا سکے۔ اچھی کہانی تھی۔ ناہید سلطانہ اختر کی کہانی اکیلی عورت پڑھی۔ جب انسان کے اوپر سے ماں، باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو اس وقت ان کی قدر کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے نگینہ ثمینہ دونوں بہنوں کی زندگی کو ایک ہی انسان نے جہنم بنا دیا۔ کہانی پڑھتے ہوئے مجھے بہت غصہ آیا صفدر پر۔ اگر ان دونوں بہنوں کی جگہ میں ہوتا تو اس کی ایسی درگت بناتا کہ زندگی بھر لڑائی جھگڑے کے قابل نہ رہتا۔ ایک سبق آمیز کہانی تھی۔ ثمر عباس کی کہانی پھندا عمدہ تحریر تھی۔ اسما قادری صاحبہ کی کہانی شیش محل پڑھی۔ دلچسپ کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی کہانی رقابت پڑھی۔ ایک سمجھ نہ آنے والی تحریر تھی۔ الیاس سیتاپوری کی کہانی غلام بادشاہ کا کوئی جواب ہی نہیں۔ کیا عمدہ لکھتے ہیں۔ زرین قمر کی کہانی شکست فاتحانہ پڑھی جس میں ثریا نے ایک گناہ کے بدلے میں دوسرا گناہ بھی کر ڈالا۔ ہمارے نبی ﷺ فرماتے ہیں ”جس نے ایک انسان کو قتل کیا اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا۔“ جب سے منانے کی کوشش کر رہا تھا تو ثریا کو چاہیے تھا میری زندگی تو برباد ہو گئی تو بچے کو نہ مارتی۔ اسے ایک شرط پر مسلمان کر کے اسی کے ساتھ نکاح کر لیتی تو دونوں کا ازالہ ہو جاتا یعنی اپنی بربادی کے بدلے میں اسے مسلمان کر کے راہ راست پر لاتی، بیسٹ کہانی تھی۔ اشفاق شاہین، رمضان پاشا، مرحا گل، بینش صدیقی اور تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ محمد صفدر معاویہ کے والد کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے اہلِ خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ دعا گو ہوں کہ اللہ اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے اور اس ادارے کو مزید ترقی نصیب فرمائے۔ آمین۔“

✠ **محمد صفدر معاویہ**، تحصیل وضلع خانیوال سے تشریف لائے ہیں ”اس سال کا آخری شمارہ مسرور ہیں میں 17 نومبر کو ملا۔ سرورق کو ایک ماڈل جو اجڑے ہوئے درخت کے ساتھ موجود ہے، ساتھ ہی کسی کے دل میں تیر بھی کھبا ہوا ہے۔ محترم جون ایلیا تک پہنچے۔ ہمہ رخ سال کا بدلنا یا نہ بدلنا ہمارے جیسی قوموں کے لیے ایک جیسا ہے کیونکہ ہم نے کبھی اپنا آپ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کا اداریہ پڑھا بجا فرمایا۔ اچھے طالب علم ہی اس ملک کو اندھیروں سے نکال سکتے ہیں، اس کے لیے اساتذہ کا رول بھی بہت بڑا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو ایسا نظام دیں کہ وہ آئندہ اپنے ملک کے لیے روشن ستارے ثابت ہوں۔ اس منشیات کی لت نے تو بڑے لوگوں کو تباہ کر دیا۔ اللہ سب کو محفوظ رکھے کہ حکومت کو تو فرصت ہی نہیں کہ وہ عوام کی خبر لے۔ وہ تو خود ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے میں مصروف ہیں۔ ان کو کیا خبر کتنے بوڑھے ہیں جن کو چھت میسر نہیں، اولاد ماں باپ کے ساتھ کیا کر رہی ہے، کون بھوک سے مر رہا ہے، کون پیاس سے مر رہا ہے، ان کو کیا۔ کاش میرا دل بھی پتھر ہوتا کہ میں بھی جب کسی بوڑھے کو 80 سال کی عمر میں بھی مزدوری کرتے دیکھتا تو آنکھیں پھیر کے چلا جاتا پر کیا کروں دل ہر بے انصافی پر خون کے آنسو روتا ہے۔ حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ جب 60 سال کی عمر کو کراس کرتے تو ان کے لیے معقول وظیفہ دیتی کہ جن کی کوئی اولاد نہیں، وہ اس عمر میں ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں کیا لکھ رہا تھا اور کہاں پہنچ گیا۔ اپنی محفل میں آئے تو خود کو صدارت پر براجمان پایا۔ محبوب مصور اتنی مختصر حاضری۔ اشفاق شاہین، رانا بشیر احمد ایاز کے بہترین تبصرے۔ دوست محمد ویلکم کرتے ہیں آپ کو سسپنس کی دنیا میں۔ کہانیوں میں ابتدا کی غلام بادشاہ سے۔ رکن الدین بیبرس نے کیا خوب مزہ دیا منگولوں کو اب وہ اپنی طاقت دوبارہ حاصل نہیں کر پائیں گے۔ اب تو ہلاکو خان بھی کچھ نہ کر سکے گا۔ شیش محل تک پہنچے۔ فاروق پر اب شاید بملہ کے قتل کا مقدمہ درج کرائے بھالیہ۔ بہرحال ہر صورت میں بھالیہ اور ربن داوا میں ٹھن گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ربن بھی جیسلے کوئی چال چل جائے۔ ماروی کی طرف آئے تو اب ماروی کی چالوں نے ایک کہانی میں سنسنی پیدا کر دی ہے۔ اب تو دشمن ہر طرف سے گھیرے میں ہیں۔ بھی مراد بھی عالی تو اب ماروی بھی بھاری پڑنے لگی دشمنوں پر، کافی انٹرسٹنگ قسط تھی۔ آخر میں ناہید سلطانہ اختر کی اکیلی عورت بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ سچ ہے کہ اگر عورت اکیلی ہو اور پھر جوان ہو اور اس نے شادی نہ کی ہو تو زمانہ اس پر الزام دھرنے سے باز نہیں آتا۔ اپنے عیب کسی کو نظر نہیں آتے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عورت کی زندگی مرد کے بغیر نامکمل ہے اور مرد کی عورت کے بغیر۔ باقی اچھے برے انسان دونوں صنف میں ہوتے ہیں۔ زرین قمر کی شکست فاتحانہ فریحہ کو بچے کو مار کر کیا ملا۔ ایک ظلم تو سہہ چکی تھی پھر بچے کو مار کر بھی خود پر ظلم کیا۔ مارنا ہی تھا تو نریندر کو مارتی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے شاہ دولہ کے بارے میں جانا۔ پہلے ہم جب چھوٹے سر والا کوئی بچہ دیکھتے تو بڑے کہتے تھے، یہ شاہ دولہ کا چوہا ہے۔ اب مکمل تفصیل معلوم ہو گئی۔ ملک صفدر حیات کی پشت پناہ پڑھی۔ اس دفعہ ملک صاحب کے ساتھ ہاتھ کیا دشمنوں نے کہ اشتیاق کی مخبری سے وہ فائل نکلوائی پھر شادو یا سلطانہ کو بھی مروا دیا پر ملک صاحب نے چودھری رب نواز کی گردن ناپ لی۔ محفل شعر و سخن بھی عمدہ رہی خصوصاً صائمہ غزل کا شعر بہت اچھا لگا۔ باقی کہانیوں میں تنویر ریاض کی رقابت، علی اختر کی تصویر، ثمر عباس کی پھندا، شاکر لطیف کی شوق اور نسیم اقبال کی مستقبل کا مصور بھی اچھی رہیں۔ بیچ میں جو تھوڑی بہت کسر تھیں وہ بھی اچھی رہیں۔“ (پسندیدگی کا بے حد شکریہ جناب)

✠ **اسحاق انجم**، کنگن پور، قصور سے تشریف لائے ہیں ”دسمبر 2015ء، جنوری 2016ء اور پھر دسمبر 2016ء تک ہم بہت سے محبت بھرے دوستوں، پیارے پیارے احباب سے محروم ہو گئے۔ سب ہی روتا ہوا چھوڑ گئے۔ نواب صاحب اور کاشف زبیر، اچھے بھلے کام کرتے ہوئے دوستوں سے باتیں کرتے کرتے اچانک ہی ہمیں چھوڑ کر دوسرے دیس جا بسے ہیں۔ تعلیمی نظام، آپ نے بجا فرمایا۔ اب کیا کیا جائے حکمران اپنے بچوں کو وہاں سے تعلیم حاصل کرنے نہیں بھیجتے جہاں یہ ”لوگو“ ہے کہ مفت تعلیم۔ ان کے تو بچے ایک قدم بھی ایسے اسکولوں میں نہیں جاتے۔ شیکسپیئر کا قول، ان کو راس نہیں آتا۔ ان لوگوں کا کیا کیا جائے جنہوں نے بانی پاکستان کے کسی قول پر عمل نہیں کیا۔ خدا ضرور ان لوگوں سے انتقام لے گا۔ سرورق دسمبر میں جہاں پتے شاخوں کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں بے وفا دوستوں کو کیا کہیں۔ انشائیہ ہی آپ کے خط، سے پہلے پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ غلام بادشاہ بھی ہوتے ہیں جو رقابت میں شیش محل، میں لگی ایک تصویر کی خاطر پشت پناہ، پھندا، شوق سے قبول کر لیتے ہیں۔ محفل شعر و سخن کی بات ہی کیا ہے۔ ماروی کو مشعل، راہ دکھا دیتی ہے اور یہ دکھی دلوں کی جان ہے۔ مستقبل کا مصور بھی اچھی تھی۔ شکست فاتحانہ میں تبدیلی ہو جانی چاہیے۔ اکیلی عورت کا کیوں نہ ساتھ ہو۔ نئے سال تک اگر زندگی نے وفا کی تو پھر حاضری ہوگی۔ شمارہ دسمبر خوب صورت کاوش ہے۔ دلی مبارک باد۔“

✠ **وارث علی**، سندیلیانوالی سے شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں ”سال 2016ء کا الوداعی یا اختتامی شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت ماہ نومبر کی 21 تاریخ میں ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ ٹائٹل سرورق بہت زبردست تھا۔ دوشیزہ کسی کے پیار میں مست کھڑی تھی۔ سبز پس منظر والا منظر دلوں کو بہت بھایا۔ کہانیوں کی فہرست سے ہو کر انشائیہ پڑھا۔ جون ایلیا کی دانائی اور حکمت سے بھری باتوں سے دل کو انسان کے برے رویے سے مایوس ہونے سے بچایا کیونکہ بقول ایلیا جی انسانیت زندہ ہے اور زندہ رہے گی، چاہے جتنے زمانے بیت جائیں...... اداریہ میں مدیر صاحب بھی سال کے ختم ہونے پر کافی ڈسٹرب نظر آئے کیونکہ سال تو گزرتے جا رہے ہیں لیکن ہم لوگ ہر لحاظ سے اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں پچھلے دسمبر میں تھے۔ تعلیمی میدان میں پیش رفت کی باتیں جو آپ نے کہیں، وہ داد و تحسین ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے لیکن شاید یہاں ایسے لوگوں کی اجارہ داری ہے جو صرف اپنے نقطہ نظر کو ترجیح دیتے ہیں۔ معاشرے کا بیڑہ غرق ہو تو ہو، ان لوگوں کو اس بات سے کیا۔ خیر اپنے رب کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ ہمارے لیے 2017ء کو نہایت ہی خوشیوں والا بنا دے اور ہم پاکستانیوں کو اور پورے عالم اسلام کو کفر و الحاد کے شر سے بچائے، آمین۔ ابھی خط لکھتے ہوئے خبریں آ رہی ہیں کہ بھارت کی طرف سے کنٹرول لائن پر فائرنگ کا سلسلہ بہت زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ پاک فوج کے جوانوں سمیت عام شہری بھی بڑی تعداد میں نشانہ بن رہے ہیں لیکن ان ڈھیٹوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ایک طرف کشمیر میں خون کی ہولی کھیل رہا ہے تو دوسری طرف ایل او سی پر بلا اشتعال فائرنگ...... یا خدا ہمارے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے جو ہمارے ملک کی ذرا سی ترقی پر آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ بہر حال کبھی تو ایسا سورج طلوع ہوگا جس دن ہمارے ملک کو اور کشمیریوں کو بالخصوص کوئی تو اچھی خبر بھی ملے گی، انشاء اللہ۔ تمام تبصروں پر سرسری نظر ڈالی۔ کرسی صدارت پر ہمارے پیارے بھائی محمد صفدر معاویہ اپنی شان سے تمکنت تھے مبارک ہو صفدر بھیا جی...... اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کے ابو کو غریق رحمت فرمائے۔ والدین کا دکھ تو ہم سب کا سانجھا ہی ہوتا ہے۔ وزارت عظمیٰ پر محبوب اپنے بہت ”بڑے“ تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ کیا بات ہے بھئی سومرو کی...... اشفاق شاہین میرے پیارے لاہور سے شامل تھے۔ ان کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ طاہر گلزار جی اس دفعہ کہاں چلی گئی ہو۔ کہانیوں کی ابتدا اپنی موسٹ فیورٹ گرداب، اوہ سوری شیش محل سے کی۔ اسما قادری بہت اچھی طرح تحریر کو بڑھا رہی ہیں۔ جولیٹ کو دشمنی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اب تو مذہب کے نام پر بھی ناقدین اسے کافی تنگ کر رہے ہیں۔ آصف خان بدستور اس سے شادی پر خواہاں ہے۔ پلیز اسما جی! آصف خان کو تو واپس بھیج دیں، فاروق بے چارہ ہنوز جولیٹ سے بہت دور ہے۔ آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ناہید سلطانہ جی کی اکیلی عورت آخری صفحات کا حق ادا کر گئی نگینہ اور ثمینہ آخر دم تک ایک مرد سے پیچھا نہ چھڑا سکیں۔ چھڑواتیں بھی تو کیسے؟ مرد کا سہارا آخر ”سہارا“ ہی ہوتا ہے۔ بنا مرد کے ایک عورت کب تک حالات کا سامنا کر سکتی ہے...... آئینہ کو باپ سے نفرت ہوئی تو باپ کے کرتوتوں کی وجہ سے...... صرف ایک مرد ہونے کی وجہ سے وہ عورتوں پر حکمرانی کرتا رہا اور آخر میں بے موت مرا۔ بہت سے کاہلوں اور ایسے مردوں کے لیے ایک تازیانہ تھی جو عورت کو گھر سے نکال کر ان کی کمائی سے عیش کرتے ہوں۔ نگینہ بے چاری کو کس بات کی سزا ملی؟ آخری وقت تک حکومت کے فرائض کو اولین ذمے داری سمجھ کر ادا کرتی رہی لیکن سرکار نے اس بے چاری کو ایک چھت تک نہ دی۔ ناہید سلطانہ جی! آپ کی بہت گہری نظر ہے معاشرے پر...... آپ سے التجا ہے کہ پلیز طلبا پر بھی کہانی لکھیں جو کالج اور یونیورسٹی لائف میں اپنی سرگرمیوں میں پتا نہیں کیا کیا گل کھلاتے ہیں یا جو بھی معاملات ہیں ان پر ایک بھرپور تحریر لکھیں۔ ملک صفدر حیات کی پشت پناہ پڑھی۔ عورت آخر عورت ہوتی ہے ملک صاحب کے کمرے سے فائل لے کر یوں گئی کہ انہیں احساس تک نہ ہوا۔ ملک بھی پھر ایماندار آدمی تھے کہ حالات ان کے ہاتھ آتے گئے اور کڑی سے کڑی ملتی گئی۔ وادی کشمیر کے پس منظر اور کشمیر کے حالات و واقعات کو اجاگر کرتی شکست فاتحانہ بہت اچھی کہانی تھی۔ کام کی مصروفیت کے باعث ابھی اتنا ہی پڑھ پایا ہوں۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے...... آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کو بھی لے آئیں۔“

✠ **محمد زبیر ساگر**، گوجرہ سے محفل کی زینت بنے ہیں ”آپ اور آپ کے پورے اسٹاف کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سسپنس اور اس کے اسٹاف کو ہزاروں برس لمبی عمر دے اور ترقی اور کامیابی دے۔ کئی ماہ بعد خط لکھ رہا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سسپنس کو بھول گیا ہوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم سسپنس سے محبت کرتے ہیں (بہت شکریہ) دسمبر کا سسپنس ہاتھوں میں ہے۔ خوب صورت ٹائٹل دلکش حسینہ ہر ماہ کی طرح سلسلے وار کہانیاں ماروی اور شیش محل سسپنس اور ایکشن سے بھرپور ہیں اور کچھ کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ ان کہانیوں کی وجہ سے سسپنس ڈائجسٹ بلندیوں پر ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اور بلندیاں عطا کرے۔ سسپنس ڈائجسٹ کی یہ خاص خوبی ہے کہ اس میں آپ کو ہر موضوع پر کہانی ملے گی۔ نئی نئی کہانیاں اور نئے موضوع بہت ہی معیاری رسالہ ہے اسی لیے تو ہم اس کے بہت پرانے قاری ہیں۔ میری پیاری آپی! یہ میرا چھوٹا سا خط ہے پلیز مہربانی فرما کر یہ

خط جنوری کے شمارے میں ضرور شائع کیجیے گا۔'' (جی جناب! آپ کا چھوٹا سا خط حاضر ہے)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال** سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''احباب! محفل سے چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر خدمت ہوں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شمارہ بروقت خرید لیا ہے اس لیے سوچا کہ اپنی محفل میں حاضری دی جائے۔ سرورق پر حسینہ لڑکپن کے مشہور شغل ''دل میں تیر'' پر سر لگائے خزاں کا استقبال کرتی نظر آئی۔ اداریہ میں گزشتہ برس پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کی نصیحت کے ساتھ ہی دو محبوب مصنفین کی جدائی کا ذکر پڑھا تو نواب صاحب اور کاشف زبیر کی جدائی کا زخم تازہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ آپ نے تعلیمی حالت زار کا درست نقشہ پیش کیا ہے۔ اصل کو چھوڑ کر فروعی مسائل میں اساتذہ کو اس قدر الجھا دیا گیا ہے کہ تعلیمی ترقی محض خواب بن کر رہ گئی ہے۔ کرسی صدارت پر محترم صفدر معاویہ کو موجود پایا جو اپنے ابو کی رحلت کے بارے میں ساتھیوں کو آگاہ کر رہے تھے۔ اللہ پاک آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ بے شک عظیم سانحہ ہے۔ دوسرے نمبر پر سسپنس کی تاریخ کا طویل ترین تبصرہ موجود تھا جو محبوب مصور سومرو نے لاڑکانہ سے ارسال کیا۔ یہ طویل ترین تبصرہ پوری دو لائنوں پر مشتمل تھا۔ مبارک ہو سومرو صاحب۔ (زبردست) اشفاق شاہین سابقہ ماہ کے شریک محفل دوستوں کی فہرست بتاتے نظر آئے۔ رانا بشیر! بانس پر نہ چڑھائیں معزز خواتین کو، انہوں نے پھر اترنا ہی نہیں جبکہ محفل کی صدارت صرف ایک ماہ کے لیے ہوتی ہے۔ کہانیوں پر تبصرہ بھرپور رہا۔ آپ کی تجویز کی ہم بھی تائید کرتے ہیں۔ دوست محمد چارسدہ! ابھی ٹائٹل میں اس بار کیا خاص بات تھی کہ آپ کو تبصر پر آمادہ کر گئی؟ مرحا گل! میٹھا کچھ زیادہ نہیں ہوگیا؟ البتہ یہ بات درست ہے کہ سسپنس نے اس جدید دور میں بھی اپنا معیار قائم رکھا ہوا ہے اور کئی نئے پڑھنے والے اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ رمضان پاشا! تبصرہ تھوڑا جارحانہ ہونا چاہیے، اتنی عاجزی اور وہ بھی عورتوں کے سامنے؟ ناک کٹوا دی یار آپ نے تو۔ محمد شہباز گجر! ماروی کی آخری قسط کا تو بہت سے قارئین کو شدید انتظار ہے، آپ بھی انتظار کرو۔ محترمہ بینش صدیقی صاحبہ! قلم سے آڑے ترچھے کھینچے گئے الفاظ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ پچھلے ماہ کی کرسی صدارت کا مبارک نامہ بھی قبول کریں۔ محمد خواجہ! آپ کے الیاس سیتاپوری کے بارے میں تجزیے سے اتفاق ہے۔ ان کی تحریر پڑھنے والے کو بے خود کر دیتی ہے اور انسان اپنے آپ کو اسی تحریر کے ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ بلقیس خان! ہم بھی ابتدا شیش محل سے ہی کرتے ہیں اور برملا اقرار بھی کرتے ہیں! خوش؟ مسافر بے خانماں! آپ نے گزشتہ کئی شماروں کا ''چھٹی تبصرہ'' پیش کر دیا۔ مسز صدیقی! آپ ہم سب کے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ محفل سے فرصت پا کر اسما قادری کے محل ''شیش محل'' میں جا گھسے۔ ربن اور راموو غیرہ کو اس بار فاروق کی تلاش میں خوب دوڑایا گیا۔ بملا کی فاروق سے محبت بھی عجیب ڈھنگ کی ثابت ہوئی۔ فاروق کے اغوا کو ہم نے بملا کی طرف سے انتقامی فعل گردانا۔ تاہم اینڈ پر بملا کے فاروق کے انکار پر کیے جانے والے ردعمل نے حیران کر ڈالا۔ واقعی محبت چیز ہے بجھنے کی نہ سمجھانے کی۔ شہزادہ کمال کی طرف سے روا رکھا جانے والا ظلم

آخر کار اس کی موت پر ختم ہوا۔ نواب سلیم اللہ محض رفاقت کی وجہ سے زد میں آ گئے۔ آصف خان کچھ زیادہ ہی تیز دوڑ رہا ہے، ذرا سانس لے لے بھائی۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ کی نم ناک تحریر ''اکیلی عورت'' پڑھ کر اداس ہو گئے۔ مصنفہ نے اکیلی عورت کے مسائل اور پریشانیوں کو بہت پر اثر انداز میں بیان کیا۔ تاہم دونوں بہنوں کا صفدر سے اس قدر بلیک میل ہونا سمجھ سے بالاتر لگا (مگر اس کے باوجود یہ سب ہمارے اردگرد ہی ہو رہا ہے) ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری مرحوم بیبرس کا ذکر کرتے نظر آئے۔ بیبرس وہ عظیم سپہ سالار جس نے ثابت کیا کہ منگولوں کو بھی شکست دی جا سکتی ہے۔ سلطان قطز کو اس کی بدعہدی لے ڈوبی۔ ذاکر کا قصہ چلا تو درداغ کا ماضی یاد آ گیا جس میں وہ بالکل ذاکر کی طرح علیہ کو حاصل کرنے کے لیے پاگل ہو چلا تھا۔ مصنف نے تمام واقعات کو ترتیب سے تحریر کا حصہ بنایا اور کہیں بھی وہ تشنگی محسوس نہ ہوئی جو اکثر تاریخی کتب پڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ ملک صفدر حیات کی روداد ''پشت پناہ'' بھی کافی پُرتجسس اور دلچسپ رہی۔ چودھری اور کانسٹیبل اشتیاق کا گٹھ جوڑ ملک صاحب کے لیے کافی پریشانی کا باعث بنا رہا۔ گاما گانی والا کا کردار بھی دلچسپ رہا۔ سب سے پُراسرار کردار شادو کا تھا۔ علی اختر کی تصویر میں بڑے میاں اور چھوٹو کا انگلی ملانے کا انداز بچپن کی یاد دلا گیا۔ آخر میں ہونے والا مکالمہ دل دہلا گیا۔ اللہ سب کے والدین کا سایہ بچوں پر قائم رکھے، آمین۔ ثمر عباس کا پھندا اتنا سخت تو نہ تھا کہ ایمن اس سے نہ نکل سکی۔ جب اسے پتا چل گیا تھا کہ ڈاکٹر اس سے سابقہ انتقام لے رہا ہے تو اسے واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ منظر امام کی مشعل ایک اصلاحی تحریر ثابت ہوئی۔ کم عمری میں وفات پا جانے والے بچے یقیناً جنت میں جاتے ہیں البتہ والدین کے لیے صبر کرنا ایک جاں گسل کام ہوتا ہے۔ اللہ سب کو آزمائش سے بچائے۔ شوق اور مستقبل کا مصور گزارے لائق تھیں۔'' (طویل اور دلچسپ تبصرے کا شکریہ)

✠ بابر عباس، ماہین بابر، بگیانہ روڈ، کھاریاں سے تبصرہ کر رہے ہیں ''سرجی! سسپنس کا نیا شمارہ اٹھارہ نومبر کو شام چھ بجے بک اسٹال سے ایسے ملا جیسے اندھے کو آنکھیں ملتی ہیں اور سرورق کو دیکھ کر جھٹکا ایسے لگا جیسے غریب آدمی کو بجلی کا بل دیکھ کر لگتا ہے۔ سرورق کی سو سالہ بوڑھی حسینہ میک اپ زدہ چہرہ لیے شاید گزرے وقت کو یاد کر رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ درخت پر بنے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر گا رہی ہے...... دل چیز ہے کیا جاناں یہ جان بھی تمہاری ہے۔ فہرست کو ویلکم کہہ کر ایلیا صاحب کو خدا حافظ کہتے ہوئے میں سیدھا پہنچا اپنی پیاری محفل میں۔ دل کو ایک زبردست دھچکا سا لگا۔ سرجی! آپ نے میرے خط کے ساتھ وہ حشر نشر کیا ہے جیسے کہ آج کل انڈین آرمی بارڈر پر نہتے شہریوں کے ساتھ کر رہی ہے (یہ زیادتی ہے بھئی ہمارے ساتھ) مجھے امید ہے کہ میرے اس خط کا بھی برا حال ہوگا۔ سرجی اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی تمام باتیں تلخ اور حقائق سے بھرپور ہوتی ہیں ہمیں آئینہ دکھلاتی ہیں مگر افسوس صد افسوس ہم لوگ بے حس ہو چکے ہیں۔ کرسی صدارت پر محمد صفدر صاحب موجود تھے۔ صفدر صاحب! خدا آپ کے والد صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) محبوب مصور سومرو صاحب کیا مختصری حاضری لگوائی ہے دل خوش کر دیا۔ اشفاق شاہین صاحب تو شاہین ہے پرواز کر اونچی چٹانوں پر۔ ایلیا صاحب کی باتوں کو سمجھنے کے لیے دماغ چاہیے ہوتا ہے۔ مرزا طاہر الدین بیگ صاحب جناب خیر تو ہے بھئی آپ تو سب کی تعریف کیے جا رہے ہیں۔ کچھ تعریف مجھ ناچیز کے لیے بھی بچا کر رکھیں۔ ادریس بھائی کیا کہنے، کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔ قربان جاؤں میں آپ کے انداز بیاں پر۔ کیا مختصر اور پر اثر خط لکھا ہے آپ نے لگتا ہی نہیں آپ وہی ادریس احمد خان ہیں۔ محمد خواجہ صاحب! اس میں کوئی شک نہیں کہ سسپنس ایک معیاری اور خوب صورت ڈائجسٹ ہے۔ یہ ہر ماہ ہمیں خوب صورت اور پیاری سی کہانیاں پڑھنے کو دیتا ہے۔ یہ معراج رسول صاحب کا لگایا ہوا وہ پودا ہے جس کی آبیاری سسپنس کے اراکین کرتے ہیں۔ بعد میں ہم اپنی اپنی ذہنی بساط کے مطابق رائے دیتے ہیں، کوئی نئی بات کریں۔ واہ جی واہ! عبدالجبار رومی انصاری میرے سسرالی شہر اور تاریخی شہر لاہور سے آئے ہیں۔ تم وہی کرو جو روم والے کرتے ہیں، آپ وہ کریں جو لاہور یے کرتے ہیں۔ رومی صاحب چھا رہے ہیں آپ! بلقیس خان صاحبہ ہر رائٹر کا اپنا اپنا انداز اور ہر انداز جداگانہ۔ محی الدین نواب صاحب اپنی طرز کے ایک منفرد رائٹر تھے۔ اسی طرح کاشف زبیر بھیا کی اپنی ایک الگ پہچان تھی۔ سسپنس ڈائجسٹ نے اور جاسوسی ڈائجسٹ نے ہمیں بہت سے انمول ہیرے دیے ہیں جن میں محی الدین نواب، عبدالقیوم شاد، اقبال کاظمی، کاشف زبیر، ممتاز آزاد، الیاس سیتاپوری، ابوضیا اقبال شامل ہیں۔ خدا ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ حسب معمول سب سے پہلے اپنے فیورٹ رائٹر محی الدین نواب کی طلسمی الف لیلہ ماروی پڑھی۔ نواب صاحب وہ رائٹر تھے جن کے آگے الفاظ ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے۔ ماروی زبردست جا رہی ہے۔ دوسرے نمبر پر اسما قادری صاحبہ کی شیش محل پڑھی۔ سرجی! یقین کریں شیش محل پر آہستہ آہستہ جمود طاری ہوتا جا رہا ہے۔ اس بار پھر حسب معمول ایک خوب صورت تحریر اکیلی عورت ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کے قلم سے۔ اکیلی عورت نے وہی مزہ دیا جو کہ اکثر ناہید سلطانہ اختر کی تحریریں دیتی ہیں۔ ویل ڈن ناہید جی۔ ملک صاحب کا کیس تو زبردست تھا مگر لحاظی توقع کے ساتھ تحریر بڑی کمزور۔ حسام صاحب کچھ توجہ دیں۔ الیاس سیتاپوری صاحب کے کیا ہی کہنے، تاریخ کے بادشاہ تھے اب بھی اپنی تحریروں کے ذریعے ہمارے درمیان زندہ ہیں۔ غلام بادشاہ بھی ان کی ایک خوب صورت تحریر ہے۔ زرین قمر کی شکست فاتحانہ کشمیر کے موضوع پر ایک اچھی اور معیاری تحریر۔ کشمیر کے موضوع پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ دیگر رائٹرز نے بھی اپنے اپنے انداز میں سسپنس کی خدمت کی اور اپنی اپنی کہانیوں سے سسپنس کا پیٹ بھرا۔ آنے والا شمارہ نئے سال کا پہلا شمارہ ہے۔ سرجی! خدا سے یہی دعا ہے آنے والا سال ہمارے لیے امن کا گہوارہ ثابت ہو اور ہر طرف سکون ہی سکون اور امن و شانتی ہو اور ہمارے پیارے جاسوسی، سسپنس، سرگزشت وغیرہ یونہی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے رہیں۔ آپ سب کو اور محفل کے تمام دوستوں کو میری طرف سے نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔''

✠ انعم کمال، کراچی سے تبصرہ کر رہی ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ یوں تو 15 کو حاصل کر لیا تھا مگر ناسازی طبیعت کے باعث تھوڑا دیر سے مطالعہ کیا لیکن یقین جانیں طبیعت کی گرانی کہانیوں کے انتخاب اور لاجواب ہونے کے باعث دور ہو گئی۔ سب سے پہلے خطوط کی محفل دیکھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ ایسا لگا کہ ایک پوری فیملی ہے اتنا پیار و محبت تو آج کل سگے رشتوں میں نہیں۔ سچ کہتے ہیں کہ اچھائی ابھی باقی ہے اسی لیے یہ دنیا قائم و دائم ہے۔ اب آتے ہیں

کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے تاریخی کہانی غلام بادشاہ پڑھی۔ انتہائی خوب صورت کہانی ہے۔ لگتا نہیں کہ تاریخی کہانی پڑھ رہے ہیں کیونکہ اسے پڑھتے ہوئے کہیں بوریت کا شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ یہ الیاس سیتاپوری صاحب کا کمال تھا کہ وہ اس پیرائے میں لکھتے کہ پڑھنے والا اس میں ڈوب سا جاتا ہے۔ اس کے بعد شیش محل پر پہنچے۔ اسما قادری صاحبہ نے کہانی کا ٹیمپو تھوڑا تیز کیا ہے مگر پھر بھی اس میں وہ بات نہیں جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرلے۔ کہانی اچھی ہے مگر جملوں کی غیر ضروری طوالت کے باعث بعض دفعہ بوریت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ متعدد لوگ اس سے اتفاق نہ کریں۔ بہرحال ہر کسی کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کی آزادی ہے۔ ماروی پڑھی۔ تیز تر کہانی ہے مگر حالات وواقعات حقیقت سے کافی دور ہیں۔ ملک صفدر حیات پشت پناہ لے کر آئے۔ ہمیں بس ٹھیک لگی۔ ثمر عباس کی پھندا اچھی کہانی تھی۔ ڈاکٹر نے انتہائی ہوشیاری سے قتل کیا مگر پھر بھی ثبوت باقی رہ گیا۔ شوق بس گزارے لائق رہی۔ منظر امام صاحب کے کیا کہنے! بہت حساس تحریر تھی۔ پڑھ کے دل اداس ہوگیا۔ بہت بہترین کہانی تھی۔ مستقبل کا مصور بھی بہترین کہانی تھی۔ مصور کا کردار نہایت ہی جاندار تھا۔ جو جو پیشگوئی کی وہ ٹھیک ثابت ہوئی۔ شاہ دولہ کی داستان حیات پڑھی۔ دل ایمان کی، روشنی سے منور ہوگیا۔ ویلڈن ضیا تسنیم بلگرامی۔ شکست فاتحانہ کچھ خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ اسٹوری آف دی منتھ ناہید سلطانہ اختر کی اکیلی عورت تھی۔ کہانی نے ہمارے معاشرے کی بہت سی تلخ حقیقتوں پر سے پردہ اٹھایا۔ حقیقت سے انتہائی قریب تر کہانی نے دل کو چھولیا۔ نہایت ہی نصیحت آموز کہانی تھی۔ محفل شعر وسخن میں اچھے اشعار شامل کیے گئے۔ نئے سال کا شمارہ بہترین تھا۔"

رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے محفل میں شریک ہیں "محمد صفدر معاویہ، محفل پر نظر ڈالتے ہی کرسی صدارت پر آپ کا نام دیکھا تو بہت خوشی ہوئی ہے...... جیسے ہی آگے بڑھے افسوس ناک خبر پڑھنے کو ملی۔ ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ رب کائنات آپ کے والد کے درجات بلند کرے گا۔ بیماری بھی جسم کا ایک صدقہ ہوتی ہے اور اچھی اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔ آپ آج جس اعلیٰ مقام پر ہیں آپ کے والدین آپ کے ساتھ ہیں۔ میلادالنبیؐ کے موقع پر آپ کے والد کے لیے ضرور خصوصی دعا کروائی جائے گی۔ ویسے تو آپ فوجی بھائی جہاں کھڑے ہوتے ہیں وہی جگہ اہم بن جاتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ کے صدارتی خط میں میرے نام کا تبصرہ بھی ہے۔ آپ کی بیماری کا پڑھ کر سب کو بہت دکھ ہوا۔ پشت پناہ، ملک صاحب کی سبھی کہانیاں پڑھنے کے لائق ہوتی ہیں۔ وہ بہت ہی محنت سے کیس حل کرتے ہیں لیکن یہ کہانی انہی کی پرانی کہانی سے ملتی جلتی ہے۔ بس تھوڑا بہت ردوبدل ہے۔ تصویر میں مصنف نے مصور کو اس احساس سے روشناس کرایا جو ہمارے پاس ہوتا ہے مگر ہم تب بھی اس کو ظاہر نہیں کرسکتے۔ مصوروں کو چیلنج کیا گیا ہے، ایسا شاہکار بنا کر دکھائیں۔ پھندا میں ڈاکٹر نے اپنا جرم چھپانے کے لیے خود کو اتنا مصروف کرلیا کہ ثبوت مٹانا ہی بھول گیا۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں اس میں خود گر جاتے ہیں۔ کاش ایمن اس کا انجام دیکھ سکتی۔ شوق جس کا ہر لفظ سسپنس سے بھرا تھا، کہانی ختم کرنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ کہانی کے انجام نے دکھی بھی کردیا اور چونکا بھی دیا۔ بہترین کہانی۔ مشعل، مصنف نے کہانی میں دینی اور مذہبی اہم بات بتائی ہے کہ مرنے والے کے لیے قرآن اور سنت پر عمل کریں۔ ان کو یاد کرنے، ثواب پہنچانے کا بہترین راستہ قرآن ہے۔ جب بھی ان کی یاد آئے، غم ستائے قرآن پاک کے ذریعے اللہ سے باتیں کریں، دل کو سکون ملے گا۔ مستقبل کا مصور میں مصور نے دوسرے کے مستقبل کی پیش گوئی کرکے اس کو طرح طرح کی تکلیفوں سے گزارا۔ ابن حاتم معذور بھی ہوگیا اور تصویر جیسا بن گیا۔ مستقبل نے ایک اچھے بھلے انسان کا مستقبل تباہ کردیا۔ نہ مصور کو کچھ ملا۔ کاش مصور اپنے مستقبل کے بارے میں بھی معلوم کرلیتا۔ شکست فاتحانہ میں مصنف نے صرف دو کرداروں کے ذریعے مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی بے بسی، لاچاری اور مجبوری کو ظاہر کیا جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ فریحہ نے اپنے بچے کو ایک برا انسان اور غیر مسلم ہونے سے بچالیا۔ اکیلی عورت میں نگینہ اور ثمینہ کی سمجھ نہیں آئی، یہ کس قسم کی عورتیں تھیں۔ اپنی دل بھر کے بے عزتی کرواتی تھیں۔ اس کی بہن ثمینہ بہن کو چھوڑتی نہیں تھی جبکہ ثمینہ کے میاں میں کونسی برائی نہیں تھی اور پھر بھی اسے اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ گھر ان کا اپنا تھا، نگینہ الگ گھر بھی نزدیک لے سکتی تھی۔ ثمینہ مردوں کو برا بھی کہتی تھی اور ساتھ بھی رکھا ہوا تھا۔ بڑی ہمت تھی۔ آخر میں مصنفہ نے عورت ہوکر کہانی کے کردار کی عورت کو اتنا گرا دیا (رضوانہ صاحبہ! ابھی آپ نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے...... عورت زندگی کے کس کس مقام پر کس کس آزمائش سے گزر رہی ہے۔ مردوں کے اس معاشرے میں عورت کو کس طرح بلیک میل کیا جاتا ہے۔ مصنفہ کی نظر یقیناً معاشرے کے اس گھناؤنے پہلو پر بہت گہری ہے۔ بہت سی جگہوں پر عورت کو انتہائی غیر یقینی صورت حال کا سامنا ہے) دوست محمد، مرزا طاہر الدین بیگ، ادریس احمد خان، عبدالجبار رومی اور زرین آفریدی کا تبصرہ خوب تھا۔ تاریخی کہانی میں ہم واقعی اسی دور میں پہنچ جاتے ہیں اور اسلامی کہانی پڑھ کر دل اور ذہن کو پاکیزگی ملتی ہے اور خطاؤں سے دور ہوتے ہیں۔ محفل شعر وسخن میں، جاوید صدیقی ٹنڈو الہ یار، مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ اور زرین آفریدی، حیدرآباد کے شعر خوب تھے۔ اس سال کے آخر اور نئے سال کی آمد میں پیارے نبی ﷺ کی آمد بھی شامل ہے حضرت محمد ﷺ کی محبت میں ایک شعر ہے۔

امت کے مقدر میں جو تھے، وہ دکھ تو نے اٹھائے
اسلام ہمیں بڑی سہولت سے ملا ہے

دعا ہے کہ سب مسلمان قرآن اور سنت کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں شامل کرلیں۔ اگر مسلمان چلتا پھرتا قرآن کی تصویر بن جائے تو وہ حافظ بھی ہے۔ زندہ ہے تو غازی ہے، فوت ہوگیا تو شہید ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

پائندہ خان، سلیمان خیل، شیخوپورہ۔ عالیہ ملک، نامعلوم مقام۔ محمد اقبال، کراچی۔ ظہیر احمد، لاڑکانہ۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہوش، حیدرآباد۔ نازیہ علی، کوئٹہ۔ رمشا کنول، لاہور۔ ثاقب خان، کراچی۔ وسیم اختر، بہاولپور۔ عاصم خان، پشاور۔ شاہین اقبال، سکھر۔ صباحر، پنڈی

دور کوئی بھی ہو جب بھی تاریخ کا حصہ بنتا ہے تو کوئی نہ کئی انفرادیت لیے ہوئے ہوتا ہے... جیسے منگولوں کا طویل ترین عہد... وہ جو دنیا کے بیشتر حصوں کو فتح کر چکے تھے مگر ایک مقام پر حلیفوں کی تلاش پر مجبور ہوگئے... ان وحشیوں کا سیلاب جو ہر بلند وپست کو خس وخاشاک کے مانند بہاتا چلا آرہا تھا، وہاں اپنی تندی وتیزی کھو بیٹھا اور جب ایک غلام نے دو بڑی طاقتوں کو آپس میں ٹکرایا تو ہلاکو خان کو ادراک ہوا کہ اصل جنگ کسے کہتے ہیں۔ وہ جو حقیقی بازی گر تھا مصر میں بیٹھا ڈور ہلا رہا تھا۔ بڑی بڑی قوموں کو پیروں تلے کچل کر خوش ہوجانے اور آزاد ممالک کو خاک وخون میں نہلا دینے والوں کو دریائے تیریک کے شمالی ساحل پر تاریخ کی فیصلہ کن شکست دے دی گئی۔ وحشی منگول سب کو ہرا سکتے تھے مگر مشیتِ ایزدی کو نہیں جس نے ایک سفاک فاتح کے غرور کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملادیا اور آنے والی اقوام کے لیے عبرت کا سامان پیدا کردیا کہ ان کے عروج اور فتح کے راز کو ہی نہیں بلکہ ان کی الم ناک شکستگی کی وجوہات کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے آنے والے کل کے بارے میں لائحہ عمل طے کرنے میں ہی عافیت اور اطمینان ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

آخری معرکہ

الیاس سیتا پوری





تردی اپنے نسب نامے کی رو سے گڈریا تھا لیکن جب منگولوں نے ایشیا اور ایشیائے کوچک کے سبزہ زاروں کو اپنے مویشیوں کے جہنم میں اتار دیا تو دوسرے ہم پیشہ خاندانوں کی طرح یہ بھی تباہ و برباد ہوگیا۔ اس کے دادا کے پاس دو ہزار جانور تھے لیکن اس کی زندگی ہی میں یہ گھٹ کر آٹھ سو رہ گئے۔ پھر جب دادا کا انتقال ہوا تو تردی کا باپ اس کا جانشیں قرار پایا۔ کچھ عرصے بعد تردی کے باپ کا بھی انتقال ہوگیا اور خاندان کی کفالت کا سارا بوجھ تردی پر آن پڑا۔ تردی کا کنبہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ایک بیوی، دو بیٹے، ایک دس سال کا ہوا دوسرا بارہ سال کا، ایک بیٹی آٹھ سال کی۔ پانچواں خود تردی۔ بڑے لڑکے کا نام جوزی، چھوٹے کا نام صارو تھا۔ لڑکی کا نام سلوتیہ تھا۔ تردی کے آٹھ سو مویشی آہستہ آہستہ ان سپاہیوں کی نذر ہوتے چلے گئے جو اکثر و بیشتر اس کے گاؤں کے سامنے سے گزرتے رہتے تھے کیونکہ اس کا گاؤں فوجوں کی گزرگاہ میں واقع تھا۔

جب چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوجی اور اس کی اولاد نے حکومت شروع کی تو اس علاقے میں امن وامان قائم ہوگیا لیکن اب تردی بالکل برباد ہوچکا تھا۔ وہ گڈریا تھا اور گڈریا ہی رہنا چاہتا تھا لیکن قدرت اور قسمت اس سے اس کا آبائی پیشہ چھین لینے پر مصر تھیں۔ بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اس نے لکڑہارے کا پیشہ اختیار کیا لیکن خانوں کی حکومت نے جنگلات کو سرکاری املاک قرار دے دیا اور تردی بدقسمتی سے لکڑہارا بھی نہ بن سکا۔

یہ برقائی خان کا زمانہ تھا۔ چنگیز خان کے پوتے برقائی خان کا زمانہ جو مسلمان ہوچکا تھا۔ تردی نے برقائی خان تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کی آنکھیں فن سپاہ گری کے ماہرین کو قدرومنزلت کی بلندیوں پر فائز دیکھ رہی تھیں اس لیے اب وہ خود بھی برقائی کی فوج میں ملازمت کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی جدوجہد اور کوششوں کے آگے آگے اس کی تقدیر سفر کررہی تھی۔ برقائی کے آدمیوں نے اس کو برقائی تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔

پتھر کا ایک مکان جس میں دو کمرے اور ایک صحن تھا۔ کمروں پر شہتیر اور گھاس پھوس بچھا کر چھتیں ڈال دی گئی تھیں۔ یہ پرندے چھتوں کے گھاس پھوس کو اٹھا اٹھا کر لے جاتے اور ان سے اپنے گھونسلے بناتے۔ جہاں جہاں سے گھاس پھوس کم ہوا تھا، وہاں سے کمرے میں بیٹھ کر آسمان کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ تردی زمین پر چادر بچھائے لیٹا ہوا تھا اور چھت کے روزنوں سے وہ نیلے آسمان کا نظارہ کررہا تھا۔ اچانک اس کی نظر چند چیونٹیوں پر پڑی۔ یہ چیونٹیاں فالسے جتنی کوئی چیز اوپر لے جانے کی کوشش میں مصروف تھیں لیکن وہ دیوار پر زیادہ دور جانے سے پہلے ہی فالسے جتنی چیز سمیت لڑھک کر نیچے فرش پر آجاتیں۔ چیونٹیاں ایک بار پھر اس جنگلی کروندے کو اپنی گرفت میں لیتیں اور اوپر چڑھنا شروع کردیتیں اور دوبارہ پھسل کر نیچے آجاتیں اور ایک بار پھر اپنی سابقہ کوشش میں مشغول ہوجاتیں۔

تردی سوچتا، آدمی اور حیوان میں کتنا فرق ہے۔ کم ازکم انسان ان چیونٹیوں جیسی حماقت نہیں کرسکتا۔ چیونٹیوں کے فضول اور یکساں طرزعمل نے اس کو بدمزہ کردیا تھا۔ اس نے چیونٹیوں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور معلوم نہیں کیا کچھ سوچنے لگا وہ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کی پوری داستان تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک چیونٹیوں کا خیال اسے پھر آگیا اور اس نے دیوار پر انہیں تلاش کیا، دیوار کے نچلے اور نصف حصے تک چیونٹیوں کا کہیں پتا نہ تھا پھر اس نے انہیں زمین پر تلاش کیا۔ وہ یہاں بھی نہیں تھیں۔ اس نے سوچا پھر یہ چلی کہاں گئیں؟ اچانک اس کی نظریں چھت اور دیوار کے سنگم پر جا پڑیں۔ چیونٹیاں اپنے ارادے میں کامیاب ہوچکی تھیں۔ گھاس پھوس کی چھت بالکل ان کے قریب تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھاس پھوس میں کہیں غائب ہوگئیں۔ تردی کے دل ودماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ جدوجہد، لگاتار جدوجہد، سعی، مسلسل سعی۔ کوشش، متواتر کوشش، عمل پیہم عمل، کامیابی کا راز اسی میں ہے۔

تردی نئی امنگوں اور تازہ ولولوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور صحن میں کھڑے ہوکر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اوپر فضا میں باز کسی پرند پر جھپٹ رہا تھا۔ سہما ہوا بدحواس پرند باز کو چک پھیریاں دے رہا تھا، وہ کبھی اوپر چلا جاتا اور کبھی نیچے آجاتا۔ کبھی آگے بڑھ جاتا، کبھی پیچھے ہٹ آتا۔ باز بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ آخر پرند تھک سا گیا اور باز نے اسے دبوچ لیا۔

تردی نے اسے بھی اپنے حق میں تائید غیبی سمجھا اور وہ قدرت کے اشاروں کے معانی ومطالب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بیوی اور بچے دور کھڑے اس کی اصل کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ تردی کسی مفہوم تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور

اس نے غیر ارادی طور پر خود سے کہا۔ ''وہ مارا...... میں سمجھ گیا تیرا مطلب۔''

بیوی بچوں کو شبہ گزرا کہ شاید تردی پاگل ہو گیا ہے۔ بیوی ناصیہ آگے بڑھی اور تردی کا بازو پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ''کیا مارا؟ کس کا مطلب سمجھ گئے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟''

تردی نے خود کو بیوی کے سامنے جوابدہ جو دیکھا تو گھبرا گیا۔ بولا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں، میرا دماغ بھی درست ہے۔ تو کیوں خوامخواہ پریشان ہو رہی ہے؟''

بیوی نے اصرار کیا۔ ''نہیں! اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے تم سے جو پوچھا ہے تم اس کا جواب دو پہلے۔''

تردی نے بیوی ناصیہ کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹایا اور جواب دیا۔ ''میں نے دو حیرت انگیز مناظر دیکھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں ان دونوں مناظر میں انسان اور خصوصاً میرے لیے بڑی عبرت اور حکمت کا سامان ہے۔''

بیوی کی نظریں تردی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ''یعنی کون سے دو مناظر؟ کیسی عبرت اور کہاں کی حکمت؟ بات ذرا صاف صاف کرو۔''

تردی نے جب یہ دیکھا کہ اب جان نہیں چھوٹے گی تو اس نے دونوں مناظر کی تفصیل بھی بتادی، بولا۔ ''چیونٹیوں کی جدوجہد میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ ہر جاندار کو جیتے جی تھکنا اور ہمت نہیں ہارنا چاہیے اور باز کے منظر میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ شکار کرو تو شکار ملے گا ورنہ کچھ نہیں۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''پھر اب کیا ارادے ہیں؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''بیوی! ابھی تک میں معمولی پرندتھا چنانچہ فوجی باز میرے سارے مویشی چٹ کر گئے، اب میں باز بنوں گا اور شاہی اور سرکاری مویشیوں پر ہاتھ صاف کروں گا۔''

بیوی نے کہا۔ ''نہیں! خبردار ایسا نہ کرنا ورنہ وہ عقاب، باز کو بھی چٹ کر جائیں گے۔''

تردی کو اپنی سوچ اور اس کے خوشگوار نتائج پر پورا یقین تھا جواب دیا۔ ''اگر وہ عقاب بن گئے تو میں بھی عقاب بن کر دکھاؤں گا کیونکہ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔''

بات ختم ہوگئی مگر بیوی کو تردی کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ تردی باہر نکل گیا۔ بچوں نے اپنی ماں کو گھیر لیا۔ ماں نے انہیں چمٹالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''بچو! مجھے تو تمہارے باپ سے باتیں کر کے ایسا لگا، گویا وہ پاگل ہو چکے ہیں۔ اب اس گھر کا کیا ہوگا؟''

ماں کو روتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے۔

☆☆☆

تردی باہر نکلا اور اس شاہراہ پر چل پڑا جس پر سے بے شمار لشکر گزر چکے تھے اور اسی راستے پر مشرق میں شاہراہ سے ملحق وہ مشہور چراگاہ تھی جس میں شاہی مویشی چرا کرتے تھے۔ تردی نے سوچا۔ اگر ان مویشیوں کو کسی طرح یہاں سے ہنکا کر جنگل میں چھپا دیا جائے تو؟

تردی کو اس خیال نے بہت زیادہ خوش کر دیا۔ وہ چلتے چلاتے اور دوڑتے بھاگتے دوپہر تک اس چراگاہ میں داخل ہو گیا جہاں برقائی خان کے مویشی گھاس کھانے میں مشغول تھے۔ تردی گزرگاہ اور چراگاہ کی حدِ فاصل پر بیٹھ گیا۔ چراگاہ کے اندر، دور جہاں بڑے بڑے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا، وہاں دو آدمی چادر اوڑھے سوئے ہوئے تھے۔ ان مویشیوں میں گائے، بکریاں، دنبے، بھیڑیں اور گھوڑے بھی شامل تھے۔ تردی کی رال بہنے لگی، وہ سوچتا۔ اے کاش یہ سارے مویشی مجھے مل جاتے تو کیا مزہ آتا۔

تردی سوچ رہا تھا کہ وہ ان مویشیوں میں سے کس کی چوری کرے کہ پکڑا نہ جائے اور چپ چاپ لے کر فرار ہو جائے۔ اس کی نظرِ انتخاب گھوڑے پر پڑی کیونکہ گھوڑے پر بیٹھ کر وہ فرار ہو سکتا تھا لیکن دوسرے مویشیوں کو چرا کر وہ بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے چراگاہ میں داخل ہو گیا اور چوری کے لیے ایک چتکبرے گھوڑے کو پسند کیا۔ وہ بہ آہستگی اس کے پاس گیا اور اس کے پاس کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ اس کا پیٹ سہلانے لگا۔ اب اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ آ گیا تھا۔ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر بغیر لگام کے فرار ہو سکتا تھا جو بظاہر مشکل اور خطرناک تھا۔ وہ پکڑا بھی جا سکتا تھا اور فرار ہوتے ہوئے پیچھا کرنے والوں کے تیروں سے زخمی یا ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔

اس نے انجام کی پروا کیے بغیر اچھل کر گھوڑے پر قبضہ کیا اور پھر ایال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دونوں رانوں سے گھوڑے کو دبا کر بھاگنے کا اشارہ کیا۔ گھوڑا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھوڑے کی ٹاپوں نے دونوں سونے والوں کو بیدار کر دیا۔ انہوں نے نیم غنودگی میں تردی کو گھوڑے پر سوار بھاگتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اپنی چادریں تو پھینکیں ایک طرف اور دوسرے گھوڑوں پر بیٹھ کر تردی کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

راستے میں چتکبرے گھوڑے نے اکڑنا اور الف ہونا

شروع کر دیا۔ تردی اس کو ڈانٹ رہا تھا۔ ''ارے احمق! تو یہ کیا کر رہا ہے؟''

پھر معلوم نہیں کس طرح گھوڑا سیدھا ہو گیا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ دونوں پیچھا کرنے والے بھی بگٹٹ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے تردی نے اپنا راستہ بدل دیا۔ وہ ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ وہ اس جنگل کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا مگر اس کا پیچھا کرنے والے اس جنگل کے بارے میں تردی جتنا علم نہیں رکھتے تھے۔ دونوں نے تردی کو جنگل میں داخل ہوتے جو دیکھا تو ذرا سہم گئے کیونکہ انہیں شبہ تھا کہ اس گھنے جنگل میں درندے ہو سکتے ہیں۔ وہ جنگل کے پاس رک گئے اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہے اور اپنے آئندہ کے طرزِ عمل پر سوچنے لگے۔

ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ ''اب کیا کیا جائے؟''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''واپس چلا جائے اور اس واردات کی خبر خان کے فوجیوں کو دے دی جائے۔''

پہلے نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔ ''اور ہمارا کیا حشر ہوگا؟''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''کچھ پتا نہیں، خدا ہی جانے کیا حشر ہوگا ہم دونوں کا۔''

دونوں کچھ دیر یوں ہی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد واپس چلے گئے۔

تردی کچھ دیر تو جنگل میں ہی رہا، اس کے بعد دوسرے کنارے پر باہر نکلا اور اپنے بیوی بچوں کو دیکھا۔ انہوں نے تردی کو ایک چنکبرے گھوڑے پر سوار جو دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ بیوی گھوڑے کے سامنے جا کھڑی ہوئی، پوچھا۔ ''یہ گھوڑا کہاں سے لے آئے؟''

تردی نے کہا۔ ''میرے پاس تیرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔''

بچے بھی باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

بیوی نے پوچھا۔ ''یہ کہاں سے چرا لائے؟''

تردی نے تیوریاں چڑھائیں، بولا۔ ''خبردار جو بے تکی باتیں کیں مجھ سے۔ جب تک میرے مویشیوں پر ڈاکا پڑتا رہا تو، تو نے اس قسم کی زبان استعمال نہیں کی اور اب میں جو ایک گھوڑا نکال لایا تو، تو اسے چوری قرار دے رہی ہے۔''

بیوی نے کہا۔ ''خدا خیر کرے۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں؟''

تردی نے کہا۔ ''بیوی! میں نے نہایت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ مویشیوں کی چوری کا پیشہ اختیار کروں۔ خدا مجھے معاف کرے، میرے ساتھ بڑی زیادتی ہو چکی ہے۔ میں اپنے مویشیوں کے خسارے کو پورا کر کے یہ پیشہ ترک کر دوں گا۔''

بیوی نے بددلی سے کہا۔ ''اس معاملے میں، میں تم سے اتفاق نہیں کروں گی۔ خان کے آدمی اپنے گھوڑے کے چور کا پیچھا کریں گے اور جب یہ چور پکڑا جائے گا تو پتا نہیں اس چھوٹے سے کنبے کا کیا حشر ہو۔''

تردی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں اس جگہ کو بھی چھوڑ دوں گا اور کسی پہاڑی کھوہ کو اپنا مسکن بنا لوں گا۔ کسی ایسی کھوہ میں جہاں تک دوسروں کا پہنچنا دشوار ہو۔''

بیوی نے کہا۔ ''جو چاہو کرو۔ میں کیا کر سکتی ہوں لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔''

تردی نے سب کو یکجا کیا اور انہیں جنگل میں چھپا دیا اور خود گھوڑے پر بیٹھ کر دوسرے شکار کی تلاش میں نکل گیا۔ وہ خان کی دسترس سے دور نکل جانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چند دن اس کام کو تنہا کرے گا پھر اس میں دوسروں کو بھی شریک کرلے گا اور جب جمعیت بڑی ہو جائے گی تو وہ اپنے اس پیشے کو دلیری سے انجام دے گا اور گروہ بنا کے ادھر ادھر کی بستیوں پر تاخت و تاراج کیا کرے گا اور اسی تگ و دو میں ہو سکتا ہے وہ کسی علاقے کا حکمران بن جائے۔

وہ گھوڑے پر سوار البرز کی پہاڑیوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ ایک پہاڑی کے نیچے چراگاہ میں اس نے بہت سارے گھوڑوں کو چرتے دیکھا۔ اس نے ان کے رکھوالوں کو نظروں سے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر دور دور تک کوئی نظر نہ آیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کو بھی اسی چراگاہ میں لے گیا۔ یہاں اس نے اونچی اونچی گھاس کے کنارے ایک آدمی کو چادر میں منہ چھپائے لیٹا ہوا دیکھا۔ یہ کچھ دیر دور ہی سے اس بات کا اندازہ لگاتا رہا کہ یہ آدمی سویا ہوا ہے یا جاگ رہا ہے۔ سویا ہوا شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ تردی اپنے گھوڑے کو بالکل اس کے قریب لے گیا اور اسے آہستہ سے آواز دی۔ ''برادر عزیز! کیا پینے کو پانی مل جائے گا؟''

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا، بلکہ اس کے خراٹوں نے تردی کو خوش کر دیا۔ وہ چراگاہ کے گھوڑوں میں گیا اور ایک گھوڑے کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر اپنی

طرف گھسیٹا۔ جب یہ گھوڑا اس کے گھوڑے کے برابر آگیا تو اس نے اپنے گھوڑے کو بھگانا شروع کر دیا۔ دوسرا گھوڑا بھی کچھ دور اس کے ساتھ چلا مگر پھر اڑنے لگا۔ تردی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس نے دوسرے گھوڑے پر چابک استعمال کیا اور اس کو آگے آگے بھگانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ وہ گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس نے دونوں گھوڑے درختوں کے ایک جھنڈ میں باندھ دیے اور خود اپنے بیوی بچوں کے پاس پہنچ گیا۔ بیوی نے پیدل آتے دیکھا تو پوچھا۔ ''وہ گھوڑا کہاں چھوڑ آئے؟''

تردی نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک گھوڑا اور لے آیا اور ان دونوں کو درختوں کے ایک جھنڈ میں باندھ آیا ہوں۔''

بیوی چپ ہو گئی۔ تردی کوئی نیا منصوبہ بنا رہا تھا۔ دونوں لڑکے اور لڑکی اس کے پاس کھڑے اس طرح دیکھ رہے تھے، گویا وہ اپنے باپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ تردی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تمہیں مجھ سے کچھ پوچھنا ہے؟''

بڑے لڑکے جوزی نے پوچھا۔ ''ہم اپنے گھر واپس کب جائیں گے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں۔''

لڑکی سلوقیہ نے پوچھا۔ ''پھر کس کو پتا ہے کہ ہم گھر کب جائیں گے؟''

دس سالہ صارو نے کہا۔ ''لیکن ہمیں پتا ہے ہم گھر ضرور جائیں گے۔''

تردی نے حیرت سے پوچھا۔ ''تجھ کو کیا پتا ہے؟ تو گھر کب واپس جائے گا؟''

جوزی نے جواب دیا۔ ''ہم نے ماں سے اپنے گھر واپسی کا سمجھوتا کر لیا ہے۔ آپ جہاں چاہیں رہیں لیکن ہم اپنے گھر واپس جائیں گے۔''

تردی غصے میں بیوی کی طرف بھاگا۔ ''ناصیہ! یہ بچے کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا تو بچوں کے ساتھ گھر واپس جانا چاہتی ہے؟''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''ہاں! صرف میں ہی نہیں، میرے بچے بھی میرے ساتھ واپس جانا چاہتے ہیں۔''

تردی نے بپھر کر پوچھا۔ ''مگر کیوں؟ آخر کیوں؟''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''میں اور میرے بچے نہ تو اس کھوہ میں رہ سکتے ہیں اور نہ ہی خانہ بدوشانہ زندگی اختیار کر سکتے ہیں۔''

تردی غصے میں چیخنے لگا۔ ''جاؤ، جاؤ تم سب مجھ کو چھوڑ دو حالانکہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں تم سب کے لیے کر رہا ہوں۔ میں تمہارے بغیر بھی رہ سکتا ہوں اور میں تمہارے بغیر رہ کر دکھاؤں گا۔''

ناصیہ نے اپنے بچوں کو ساتھ لیا اور اپنے گھر واپس چلی گئی۔

جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچی تو اس نے اپنے گھر کو خان کے آدمیوں سے گھرا ہوا پایا۔ باہر تین آدمی کھڑے ہوئے تھے اور اندر بھی کچھ موجود تھے۔

ایک سپاہی نے ناصیہ کو اپنے بچوں کے ساتھ آتا دیکھ لیا اور دوڑ کر اس کو پکڑ لیا۔ ''عورت! تو کہاں رہتی ہے؟''

ناصیہ نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ میرا گھر ہے...... میرا اپنا گھر، کیوں؟''

سپاہی نے جواب دیا۔ ''ہم خان کے چور کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ اسی چور کا گھر ہے۔''

ناصیہ نے شرم سے سر جھکا لیا۔

سپاہی نے شور کر کے اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا۔ ''دوستو! ہمیں جس چور کی تلاش ہے اس کے بیوی بچے ہمارے قبضے میں ہیں، اب گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ دس سپاہی اور آگئے اور انہوں نے ناصیہ اور اس کے بچوں کو حراست میں لے لیا۔

ناصیہ نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہمارا قصور؟''

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ''تیرا شوہر چور ہے۔ وہ خان کا گھوڑا چرا لایا ہے، اس کا پتا بتا ورنہ تم سب کو قید کر دیا جائے گا۔''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''ہمیں نہیں معلوم کہ میرا شوہر کہاں چلا گیا۔ میں خود اس کی تلاش میں گئی تھی اور مایوس ہو کر تمہارے سامنے واپس آئی ہوں۔''

ایک پُررعب اور وجیہہ سپاہی جوان سب کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ ناصیہ کے قریب گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا۔ ''عورت! ذرا میری طرف دیکھ اور بتا کہ تیرا شوہر کہاں ہے؟''

ناصیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور جواب دیا۔ ''میں نے اس سوال کا جو جواب دیا، وہی ہزار بار دوں گی۔ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔''

سردار نے کہا۔ ''عورت! اگر تیرے پاس ہر سوال کا یہی جواب ہے تو میں بھی اس بات پر مجبور ہوں کہ تم سب کو اس وقت تک قید میں ڈال دوں جب تک تیرا شوہر ہمیں نہ

مل جائے۔''

ناصیہ بے بس ہوگئی، بولی۔ ''لیکن یہ تو ظلم ہوگا ہم پر۔''

سردار نے جواب دیا۔ ''مگر یہ ظلم ہم نہیں، تیرا شوہر تم سب پر کر رہا ہے۔''

خان کے سپاہیوں نے پورے کنبے کو گرفتار کرلیا اور انہیں گھوڑوں پر لاد کر چلے گئے۔

ان دنوں برقائی خان ہلاکو خان کے خلاف جنگی تیاریوں میں مشغول تھا۔ یہ تیاریاں دریائے تیریک کے شمالی ساحل پر بحیرۂ کیسپین کے کنارے کنارے جاری تھیں۔ خود برقائی خان کا نوجوان بھتیجا نوگائی قفقاز کے جنوبی حصے میں دریائے سمور کے جنوبی ساحل پر یہ دیکھنے آیا ہوا تھا کہ ہلاکو خان کی فوجی سرگرمیوں کا کیا حال ہے کیونکہ اس نے سنا تھا کہ ہلاکو خان، منگو خان کی موت کی خبر سن کر قراقرم واپس جاتے جاتے اچانک رک گیا ہے۔ یہاں سے نوجوان نوگائی نے ہلاکو خان کے منگول دستوں کو ادھر ادھر چھاپے مارتے دیکھا۔ اس نے جگہ جگہ چوکیاں قائم کیں۔ اپنا جاسوسی نظام پھیلا دیا اور ہلاکو خان کو ایک سرسری سا پیغام بھیج دیا۔ ''ہمارا تم سے کوئی جھگڑا نہیں۔ تم اپنی افواج کو قفقاز سے دور رکھو۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ ہم دونوں آپس میں خوامخواہ دست وگریباں ہوجائیں۔''

ہلاکو خان کو عین جالوت میں اپنے نامور فوجی جنرل قطبوغا کی شکست اور اس کے قتل کی خبریں مل چکی تھیں اور وہ قراقرم کے بجائے مصر واپس جانا چاہتا تھا تاکہ مملوک سلطان بیبرس کو اس کی زیادتیوں اور جسارتوں کا عبرتناک جواب دے سکے لیکن اس دوران اچانک اس کے مخبروں نے یہ خبر دی کہ برقائی خان اس کے عقب سے ایک بڑا حملہ کرنے والا ہے۔ ہلاکو خان کو مجبوراً آذربائیجان میں ہی رک جانا پڑا اور برقائی اور نوگائی کے مقابلے کی تیاریاں کرنا پڑگئیں۔

تردی کے کنبے کو گرفتار کرنے والا فوجی دستہ اس کے کنبے کو اپنے ساتھ لے کر نوگائی کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس وقت نوگائی اپنے خیمے سے نکل کر کہیں جا رہا تھا۔ اس نے اس کنبے کو دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ انہیں میرے پاس کیوں لایا گیا؟''

اس بار ناصیہ بڑی دلیری سے بولی۔ ''خان! ہمارے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔''

نوگائی نے پوچھا۔ ''کیا زیادتی ہوئی ہے تیرے ساتھ؟''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''میرے شوہر نے گھوڑا چرایا۔ میں اور میرے بچے اس سے لاعلم رہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس نے جو ہم کو میرے شوہر کے بدلے میں گرفتار کیا ہے یہ کس حد تک انصاف کہلائے گا؟''

نوگائی جاتے جاتے رک گیا، بولا۔ ''عورت! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس بھی زیادہ وقت نہیں ہے۔''

نوگائی نے پوچھا۔ ''تو کیا چاہتی ہے عورت؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''میں اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں اور میرے بچے تردی کے جرم اور گناہوں کی سزا نہیں پاسکتے۔''

نوگائی اس عورت کی بہادری سے متاثر نظر آرہا تھا، بولا۔ ''بے شک عورت تو ٹھیک کہتی ہے۔ تو اپنے گھر واپس جاسکتی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ جب تیرا شوہر تردی پکڑا جائے گا تو تم سب کو ایک بار پھر میرے پاس حاضری دینا ہوگی۔''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''بے شک! لیکن میں اپنے شوہر کے جرائم سے برأت کا اظہار کرتی ہوں اور میں یا میرے بچے سزا میں حصہ نہیں کرسکتے۔''

نوگائی نے ناصیہ اور اس کے بچوں کو اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

ناصیہ اپنے گھر واپس پہنچی تو بہت تھکی تھکی سی تھی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ تردی جو کچھ کر رہا تھا، وہ بہت خطرناک تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ تردی جس روز بھی پکڑا گیا، وہ خود تو سزا پائے گا ہی لیکن اس سے ناصیہ اور بچے بھی محفوظ نہیں رہیں گے اور تردی کی عدم موجودگی میں گھر کا خرچ چلانا ناصیہ کے بس کی بات نہیں تھی۔

وہ دو دن تک فاقے سے پڑی رہی۔ اس کے دونوں لڑکے جنگل سے پھل توڑ لائے مگر ان پھلوں نے اناج کی جگہ نہ لی اور ان کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ ناصیہ کو اپنی فکر زیادہ نہیں تھی لیکن اپنے تینوں بچوں کی طرف سے زیادہ فکرمند تھی۔

تیسرے دن آدھی رات کے بعد کسی نے ناصیہ کے کمرے کے در پر آہستہ آہستہ دستک دی۔ بچے سو چکے تھے لیکن ناصیہ جاگ رہی تھی۔ اس نے دستک کی مخصوص آواز سے آنے والے کو پہچان لیا تھا، بولی۔ ''جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔''

باہر سے سرگوشی میں جواب دیا گیا۔ ''ناصیہ! میں چار گھوڑے اور سونا لے کر آیا ہوں۔ دروازہ کھول، تیرے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔''

ناصیہ نے دروازہ کھول دیا۔ تردی نے کمزور روشنی میں اپنے بچوں کو سوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنے بچوں کی آنکھیں سوتے میں بھی کھلی ہوئی دیکھیں۔ ان کے گال پچک گئے تھے اور ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ تردی نے پوچھا۔ ''کیا میرے بچے بیمار ہیں؟ ان کی صحت کو کیا ہوا؟''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''انہیں کیا ہوگا؟ جن کا باپ ہی نہ ہو، انہیں محرومی کے سوا کیا بیماری ہو سکتی ہے۔''

تردی نے بیزاری سے بیوی کو گھورا۔ ''عورت! تو ہوش میں تو ہے، یہ کیا بک رہی ہے؟ ان بچوں کا باپ تو ان کے پاس کھڑا ہے۔''

ناصیہ نے اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دیا۔ ''تمہاری وجہ سے ہمیں زریں خیل کے خان کے بھتیجے نوگائی کے دربار میں قیدی بن کے جانا پڑا۔ اس نے مجھے اور میرے بچوں کو اس شرط پر چھوڑا ہے کہ جب تم گرفتار ہو جاؤ گے تو ہمیں ایک بار پھر اس کے دربار میں حاضری دینا ہوگی۔''

تردی نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''اللہ نے چاہا تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میں نے ایران میں اپنا ایک ساتھی پالیا ہے۔ وہ میرے پیشے میں حصے دار بن گیا ہے۔ وہ ایران میں رہائش کے لیے ایک گھر بھی فراہم کرے گا، بے صبری عورت! مصیبت کے دن گئے، عیش کے دن آگئے۔''

لیکن ابھی تردی کی بات صحیح طرح پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے کمرے میں کئی آدمی داخل ہو گئے۔ تردی نے انہیں پہچان لیا۔ یہ زریں خیل کے خان کے آدمی تھے۔ اس نے بیوی کو اس کے حال پر چھوڑا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ آنے والوں میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔ ''تردی! اب مت بھاگ۔ تیرے سارے راستے بند کیے جا چکے ہیں۔''

تردی نے باہر نکل کر بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا کیونکہ مکان کے چاروں طرف نوگائی کے آدمی موجود تھے۔

گرفتاری کے بعد اسے رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ ناصیہ سے یہ دل دوز منظر نہیں دیکھا گیا۔ اس نے نوگائی کے سپاہیوں کی خوشامد کی۔ ''بھائیو! تم میرے دینی بھائی ہو میرے شوہر پر رحم کرو۔ اسے چھوڑ دو، یہ توبہ کر کے نیک آدمی بن جائے گا۔''

لیکن تردی نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ ''اری تو اپنی زبان بند نہیں رکھے گی۔'' پھر زریں خیل کے آدمیوں سے کہا۔ ''میری بیوی نہیں جانتی کہ میں کتنا برا ہوں۔ میں چھوٹوں گا تو پھر چوری کروں گا۔''

بچوں کو بھی بیدار کر دیا گیا کیونکہ نوگائی کی عائد کی ہوئی شرط کے مطابق تردی کی گرفتاری کے بعد پورے کنبے کو دوسری بار نوگائی کے دربار میں حاضری دینی تھی۔

بچوں نے بیداری کے بعد جو منظر دیکھا، اس پر انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ باپ تردی رسیوں سے جکڑا ہوا ان کے سامنے پڑا تھا اور ماں بے بسی اور مجبوری سے ایک ایک کی صورت تک رہی تھی۔

آخر ماں نے بچوں کو حکم دیا۔ ''میرے بچو! جیسا کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ تمہارا باپ پکڑا گیا۔ یہ لوگ اس کو پکڑ کر نوگائی کے دربار میں لے جائیں گے اور ان سب کے پیچھے ہم بھی چلیں گے کیونکہ ہم نے نوگائی سے اس قسم کا ایک معاہدہ کر رکھا ہے۔''

ان لوگوں نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور اسی وقت ان سب کو لے کر نوگائی کے دربار کا رخ کیا۔

جب یہ لوگ بحیرۂ کیسپین کے مغربی ساحل کے سامنے شمال میں سفر کر رہے تھے تو انہیں ایک جگہ ہلاکو خان کا ایک ہراول دستہ نظر آیا۔ یہ لوگ خود کو اس دستے کی نظر سے بچاتے ہوئے نوگائی کے قریب پہنچ گئے۔

نوگائی اپنی فوج کے ساتھ خیمے ڈالے ہوئے پڑا تھا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ تردی چار گھوڑوں سمیت گرفتار ہو چکا ہے اور اب وہ بہت جلد نوگائی کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، تو اسے بڑا دکھ پہنچا۔ تردی کو خیمے میں اپنے بیوی بچوں کے پاس ہی رکھا گیا تھا۔ ناصیہ محسوس کر رہی تھی کہ رسیوں کی سخت بندش نے تردی کو بہت پریشان کر رکھا ہے مگر اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنے شوہر کے حال پر رونا آرہا تھا۔

اس نے آہستہ سے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ''کیا تم سخت تکلیف میں ہو؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''ہاں، رسی کی سخت بندشیں میری کھال کو ہٹا کر گوشت میں پیوست ہوتی جارہی ہیں۔''

ناصیہ رونے لگی، آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ مجبوری ہے۔''

تردی نے کہا۔ ''اس وقت اس خیمے میں ہمارے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر تو چاہے تو میری بندشیں ڈھیلی کر سکتی ہے۔''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''مگر تم اس ہوا میں بھی نہ رہنا کہ ہمیں ہمارے سوا اور کوئی نہیں دیکھ رہا۔ نوگائی کے آدمی کسی نہ کسی بہانے اندر آجاتے ہیں اور ہمارا جائزہ لے کر واپس چلے جاتے ہیں۔''

تردی نے کہا۔ ''لیکن اس کے باوجود اگر تو چاہے تو میری بندشیں ڈھیلی کر سکتی ہے۔''

ناصیہ کو اس بے شرم انسان پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ جھنجلا کر بولی۔ ''مگر میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ یہ کام نہ کرو لیکن تم نہیں مانے اور آج میرے سامنے جس حال میں بھی ہو، میری روح کو زخمی کر رہے ہو۔''

تردی نے ڈانٹ کر کہا۔ ''باتونی عورت! یہ کیا محبت جتائے چلی جارہی ہے۔ اگر تو مجھ سے واقعی محبت کرتی ہے تو اس کا عملی ثبوت دے اور میری بندشیں ڈھیلی کردے اور اگر یہ معمولی سا کام تیرے بس میں نہیں تو یہاں سے دفعان ہوجا اور پھر کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔''

ناصیہ ڈرتے ڈرتے اٹھی اور تردی کی بندشیں ڈھیلی کرنے لگی۔ جب وہ ذرا ڈھیلی ہوگئیں تو تردی نے کہا۔ ''ذرا اور......''

ناصیہ نے کہا۔ ''اب تو یہ خاصی ڈھیلی ہوچکی ہیں، بس اتنی ہی کافی ہیں۔''

تردی نے پھر غصے کا اظہار کیا۔ ''عجیب بے ہودہ اور بے وفا عورت ہے۔ جب اتنی ڈھیلی ہی کردی ہے رسی تو پھر کھول کیوں نہیں دیتی تاکہ میں ان موذیوں کے چنگل سے نکل بھاگوں۔''

ناصیہ خوفزدہ ہوگئی، پوچھا۔ ''جب تم یہاں سے فرار ہوجاؤ گے تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟''

تردی نے بے مروتی سے جواب دیا۔ ''تو اپنا حشر سوچ رہی ہے اور میں اپنے حشر سے خوفزدہ ہوں مگر یہ طے ہے کہ جب میں یہاں سے فرار ہوجاؤں گا تو باہر نکل کر تجھے بھی رہائی دلانے کی کوشش کروں گا۔''

ناصیہ نے بڑے کرب سے کہا۔ ''تردی! تم چور تو تھے ہی، اب خود غرض بھی ہوگئے ہو۔ میں تمہیں نہیں کھول سکتی۔''

تردی نے دانت اور دونوں پاؤں کی مدد سے آزاد ہونے کی کوشش شروع کردی اور ناصیہ سے کہا۔ ''ناصیہ! میں تجھ کو خوب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ تو اب بھی حسین ہے۔ میرا خیال ہے میری عدم موجودگی میں تو نے خان کے کسی سپاہی یا سردار کو پسند کرلیا ہے اور اب تو مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔''

ناصیہ مشتعل ہوکر کھڑی ہوگئی، چیخ کر بولی۔ ''تردی! کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟ کہیں تم نشے میں تو نہیں ہو؟ تم مجھے ایسا سمجھتے ہو۔ افسوس افسوس۔ جی چاہتا ہے کہ میں خود تمہیں ہلاک کردوں۔ تم بہت زیادہ ذلیل اور گھٹیا ہوچکے ہو۔''

ناصیہ کی چیخ نے پہرے کے نیم خوابیدہ سپاہیوں کو بیدار کردیا۔ وہ بھاگ کر اندر پہنچے اور پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کس نے کس کو مارا......ہمیں بتاؤ تاکہ اس کمبخت کی خبر لیں۔''

تردی اندھیرے میں ناصیہ کو گھور رہا تھا، بولا۔ ''ناصیہ! اب تو خوش ہوجا۔ سپاہی بیدار ہوکر اندر آچکے ہیں۔ اب میں یہاں سے فرار بھی نہیں ہوسکوں گا اور شاید مجھ پر مقدمہ چلے گا اور میں سزا پا جاؤں گا اور تیری راہ کا ایک پتھر ہٹ جائے گا۔''

ناصیہ رونے لگی۔ ''لوگو! خدا کے لیے اس کی زبان پکڑو۔ یہ مجھے گالیاں دے رہا ہے، مجھ کو ذلیل کررہا ہے۔''

ایک سپاہی نے تردی سے پوچھا۔ ''آخر بات کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''میرے پاس آؤ بھائی! بات مجھ سے پوچھو۔''

وہ سپاہی تردی کے پاس جاکھڑا ہوا۔

تردی نے ناصیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب والا! اگر آپ لوگ یہاں آنہ جاتے تو یہ عورت مجھ کو رہا کردیتی۔ یہ مجھ سے خوشامدیں کرتی رہی کہ میں جیل سے فرار ہوجاؤں لیکن میں نے یہ کہا کہ میں مقدمے کے فیصلے سے پہلے ہرگز فرار نہیں ہوں گا کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو میرا ضمیر زندگی بھر مجھے پریشان کرتا رہے گا۔''

ناصیہ، تردی کے جھوٹ اور الزام تراشی پر حیرت زدہ رہ گئی، بولی۔ ''تردی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''ہاں! یہ میں درست کہہ رہا ہوں اور میں بدرجہ مجبوری کہہ رہا ہوں۔ میں نے چوری جیسا رکیک فعل انجام دے کر خود کو اپنی ہی نظر میں گرالیا ہے۔ اب میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اور گھناؤنا کام کروں۔''

ناصیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سپاہیوں سے کہا۔ ''میرا شوہر مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔''

لیکن سپاہیوں نے تردی کی بات کا یقین کیا اور ناصیہ

اور اس کے بچوں کو تردی کے خیمے سے نکال دیا۔ جب سپاہی دوبارہ اس کے خیمے میں داخل ہوئے تو تردی نے کہا۔ ''میرے بھائیو! تم سب نے دیکھ لیا کہ مجھ میں شریفانہ خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ آپ لوگ نوگائی کے روبرو میری سفارش کریں، شاید کام بن جائے۔''

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ''بہرحال کوئی کوشش کرے یا نہ کرے، میں تیرا یہ کام ضرور کروں گا۔''

تردی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جماہیاں لینے لگا۔ تین دن اور تین راتیں قید خانے میں گزارنے کے بعد تردی کو نوگائی کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔

نوگائی بہت مصروف معلوم ہوتا تھا۔ اس کے آس پاس اس کے امراء تھے اور بالکل پہلو میں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نوگائی کے تخت کے پاس تردی کو کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ناصیہ اور اس کی تینوں اولادوں کو تردی کے داہنی طرف بٹھا دیا گیا تھا۔

نوگائی نے تردی سے پوچھا۔ ''تو نے ہمارا گھوڑا چرایا؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے ایک گھوڑا چرایا تھا۔''

نوگائی نے پوچھا۔ ''وہ گھوڑا کہاں ہے؟ واپس دے۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''میں نے اس گھوڑے کو فروخت کر دیا تھا۔''

نوگائی نے پوچھا۔ ''کس کے ہاتھ؟ وہ شخص کہاں ہے تاکہ اس سے گھوڑا واپس لیا جائے۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''وہ تاجر تھا جو اصفہان جا رہا تھا۔ اب میں اس کو کہاں تلاش کروں؟''

نوگائی کو تردی پر غصہ آ رہا تھا، بگڑ کر پوچھا۔ ''کیا تو اس گھوڑے کے عوض کوئی دوسرا گھوڑا دے سکتا ہے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''اس وقت میرے پاس چار گھوڑے ہیں، آپ لوگ اس میں سے ایک گھوڑا لے کر اپنا نقصان پورا کر سکتے ہیں۔''

نوگائی نے پوچھا۔ ''یہ چار گھوڑے تیرے پاس کہاں سے آئے؟''

تردی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''چوری سے۔''

نوگائی غصے میں کھڑا ہو گیا، بولا۔ ''تو کتنا بے غیرت اور بے شرم انسان ہے۔ میں تجھ کو بدترین سزا دوں گا۔ ایسی سزا کہ چوری کا پیشہ اختیار کرنے والے تیرے انجام سے عبرت حاصل کریں۔''

تردی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''بدترین سزا موت کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے کیا؟ مگر میں موت سے نہیں ڈرتا۔ آپ کو جو سزا دینا ہو دے دیجیے۔ ویسے آپ ایسا کر نہیں سکیں گے۔''

نوگائی نے غصے میں پاؤں پٹخا اور کہا۔ ''میں تجھ کو ایسی سزا دوں گا جو موت سے بھی بدتر ہو گی۔ آخر تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''غصہ کر کے اپنی توانائی کیوں ضائع کر رہے ہیں؟''

نوگائی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''تردی! ہمیں ہمارا گھوڑا واپس کرے اور جرمانے میں مزید نو گھوڑے اور دے......''

تردی ہنسا۔ ''لیکن میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میں دس گھوڑے دوں گا کہاں سے؟''

نوگائی نے اپنے فیصلے کا بقیہ حصہ سنا دیا۔ ''اگر تردی دس گھوڑے نہیں دے سکتا تو اس کی بیوی بچے بحق سرکار ضبط کر لیے جائیں گے اور سرکار ان بچوں اور اس کی بیوی کو بیچ کر جرمانے کی رقم وصول کر لے گی۔''

تردی کی ساری خوشی اور ساری چالاکی دور ہو گئی، وہ چیخا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہو گا۔ یہ تو بہت بڑا ظلم ہو گا مجھ پر۔''

نوگائی کے فیصلے پر فوراً ہی عملدرآمد ہوا اور تردی کے بیوی بچوں کو نوگائی کے خیمے سے ملحق خیمے میں قید کر دیا گیا۔

تردی نے پوچھا۔ ''کیا میں رہا کر دیا جاؤں گا؟''

نوگائی نے جواب دیا۔ ''تو بھی غلامی میں لے لیا گیا ہے۔ میں تجھ سے بھی کام لوں گا۔ تو میرے چند آدمیوں کے ساتھ ہلاکو خان کے پاس جائے گا۔ یہ لوگ چند ماہ ہلاکو خان کے مہمان رہیں گے اور تو ان کی خدمت کرے گا اور ہاں، غور سے سن، اگر تو نے ان کے پاس سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو یہ تجھے کسی رورعایت کے بغیر ہلاک کر دیں گے۔''

تردی نے درخواست کی۔ ''نوگائی بہادر! میں آپ کی زندگی بھر خدمت کروں گا۔ آپ میرے بیوی بچوں کو میرے پاس ہی رہنے دیں۔''

نوگائی نے جواب دیا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔'' اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ''اس کے پاؤں میں لکڑی کی بیڑی ڈال دی جائے۔''

اس کے حکم کی اس طرح تعمیل کی گئی کہ کاٹھ کی ایک وزنی موٹی اور لمبی دھنی کے سوراخ میں اس کا پاؤں ڈال دیا

گیا۔ تردی اس دھنی کو ہلا جلا بھی نہیں سکتا تھا۔ جہاں بٹھایا گیا تھا، وہیں بیٹھا رہ گیا۔ یہیں کھانا پانی بھی مل جاتا اور یہیں خیمے کی دیوار سے ٹیک لگا کر نیند مار لیتا۔ خیمے کی نرم اور ملائم دیوار اسے وہ سہارا اور آرام نہیں دے سکتی تھی جو کوئی پتھر کی دیوار دے سکتی تھی۔

اس دوران برقائی خان بھی نوگائی کے پاس آ گیا۔ برقائی خان نے تردی کے عجیب و غریب مقدمے اور فیصلے کی تفصیل سنی اور تردی کو لکڑی کی بیڑی سے نجات دلائی اور اسے حکم دیا۔ ''تو مسلمان ہے تردی اور میں بھی مسلمان ہوں۔ تو نے گھوڑوں کی چوری کی، اسلامی شرع میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے لیکن یہاں ابھی اسلامی شرعی سزائیں نہیں دی جارہی ہیں اور ہم لوگ فی الحال وہی سزائیں دے رہے ہیں جو ہمارے یہاں رائج ہیں۔ میں نے تجھ کو رہائی دلا دی، جیسا کہ نوگائی نے کہا۔ تجھ کو میرے ایک وفد کے ساتھ ہلاکو خان کے پاس جانا پڑے گا۔ جب تو وہاں سے بخیر و خوبی واپس آجائے گا تو میں خود تیری سزا میں تخفیف اور رعایت کی بابت سوچوں گا۔''

تردی نے عرض کیا۔ ''لیکن خان بابا! میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟''

برقائی نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ تو دیا کہ جب تو واپس آجائے گا تو میں اس پر غور کروں گا۔''

تردی نے مایوسی سے کہا۔ ''لیکن اس وقت تک تو میرے بیوی بچے فروخت ہو چکے ہوں گے۔''

برقائی نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔''

تردی نے بڑے جوش و خروش سے کہا۔ ''تب پھر میں بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میرے ذمے جو کام بھی کریں گے، میں اس کو بڑی جانفشانی اور دیانت داری سے انجام دوں گا۔''

تردی کو ایک خیمے میں رکھا گیا اور کئی دن برقائی نے بطور خاص اس کو سمجھایا۔ ''دیکھو تردی! تم ایک شاطر انسان ہو۔ تم ہلاکو خان کے گھوڑوں اور مویشیوں کو اس نظر سے دیکھنا کہ اگر انہیں ہنکا کر یہاں لے آیا جائے تو کتنی دشواری یا آسانی پیش آئے گی۔ میں ہلاکو خان کی سوار فوج کو کمزور کر کے اسے تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد ہلاکو خان سے نمٹنا چاہتا ہوں۔''

تردی نے عرض کیا۔ ''اتنا زبردست کام میں اکیلا کس طرح انجام دوں گا؟''

برقائی نے جواب دیا۔ ''میرے آدمی تیری مدد کریں گے۔''

تردی نے کہا۔ ''اور اگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہا تو؟''

برقائی نے جواب دیا۔ ''اگر گھوڑوں اور مویشیوں کو ہماری طرف ہنکا نہ سکو تو انہیں ہلاک تو کر سکو گے۔ میرا مطلب ہے کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار کر بھی تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔''

تردی نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، ایسا کر سکتا ہوں۔''

برقائی خان نے اسے اپنے پاس سے رخصت کر دیا۔ اس کو آزادی مل گئی اور وہ اپنے کام کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

برقائی والگا کے کنارے اپنے شہر واپس چلا گیا۔ نوگائی گویا اس کو بھول ہی چکا تھا۔ برقائی کے جانے کے چار دن بعد تک نوگائی نے تردی کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ حالانکہ تردی اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

ایک دن نوگائی نے اچانک اس کو طلب کر لیا، اس وقت نوگائی تقریباً بیس آدمیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے تردی کو ان سب کے سامنے کھڑا کر دیا اور ان سبھوں سے کہا۔ ''یہ تردی تمہارے ساتھ کیا جائے گا۔ یہ بظاہر تو تمہاری خدمت کرے گا لیکن درپردہ یہ ہلاکو خان کے گھوڑوں اور مویشیوں کو ادھر ہنکالانے کی کوشش کرے گا اور اگر یہ اس میں ناکام رہا تو پھر یہ گھوڑوں اور مویشیوں کو ہلاک کر کے ہلاکو خان کو کمزور کر دے گا۔'' اور تردی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تردی۔ تم ان سب کو اپنے سے برتر اور اعلیٰ سمجھو گے اور ان کی خدمت کرو گے مگر درپردہ تم وہی کرو گے جو چچا برقائی خان کا حکم ہے۔''

تردی کے ذہن پر بیوی بچے چھائے ہوئے تھے مگر وہ ان سے اسی وقت مل سکتا تھا جب وہ مراغہ سے بانیل و مرام واپس آجاتا۔

وہ اپنے خیمے میں بے خبر سویا ہوا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے خیمے میں دو آدمیوں کے ساتھ اپنی بیوی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ خیمے میں ایک دوشاخہ موم بتی جل رہی تھی۔ تردی کو ایسا لگا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اٹھ کر اپنی بیوی کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ''ناصیہ! یہ تو ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟''

ناصیہ نے جواب دیا۔ ''یہ خواب نہیں... تردی! حقیقت ہے۔ تو مراغہ جا رہا ہے اور میں تجھ سے ملنے آئی

ہوں۔" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔
تردی نے دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "پھر یہ دونوں کون ہیں؟"
ناصیہ نے جواب دیا۔ "نوگائی کے ملازم۔ ہم دونوں ان کی موجودگی میں ایک تشنہ ملاقات کر سکتے ہیں۔"
تردی نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو دونوں آدمیوں نے اسے روک دیا اور کہا۔ "نہیں! تم دونوں درمیان میں فاصلہ رکھ کر مل سکتے ہو، باتیں کر سکتے ہو۔"
تردی نے سرد آہ بھری۔ "ناصیہ! یہ کیسا وقت آن پڑا ہے ہم دونوں پر۔"
ناصیہ نے بھی بڑی اداسی اور مایوسی سے کہا۔ "کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ مویشی یا گھوڑے چرانے کا پیشہ مت اختیار کرو مگر تم نہیں مانے اور آخر کار اس مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔"
تردی نے جواب دیا۔ "خان بابا (برقائی خان) نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں نے اس کا کام اس کی مرضی کے مطابق انجام دیا تو وہ مجھے رہا کر دے گا اور شاید میرے بیوی بچے بھی میرے حوالے کر دیے جائیں۔"
دونوں آدمیوں نے بمشکل آدھ گھنٹا ان دونوں کو یکجا رہنے دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں کی منت سماجت اور خوشامد کی پروا کیے بغیر ناصیہ کو لے کر چلے گئے۔ اس مرحلے پر تردی نے سوچا کہ وہ خان بابا کی ہدایت پر عمل نہ کرے اور ہلاکو خان سے مل کر سارا بھانڈا پھوڑ دے لیکن جب اس نے اس کا انجام سوچا تو سرد پڑ گیا۔
ایک دن وہ نوگائی کے وفد کے ساتھ مراغہ روانہ ہو گیا۔ تردی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ وفد ہلاکو خان سے کیا بات کرے گا؟
یہ بڑا پُر پیچ کوہستانی راستہ تھا۔ ندی نالوں نے بھی ان کی راہ روکی لیکن یہ لوگ راہ کی ہر دشواری کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب یہ لوگ ہلاکو خان کی حدود میں داخل ہوئے تو انہیں روک لیا گیا۔ برقائی خان کے وفد نے انہیں بتایا کہ وہ ہلاکو خان کے لیے ایک خاص پیغام لے کر مراغہ جا رہے ہیں اس لیے انہیں جانے دیا جائے۔
سرحدوں کی نگہبانی کرنے والوں نے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد انہیں مراغہ جانے دیا۔ مراغہ کے باہر ان لوگوں نے ہلاکو کے عظیم الشان لشکر کے خیموں کو میلوں میں پھیلے دیکھا۔ یہاں ہر طرف سے دھواں اٹھ رہا تھا اور فوجی ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ان فوجیوں نے اس وفد کے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھا جو انہی جیسے لباسوں میں ملبوس اور انہی جیسے تندرست و توانا تھے لیکن تردی ان سب سے بالکل مختلف تھا۔ دیوؤں میں ایک چھوٹا سا انسان یوں لگتا تھا، گویا لمبے چوڑے انسانوں میں ایک بونا پھنس گیا ہو۔
تردی نے گھوڑوں کے اصطبل دیکھے اور اس کا دماغ منصوبے بنانے لگا۔
انہی فوجیوں میں سے چند جوان باہر نکلے اور وفد کو اپنے گھیرے میں لے لیا لیکن اس وفد کے سردار نے ان جوانوں کو متنبہ کیا۔ "ہم برقائی خان کا ایک خاص پیغام لے کر ہلاکو خان کے پاس آئے ہیں اس لیے ہم سے کوئی ایسا سلوک نہ کرو جو نازیبا اور تکلیف دہ ہو۔ کل تم میں سے کچھ لوگ برقائی کے پاس بھی جا سکتے ہیں اور تم سے بھی ایسا ہی ہتک آمیز سلوک کیا جا سکتا ہے۔ بس ذرا اس کا خیال رہے۔"
لیکن جوانوں نے اسی حصار میں انہیں ہلاکو خان کے پاس پہنچا دیا۔ اس وقت ہلاکو خان اپنی چہیتی بیوی دوقوز سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بیبرس کی فتح سے بہت پریشان تھا اور اب قراقرم واپس جانے کے بجائے مصر جانا چاہتا تھا۔ وہ بیبرس اور مصر کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے پوچھ رہا تھا۔ "سنتا ہوں، بیبرس بہت زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"
دوقوز نے جواب دیا۔ "میرے آقا! میرے خیال میں آپ اتنے کمزور بھی نہیں کہ بیبرس کا مقابلہ نہ کر سکیں مگر پھر بھی خود کو اور زیادہ طاقتور بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ مغربی ممالک کی عیسائی دنیا سے دوستی کریں اور انہیں اپنا حلیف بنا کر مدد حاصل کریں۔"
ہلاکو خان خاموشی سے دوقوز کے مشورے پر غور کرنے لگا۔
دوقوز اٹھی اور خاموشی سے اپنے چوبی چیپل میں چلی گئی۔ سرخ رنگ کا یہ چیپل اس کے خیمے سے ملحق تھا۔ ہلاکو خان بھی اٹھا اور اپنی بیوی کے چیپل کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں کئی نسطوری مسیحی دوقوز کے قدموں میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ دوقوز نے پوچھا۔ "مقدس باپ یعقوب کہاں تشریف لے گئے؟"
ایک مسیحی نے جواب دیا۔ "پتا نہیں لیکن اگر آپ حکم دیں تو انہیں تلاش کر کے آپ کی خدمت میں حاضر

کر دیا جائے؟''

دوقوز نے کہا۔ ''ہاں، انہیں تلاش کر کے میرے پاس لایا جائے۔''

وہ مسیحی اسی وقت کہیں چلا گیا۔ ہلاکو خان نے چند فوجیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، پوچھا۔ ''کیا بات ہے، مجھ سے کوئی کام؟''

ایک فوجی نے عرض کیا۔ ''خان بابا برقائی خان کا ایک وفد آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ وفد؟''

فوجی نے جواب دیا۔ ''اسے ایک خیمے میں ٹھہرایا گیا ہے۔''

ہلاکو خان نے مزید پوچھا۔ ''وفد میں کل کتنے آدمی ہوں گے؟''

جواب دیا گیا۔ ''بیس یا اکیس۔''

ہلاکو خان برہم ہو گیا۔ ''مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ کسی معمولی سی بات کا جواب شک وشبے میں دیا جائے۔ بیس یا اکیس۔ یہ کوئی بڑی تعداد تو نہیں کہ اس کا گننا محالات میں سے ہو۔ یہ میرے آدمیوں کو آخر ہو کیا گیا ہے؟''

وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے خیمے میں چلا گیا اور برقائی خان کے وفد کے بارے میں حکم دیا کہ اسے کل صبح پیش کیا جائے۔

ہلاکو خان بیبرس سے ناراض تھا۔ ناراض ہی نہیں برہم، بلکہ غضب ناک ہو رہا تھا۔ قط بوغا کی شکست اور اس کے افسوس ناک انجام نے ہلاکو خان کو آتش زیر پا کر رکھا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مصر پر فوج کشی کر دیتا۔

دوقوز پادری یعقوب کو لے کر ہلاکو خان کے خیمے میں آ گئی اور شوہر کو مشورہ دیا۔ ''میرے آقا! عیسائی دنیا صدیوں سے صلیبی جنگیں لڑتی چلی آ رہی ہے اور یہ لوگ یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو اپنا ایک قاصد قسطنطنیہ روانہ کر دیا جائے اور وہ عیسائی دنیا سے آپ کے لیے مدد حاصل کرے۔ اس طرح آپ اور مسیحی مل کر مسلمانوں کی آخری قوت بیبرس کو خاک میں ملا کر سرخ رو ہو سکیں گے۔''

ہلاکو خان مسلمانوں سے لڑنے کے لیے کسی اور کی مدد حاصل کرنے میں اپنی کسرِ شان سمجھتا تھا۔ اس نے دوقوز کو منع کر دیا کہ فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بیبرس کے لیے میں ہی کافی ہوں۔ واپسی میں یروشلم کا تیاپانچا کر دوں گا۔

برقائی خان اس کے تایا کا بیٹا تھا۔ برقائی خان یوں تو ہلاکو خان کی نظر میں قابلِ تعظیم تھا لیکن جب سے اس نے اسلام قبول کیا تھا، وہ ہلاکو کی نظروں سے گر گیا تھا۔ اس کا وفد کیوں آیا تھا؟ رات بھر یہ معمولی سا سوال اسے تنگ کرتا رہا۔

طلوعِ آفتاب سے ذرا پہلے برقائی کا وفد ہلاکو خان کے خیمے کے جنوبی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ یہاں ان کی خشک میووں اور گھوڑی کے دودھ سے تواضع کی گئی۔

ہلاکو خان کے ایک طرف نصیر الدین طوسی بیٹھا ہوا تھا اور دوسری طرف شہزادہ اباقا خان۔ ہلاکو خان نے ان دونوں سے کہا۔ ''ذرا تم دونوں وفد کی باتوں پر غور کرنا۔ میں اس وفد کو لاجواب کر کے واپس کرنا چاہتا ہوں۔''

اس وفد کو ہلاکو خان کے روبرو کھڑا کر دیا گیا۔ اس وقت ہلاکو خان مذاق کرنے کی حالت میں تھا۔ اس نے وفد سے پوچھا۔ ''تم لوگ کس نسل سے تعلق رکھتے ہو؟''

وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ''اسی نسل سے جس سے آپ کا تعلق ہے۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''خان بابا کا کیا حال ہے؟ وہ دو چوٹیاں اب بھی گوندھتا ہے یا نہیں؟''

وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ''ایل خان! (ہلاکو خان) ہم آپ سے خان بابا کی کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے نام خان بابا کا ایک خط لے کر آئے ہیں۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''خط میرے حوالے کر اور مجھے یہ بتا کہ برقائی پر اسلام کا جادو کس نے کیا تھا؟''

وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ''اسلام میں اگر واقعی سحر ہے تو وہ منجانب اللہ ہے۔''

ہلاکو خان نے برقائی کا خط نصیر الدین طوسی کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ''خط بہ آوازِ بلند پڑھا جائے۔''

خواجہ نصیر الدین طوسی نے خط پڑھنا شروع کر دیا۔

اس میں لکھا تھا۔ ''ہلاکو خان میرے بھائی کو معلوم ہو کہ میں برقائی خان بن جوجی خان ہوں۔ مجھ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم مسلمانوں کی بربادی کا فیصلہ کر کے جو گھر سے نکلے ہو، اسے بند کر دو۔ تم نے مسلمانوں کے خلیفہ......''

وہ اپنے ذہن اور حافظے پر زور دیتا ہوا بولا۔ ''مسلمانوں کا خلیفہ؟ یہ کون ہے؟''

نصیر الدین طوسی نے جواب دیا۔ ''مستعصم باللہ۔ جس کو نمدے میں لپیٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''آگے آگے......اور کیا لکھا ہے؟''

نصیر الدین نے بقیہ خط پڑھا۔ ''ہلاکو خان! میں جانتا ہوں، تیری بیوی دوقوز مسیحی ہے اور تیری نکیل دوقوز کے ہاتھ

میں ہے۔ وہ جدھر گھماتی ہے تو اسی طرف چل پڑتا ہے اور دوقوز کی نکیل مسیحی علما کے ہاتھ میں ہے، وہ جدھر گھماتے ہیں دوقوز اسی طرف گھوم جاتی ہے۔ تو نے مسلمانوں کے خلاف مکاری، دغابازی اور چالبازی سے بھی کام لیا ہے اور سننے میں یہ آیا ہے کہ اب تو بیبرس اور مصر کے خلاف منصوبے بنا رہا ہے۔ خبردار! یہ میری تاکید جان...... ادھر کا رخ نہ کرنا۔ میں مسلمانوں کا امین اور محافظ ہوں۔ اگر تو مصر پر حملہ کرے گا تو میں آذربائیجان اور ایران پر حملہ کردوں گا اور میں یوں بھی تیری فضول فتوحات سے خوش نہیں ہوں۔ تجھ کو جو کچھ مل چکا ہے، اسی پر قانع ہوجا اور مزید فتوحات سے باز آجا۔ ورنہ اگر میں نے اپنے مرض اور بھوک جوع الارض (زمین کی بھوک) میں سر اٹھایا تو سیحی دنیا میری زد میں ہوگی اور میں ان کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تو مسلمانوں کے ساتھ کر رہا ہے لیکن افسوس کہ اسلام ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔''

اس خط نے ہلاکو خان کو بہت زیادہ فکرمند اور پریشان کردیا۔ مصر پر حملہ آوری کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ وفد کے سردار نے کہا۔ ''محترم ایل خان! ہم اس کا جواب لیے بغیر نہیں جائیں گے۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔ جب تک تمہیں جواب نہیں ملے گا، تم ہمارے مہمان رہو گے۔''

برقائی کے وفد کو ایک خیمے میں ٹھہرا دیا گیا اور ہلاکو خان نے اپنے مشیروں کے سامنے یہ خط رکھ کر ان سے مشورہ طلب کیا...... خواجہ نصیرالدین نے عرض کیا۔ ''اگر محترم ایل خان نے مصر کا رخ کیا تو برقائی کی افواج ان علاقوں کو تہس نہس کر کے واپس چلی جائیں گی۔''

شہزادہ اباقا خان نے مشورہ دیا۔ ''اگر مجھے فوج دے کر حکم دیا جائے تو میں سرائے برقائی خان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر واپس آسکتا ہوں۔''

اس مجلسِ مشاورت میں یعقوب پادری اور دوقوز بھی شامل تھے۔ دوقوز نے پادری یعقوب سے پوچھا۔ ''مقدس باپ! ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

پادری یعقوب نے جواب دیا۔ ''جہاد۔ مسلمان کافروں کے خلاف جہاد۔ بیبرس اور برقائی خان دونوں کے خلاف جہاد۔''

پادری یعقوب کا مشورہ ہلاکو خان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ دوقوز اپنے شوہر کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے ہلاکو کے بشرے سے یہ سمجھ لیا تھا کہ پادری یعقوب کا مشورہ اسے پسند نہیں آیا ہے، بولی۔ ''میرے آقا! آپ کو خدا نے عقلمندترین مشیر دیے اور خود آپ کی اپنی عقل ہمیشہ صحیح سمت میں آپ کی راہنمائی کرتی رہی ہے۔ آپ اس سے معلوم کریں کہ اب آپ کو کیا کرنا چاہیے۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''مجھے جو کچھ کرنا ہے، میری عقل نے مجھے بتا دیا ہے اور میں وہی کروں گا، میری عقل جس کا مشورہ دے چکی ہے۔''

اس کی عقل نے اسے کیا مشورہ دیا ہے؟ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہلاکو خان سے یہ پوچھتا۔

پادری یعقوب اور خواجہ نصیرالدین طوسی میں ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف تلخ کلامیوں پر اتر آیا کرتے تھے۔ خواجہ طوسی کو پادری یعقوب کا یہ مشورہ انتہائی گراں گزرا اس نے کہا۔ ''پادری محترم! آپ جہاد کو اتنا آسان سمجھتے ہیں اگر آپ جہاد کرسکتے ہیں تو مسلمان بھی آپ کے خلاف جہاد کرسکتے ہیں۔''

پادری یعقوب نے خواجہ طوسی پر الزام لگایا۔ ''جہاں تک میں سمجھا ہوں، ہم میں مسلمانوں کے جاسوس بھی موجود ہیں۔ ہمیں ان جاسوس لوگوں سے ہوشیار رہنا ہوگا۔''

خواجہ طوسی نے بگڑ کر جواب دیا۔ ''چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ جو جیسا ہے اس کو ہر کوئی اپنے ہی جیسا نظر آتا ہے۔''

ہلاکو خان نے اس نوک جھوک میں مداخلت کی اور ان دونوں کو نرمی سے سمجھایا۔ ''نفاق اور جھگڑے کی باتیں کم از کم میرے آدمیوں کو نہیں کرنا چاہئیں، اس سے بڑی بڑی حکومتیں اور خاندان تباہ ہوجاتے ہیں۔''

ہلاکو خان اس وقت اداس بھی بہت زیادہ تھا۔

کئی دن بعد ہلاکو خان نے برقائی خان کو اس کے خط کا جواب دے دیا۔ ''برقائی خان کو معلوم ہونا چاہیے کہ تیری ہر بات قابلِ قبول ہے کیونکہ میں جھگڑے کو بڑھانا پسند نہیں کرتا۔''

ابھی تک تردی بالکل خاموش تھا، بولا۔ ''جب سارے معاملات بخیر وخوبی طے پا گئے تو محترم ایل خان کو چاہیے کہ وہ اپنے سامان اور گھوڑوں کی نمائش تو کرادیں۔ میرے جیسا غریب بار بار ایسے موقعے کہاں پائے گا۔''

ہلاکو خان نے اس کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ تردی کی چالاک نظریں یہ بھانپ چکی تھیں کہ ہلاکو خان بظاہر پریشانیوں کے علاوہ بھی کسی اور پریشانی میں مبتلا ہے لیکن وہ ازراہِ تکلف ابھی اس کا ذکر نہیں کر رہا ہے۔ تردی

نے سوچا، ہلاکو کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس سے بہتر موقع پھر نہیں ملے گا۔

جاتے سے پہلے تردی ہلاکو خان کے در پر کھڑا ہوگیا، اس نے کہا۔ ''محترم ایل خان سے کہہ دو کہ تردی اس وقت تک واپس نہیں جائے گا جب تک کہ وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرلے گا۔''

اس وقت ہلاکو خان اندر موجود نہیں تھا مگر دوقوز چند پادریوں اور مسیحی پیشواؤں سے باتیں کررہی تھی۔ اس نے تردی کی باتیں جو سنیں تو اندر بلوالیا، پوچھا۔ ''تو واپس نہیں گیا؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''محترم خاتون! سچی بات تو یہ ہے کہ ہلاکو خان اور برقائی خان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ میں ان دونوں کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کل ان دونوں میں مفاہمت بھی ہوسکتی ہے۔''

دوقوز کسی تمہید سے گھبرا گئی، بولی۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''برقائی کا وفد واپس چلا گیا لیکن میں ابھی تک یہیں ہوں۔''

دوقوز نے پوچھا۔ ''مگر تو کیوں نہیں گیا؟ اس کی وجہ؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''میں نے محترم ایل خان کو پریشان پریشان سا دیکھا ہے۔ جب تک میں اس پریشانی کا سبب نہیں معلوم کرلوں گا میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

دوقوز سناٹے میں آگئی۔ وہ مسیحی پیشواؤں کے منہ دیکھنے لگی۔ ایک پادری نے دوقوز کے کان میں کچھ کہا۔ ملکہ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی، اس نے پوچھا۔ ''تیرا مذہب کیا ہے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''میرا کوئی مذہب نہیں، کبھی میں مسلمان بن جاتا ہوں اور کبھی مسیحی، کبھی بودھ مت کا پیرو بھی بن جاتا ہوں اور کبھی بالکل دہریہ بن جاتا ہوں۔''

ایک عیسائی پادری نے پوچھا۔ ''آج کل تو کیا ہے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''مسیحی۔''

جملہ مسیحی پیشوا کھڑے ہوگئے اور تردی کو فرطِ جوش میں باری باری گلے لگایا۔ پادری یعقوب نے کہا۔ ''اے شخص! اب تو مرتے دم تک مسیحی مذہب پر ہی رہے گا۔''

تردی نے مایوسی سے جواب دیا۔ ''لیکن افسوس کہ مسیحی لوگ میری قدر نہیں کرتے۔''

دوقوز اور مسیحی پیشوا جس موضوع پر بات چیت کر

سنہری باتیں

☆ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

☆ آنکھ والا وہ ہے جو اپنے آپ کو دیکھے۔

☆ ایک سیاست دان اگلے انتخاب کے بارے میں سوچتا ہے اور ایک سیاسی مدبر اگلی نسل کے بارے میں۔

☆ کتنے قیمتی ہوتے ہیں وہ آنسو جو کسی مصیبت پر بہائے گئے ہوں۔

☆ سب سے بڑا عیب وہ ہے جو اپنے آپ کو محسوس نہ ہو۔

☆ غلطیوں کا احساس کامیابی کی کنجی ہے۔

☆ جاہل کے لیے سب سے اچھی بات خاموشی ہے۔

☆ سچ بات کہنے کی عادت ڈالو...... چاہے وہ کتنی کڑوی کیوں نہ ہو۔

☆ ہمت سے زندگی بنتی ہے اور بے دلی سے موت۔

☆ تجربہ ایک اچھا استاد ہے۔

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

حقیقی جنگ

سکندر اعظم کی جنگ کے دوران ایک فقیر سے ملاقات ہوئی۔

فقیر۔ ''یہ جنگ جیتنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟''

سکندر اعظم۔ ''ایک اور جنگ لڑوں گا۔''

فقیر۔ ''اس کے بعد......؟''

سکندر اعظم۔ ''پھر ایک اور جنگ لڑوں گا۔''

فقیر۔ ''آپ پوری دنیا فتح کرلو، اس کے بعد؟''

سکندر اعظم۔ ''پھر آرام سے زندگی گزاروں گا۔''

فقیر۔ ''وہ تو میں بنا جنگ لڑے بھی گزار رہا ہوں۔ بس ایک جنگ لڑی ہے اپنے نفس سے۔''

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل پور

رہے تھے، بردست وہ گفتگو رک گئی تھی۔ آخر ان لوگوں نے جب اس پر یقین کرلیا کہ تردی مسلمان نہیں، مسیحی ہے تو وہ سب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے تردی کو اپنا مہمان بنالیا، بولے۔ ''تردی! تیری محبت کا شکریہ...... جب تک ہلاکو خان نہیں آتا تو اس خیمے میں ہمارا مہمان رہے گا۔''

تردی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ پادری یعقوب اور دوقوز بھی باتیں کرنے لگے۔ کبھی کبھی ان دونوں کی باتوں میں دوسرے پادری بھی بول دیتے تھے۔

دوقوز نے سرگوشی میں پادری یعقوب کو سمجھایا۔ ''ہلاکو خان کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد جب انسان کو دفن کردیا جاتا ہے تو مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق قبر میں دو فرشتے آتے ہیں منکر اور نکیر۔ یہ دونوں فرشتے مرنے والے سے سوالات کرتے ہیں۔ اگر مرنے والا ان سوالات کے صحیح جواب نہیں دیتا تو ان پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ کوئی پادری یہ ساری باتیں ہلاکو خان کے گوش گزار کردے پھر آگے کا کام میں خود انجام دے لوں گی۔''

پادری یعقوب نے جواب دیا۔ ''ملکۂ عالیہ! آپ نے مسیحیت پر جو احسان فرمایا ہے، وہ عیسائی مذہب رہتی دنیا تک یاد رکھے گا۔ بہرحال یہ کام پادری یوشع انجام دے گا۔''

دوقوز نے تردی کے سامنے خشک میوہ رکھوایا اور اصرار کر کے کھلاتی رہی۔ اس کو یقین ہوچکا تھا کہ تردی عیسائی ہوجائے گا' پکا عیسائی اور پھر جب یہ برقائی کے پاس واپس جائے گا تو یہ شخص ہلاکو کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے سکے گا۔

ہلاکو خان اپنے خیمے میں واپس آیا تو دوقوز نے تردی کا نہایت پراثر تعارف کرایا۔ دوقوز نے کہا۔ ''میرے آقا! تردی زمانے کا ستایا ہوا ایک ذہین اور ہوشیار انسان ہے اور اس کو آپ سے اتنی محبت اور ہمدردی ہوگئی ہے کہ وہ آپ سے ملے بغیر واپس بھی نہیں جائے گا، وہ آپ کا انتظار کررہا ہے۔''

ہلاکو خان نے اپنا سر پکڑلیا، بولا۔ ''وہ میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں کوئی عام اور معمولی آدمی تو نہیں ہوں کہ ہر کسی کو شرفِ ملاقات بخشتا رہوں۔ میں کسی تردی وردی کو نہیں جانتا اور نہ ہی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

دوقوز نے پوچھا۔ ''خان محترم! آپ کچھ زیادہ پریشان نظر آرہے ہیں۔ اس پریشانی کا کوئی خاص سبب؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ دوقوز تو خود بھی اتنی زیادہ مصروف ہوگئی ہے کہ عیسائی راہنما تجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ تجھ کو نہیں معلوم کہ میری ماں کی حالت کتنی تشویش ناک ہے۔ وہ کسی وقت بھی آسمان کی وسعتوں میں کسی دریچے سے داخل ہوکر گم ہوجائے گی۔ میں اس کا علاج کرار ہا ہوں لیکن کوئی امید بر نہیں آتی۔''

اس دوران میں ہلاکو خان کو اطلاع ملی کہ پادری یعقوب اور یوشع بھی باریابی کے طالب ہیں۔ چنانچہ دونوں پادریوں کو اسی وقت طلب کرلیا گیا۔ دوقوز پہلے ہی سے موجود تھی۔ دوقوز نے ہلاکو خان سے درخواست کی۔ ''میرے آقا! تردی کو بھی شرفِ باریابی بخشا جائے کیونکہ وہ ہمارے وفاداروں میں شامل ہونا چاہتا ہے۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''اگر تو کہتی ہے تو اس کو بھی بلوالے ورنہ مجھ کو ان لوگوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔''

دوقوز نے تردی کو بھی وہیں بلوالیا۔ تردی نے ہلاکو خان کو بہت قریب سے دیکھا تو بہت متاثر ہوا۔ ہلاکو خان نے اس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

تردی نے ادب سے عرض کیا۔ ''محترم ایل خان! دہائی ہے، مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ برقائی خان نے گھوڑے کی چوری کے جرم میں میرے بیوی بچوں کو یرغمال بنا کے رکھ لیا ہے۔ آپ انہیں یہیں بلوادیں کیونکہ اب میں واپس نہیں جانا چاہتا۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''تو نے گھوڑا چرایا تھا؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''ہاں، جب میں معاشی طور پر بالکل تباہ و برباد ہوچکا تھا، اس وقت میں نے چوری کی۔''

ہلاکو خان نے دوٹوک جواب دیا۔ ''تب پھر میں تیری سفارش نہیں کرسکتا۔ یہ میرے شایان شان بھی نہیں ہے اور پھر کیا تو خود بھی یہ نہیں جانتا کہ ہمارے یہاں چوری ایک بدترین جرم ہے۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''خان محترم! مجھے ہر بات کا علم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ چوری ایک بدترین جرم ہے لیکن میں نے یہ جرم ان حالات میں بدرجۂ مجبوری کیا ہے جن میں ازروئے اسلام حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔''

تردی نے مزید عرض کیا۔ ''محترم خان! میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ خدا کے لیے بھیجنے میں عجلت سے کام نہ لیجیے۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''برقائی خان میرا بھائی ہے۔ جب میں اس کے آدمی کو روک کر اپنے ساتھ رکھوں گا تو وہ مجھ سے ناراض ہوجائے گا اور میں اس کو ناراض نہیں کرسکتا۔''

اچانک ایک شخص گھبرایا ہوا اجازت لیے بغیر اندر داخل ہوا اور عرض کیا۔ ''والدہ محترمہ کی حالت بہت زیادہ نازک ہوچکی ہے۔''

ہلاکو خان فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی حاضرین بھی کھڑے ہوگئے۔

ہلاکو خان نے چلتے چلتے حکم دیا۔ ''نصیرالدین طوسی کو حاضر کیا جائے۔''

ایک خدمت گار خواجہ طوسی کی طرف چلا گیا۔ پادری یعقوب اور یوشع ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

ہلاکو کی ماں کا خیمہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ہلاکو خان کے خیمے کی پشت پر تھا۔ جب یہ لوگ اس خیمے میں داخل ہوئے تو وہاں دوقوز اور دوسری خواتین پہلے ہی سے پہنچ چکی تھیں۔ ہلاکو خان کو دیکھتے ہی خواتین مریضہ کے پاس سے ہٹ گئیں۔ ہلاکو خان اپنی بوڑھی ماں پر جھک گیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''ماں! تو کیسی ہے؟''

ماں نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ ''بیٹے! ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تیرے دادا چنگیز خان اور تیرے باپ تولوئی کو اپنے سرہانے کھڑے دیکھا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جاودانی نیلے آسمان کی کھڑکیاں کھل چکی ہیں، ہم دونوں تجھ کو لینے آئے ہیں۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''ماں! تو نے ان دونوں کو یہ نہیں بتایا کہ ان کی قوم اور ان کی اولاد میں نفاق پیدا ہوچکا ہے اور اب ہم آپس ہی میں برسرپیکار ہونے والے ہیں۔''

لیکن ماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔

پادری یوشع نے کہا۔ ''اب شاید یہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہوجائے گی۔''

ہلاکو خان بہت غمزدہ ہورہا تھا۔ پادری یعقوب نے کہا۔ ''جب یہ اپنے آسمانی سفر پر روانہ ہوچکی ہوگی تو اسے ایک نئی دشواری پیش آجائے گی۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''کون سی نئی دشواری؟''

لیکن اسی لمحے ہلاکو کی ماں بڑبڑانے لگی۔ ''جلدی نہ کرو۔ جب میں نے تمہارے ساتھ چلنے کا وعدہ کرلیا ہے تو میں ضرور چلوں گی مگر جلدی نہ کرو...... اور منگوخان یہ تو! تو یہاں کیوں آیا؟ لیکن یہ ہلاکو کہاں چلا گیا؟ میں اس سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔''

ہلاکو خان نے اپنی ماں کو ہلایا، بولا۔ ''ماں! میں موجود ہوں...... آنکھیں کھول اور مجھے پہچان۔''

نصیرالدین طوسی اپنے کاندھوں پر طیلسان ڈالے اندر داخل ہوا۔ طیلسان کے دونوں سرے سامنے لٹک رہے تھے۔ اس نے بیمار ماں پر نظر ڈالتے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ اب وہ جانبر نہیں ہوسکے گی۔

نصیرالدین کے پیچھے پیچھے کئی طبیب بھی آگئے اور انہوں نے ہلاکو کی ماں کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اعلان کیا۔ ''نبضیں چھوٹ چکی ہیں اس لیے بچنے کا کوئی امکان نہیں اس لیے ان سے آخری بار ہم کلام ہونے کی کوشش کی جائے۔''

دوقوز نے ماں سے کوئی بات پوچھی مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ ہلاکو خان نے ماں سے کہا۔ ''ماں! جب تو آسمانی دریچوں کے اس پار جائے گی تو وہاں خان اعظم چنگیز خان سے کہہ دینا کہ اس کی سولدو (روح) ہمارے پرچموں میں داخل ہوجائے کیونکہ یہ پرچم عنقریب مصر پر یلغار کرنے والے ہیں۔''

بوڑھی ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخرکار اس کا منکا ڈھلک گیا اور گردن ایک طرف مڑ گئی۔

نصیرالدین طوسی نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''اس کا مطلب کیا ہوا؟''

نصیرالدین طوسی نے جواب دیا۔ ''ہم سب اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔''

ہلاکو خان کو بہت دکھ تھا، ماں کی موت نے اس سخت دل شخص کو بھی آبدیدہ کردیا تھا۔ پادری یوشع نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ ''محترم ایل خان! اس موقع پر مجھے ایک بہت ضروری بات گوش گزار کرنی ہے۔''

ہلاکو خان نے اجازت دے دی۔ ''تجھ کو اجازت ہے۔''

پادری یوشع نے عرض کیا۔ ''محترم خان! آپ نصیرالدین سے پوچھیے کہ جب انسان مر کر قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟''

حاضرین پر سکتہ طاری ہوگیا۔ نصیرالدین پادری یوشع کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اب خیمے کے اندر لوبان سلگایا جاچکا تھا اور اس کی تیز روشنی والا دھواں پورے خیمے میں پھیلتا جارہا تھا۔

نصیرالدین طوسی نے پادری یوشع سے پوچھا۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔''

اب ہلاکو خان بھی طوسی سے رجوع ہو چکا تھا، اس نے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ مرنے والے کی قبر میں کوئی خاص بات رونما ہوتی ہے؟''

نصیرالدین نے جواب دیا۔ ''ہاں، قبر میں دو فرشتے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نکیر ہے۔ یہ دونوں ہر مُردے سے چند سوال کرتے ہیں۔ اگر انہیں ان کے سوال کا جواب مل جاتا ہے تو مرنے والا سکھ اور آرام سے رہتا ہے اور اگر جوابات نہیں دے پاتا تو اس کا حشر خراب کر دیا جاتا ہے اور عذاب قبر شروع ہو جاتا ہے۔''

ہلاکو خان نے حیرت سے پوچھا۔ ''قبر میں یہ سب بھی ہوتا ہے؟''

نصیرالدین نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ سب قبر میں ہوتا ہے۔''

ہلاکو خان نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''پھر میری ماں ان فرشتوں کو کس طرح جوابات دے گی؟''

پادری یوشع نے عرض کیا۔ ''خان محترم! اس کا بھی ایک حل موجود ہے، بشرطیکہ آپ اس کو پسند فرمائیں۔''

ہلاکو خان بہت بے چین ہو رہا تھا، بولا۔ ''تو بتا تو سہی، میں اس کو پسند بھی کروں گا اور اس پر عمل بھی کروں گا۔''

پادری یوشع نے نصیرالدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر انہیں مادرِ مقدس کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور ماں کو فرشتوں کے سوال و جواب سے نجات مل جائے گی۔''

ہلاکو خان کو پادری یوشع کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اس نے نصیرالدین سے پوچھا۔ ''خواجہ طوسی! تیرا کیا خیال ہے؟''

نصیرالدین نے جواب دیا۔ ''بات تو بہت معقول ہے لیکن اگر مجھ کو ماں کے ساتھ دفن کر دیا گیا تو پھر محترم ایل خان کے ساتھ کون دفن ہو گا؟''

ہلاکو خان اور زیادہ چکرا گیا، پوچھا۔ ''نصیرالدین! تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

نصیرالدین نے جواب دیا۔ ''ماں کے ساتھ پادری یوشع کو دفن کر دیا جائے کیونکہ قبر کے دونوں فرشتوں کو یہ پادری سنبھال لے گا اور میں آپ کی قبر میں دفن ہو کر آپ کے لیے فرشتوں کو بے بس اور لاجواب کر دوں گا۔''

ہلاکو خان کو یہ تجویز بھی بہت پسند آئی، اس نے اعلان کر دیا۔ ''خواجہ نصیرالدین میری قبر میں دفن کیا جائے گا مگر پادری یوشع کو میری ماں کے ساتھ قبر میں داخل ہونا پڑے گا تاکہ میری ماں قبر کے سوال جواب اور عذاب سے بچ جائے۔''

اس خوفناک اعلان نے پادری یوشع، پادری یعقوب اور دوقوز کو حواس باختہ کر دیا۔ یوشع کو پسینا آنے لگا۔

پادری یعقوب آگے بڑھا اور مودبانہ عرض کیا۔ ''محترم ایل خان! پادری یوشع نے جو کچھ کہا تھا ازراہِ مذاق کہا تھا۔ حالانکہ جو مر گیا، مر گیا۔ قبروں میں عذاب کس طرح ہو سکتا ہے۔''

ہلاکو خان کو ماں کی موت نے حد درجہ چڑچڑا اور بددماغ کر دیا تھا، اس نے جھنجلا کر پادری یعقوب سے پوچھا۔ ''کیا تو کبھی مرا ہے؟''

پادری یعقوب نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں تو کبھی نہیں مرا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''پھر تجھے کیا پتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔'' پھر اپنے جاں نثاروں سے کہا۔ ''دوستو! میری بات غور سے سنو اور اس پر اسی طرح عمل کرو جس طرح میں بیان کروں۔''

لوگ ہمہ تن آواز سننے میں مشغول تھے۔ پادری یوشع کے چہرے کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اس نے عرض کیا۔ ''محترم خان! میں جانا چاہتا ہوں۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''تو بہت جلد اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جائے گا، قبل از مرگ واویلا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

تردی اس فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ شاید اسے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ وحشی منگولوں کے زیرِ سایہ عیسائیوں کی صلیب بلند ہوتی جا رہی تھی اور اسلام کے مخالف اس کو کس کس طرح نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

ہلاکو خان نے جھک کر اپنی ماں کی پیشانی کو بوسہ دیا اور خیمے سے باہر چلا آیا۔

پادری یعقوب نے نصیرالدین سے درخواست کی۔ ''محترم خواجہ طوسی! پادری یوشع کی جان بچا لیجیے۔''

نصیرالدین نے جواب دیا۔ ''جان لینے اور دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اس سلسلے میں، میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

دوقوز نے دونوں پادریوں کو تسلی دی۔ ''آپ

دونوں ذرا بھی نہ گھبرائیں، ابھی میں ہلاکو خان سے بات کروں گی۔"

پادری یوشع نے دوقوز کی خوشامد کی۔ "جس طرح بھی بن پڑے، آپ مجھے معافی نامہ ضرور دلوا دیں۔"

تردی، نصیرالدین کے ساتھ ہی خیمے سے نکل گیا۔ یہ دونوں ہلاکو کے دربار میں چلے گئے۔ راہ میں تردی نصیرالدین سے بات کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کرسکا۔ طوسی کا رعبِ علم اتنا زیادہ تھا کہ اچھے اچھے اس سے مرعوب رہتے تھے۔

دوقوز نے ہلاکو خان سے پادری یوشع کے لیے سفارش کی اور کہا۔ "قبر میں دفن ہونے کے لیے کئی اور جوان آمادہ ہو چکے ہیں۔ آپ انہیں ملاحظہ فرمالیں اور جس کو مناسب فرمائیں، اسے قبر میں دفن کر دیا جائے۔"

ہلاکو خان بہت چڑچڑا ہو رہا تھا۔ جھنجلا کر جواب دیا۔ "دوقوز! کیا میری ماں کی قبر میں تو دفن ہونے کے لیے تیار ہے؟ اگر تو پادری یوشع کی جگہ قبر میں دفن ہونے کے لیے تیار ہے تو میں یوشع کو آزاد کر دوں گا۔"

پادری یوشع کی جس شخص نے بھی سفارش کی، ہلاکو خان نے اس کے سامنے یہی تجویز رکھ دی۔ آخر اس پیشکش سے ہر شخص دستبردار ہو گیا۔ تردی یہ دلچسپ تماشا دیکھ رہا تھا اور خوب خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ خواجہ طوسی سے بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا لیکن کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔

ہلاکو خان کی ماں کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ مرنے والی ماں کی خدمت کے لیے درجن بھر کنیزیں نہلا دھلا اور بنا سنوار کر اس کے پاس کھڑی کر دی گئیں۔ ان کنیزوں کا دل بیٹھا جا رہا تھا کیونکہ ذرا دیر بعد انہیں بھی ہلاکو خان کی ماں کے ساتھ زندہ دفن ہو جانا تھا۔ ان کے پاس ہی پادری یوشع کھڑا رو رہا تھا۔ ہر کسی کو پادری یوشع پر رحم آ رہا تھا۔

ایک لمبے چوڑے کمرے کی طرح ہلاکو خان کی ماں کی قبر تیار کی گئی۔ اس ہال میں ماں کی لاش کو درمیان میں رکھ دیا گیا۔ یہیں مرنے والی کا سامان بھی رکھ دیا گیا۔ سب سے آخر میں کنیزوں اور پادری یوشع کو حکم دیا گیا کہ وہ ماں کے آس پاس کھڑے ہو جائیں۔

کنیزیں بادلِ ناخواستہ آہستہ آہستہ قبر میں اتریں اور ماں کے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔

پادری یوشع اس طرح چیخ کر رویا جس طرح قصائی کی چھری تلے کوئی بکرا ڈکار کر روتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر رحم کی درخواست کی "محترم ایل خان! رحم...... مجھ پر رحم فرمائیں۔"

ہلاکو خان نے کہا۔ "عجیب بے وقوف ہے یہ شخص! اگر بات رحم کی ہوتی تو ممکن ہے میں اس پر غور بھی کرتا لیکن یہ بات رحم کی نہیں، میری ماں کے دکھ سکھ کی بات ہے۔ قبر کے فرشتے اس سے سوال جواب کریں گے اور میری ماں اس کے صحیح صحیح جواب نہیں دے سکے گی۔ میں نے اپنی ماں کی مدد اور نجات کی خاطر اس پادری یوشع کو قبر میں اتارا ہے اور یہ مجھ سے خوامخواہ رحم کی درخواست کر رہا ہے۔"

آخر پادری یوشع کو ماں کے قریب دھکیل کر قبر کو نہایت پھرتی سے بند کر دیا گیا۔ جب تک قبر پوری طرح بند نہ ہو گئی، پادری یوشع اور کنیزوں کے شور و غل کی آوازیں باہر آتی رہیں۔

ہلاکو خان اپنی ماں کی قبر پر کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور پھر چپ چاپ اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔

پادری یعقوب نے نصیرالدین طوسی سے دل شکستہ آواز میں کہا۔ "خواجہ! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ آپ چاہتے تو پادری یوشع کی جان بچ سکتی تھی۔"

خواجہ طوسی نے جواب دیا۔ "تم لوگوں نے کنواں میرے لیے کھودا تھا اور اس میں پادری یوشع گر گیا۔ پھر میں اس کو کیوں بچاتا؟ اس پر کیوں رحم کھاتا؟"

تردی کو اس بھیانک منظر نے لرزہ براندام کر دیا۔ اس نے سوچا کہ اس اندھیر نگری میں کسی دن، کسی نہ کسی معاملے میں اس کی باری بھی آسکتی ہے۔ اس کو اس کی عقل نے مشورہ دیا کہ چوکنا اور ہوشیار رہ اور بولنے، بات کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لے۔ معلوم نہیں کون سی بات کس مصیبت میں مبتلا کر دے۔

☆☆☆

دوقوز نے بعد میں ہلاکو خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "میرے آقا! مسلمانوں کے علاوہ قبر کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اگر پادری یوشع کو ماں کے ساتھ دفن نہ کیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔"

ہلاکو خان نے دوقوز کو ڈانٹ دیا۔ "اب اس موضوع پر بات نہیں ہو گی، کبھی بھی نہیں ہو گی۔ جو ہوا پادری یعقوب اور یوشع کی وجہ سے ہوا اور تجھ کو ان لوگوں کی وکالت کا حق کس نے دیا ہے؟"

جب دوقوز اپنے شوہر ہلاکو خان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئی تو وہ خاموشی سے اپنی سرخ خانقاہ میں چلی گئی

اور وہاں قربان گاہ مسیح پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ہلاکو خان کو اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ بیبرس کی سرکوبی کے لیے مصر کا رخ کرے یا برقائی خان سے جنگ کرے۔

ہلاکو خان کی پوری زندگی جنگ و جدل میں گزری تھی اور اس نے اپنے کسی دشمن کو کبھی بھی اس قابل نہ سمجھا تھا کہ اس کی سرکوبی کے لیے غور و فکر کرے لیکن اب وہ اس پر مجبور ہو چکا تھا۔ اس کے شامانوں (ساحروں) نے اسے یہ باور کرا رکھا تھا کہ خان اعظم کی سولدے (روح) منگولوں کے پرچم میں حلول کر چکی ہے، یاک کے نو دموں والے پرچم میں......

لیکن اب جبکہ اس کا مقابلہ برقائی سے تھا اور مقابلے میں دونوں طرف منگول ہی تھے تو خان اعظم کی روح کس کے پرچم میں ہوگی؟ اس نے برقائی کے اسلام کو کبھی بھی پسند نہیں کیا تھا اور وہ یہ بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ برقائی ہلاکو خان کے مقابلے میں مصر کے مملوک حکمراں بیبرس کا ساتھ دے۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ برقائی جیسے کوہِ گراں کو پاش پاش کیے بغیر وہ بیبرس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور آخر اس نے وہی فیصلہ کیا جو ایک غیر معمولی جنرل ان حالات میں کر سکتا تھا۔ برقائی کو سزا دے کر مصر کی گوشمالی کرنا۔

ہلاکو خان نے اپنے ارادے کا اظہار کسی پر بھی نہیں کیا۔ اس نے شہزادہ اباقا خان کو حکم دیا کہ منگول عساکر کو کوچ کے لیے تیار رکھے۔ شہزادے نے پوچھا۔ ”یہ عساکر کس طرف کوچ کریں گے؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”میں منگول شامانوں اور مسلمان منجموں سے پوچھوں گا کہ ہمارا اقبال اور فتح مندیاں ہمیں کس طرف لے جائیں گی اور خوش طالعی ہمارا کس جگہ انتظار کر رہی ہے؟“

اباقا خان اس گول مول جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس کو اپنے باپ پر حیرت تھی کہ وہ پہلی بار تذبذب اور شک و شبہے کا شکار ہوا تھا۔

ہلاکو خان کو اچانک حقیر تردی یاد آ گیا جو اس کی محبت اور احترام میں برقائی کے پاس واپس نہیں گیا تھا اور جس کی بابت یہ معلوم ہوا تھا کہ برقائی خان نے اس کے بیوی بچوں کو یرغمالی بنا لیا تھا۔ ہلاکو خان کو اس بات کا تجربہ تھا کہ اس قسم کے دل جلے اور قسمت کے مارے انسان بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ اس نے اچانک تردی کو طلب کر لیا۔

جب تردی آ گیا تو اس سے پوچھا۔ ”تیرا دین کیا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”ہم آشفتہ حالوں کا دین کیا ہو سکتا ہے، کوئی دین نہیں۔ ہمارا دین یہ ہے کہ جو ہمارا ساتھ دے، ہماری مدد کرے، ہم اس کی پرستش کرنے لگیں۔“

ہلاکو خان کو تردی کا جواب بہت پسند آیا، پوچھا۔ ”تو میری کیا مدد کر سکتا ہے؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”مدد تو میری آپ کریں گے، میں تو خود زمانے اور قسمت کا ستایا ہوا مدد حاصل کرنے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ میری مدد تو کر، میں تیری مدد کروں گا۔“

تردی ہلاکو خان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا، بولا۔ ”خان محترم! میں زیادہ عقلمند آدمی نہیں ہوں، آپ کی پُراز مغز باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”جتنے دنوں سے تو ہمارے درمیان رہ رہا ہے تو نے دیکھا ہوگا کہ میں مذہبی معاملات میں رواداری واقع ہوا ہوں۔ میرے آس پاس مسلمان، عیسائی، بودھ اور یہودی تک ہیں۔ میری بیوی دوقوز مسیحی ہے اور میرا وزیر اور مشیر مسلمان نصیرالدین طوسی۔ میرے عساکر میں مہندس اور ہنرمند چینی بدھ ہیں اور تاجروں کی بیشتر تعداد مسلمان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ برقائی سے جنگ بھی کروں اور سازش بھی۔ سازش میں چند مسلمان میرا ساتھ دیں گے کیونکہ یہ مسلمان مجھ سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔“

تردی نے محسوس کیا کہ ہلاکو خان بہک رہا ہے اور اس کی قوتِ فیصلہ اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ وہ کہنا کچھ چاہتا ہے اور منہ سے کچھ نکل جاتا ہے۔ تردی نے جواب دیا۔ ”میں خان محترم کی ہر خدمت انجام دینے کو تیار ہوں۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”برقائی کے آس پاس کس قسم کے مسلمان موجود ہوتے ہیں؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”مسلمان عالم اور صوفی۔ یہ دونوں اسلامی تعلیمات کی بنیادی روح برقائی کو ذہن نشین کراتے رہتے ہیں۔“

ہلاکو خان جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کو اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ عاجز آ کر بولا۔ ”اچھا ابھی تو، تو ہماری میزبانی کے مزے لوٹ۔ اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ تو ہمارے کس کام آ سکتا ہے۔“

تردی نے درخواست کی۔ ”خان محترم! یوں تو مجھے ہر قسم کا آرام میسر ہے مگر پھر بھی میں گھومنے پھرنے میں ایک

قسم کا خوف اور جھجک سی محسوس کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں یہاں کی ہر حسین شے اور ہر خوب صورت جگہ کا نظارہ کروں۔ میں منگول عساکر کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے اتنے بہت سارے گھوڑے کہیں اور نہیں دیکھے۔ میں انہیں قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں منگول عساکر کے ایک طرف موجود ان بازاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں انسانی ضروریات کی تمام چیزیں تھوک میں ملتی ہیں۔ میں ان مشینوں اور آلات کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں جو قلعوں کی تسخیر میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میں نے یہ ساری پرلطف اور حیرت انگیز چیزیں کہیں اور نہیں دیکھیں۔ کبھی کبھی تو میں اس ماحول میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میں کسی اور ہی دنیا اور کسی اور ہی مخلوق میں آ گیا ہوں۔ میں ان بستیوں اور آبادیوں میں گھومنا پھرنا چاہتا ہوں جنہیں آپ نے بسایا ہے، آپ نے آباد کیا ہے اور ان میں ہر مذہب و ملت کے لوگ باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں اور شاید...... شاید نہیں، یقیناً دنیا کے یہی وہ محفوظ اور پرسکون معمورے ہیں جہاں کے لوگ کسی خوف اور خطر کے بغیر آرام اور اطمینان سے رہتے ہیں۔ میں ان سب کو قریب سے دیکھ کر خود میں یہ فخر اور احساس پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ میں باہر کی دنیا کا شاید وہ پہلا شخص ہوں جس نے ایل خان اور اس کی دنیا کو بہت قریب سے بلکہ ان میں رہ بس کے آزادی اور اطمینان سے دیکھا ہے۔ محترم ایل خان! آپ یقین کریں، میں اس وقت بھی اپنی بیوی بچوں کی جدائی اور مفارقت کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں بلکہ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ بیوی بچوں کی اسی جدائی اور مفارقت نے مجھے آپ تک پہنچایا اور یہ سب کچھ دیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے تو میں خوشی سے پاگل ہو جاتا ہوں اور یہ خوشی میرے غم و اندوہ پر حاوی آ جاتی ہے۔"

ہلاکو خان کو اس کے شوق کی فراوانی نے بہت محظوظ کیا۔ اس نے جواب دیا۔ "تو جس قسم کی آزادی چاہتا ہے۔ میری طرف سے دے دی گئی مگر اس کی ایک معمولی سی قیمت ادا کرنی ہو گی تجھے۔"

تردی نے کہا۔ "میں اس کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

ہلاکو خان نے کہا۔ "میں سازش اور حیلہ گری کا بالکل قائل نہیں لیکن ایک عظیم مقصد کے لیے میں اس پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میں تجھ کو برقائی کی خدمت میں بیش قیمت تحائف کے ساتھ واپس کروں گا اور اس سے تیری سفارش کروں گا کہ وہ تجھے معاف کر دے اور تیرے بیوی بچے تیرے حوالے کر دے اور تو اس کے صلے میں برقائی خان کو کسی بھی طرح زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھ کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دوں گا۔"

تردی نے پست ہمتی کا اظہار کیا۔ "لیکن یہ بہت مشکل کام ہے محترم ایل خان!"

ہلاکو خان نے طیش میں کہا۔ "لیکن ناممکن نہیں ہے۔ میں نے اپنے دل کا راز تجھ پر ظاہر کر دیا ہے۔ اب تو اسے راز میں رکھ کر انجام دے گا، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں جس قسم کی مدد تجھ کو درکار ہو گی میں کروں گا۔"

تردی نے پوچھا۔ "مجھے واپس کب جانا ہو گا؟"

ہلاکو خان نے کہا۔ "میں بتاؤں گا۔"

ہلاکو خان نے تردی کو عام اجازت دے دی کہ وہ جہاں اور جو کچھ دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے۔

تردی نے آزادی سے گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ اس نے منگول سپاہ کو بہت قریب سے دیکھا۔ منگول شامانوں کو دیکھا جو وحشی منگولوں میں غلط سلط پیش گوئیاں کرتے پھرتے تھے۔ یہیں مسلمان منجموں سے بھی ملاقات ہوئی جن کی پیش گوئیاں کبھی سچ نکلتیں، کبھی بالکل جھوٹ۔ اس نے وہ آلات بھی دیکھے جن سے فصیل کی دیواریں اور قلعے توڑے پھوڑے جاتے تھے۔ اس نے منگولوں کا شاندار اصطبل بھی دیکھا جس میں عربی اور عراقی گھوڑوں کے علاوہ قراقرم اور چین کے گھوڑے بھی موجود تھے۔ اس نے ان دکانداروں اور ہنرمندوں کو بھی دیکھا جو اپنی بے مثل کاروباری صلاحیت اور ہنرمندی میں لاثانی تھے۔ اس آبادی کو بھی دیکھا جس میں چین، قراقرم، روس، قفقاز، چینی ترکستان، روم، ایران اور عراق و عرب کے لوگ آباد تھے۔ ان میں مسلمان، بودھ، عیسائی اور یہودی بھی شامل تھے اور انہی میں وہ دہریے اور خدا کی ذات کے منکر بھی تھے جو ہلاکو خان کی مذہبی رواداری کے دل و جان سے قائل اور معتقد تھے۔

شام سے ذرا پہلے جب وہ مخلوط بستی میں سے گزر رہا تھا تو اس نے ایک گھر سے گانے کی آواز سنی۔ گانے والی کوئی لڑکی تھی اور وہ سمرقند اور بخارا کی فارسی اور ترکی کی آمیزہ زبان میں کچھ گا رہی تھی۔ تردی کی زبان بھی یہی تھی۔ اس کی اپنی زبان کے سحر نے اسے روک لیا۔ اس کے پاؤں رک گئے اور وہ گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی لڑکی گا رہی تھی۔

''او غیرت مند قوم کی بے غیرت اولادو! آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔

دشمن تمہیں نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے، تمہارا مرکز (بغداد) برباد کر دیا گیا۔

یا رسول اللہ ﷺ! اپنی امت کے نافرمانوں پر رحم فرمائیں۔

اغیار، جو باطل ہیں حق کو نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ سمرقند و بخارا خاک میں مل گئے۔

وہ ایران اور عراق کہاں ہیں جہاں اسلام کا پرچم بلند رہتا تھا۔

موصل و بغداد کی شوکت کو کیا ہوا؟

اے اللہ! تیری پسندیدہ قوم کے شہباز کدھر چلے گئے؟''

اچانک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک عمر رسیدہ شخص باہر نکلا۔ اس نے تردی کو دروازے پر کان لگائے بیٹھے دیکھا تو پوچھا۔ ''تو کون ہے اور یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنی مادری زبان میں گانے کی آواز سنی تو بے اختیار کھڑا ہو گیا اور گیت سننے لگا۔''

وہ شخص تردی کو اندر لے گیا اور پوچھا۔ ''مگر یہ تو بتا تو ہے کون؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''میں ایل خان کا مہمان تردی ہوں۔''

اس شخص کے چہرے کا رنگ بدل گیا، خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے اپنی بیٹی روشنک کو منع کیا تھا کہ اس قسم کے گیت نہ گایا کرے مگر وہ باز ہی نہیں آتی۔ میرے محترم مہمان! آپ یقین کریں، روشنک جو کچھ گا رہی تھی، اس میں اس کے یا میرے جذبات شامل نہیں تھے، یہ محض ایک گیت تھا۔''

تردی نے کہا۔ ''مجھے اپنی بیٹی روشنک سے ملا تو سہی۔ جس کی آواز اتنی خوب صورت ہے، وہ خود کتنی خوب صورت ہو گی۔''

عمر رسیدہ شخص کو ملانے میں تامل ہوا، تردی نے کہا۔ ''خیر، کوئی بات نہیں۔ میں واپس چلا جاؤں گا اور ہلاکو خان سے کہوں گا کہ وہ تجھے اور روشنک کو اپنے دربار میں طلب کر کے یہ گیت سنے، اس وقت تو، تو انکار نہیں کر سکے گا۔''

بوڑھا ایک دم راضی ہو گیا، بولا۔ ''لیکن میں نے یہاں کب انکار کیا ہے۔ تو میرے ساتھ آ، میں روشنک سے دو چار گیت اور سنوا دوں گا۔''

بوڑھا، تردی کو اپنی بیٹی روشنک کے پاس لے گیا جو ایک قالین پر بیٹھی گا رہی تھی۔ اس نے نیلے لباس پر سرخ رنگ کا شلوکا سا پہن رکھا تھا اور سر کے بال رومال سے باندھ لیے تھے۔ روشنک بلاشبہ بہت حسین تھی۔ اس کی ٹھوڑی کے گڑھے پر ایک تل تھا اور بڑی بڑی پلکوں کے اوپر بھویں ہلال کی طرح نصف دائرہ بنا رہی تھیں۔

روشنک نے اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھا تو خاموش ہو گئی۔

تردی نے شوخی سے کہا۔ ''گایئے، گایئے...... آپ رک کیوں گئیں؟''

روشنک کوئی جواب دیے بغیر دوسرے کمرے میں جانے لگی، تردی نے کہا۔ ''ہم تو آپ کی آواز کے سحر میں یہاں تک آ گئے اور آپ نے اس سحر کو توڑ دیا۔ یہ تو بڑی زیادتی ہو گی ہمارے ساتھ۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''بیٹی روشنک! یہ ہلاکو خان کا مہمان تردی ہے۔ خدا کے لیے تو کچھ دیر کے لیے یہیں رہ، ورنہ یہ شخص تجھ کو، مجھ کو ہلاکو خان کے دربار میں بلوا لے گا۔''

روشنک واپس آ گئی، بولی۔ ''یہ چاہتے کیا ہیں؟''

بوڑھے کے بجائے تردی نے جواب دیا۔ ''ہم آپ کا گانا سننا چاہتے ہیں۔ آپ کے بامعنی اشعار جب سوز میں ڈوبی ہوئی آواز میں دل سے نکلے تو ہم تڑپ کر رہ گئے۔ سبحان اللہ۔ مزہ آ گیا۔''

روشنک نے کہا۔ ''میں جو کچھ گا رہی تھی، اپنے لیے گا رہی تھی، دل بہلانے کے لیے...... ورنہ اشعار کے مفہوم کا میرے جذبات و احساسات سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں۔''

تردی نے کہا۔ ''ہمیں ان باتوں سے کیا واسطہ۔ ہم تو آپ کا گیت سننا چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔''

روشنک نے تردی کو ایک دوسرا گیت سنایا مگر اس میں پہلے جیسا مزہ نہیں آیا، تردی نے کہا۔ ''اس گیت میں چونکہ آپ کے جذبات اور احساسات شامل نہیں تھے، اس لیے مزہ نہیں آیا۔''

دونوں گھبرا گئے، بوڑھے نے کہا۔ ''تردی! غالباً تیرا یہی نام ہے۔ میں ایک مسلمان تاجر ہوں۔ کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں، نیا نیا یہاں آیا ہوں اگر تیری یہ تنقید ایل خان کے کانوں تک پہنچ گئی تو خدا جانے ہم دونوں کا کیا حشر ہو۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''آپ مطمئن رہیں، یہ بات آگے نہیں بڑھے گی لیکن ہمیں اس بات کی اجازت ہونی

چاہیے کہ اس گھر میں، گھر کے ایک فرد کی طرح آتے جاتے رہیں۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تم کس دین سے تعلق رکھتے ہو؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''فی الحال میرا کوئی دین نہیں۔ جو دین میرے آقا کا وہی میرا اپنا دین۔''

بوڑھے نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ''تردی! ذرا باہر آؤ میرے ساتھ۔ میں چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

تردی اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ بوڑھے نے کہا۔ ''تردی! ہم مسلمان ہیں۔ جب تم اس گھر میں آنا جانا شروع کرو گے تو میری بیٹی سے عشق لڑانے کی کوشش کرو گے۔ اگر تم وعدہ کرو کہ ایسا نہیں ہوگا تو میں گھر میں آنے جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''پھر بھی آنے جانے میں احتیاط سے کام لینا۔''

تردی دوبارہ اندر چلا گیا اور روشنک سے کہا۔ ''اے صبح جیسی صبیح اور شام جیسی ملیح دوشیزہ! آئندہ ایسا گیت نہ گانا جیسا تو میری آمد سے پہلے گا رہی تھی۔ ہاں، جب میں اس کی فرمائش کروں تو انکار بھی نہ کرنا۔''

دونوں باپ بیٹی کو تردی خاصا دلچسپ آدمی محسوس ہوا۔ وہ دونوں مسکرانے لگے اور تردی انہیں مسکراتا چھوڑ کر چلا آیا۔

☆☆☆

ہلاکو خان کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے تو وہ برقائی خان سے نمٹے گا، بعد میں والیِ مصر بیبرس سے۔

برقائی خان پر حملہ کرنے سے پہلے اس نے ایک عجیب و غریب قدم اٹھایا۔ اس نے والی قسطنطنیہ سے خط کتابت شروع کر دی۔ دراصل وہ اس طرح مغرب اور مسیحی دنیا میں اپنے ساتھی تلاش کر رہا تھا۔ اس نے والیِ قسطنطنیہ کو خط میں لکھا:

''میں ہلاکو خان، جس نے مشرق کی مسلم قوتوں کا تقریباً خاتمہ کر دیا، اب یروشلم کو ان کی دستبرد سے بچانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ قسطنطنیہ کا قیصر ہم سے رشتہ و تعلق پیدا کرلے۔ میری بیوی دوقوز مسیحی ہے اور تمام مسیحیوں کی طرح اس کی بھی یہی خواہش ہے کہ یروشلم پر صلیب استادہ ہو۔ اس کا بیٹا اباقا خان میرا جانشین تیری فرزندی میں آنے کا خواہش مند ہے اور یہ تیرے اور تیری بیٹی کے لیے وجہ افتخار ہوگا کہ تیری بیٹی ماریہ، اباقا خان کی بیوی اور میری اور دوقوز کی بہو بنے۔ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

دوسری طرف یہ خبر برقائی خان اور بیبرس کو بھی پہنچ گئی۔ بیبرس نے برقائی کو لکھا۔

''زریں خیل کے کوہ گراں! ہلاکو خان سے جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔ وہ قیصر سے رشتے داری کے بعد اپنا ایک حلیف حاصل کرلے گا۔ اب آپ بھی وہی کریں جو ہلاکو خان نے کیا ہے۔ آپ قیصر کو لکھیں کہ آپ بھی اس سے رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اپنے بہادر بھتیجے نوگائی کی شادی قیصر کی دوسری بیٹی سے کرنا چاہتے ہیں۔ ماریہ جو اباقا خان کی بیوی بننے والی ہے، قیصر کی ناجائز بیٹی ہے مگر نوگائی کی بیوی اپنے باپ کی جائز بیٹی ہوگی۔''

برقائی نے بیبرس کی تجویز پر عمل کیا اور قسطنطنیہ کا قیصر نہ تو ہلاکو کی تجویز کو مسترد کرسکا اور نہ برقائی خان سے انکار کرسکا۔ وہ بیک وقت اباقا خان اور نوگائی کا پدرِ نسبتی بن گیا۔

ہلاکو خان نے ایسا محسوس کیا گویا وہ ایک معرکہ ہار گیا۔ ایک جنگ ہار گیا۔ اب وہ بیبرس سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہو چکا تھا کیونکہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ برقائی کے پیچھے بھی بیبرس کی سوجھ بوجھ کارفرما ہے۔

تردی بڑے سکون اور اطمینان سے روشنک کے پاس آ جا رہا تھا۔ ہلاکو خان اور قسطنطنیہ کے قیصر کے درمیان جو معاملہ طے پایا تھا، وہ اس سے بھی واقف ہو چکا تھا اور اس کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ اس کی جوابی کارروائی میں بیبرس نے کیا کردار ادا کیا۔ جب اس نے یہ ساری باتیں روشنک کو بتائیں تو وہ بہت خوش ہوئی مگر اپنی اس خوشی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

تردی نے کہا۔ ''روشنک! کیا بات ہے تو خوش نہیں ہوئی حالانکہ ان واقعات نے ہمیں یہ بتایا کہ اسلام ایک بار پھر ابھر رہا ہے اور وحشی منگول اپنی ترک و تاز اور یلغار کو برقرار رکھنے میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں۔''

روشنک نے جواب دیا۔ ''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

تردی نے روشنک کو چھیڑا۔ ''اس خبر نے تجھ کو خوش کیا یا نہیں؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''تردی! اس وقت ہم سب ہلاکو خان کی رعایا ہیں۔ ہلاکو خان کی ذلت سے ہم کس طرح

خوش ہو سکتے ہیں؟''

تردی نے کہا۔ ''لیکن میں تو اس خبر سے بہت خوش ہوا ہوں۔''

روشنک نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تجھ کو سمجھ گئی ہوں تردی! اس طرح تو میرے دل کی بات اگلوانا چاہتا ہے۔''

تردی نے کہا۔ ''نہیں روشنک! یہ بات نہیں ہے۔ میں اس خبر سے واقعی بہت خوش ہوا ہوں۔''

روشنک نے دزدیدہ نظروں سے مسکراتے ہوئے تردی کو دیکھا اور شوخی سے کہا۔ ''کیا میں یہ خبر ہلاکو خان تک پہنچادوں؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''اگر پہنچا سکو تو ضرور پہنچا دو۔''

روشنک نے کہا۔ ''چونکہ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنا میرے بس میں نہیں تو اجازت دے دی۔''

تردی نے کہا۔ ''روشنک! تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔''

روشنک نے کہا۔ ''کوشش کر تو رہی ہوں کچھ کچھ۔ اللہ نے چاہا تو سمجھ بھی لوں گی تمہیں کبھی نہ کبھی۔''

روشنک کی قربت آہستہ آہستہ محبت میں بدلنے لگی لیکن خود روشنک اس سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے روشنک کو یہ بتا رکھا تھا کہ ابھی تک وہ کنوارا ہے لیکن روشنک نے اس بات کا کوئی اثر ہی نہیں لیا، بولی۔ ''تم اگر کنوارے ہو تو مجھے کیا۔''

تردی نے پوچھا۔ ''کیا تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''میں مطلب سمجھ کے کروں گی کیا۔ تم نے میرے باپ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرو گے۔''

تردی نے کہا۔ ''ہاں، میں نے یہ وعدہ کیا تو تھا لیکن اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔''

روشنک نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''لیکن مجھے تو ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔''

روشنک نے بات زیادہ نہیں بڑھنے دی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور کہا۔ ''تردی! اب تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ تمہاری طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ آئندہ اس گھر میں اس وقت آنا جب میرا باپ بھی گھر میں موجود ہو۔''

تردی اسی وقت چلا گیا۔ روشنک دیر تک اپنے کمرے میں بند تردی کی موجودگی اور عدم موجودگی کا اندازہ لگاتی رہی اور جب کمرے سے نکل کر اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں تردی بیٹھا تھا تو یہ جان کر دکھ محسوس کیا کہ تردی نے شریفانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ اس نے سوچا، تردی چاہے کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو لیکن آدمی شریف ہے۔

اس کے بعد تردی کئی دن غائب رہا۔ اس دوران وہ کئی بار ہلاکو خان کے پاس گیا اور کہا۔ ''محترم ایل خان! میں شب و روز اس پر غور کر رہا ہوں کہ برقائی خان کو کس سازش سے ہلاک کیا جائے۔ جیسے ہی کوئی ترکیب سمجھ میں آئی، میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''لیکن میری سمجھ میں وہ ترکیب آچکی ہے۔ میں اگر چاہوں کہ برقائی خان کو ہلاک کر دیا جائے تو اس کو ہلاکت سے دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں بچا سکتی۔''

تردی نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''عقل و ذہانت میں محترم ایل خان کا کوئی کیا مقابلہ کرے گا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''مجھے ایک حسین ترین لڑکی کی تلاش ہے۔ میں اپنا یہ کام اسی سے لے لوں گا۔''

تردی خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں ہلاکو خان کو روشنک کا پتا نہ چل جائے۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ کتنی حسین لڑکی چاہتے ہیں؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''بالکل روشنک جتنی حسین۔''

تردی کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے، بہت نحیف آواز میں پوچھا۔ ''کیا آپ روشنک سے واقف ہیں؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''خوب اچھی طرح۔ تردی! میں ایک گلہ بان کی طرح اپنے آدمیوں کا بہترین علم رکھتا ہوں۔''

تردی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''روشنک کی آواز کے سحر سے بھی آپ واقف ہوں گے؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''سحر سے بھی اور آواز کے سوز سے بھی۔ کلام کے جذبات، احساسات اور مفہوم سے بھی۔''

اب تو تردی کا کام تمام ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ جس ہلاکو خان کو روشنک کی اتنی ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں، وہ خود اس کے بارے میں کیا کچھ نہ جانتا ہوگا۔

ہلاکو خان نے کہا۔ ''تردی! میں ایک روادار حکمراں ہوں۔ مسجدوں میں کیا ہوتا ہے، میں اس کی پروا بھی نہیں کرتا۔ یہاں گرجے بھی ہیں اور صومعے بھی...... لیکن میں نہ تو مسجد میں کوئی دخل دیتا ہوں، اور نہ چرچ اور صومعے سے کوئی

تعلق رکھتا ہوں۔ روشنک مسلمان ہے اور ایک مسلمان کو اپنے شاندار ماضی پر فخر اور افسوس ناک حال پر نوحہ تو کرنا ہی چاہیے۔"

تردی نے سر جھکالیا اور آہستہ آہستہ کہا۔ "جی ہاں محترم ایل خان۔"

ہلاکو خان نے تردی کو زیادہ دیر نہیں بٹھایا، یہاں سے اٹھ کر وہ سیدھا روشنک کے گھر پہنچا۔ وہ روشنک کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ تو جس راز کو چھپائے ہوئے ہے، ہلاکو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔

گھر کے دروازے بند تھے، تردی نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے روشنک نے پوچھا۔ "کون؟"

تردی نے جواب دیا۔ "میں تردی ہوں روشنک...... دروازہ کھولو۔"

روشنک کا دل یہ کہہ رہا تھا کہ دروازہ کھول دے لیکن زبان نے دل کا ساتھ نہیں دیا، کہا۔ "واپس جاؤ۔ اس وقت باوا جان گھر پر نہیں ہیں۔"

تردی نے کہا۔ "روشنک! اتنی ظالم نہ بنو۔ میں تم سے چند باتیں کر کے چلا جاؤں گا۔ مجھ پر اعتبار کرو۔"

روشنک نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ اس وقت باوا جان گھر میں نہیں ہیں۔"

تردی نے اصرار کیا۔ "لیکن میں نے بھی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں تم سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔"

دوسری طرف سے روشنک نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تردی کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا پھر دوبارہ آواز دی۔ "روشنک! میں ایک شریف انسان ہوں، مجھ پر اعتبار کرو۔"

روشنک نے جواب دیا۔ "میں کب کہتی ہوں کہ تم شریف انسان نہیں ہو، مگر تم مسلمان تو نہیں ہو۔"

تردی نے بڑی بے چینی سے کہا۔ "میری بات تو سنو! میں ہلاکو خان کے پاس سے آرہا ہوں اور اس وقت میں تمہیں چند ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔"

روشنک نے جواب دیا۔ "میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ میں باوا جان کی عدم موجودگی میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

تردی نے مایوسی سے کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہیں مجبور تو نہیں کرسکتا۔"

روشنک کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑی سن گن لیتی رہی لیکن اس کے بعد تردی کی آواز نہیں سنائی دی۔

روشنک نے تردی کے خلاف جو ظالمانہ روش اختیار کی تھی، اس پر بہت زیادہ غمگین تھی لیکن وہ ایسا کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی تھی۔ وہ دیر تک ملول اور افسردہ ادھر ادھر گھر میں پھرتی رہی۔ شام کو جب اس کا باپ واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تردی دروازے سے ٹیک لگائے سویا ہوا ہے۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور روشنک نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ سویا ہوا تردی لڑھک کر اندر گر گیا۔

روشنک نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "یہ کیا؟"

اب تردی بھی بیدار ہو چکا تھا۔ روشنک کے باپ نے پوچھا۔ "یہ معاملہ کیا ہے؟"

تردی نے جواب دیا۔ "میں آپ کی عدم موجودگی میں یہاں آیا تھا۔ روشنک نے دروازہ کھولنے سے انکار کردیا لیکن میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ روشنک سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا اس لیے میں دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا پھر مجھے نیند آگئی، میں سو گیا۔"

روشنک تردی کا اثر قبول کرتی جارہی تھی۔ اس نے تردی کی اس جگہ کو دیکھا جہاں زمین پر بیٹھ کر وہ سو گیا تھا۔ پسینے نے اس جگہ کو نم کردیا تھا۔ روشنک نے تردی کو رحم آمیز نظروں سے کچھ دیر دیکھا اور سامنے سے ہٹ گئی۔

روشنک کا باپ تردی کو اندر لے گیا۔ پوچھا۔ "کوئی خاص بات تھی جو تجھے خلافِ معمول یہاں لے آئی؟"

تردی نے جواب دیا۔ "مجھے حیرت ہے کہ ہلاکو خان آپ دونوں سے بھی واقف ہے۔ خوب اچھی طرح اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ روشنک مسلمانوں کا دکھ درد براہِ راست اپنے دل میں رکھتی ہے۔"

روشنک کے باپ نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ تو برا ہوا۔"

تردی نے کہا۔ "لیکن آپ گھبرائیں نہیں کیونکہ ہلاکو خان اس میں روشنک کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ وہ ایک انصاف پسند فاتح ہے۔"

روشنک کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ "کاش ایسا ہی ہوتا۔"

تردی روشنک سے ملنے اور بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ اس کے باپ کی پروا کیے بغیر روشنک کے پاس چلا گیا۔ روشنک ایک کونے میں بیٹھ کر کچھ سوچ رہی تھی۔ تردی نے اسے آواز دی۔ "روشنک! آج میں نے یہ

فیصلہ کرلیا تھا کہ تجھ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

روشنک نے پوچھا۔ "مگر تم چاہتے کیا ہو؟"

تردی نے جواب دیا۔ "میری نظریں، میرا طرزِ عمل، میرا والہانہ انداز، یہ سب کیا باور کراتے ہیں؟"

روشنک نے کہا۔ "میں نے ان باتوں پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔"

لیکن تردی نے اپنی بات اسی جذباتی انداز میں جاری رکھی۔ "روشنک! میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا، تو ہی بتا اب میں کیا کروں؟"

روشنک کا باپ بھی وہاں پہنچ گیا، بولا۔ "تردی! میں نے تجھ کو اتنی آزادی یا اجازت نہیں دی کہ تو مجھ کو نظرانداز کر کے میری بیٹی سے باتیں کرتا رہے۔ تو کیا چاہتا ہے، میں خوب جانتا ہوں مگر تو جو چاہتا ہے، وہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

تردی نے پوچھا۔ "آخر کیوں نہیں ہوسکتا؟"

باپ نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ ہم مسلمان ہیں اور تو معلوم نہیں کیا ہے۔"

تردی نے کہا۔ "روشنک کے لیے میں مسلمان ہوسکتا ہوں۔"

باپ نے مضحکہ اڑانے کے انداز میں کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ "لڑکی کی خاطر مسلمان ہونے والا مسلمان نہیں ہوسکتا۔"

تردی لاجواب اور بے بس ہوگیا۔ روشنک کو باپ کی باتیں اچھی نہیں لگیں، اس نے کہا۔ "باوا جان! کیا سارے مسئلے اسی وقت طے پا جائیں گے؟"

تردی نے براہِ راست روشنک سے بات کی۔ "اگر تو مجھے منع کردے گی تو میں کبھی یہاں نہیں آؤں گا لیکن تجھ کو میری تبدیلیِ مذہب کی پیشکش پر غور ضرور کرنا چاہیے۔"

باپ نے سختی سے کہا۔ "روشنک! ایک مثل ہے، اعتبار کرنا اچھی بات ہے مگر اعتبار نہ کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔ تو جس شخص سے واقف نہیں اس پر اعتبار کس طرح کرسکتی ہے؟"

روشنک نے جواب دیا۔ "باوا جان! میں نے اس پر اعتبار کہاں کیا؟ میں جو قدم بھی اٹھاؤں گی، سوچ سمجھ کر اٹھاؤں گی۔"

باپ نے تردی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "تردی! اس وقت تو یہاں سے چلا جا۔ ابھی تک میری بیٹی میرا بڑا احترام کرتی رہی ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ جب سے تو اس سے ملا ہے وہ کچھ باغی ہوتی جارہی ہے۔"

تردی نے خوشامد کی۔ "آپ روشنک ہی کے نہیں، میرے بھی باپ ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ انصاف سے کام لیں۔"

باپ نے جواب دیا۔ "اس وقت تو، تو یہاں سے چلا جا۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات کروں گا۔"

تردی نے بات کو بگڑتے دیکھا تو جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ روشنک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "روشنک! میں جارہا ہوں، شاید کل پھر ملاقات ہوگی۔"

جب وہ دروازے سے باہر نکل گیا تو روشنک کا باپ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچا۔ اس نے تردی کو آواز دی۔ "تردی! ذرا میری بات تو سنتا۔"

تردی رک گیا اور مڑ کر روشنک کے باپ کی طرف دیکھنے لگا، بولا۔ "کیا بات ہے؟"

باپ نے کہا۔ "اب تم یہاں نہیں آؤ گے اور اگر آؤ گے تو میری موجودگی میں، ورنہ میں تیری شکایت ہلاکو خان تک پہنچادوں گا۔"

تردی نے بڑی بے بسی سے پوچھا۔ "کیا یہ مجھ پر ظلم نہیں ہے؟"

باپ نے جواب دیا۔ "اب تو جاسکتا ہے، مجھے بس یہی کہنا تھا۔"

تردی چلا گیا۔ روشنک کا باپ جب مکان میں داخل ہوا تو اس نے روشنک کو دروازے کی درز سے جھانکتے دیکھا۔ روشنک تردی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

باپ نے اسے ملامت کی۔ "روشنک! ہم یہاں کس لیے آئے ہیں۔ اگر تو نے تردی جیسے بے دین میں اسی طرح دلچسپی لی اور مجھ کو ذلیل و خوار کیا تو میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا اور تردی تیری بو تک نہیں پاسکے گا۔"

روشنک اس وقت تو خاموش رہی لیکن رات کو کھانے کے دوران اس نے باپ سے پوچھا۔ "باوا جان! کیا تردی دوبارہ آنے کا وعدہ کرگیا ہے؟"

باپ نے جواب دیا۔ "نہیں، اس نے ایسا کوئی وعدہ تو نہیں کیا مگر تو نے یہ سوال کیوں کیا؟"

روشنک نے کہا۔ "آپ باہر نکل کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں، وہاں کیا باتیں ہوئیں؟"

باپ نے ڈانٹ دیا۔ "گستاخ لڑکی! اب آئندہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔"

روشنک خاموش ہوگئی۔

تردی روشنک سے جدا ہوکر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ روشنک کے باپ کی اس دھمکی سے خوفزدہ ہوگیا تھا

کہ اگر وہ نہیں مانا تو وہ اس کی ہلاکو خان سے شکایت کردے گا اور تردی خوب جانتا تھا کہ شکایت کے بعد اس کے شادی شدہ ہونے کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس موقع پر اس نے دوقوز کی مدد لینا چاہی لیکن یہاں پر اسے یہ مشکل پیش آئی کہ دوقوز نے اسے عیسائی ہوجانے پر مجبور کیا۔ اس نے کہا۔ ''تردی! میں تیری ہر قسم کی مدد کرسکتی ہوں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ تو پہلے عیسائی ہوجا۔ لیکن یہ بتا کہ اس شادی کے بعد تو اپنے بیوی بچوں کو کیا جواب دے گا؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''اسلام نے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ ایک سے زائد شادیاں کرسکتا ہے۔''

دوقوز کو تردی کی باتیں دکھ پہنچا رہی تھیں۔ اس نے تردی کو اپنے پاس سے دور کردیا، بولی۔ ''اب تو جاسکتا ہے۔ میرا وقت اپنی فضول باتوں میں ضائع نہ کر۔''

تردی نے دوقوز کے پاؤں پکڑ لیے، بولا۔ ''ملکۂ عالیہ! مجھے روشنک کے عشق نے پاگل کردیا ہے۔ میں آپ کی ہمدردیوں اور مہربانیوں کا مستحق ہوں۔''

دوقوز نے پادری یعقوب کو اپنے قریب بلایا اور اس سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''محترم مقدس باپ! مسلمان تو تبلیغ کا کام ہماری جتنی لگن سے نہیں کرتا پھر یہ لوگ مسلمان کیوں ہوجاتے ہیں؟''

پادری یعقوب نے جواب دیا۔ ''شاید اپنی سادگی کی وجہ سے۔''

دوقوز نے تردی کو سمجھایا۔ ''میں تجھ کو سمجھاتی ہوں کہ اپنے بیوی بچوں میں واپس جا اور مسلمان لڑکی کا پیچھا چھوڑ دے۔''

تردی کو احساس ہوا کہ اس نے اپنے اس معاملے میں دوقوز کو شامل کرکے بدترین غلطی کی ہے۔ اس نے دوقوز کو بے وقوف بنانا چاہا۔ بولا۔ ''ملکۂ عالیہ! میرا خیال ہے مسلمان ساحر ہوتے ہیں اور اس مسلمان لڑکی نے مجھ پر جادو کردیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ روشنک کے سحر کو توڑ دوں۔''

دوقوز نے پادری یعقوب سے کہا۔ ''مقدس باپ! آپ تردی کے سینے پر صلیب کا نشان بنادیں تاکہ یہ مسلمان لڑکی کے جادو کے اثر سے محفوظ ہوجائے۔''

پادری یعقوب نے تردی کے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور کہا۔ ''تردی! جا خداوند مسیح نے چاہا تو، تو مسلمان لڑکی کے سحر سے محفوظ رہے گا۔''

جب وہ دوقوز کے پاس سے اٹھ کر باہر آیا تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ روشنک کی محبت اور زیادہ شدت سے اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگئی ہے۔ اس کے قدم خودبخود روشنک کی طرف اٹھنے لگے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس نے ہلاکو خان کو اپنے مشیران اور وزراء کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ ہلاکو خان کے ساتھ نصیرالدین طوسی بھی تھا اور چند عیسائی اور بودھ مدبر بھی۔ تردی بھی ان لوگوں میں شامل ہوگیا۔ ہلاکو خان نے تردی کو دیکھ لیا مگر بولا کچھ نہیں۔ نصیرالدین طوسی نے تردی کو کن انکھیوں سے دیکھا اور یوں بن گیا گویا اس نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ ہلاکو خان نے طوسی سے کہا۔ ''خواجہ! میں شیخ الجبال پر رشک کرنے لگا ہوں، میں سوچتا ہوں اے کاش! چند دنوں کے لیے میں شیخ الجبال بن جاتا۔ اگر ایسا ہوجاتا تو، تو جانتا ہے سب سے پہلے کیا کام کرتا؟''

خواجہ طوسی نے پوچھا۔ ''آپ پہلا کام کون سا انجام دیتے؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''میں اپنے چند فدائیوں کو حکم دیتا کہ وہ سرائے برقائی خان جائیں اور برقائی خان کو قتل کر آئیں۔ ایسا میں اس لیے کرتا کہ میں برقائی خان سے الجھنا نہیں چاہتا۔ میں اس فتنے کو ایک شخص کی موت سے کچل سکتا تھا۔''

خواجہ طوسی نے کہا۔ ''محترم ایل خان! آپ شیخ الجبال سے بڑی حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کا پورا لشکر، پوری فوج آپ کی فدائی ہے۔ آپ جس کسی کو بھی یہ حکم دیں گے، وہ بخوشی اس کام کو انجام دے گا۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''خواجہ! کیا تو اس جوان تردی سے واقف ہے؟''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''بس اس حد تک کہ میں نے اس شخص کو خان محترم کے دربار میں فریادی کی حیثیت میں آیا ہوا دیکھا تھا۔''

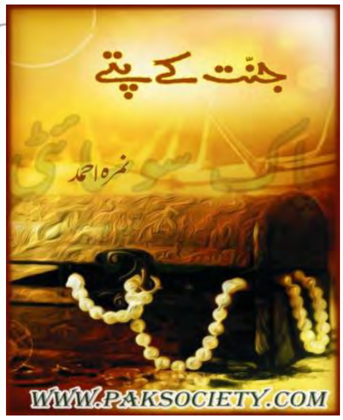
ہلاکو خان نے کہا۔ ''میں نے اس کو ایک خاص مقصد سے روک لیا ہے۔ میں اس سے اسی نوع کا ایک کام لینا چاہتا ہوں۔''

خواجہ نے تذبذب سے عرض کیا۔ ''یہ شخص اتنا بڑا کام خلوص اور عقیدت سے کس طرح انجام دے گا؟''

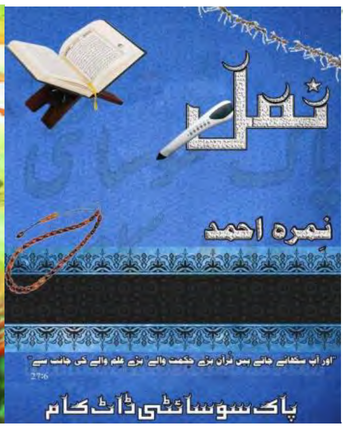
ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''میں نے اس جوان میں جو خاص بات دیکھی ہے، وہ یہ ہے کہ......''

ابھی ہلاکو خان اپنا جملہ بھی پورا نہیں کرپایا تھا کہ ان کے سامنے ایک پہاڑی آگئی۔ یہ ننگی پہاڑی تھی۔ اس پر سبزہ بھی نہیں تھا۔ ہلاکو اس پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اس کے پیچھے

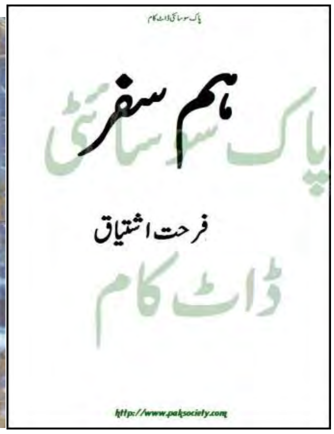
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

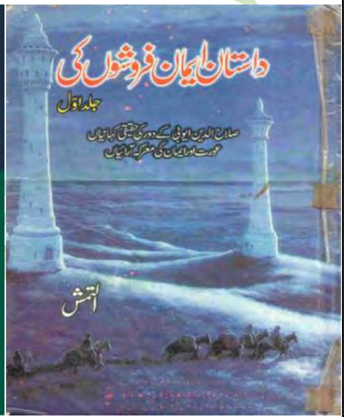




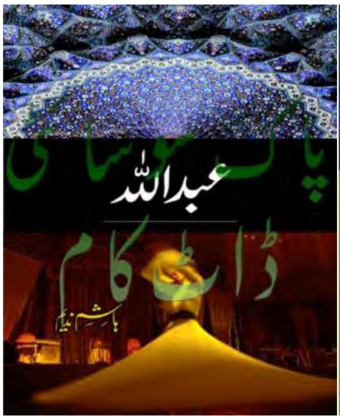


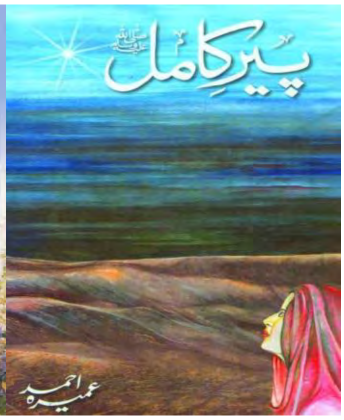




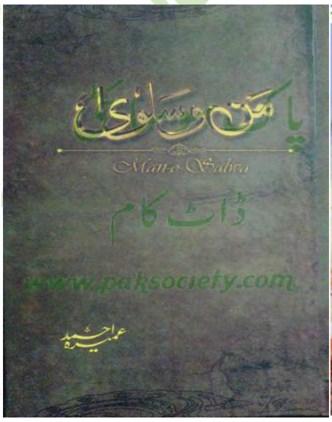




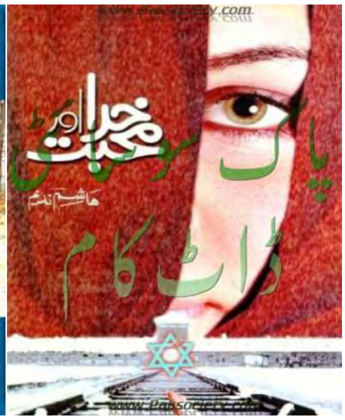


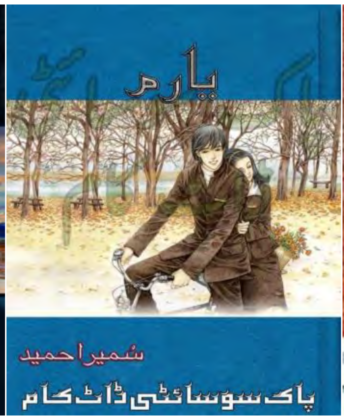




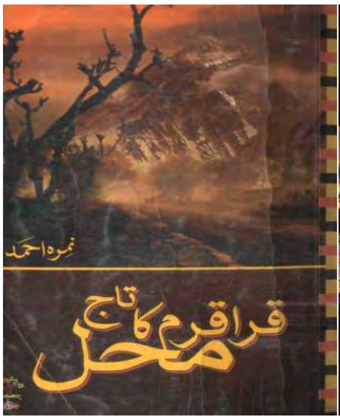












پیچھے اس کے ساتھی بھی چڑھ گئے۔

جملہ ساتھی ایک جگہ پر ٹھہر گئے اور ہلاکو خان اور اس کا ایک خادم دونوں پہاڑی کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھنے لگے۔ خادم کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور اس تھیلے میں کسی جانور کا گوشت بھرا ہوا تھا۔

سب سے اونچی چوٹی پر چڑھنے کے بعد ہلاکو خان ایک چٹان پر کھڑا ہو گیا۔ خادم گوشت کا تھیلا ہلاکو خان کے قدموں میں رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہلاکو خان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نیلا آسمان بالکل صاف تھا۔ ابر کا ایک ٹکڑا تک کہیں نہیں نظر آرہا تھا۔ ہاں کہیں کہیں چیلوں کی چار چار پانچ پانچ کی ٹکڑیاں محوِ پرواز تھیں۔

ہلاکو خان نے نیلے آسمان کی وسعتوں میں نظریں جما دیں اور آہستہ آہستہ بولا۔ ''اے نیلے جاودانی آسمان! آج میں قربانی پیش کرنے آیا ہوں۔ اگر تو نے میری قربانی قبول کر لی تو میں سمجھوں گا کہ میں نے برقائی کو شکست دے دی اور اگر میری قربانی کو شرفِ قبولیت سے محروم رکھا گیا تو میں اپنی قسمت پر صبر کر لوں گا، اس قسمت پر جس پر مسلمان یقین رکھتے ہیں اور آج مجھے اس قسمت پر مجبوراً ایمان لانا پڑ گیا ہے۔''

ہلاکو خان نے تھیلے میں سے گوشت نکالا اور اس کو پہاڑی کی بلند ترین چوٹی پر رکھ کر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد چیلیں تو غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ ایک عقاب نمودار ہوا اور اس نے گوشت کو چونچ میں دبایا اور فضا میں بلند ہوتا چلا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر واپس آیا اور گوشت کو اس جگہ چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ہلاکو خان نے کچھ دیر عقاب کا انتظار کیا لیکن وہ پھر واپس نہیں آیا اور چیلیں دوبارہ نمودار ہو گئیں۔

ہلاکو خان دل شکستہ اور دل برداشتہ پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر اپنے آدمیوں میں چلا گیا۔ اس نے خواجہ طوسی سے کہا۔ ''خواجہ! میری قربانی قبول ہونے کے بعد نامقبول ہو گئی۔ بتا اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''محترم ایل خان! آپ اپنے دشمنوں کو مغلوب کر لیں گے مگر انہیں تباہ و برباد نہیں کر سکیں گے۔''

ہلاکو خان نے افسردہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور خواجہ طوسی سے کہا۔ ''جب میرا دادا خان اعظم دنیا کی تسخیر کو نکلا تھا تو اس نے برخان کلدون کی چوٹی پر کھڑے ہو کر چھوٹے سے گوسفند کا نذرانہ جاودانی نیلے آسمان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ عقاب اس گوسفند کو لے کر کہیں غائب ہو گیا تھا اور خان اعظم نے اقوامِ عالم کو اپنے گھوڑے کے سموں تلے روند ڈالا تھا۔ اے کاش میرا نذرانہ بھی اسی طرح قبول کر لیا جاتا۔''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''محترم خان! زمانہ بدل چکا ہے اور آپ نے اب تک جو فتوحات حاصل کی ہیں، ان کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔''

ہلاکو خان پہاڑی بلندیوں سے نشیب کی طرف اتر رہا تھا۔ جب وہ مسطح میدان میں آگیا تو اس نے تردی کو اپنے پاس بلایا اور اس کو نصیحتیں کرنے لگا۔ اس نے تردی کو سمجھایا۔ ''روشنک سے عشق لڑانے کی کوئی ضرورت نہیں، میرے ساتھ چل۔ میں تجھ سے چند ضروری باتیں کروں گا۔''

تردی بہت پریشان ہو چکا تھا۔ ہلاکو خان کو ہر بات کا علم تھا اور یہ بات تردی کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔

خواجہ طوسی نے ایک جگہ موقع پا کر تردی کو سمجھایا۔ ''تردی! سچ بتا تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اگر مجھ کو تیرے آنے کی غرض و غایت معلوم ہو جائے تو میں تیرے مفر کی کوئی راہ نکال لوں گا۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''خواجہ بزرگ! میں ایک فریادی ہوں۔ برقائی نے مجھ پر ظلم کیا ہے، میں اس ظلم کا ازالہ چاہتا ہوں۔''

خواجہ طوسی نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''تیرا دین؟ کیا تو مسلمان ہے؟''

تردی کو پس و پیش میں دیکھ کر خواجہ بزرگ نے ایک بار پھر سرگوشی میں پوچھا۔ ''تیرا دین؟ کیا تو مسلمان ہے؟ مجھ کو صحیح صحیح بتا دے تاکہ میں اس کی روشنی میں کچھ انتظام کر دوں۔''

تردی سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتا تھا مگر زبان کھلتے کھلتے بند ہو گئی۔

خواجہ نے غصے میں کہا۔ ''ہلاکو خان سے کام لینے کے لیے عقل بھی بہت زیادہ چاہیے ورنہ خان محترم کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تجھ کو ایک فدائی کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے اور اگر تو نے ہلاکو خان کے دباؤ میں آ کر اس کا یہ کام نہ کیا تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ مجھے صاف صاف اور سچ سچ بتا دے۔''

تردی نے ہلاکو خان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے عقیدت مندوں میں گھرا ہوا تھا۔ تردی نے آہستہ سے کہا۔

"خواجہ بزرگ! میں مسلمان ہوں اور یہاں گھومنے پھرنے چلا آیا ہوں......"

خواجہ نے پوچھا۔ "اور وہ......وہ بیوی بچوں والا معاملہ؟"

تردی نے جواب دیا۔ "وہ واقعہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔"

خواجہ نے کہا۔ "تم میرے پاس آجانا، میں اپنے گھر پر تجھ سے کھل کر باتیں کروں گا۔"

لیکن ہلاکو خان نے تردی کو کہیں اور جانے ہی نہیں دیا۔ اس نے کہا۔ "تردی! یہ وقت کی بات ہے جو میں تجھ جیسے معمولی آدمی سے اس طرح ملتا ہوں۔ میں تجھ سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔"

تردی نے سرِ عجز و نیاز جھکا دیا، بولا۔ "میں خان محترم کی ہر خدمت انجام دینے کو تیار ہوں۔"

ہلاکو خان نے کہا۔ "تو نے شیخ الجبال کا نام تو سنا ہوگا۔"

تردی نے جواب دیا۔ "خوب اچھی طرح۔ میں شیخ الجبال اور اس کے فدائیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

ہلاکو خان نے کہا۔ "میں تیرے بیوی بچوں کے سلسلے میں برقائی کے نام ایک سفارشی خط لکھوں گا۔ تو یہ خط برقائی کو دے گا اور جب وہ میرے خط کی پڑھائی میں مشغول ہو جائے تو تو زہر میں بجھا ہوا خنجر اس کے دل میں پیوست کر دے گا۔"

تردی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "اور پھر برقائی کے سپاہی میرا کیا حشر کریں گے؟"

ہلاکو خان نے اس کا مذاق اڑایا۔ "پھر تیرا کیا حشر ہوگا؟ تو اگر چالاکی سے کام لے گا تو بچ جائے گا اور اگر تو نے میرا یہ کام سستی سے کیا اور وہاں سے فرار نہ ہو سکا تو وہیں قتل بھی کر دیا جائے گا۔"

تردی نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ "محترم ایل خان! اگر میں قتل کر دیا گیا تو میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟"

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ "تیرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ مجھے کیا معلوم۔ یہ سوچنا میرا نہیں تیرا کام ہے۔"

تردی چپ ہو گیا تو ہلاکو خان نے چیخ کر پوچھا۔ "کیا تو بہرہ ہے، گونگا ہے......تو بولتا کیوں نہیں؟"

تردی نے جواب دیا۔ "میں آپ کا یہ کام ضرور انجام دوں گا۔"

ہلاکو خان خوش ہو گیا۔ "اور جب تو وہاں سے بچ کر واپس آجائے گا تو میں روشنک کو تیرے حوالے کر دوں گا۔"

تردی کی ساری خوش فہمیاں دور ہو گئیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "محترم خان! ایک تجویز میرے ذہن میں ہے۔ اگر اس پر ہوشیاری سے عمل کیا جائے تو برقائی کو ہلاک بھی کیا جا سکتا ہے اور خود کو محفوظ بھی رکھا جا سکتا ہے۔"

ہلاکو خان نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

تردی نے جواب دیا۔ "محترم خان! روشنک حسین ترین لڑکی ہے، اس کو میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں اسے برقائی خان کی خدمت میں پیش کر دوں گا، آپ کا نذرانہ کہہ کر اور روشنک کو یہ سمجھا دیا جائے گا کہ وہ خلوت میں برقائی خان کو زہر دے کر ہلاک کر دے۔ اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

لیکن ہلاکو خان نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، بولا۔ "چالاک آدمی! اس طرح تو، تو روشنک کو لے کر فرار ہو جائے گا۔"

تردی نے عرض کیا۔ "روشنک کی جگہ کوئی دوسری خوب صورت لڑکی بھی یہ کام کر سکتی ہے۔"

ہلاکو خان نے کہا۔ "نہیں، تو میری تجویز پر عمل کرے گا۔"

تردی نے بے دلی سے کہا۔ "بہتر ہے، جیسی خان محترم کی مرضی۔" پوچھا۔ "مجھے برقائی خان کی خدمت میں کب جانا ہے؟"

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ "قسطنطنیہ کا قیصر اپنی بیٹی ماریہ کو میرے بیٹے اباقا خان کی دلہن بنا کر بھیج چکا ہے۔ وہ اپنے بیش قیمت تحائف اور دوسرے قیمتی سامان کے ساتھ یہاں پہنچنے ہی والی ہے، میں چاہتا ہوں کہ طمطراق اور شان وشوکت کا یہ عدیم النظیر منظر تو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، اس کے بعد تو چلا جائے گا۔"

ہلاکو خان نے جب اس کو گھر جانے کی اجازت دی تو مایوسی اور الجھن نے اس کے دل و دماغ کو بوجھل کر کے رکھ دیا تھا۔ اب وہ خواجہ طوسی سے ملنا ضروری سمجھتا تھا۔ وہ کئی دن بعد خواجہ بزرگ کی خدمت میں گیا۔ اس وقت خواجہ طوسی تنہا نہیں تھا۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے مگر یہ سب مسلمان تھے اور وضع قطع سے تاجر معلوم ہوتے تھے۔

خواجہ طوسی نے مسکراتے ہوئے تردی کا استقبال کیا، پوچھا۔ "تیرا چہرہ لٹکا ہوا کیوں ہے......خیریت تو ہے؟"

تردی نے حاضرین مجلس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آیا ہوں تو کچھ دیر دم لوں گا، اس کے بعد اپنا مدعا بیان

کروں گا۔"

خواجہ طوسی نے کہا۔"یہ سب اپنے ہی آدمی ہیں۔ ان سے پریشان یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

تردی نے بڑی ہمت کی کہ سب کچھ ان لوگوں کے سامنے ہی بیان کردے مگر زبان نہ کھل سکی۔

نصیرالدین طوسی نے حاضرین سے کہا۔"صاحبان! اب آپ لوگ جاسکتے ہیں، اللہ نے چاہا تو کل پھر ملاقات ہوگی۔"

جب حاضرین مجلس چلے گئے تو خواجہ طوسی نے اپنی آنکھیں تردی کی طرف کرلیں اور پوچھا۔"ہاں، اب بتا کیا بات ہے؟"

تردی نے سارا واقعہ رو رو کر سنا دیا، بولا۔"خواجہ بزرگ! آپ خود بتائیں کہ اس طرح میں بچ کر آسکتا ہوں بھلا! میں خود بھی مارا جاؤں گا اور زندگی بھر کی بدنامی الگ۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان حالات میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟"

خواجہ طوسی نے جواب دیا۔"تو موقع پاتے ہی یہاں سے فرار ہوجا اور برقائی سے مل کر اسے ہلاکو خان کی سازش سے مطلع کردے۔ شاید تو نہیں جانتا کہ اس کا تجھے کیا فائدہ پہنچے گا۔"

تردی نے پوچھا۔"اس کا مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟"

خواجہ نے جواب دیا۔"برقائی تیری وفاداری سے خوش ہوکر تیرے جرم کو بھلا دے گا اور تیرے بیوی بچے تیرے حوالے کردیے جائیں گے۔"

تردی نے اس تجویز پر خوشی کا اظہار نہیں کیا، بے دلی سے پوچھا۔"بس یا کچھ اور؟"

خواجہ نے جواب دیا۔"یہ بھی ممکن ہے کہ برقائی خان تجھ کو انعام واکرام سے نوازدے۔"

تردی نے پھر مایوسی سے کہا۔"لیکن اس سے میں زیادہ خوش تو نہیں ہوں گا۔"

خواجہ نے کہا۔"بہرحال میں نہیں جانتا کہ تجھ کو کس طرح بہت زیادہ خوش کیا جاسکتا ہے۔"

تردی نے جواب دیا۔"خواجہ بزرگ! میں یہاں کے ایک تاجر کی بیٹی روشنک پر عاشق ہوگیا ہوں۔ اگر میں سرائے برقائی خان روشنک کے بغیر گیا تو گویا میں یہاں سے ناکام، دل شکستہ و دل برداشتہ واپس جاؤں گا۔ میں روشنک کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

خواجہ نے اس کو سمجھایا۔"تردی! بچوں جیسی باتیں نہ کر۔ روشنک یہیں رہے گی، وہ تیرے ساتھ نہیں جاسکتی۔"

تردی نے پوچھا۔ ''وہ میرے ساتھ کیوں نہیں جاسکتی؟ اس کی وجہ؟''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''تردی! اگر تو نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی غلطی کی تو ہلاکو خان کے آدمی بھیڑیوں کی طرح تیرا پیچھا کریں گے اور کہیں بھی تجھے ہلاک کر کے روشنک کے ساتھ واپس آجائیں گے۔''

تردی نے پوچھا۔ ''ہلاکو خان کو روشنک سے کیا دلچسپی ہے؟''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''اس سوال کا جواب تو ہلاکو خان ہی دے سکتا ہے۔''

تردی زچ سا ہو گیا تھا، بولا۔ ''خدایا! یہ میں کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''اس وقت تو شرفاء میں گھرا ہوا ہے لیکن اگر ذرا سا بھی بہکا تو سیدھا جہنم میں چلا جائے گا۔''

تردی نے کہا۔ ''خواجہ بزرگ! اگر میں یہ راز جان کر رہوں گا کہ روشنک ہلاکو خان کو کیوں عزیز ہے۔''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''اس میں کوئی راز ہوگا تب تو، تو کچھ جانے گا۔ بات سیدھی سی یہ ہے کہ خان روشنک کو پسند کرتا ہے اور ہمیں کچھ پتا نہیں کہ اس کو کب طلب کر لیا جائے۔''

تردی پر تو گویا بجلی گر گئی۔ وہ کچھ دیر گم صم خواجہ کے پاس بیٹھا رہا، اس کے بعد اپنے گھر چلا گیا۔

☆☆☆

تردی انتہائی ضبط و برداشت کے باوجود روشنک کے پاس جانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ خوب جان چکا تھا کہ روشنک کے پاس جانے کا مطلب موت کو دعوت دینا ہے لیکن عشق کے ماروں کی طرح وہ بھی اپنی جان کو ہتھیلی پر لے کر روشنک کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت روشنک تنہا تھی۔ اس کا باپ کہیں گیا ہوا تھا۔ تردی کی دستک ہی سے اس نے اسے پہچان لیا۔ تردی کو اندیشہ تھا کہ روشنک دروازہ نہیں کھولے گی لیکن خلاف توقع دروازہ کھل گیا۔ تردی نے پوچھا۔ ''کیا تیرے باوا جان موجود ہیں؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''نہیں، وہ موجود نہیں ہیں۔''

تردی نے کہا۔ ''پھر تو حیرت ہے کہ......''

روشنک نے بات کاٹ دی، بولی۔ ''آج میں تمہیں اندر اس لیے بلاؤں گی کہ تم سے فیصلہ کن باتیں کروں گی۔''

تردی کھویا کھویا سا سوالیہ نشان بنا اندر داخل ہوا۔ روشنک نے اسے دالان میں بٹھایا۔ وہاں پتھر کا ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ روشنک نے کہا۔ ''تردی! تم اس پر بیٹھ جاؤ۔''

تردی نے اس میں اپنی بے عزتی محسوس کی، بولا۔ ''مجھے اندر کمرے میں نہیں بٹھاؤ گی؟''

روشنک نے جواب دیا۔ ''نہیں، تم اس وقت تک کمرے میں نہیں جاسکتے جب تک تم خود کو اس کا اہل نہیں ثابت کرو گے۔''

تردی نے پوچھا۔ ''کس قسم کی اہلیت؟''

روشنک نے پوچھا۔ ''میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

تردی گھبرا گیا اور کچھ تامل سے جواب دیا۔ ''بس نہیں کی شادی، کوئی معقول لڑکی نہیں مل سکی۔''

روشنک نے طنزاً کہا۔ ''تو کوئی معقول لڑکی نہیں مل سکی تم کو۔ گویا میں بہت معقول لڑکی ہوں۔''

تردی کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل بالکل، کسی معقول لڑکی کا ملنا آسان بات نہیں۔''

روشنک نے پوچھا۔ ''کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ تو...... یہاں ہلاکو خان کے پاس کیوں آیا ہے؟''

تردی اور زیادہ گھبرا گیا۔ ''میں یہاں کیوں آیا؟ تیرا باپ یہاں کیوں آیا؟ یہ لاکھوں لوگ ہلاکو خان کے پاس کیوں آئے؟''

روشنک نے کہا۔ ''مجھے اور کسی سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''کام کی تلاش میں۔ طالع آزما بن کر۔''

روشنک نے پوچھا۔ ''اور بیوی بچے یرغمال بنے برقائی یا اس کے بھتیجے کے پاس کس کے پڑے ہوئے ہیں؟''

تردی سمجھ گیا کہ روشنک کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا، بولا۔ ''یہ آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ کس کی بیوی، کس کے بچے اور کس کے پاس یرغمال بنے ہوئے ہیں۔''

روشنک نے بے مروتی سے کہا۔ ''زیادہ چالاک نہ بنو تردی۔ میں سب کچھ جان چکی ہوں۔''

تردی اپنی بات پر اڑا رہا، بولا۔ ''مجھ پر تہمت نہ لگا روشنک! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور تجھی سے شادی کروں گا۔''

روشنک نے جواب دیا۔ ''جب میں شادی کروں گی

تب تو کرو گے لیکن اب میں شادی نہیں کروں گی اور عنقریب اپنا مقدمہ ہلاکو خان کے دربار میں لے جاؤں گی۔ وہاں تیرا جھوٹ سچ سب پر عیاں ہو جائے گا۔''

اب تردی بالکل بے بس ہو چکا تھا، بولا۔''روشنک! تو مجھ سے شادی کر یا نہ کر لیکن اس مقدمے کو ہلاکو کے پاس ہرگز نہ لے جا۔''

روشنک جل کر بولی۔''اس لیے کہ تیرا جھوٹ کھل جائے گا اور ہلاکو خان تجھے اس جھوٹ کی سزا میں قتل بھی کرا سکتا ہے۔''

تردی نے جواب دیا۔''اب جو چاہو سمجھو لیکن میں اپنے ذاتی معاملات منگول فاتح کے دربار میں نہیں جانے دوں گا۔''

روشنک نے اسی دل جلے لہجے میں کہا۔''بہرحال تم وہاں جاؤ یا نہ جاؤ لیکن میں تمہارے بارے میں تحقیقات ضرور کروں گی۔''

تردی نے جب یہ دیکھا کہ پوری طرح ہر طرف سے گھر چکا ہے تو کہا۔''اگر تیری خوشی اسی میں ہے کہ ہمارے گھروں کی باتیں ہلاکو خان کے دربار میں ہوں تو میں بھی تیار ہوں کیونکہ میں اس طرح اپنی سچائی ثابت کرسکوں گا لیکن اس سلسلے میں ایک درخواست ضرور کروں گا۔''

روشنک نے پوچھا۔''وہ کیا؟''

تردی نے جواب دیا۔''آج کل میں...... شہزادہ اباقا خان کی دلہن قسطنطنیہ سے آنے والی ہے۔ اس کے آنے کے بعد تو اپنا مقدمہ پیش کرسکتی ہے، اس وقت تجھ کو میری سچائی کا علم ہو جائے گا۔''

روشنک شک وشبہے میں پڑگئی۔ اس کو اپنی معلومات پر شبہ ہو گیا، آہستہ سے بولی۔''میں چند دن صبر کرلوں گی لیکن اس معاملے کو ہلاکو کے دربار تک ضرور لے جاؤں گی۔''

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور روشنک کا باپ اندر داخل ہوا۔ اس نے تردی کو اندر بیٹھے دیکھا تو اس کا دماغی توازن بگڑ گیا، تردی کو گھورتے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔''تو پھر آ گیا اس گھر میں؟ میری اجازت کے بغیر۔''

تردی نے جواب دیا۔''ہاں، میں آپ کی مرضی کے بغیر ایک بار پھر اس گھر میں آ گیا لیکن......''

روشنک کے باپ نے کہا۔''کیا میں نے تجھ کو یہاں آنے سے منع نہیں کیا تھا؟''

اس بار تردی کی جگہ روشنک بولی۔''باوا جان! آپ ذرا تحمل اختیار کریں۔ میں نے تردی سے تقریباً فیصلہ کن باتیں کرلی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں بعد یا تو تردی ذلیل وخوار ہو کر کہیں کا بھی نہیں رہ جائے گا یا پھر میں اس لائق ہو جاؤں گی کہ تردی کے بارے میں کوئی مخلصانہ فیصلہ کرسکوں۔''

روشنک کے باپ نے تردی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تردی! ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ قطع تعلق کرلیں اگر تو صاف صاف سننا ہی چاہتا ہے تو سن۔ یہاں ہم ہلاکو خان کی رعایا ہیں اور میں نے سنا ہے کہ ہلاکو خان نے روشنک کو پسند کرلیا ہے۔'' روشنک کے باپ کی آواز بھرا گئی۔''کبھی کبھی تو یہ جی چاہتا ہے کہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں مگر افسوس کہ جی چاہنے کے باوجود ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ ہلاکو خان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، وہ ہمیں کہیں سے بھی پکڑ سکتے ہیں۔''

تردی نے پوچھا۔''یہ آپ کو کس نے بتایا کہ ہلاکو خان روشنک کو پسند کرتا ہے؟''

باپ نے جواب دیا۔''اس کے خاص آدمیوں نے۔ ان میں خواجہ طوسی بھی شامل ہے، میں تو یہاں آکر پچھتایا۔''

روشنک اٹھ کر جانے لگی، اس نے جاتے جاتے کہا۔ ''باوا جان! اگر ہلاکو خان نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تو میں خودکشی کرلوں گی۔''

باپ نے کہا۔''مگر یہ نادانی ہے، میں تو مقدر کا قائل ہوں۔ اگر قسمت میں یہی لکھ دیا گیا ہے کہ تو ہلاکو خان کی داشتہ بن جائے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔''

تردی پر ہلاکو خان کا رعب طاری ہو چکا تھا۔ وہ خاصا سہم چکا تھا، بولا۔''ویسے یہ بات اچھی نہیں ہے۔ حکمرانوں کو اپنی رعایا پر ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے۔''

روشنک کے باپ نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور دھیمے لہجے میں کہا۔''تردی! یہ کیا غضب کرتا ہے کہ تو ہلاکو خان کو بالواسطہ ظالم کہہ رہا ہے۔''

تردی نڈھال اور مایوس اٹھا اور روشنک کے کمرے میں چلا گیا۔ روشنک بستر پر اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ تردی کو گمان گزرا کہ شاید وہ رو رہی ہے اس نے روشنک کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔''روشنک! مت پریشان ہو۔ میں کوئی بات قبل از وقت نہیں کہنا چاہتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ظلم کی سیاہ ترین رات سپیدۂ سحر سے رشتہ قائم کرچکی ہے۔''

روشنک کے باپ نے تردی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے

باہر تک چھوڑ آیا، بوقتِ وداع کہا۔ ”تردی! اب تو یہاں نہیں آئے گا کیونکہ یہاں کی ذرا ذرا سی خبر ہلاکو خان تک پہنچ جاتی ہے۔“

تردی کوئی وعدہ کیے بغیر چلا آیا۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، اس نے اندر ایک شخص کو اپنا انتظار کرتے پایا۔ تردی اس شخص کو ہلاکو خان کے دربار میں دیکھ چکا تھا۔ اس شخص کی بڑی اور گھنی مونچھیں اس کو ہزاروں میں ممتاز کیے رکھتی تھیں۔ تردی نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ کا مجھ سے کوئی کام؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں جس مقصد اور پیغام کے ساتھ یہاں آیا ہوں، ناممکن ہے کہ تو اس کا علم نہ رکھتا ہو۔“

تردی نے بے پروائی اور بے دلی سے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ تم یہاں کیا اور کس کا پیغام لائے ہو۔“

”فاتح خان کا حکم ہے تو شہزادہ اباقا خان کی دلہن کے آتے ہی یہاں سے چلا جائے۔“

تردی نے جواب دیا۔ ”خان کا حکم سر آنکھوں پر۔ تم فاتح خان کو جا کر میری طرف سے یقین دلا دو کہ اب میں اس جگہ نہیں جاؤں گا جو میرے لیے ممنوعہ قرار دی جا چکی ہے۔“

وہ شخص چلا گیا، تردی کو اب اس جگہ اذیتیں پہنچ رہی تھیں۔

پانچ دن بعد قسطنطنیہ کے قیصر کی بیٹی دلہن بن کر حشم و خدم کے ساتھ مراغہ میں داخل ہوگئی۔ گھوڑوں، اونٹوں اور گاڑیوں پر سامان لدا ہوا تھا اور اباقا خان اپنی دلہن کے استقبال کے لیے مراغہ کے باہر کھڑا تھا۔ ہلاکو خان اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

دلہن اور اس کے سامان کو دیکھنے والوں میں تردی بھی شامل تھا۔ جہیز کے سامان سے لدی ہوئی گاڑیاں اور اونٹ آہستہ آہستہ شہزادے کے مستقر کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

جب دلہن اباقا خان کے قصر میں اتاری گئی تو ہلاکو خان بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے خیموں کے شہر سے نکلا، اور اباقا خان کے قصر میں داخل ہوگیا۔ اس نے دلہن ماریہ کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کا حسن خاصا پسند آیا، بولا۔ ”میں نے اباقا خان کے لیے حسین ترین دلہن کا انتخاب کیا ہے۔“

دلہن نے چہرے پر پڑی ہوئی جالی میں سے دنیا کے عظیم فاتح کا دیدار کیا۔ اس نے اس خونخوار فاتح کی بابت معلوم نہیں کیا کچھ سن رکھا تھا۔ جب اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا کہ یہی وہ ہلاکو خان ہے جس نے دنیا بھر کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ دلہن اپنے پدرِ نسبتی کے احترام میں کھڑی ہوئی تھی یا دنیا کے بہت بڑے فاتح کے رعب اور دبدبے نے اس کو کھڑا کر دیا تھا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ لیکن دلہن نے اس فاتح کے چہرے پر مزاح اور تمسخر کی ہلکی سی جھلک ضرور محسوس کی۔

ہلاکو خان نے دلہن سے پوچھا۔ ”تیرا باپ قیصر کیسا ہے؟“

دلہن نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہیں اور آپ کے حق میں دست بہ دعا رہتے ہیں۔“

ہلاکو خان نے ناگواری سے منہ بنایا، کہا۔ ”لیکن میں نے جس مقصد سے اس رشتے کی بنیاد ڈالی تھی، وہ تو فوت ہوگیا۔“

اسی وقت دوقوز بھی وہاں پہنچ گئی۔ دوقوز نے دلہن کو گلے لگا لیا۔ ہلاکو خان نے دوقوز سے کہا۔ ”دوقوز! ذرا صبر کر، میں اس سے چند ضروری باتیں کر لوں۔“ پھر دلہن کو مخاطب کیا۔ ”میں یہ چاہتا تھا کہ تیرے باپ سے رشتہ و تعلق پیدا کر کے فوجی مدد حاصل کروں اور پھر مسلمانوں کو یروشلم سے نکال کر مصر کو روندتا ہوا افریقا میں داخل ہو جاؤں اور اسلام کو صحارا کے عظیم ریگ زار کے حوالے کر کے واپس آ جاؤں لیکن افسوس کہ تیرا باپ زیادہ عقلمند نہیں ثابت ہوا۔“

دلہن نے سہم کر پوچھا۔ ”دنیا کے عظیم فاتح! میرے باپ نے وہ کون سی غلطی کی ہے جس کا آپ کو ملال ہے؟“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”کیا تیرے باپ نے اپنی دوسری بیٹی کی شادی برقائی خان کے بھتیجے نوگائی سے نہیں کر دی؟ برقائی خان مسلمان ہو چکا ہے اور اس کو مصر کے غلام بادشاہ بیبرس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ میری اس تدبیر کو اس طرح زائل کر دے۔ مصر کا یک چشم غلام بادشاہ بیبرس بہت شریر اور ہشیار آدمی ہے۔ افسوس کہ وہ ابھی تک میرے ہاتھوں سے بچا ہوا ہے۔“

دلہن کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان کچھ دیر خاموش کھڑا رہا، پھر پوچھا۔ ”کیا تیری دوسری بہن نوگائی کی بیوی بن گئی ہے؟“

دلہن نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس وقت میری بہن دلہن بنی ہوئی نوگائی کے محل میں اتر رہی ہوگی۔“

ہلاکو خان نے دوقوز سے کہا۔ ”اب تو دلہن سے باتیں کر۔ میں اپنی تدبیر کو خاک میں ملتے دیکھ کر کچھ دیر سوگ

منالوں گا۔“

ہلاکو خان نے اسی وقت تردی کو طلب کرلیا۔ جب وہ اپنے خیموں کے شہر میں واپس آیا تو مزاج چڑچڑا ہو چکا تھا اور طبیعت پر جھنجلاہٹ طاری تھی۔ اس نے تردی کو بہت ڈانٹا پھٹکارا اور اس کو حکم دیا کہ وہ فوراً برقائی سے ملاقات کرے اور مجوزہ منصوبے پر فی الفور عمل کرے۔

ہلاکو خان نے تردی کو برقائی خان کے نام ایک خط دیا۔ اس خط میں تردی کی سفارش کی گئی تھی اور کہا گیا کہ تردی کے بیوی بچے اس کے حوالے کردیے جائیں۔

اس موقع پر ہلاکو خان نے شیخ الجبال کی طرح تردی کو ایک خنجر بھی دیا۔ ہلاکو خان نے کہا۔ ”یہ خنجر زہر میں بجھا ہوا ہے اور اس کا ایک ہی بھرپور وار برقائی کی ہلاکت کے لیے کافی ہوگا۔“

ہلاکو خان نہیں چاہتا تھا کہ اس کا یہ منصوبہ ناکام اور ناتمام رہے۔ اس نے اپنے منصوبے کی جزئیات اور تفصیلات بھی تردی کو سمجھائیں۔ ہلاکو خان نے کہا۔ ”اور تردی دیکھ! میری باتیں ذرا غور سے سن۔ اگر تو نے اس منصوبے پر اسی طرح عمل کیا جس طرح میں چاہتا ہوں تو یقین ہے کہ تو اس میں کامیاب رہے گا۔ تو برقائی خان کو راہ میں روک کر میرا خط اس کو دے گا پھر جب وہ غافل ہو کر پورے انہماک سے میرا خط پڑھنے لگے تو تو اسی وقت یہ خنجر اس کے سینے یا پہلو میں پیوست کردے گا۔ تو اپنا کام ختم کرتے ہی کسی سے گھوڑا چھین کر فرار ہوجائے گا۔ میں یہاں تیرا انتظار کروں گا۔“

تردی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”لیکن اس طرح میرے بیوی بچے مجھے کس طرح ملیں گے؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”اگر بیوی بچے نہیں بھی ملیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔ یہاں روشنک تیرا انتظار کر رہی ہوگی اور روشنک کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ تو کنوارا ہے کیونکہ تو نے خود اس کو یہ یقین دلا رکھا ہے۔“

تردی نے خنجر پر ایک نظر ڈالی اور ہلاکو خان سے اس کی پیشکش کی وضاحت چاہی۔ ”محترم خان! کیا میں اس پر یقین کرلوں کہ جب میں یہ کام کر کے واپس آؤں گا تو روشنک مجھے مل جائے گی؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”یہ میں وعدہ کر رہا ہوں، ہلاکو خان۔ کیا میں وعدہ خلافی کرسکتا ہوں؟ کیا میں دروغ گوئی کا مرتکب ہوسکتا ہوں؟“

تردی نے سہم کر کہا۔ ”نہیں، ہرگز نہیں۔ تب پھر میں یہ کام ضرور کروں گا اور اس کے عوض روشنک کو حاصل کرلوں گا۔“

جاتے جاتے اس نے ہلاکو خان سے اجازت لی۔ ”محترم خان! کیا میں جانے سے پہلے روشنک سے ملاقات کرسکتا ہوں؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”بالکل ضرور...... تو روشنک سے ملاقات کرسکتا ہے۔“

تردی نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”میری ایک درخواست اور ہے۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

تردی نے جواب دیا۔ ”روشنک کو کسی نے یہ بتادیا تھا کہ میں بیوی بچوں والا ہوں لیکن میں نے اس کی تردید کردی۔ آخر میں ہم دونوں میں یہ طے پاگیا تھا کہ یہ مقدمہ آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اب میں تو برقائی کے پاس جارہا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں بہت ممکن ہے کہ روشنک کسی ذریعے میری اس بات کی تصدیق کرنا چاہے تو روشنک کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں بیوی بچوں والا ہوں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”تو بالکل بے فکر ہو کر چلا جا، روشنک یا کوئی اور تجھ کو جھٹلا نہیں سکے گا۔“

تردی ہلاکو خان کے پاس سے اٹھ کر سیدھا روشنک کے پاس پہنچا۔ اس وقت روشنک کا باپ بھی گھر ہی میں موجود تھا۔

تردی نے اندر آنے کی اجازت چاہی مگر روشنک کے باپ نے اس کو دروازے ہی پر روک دیا اور کہا۔ ”تجھ کو جو بات بھی کرنا ہو یہیں کرلے۔ میں روشنک کو یہیں بلوائے لیتا ہوں۔“ اس کے بعد اس نے روشنک کو آواز دی۔ ”بیٹی روشنک! ذرا یہاں دروازے پر آجا۔ تردی چند باتیں کرنا چاہتا ہے۔“

روشنک فوراً ہی آگئی۔ اس کے باپ نے تردی سے پوچھا۔ ”تجھ کو کیا بات کرنی ہے؟ جلدی کر اور اپنا راستہ لے۔“

تردی نے دونوں ہی کو مخاطب کیا۔ ”میں کچھ دنوں کے لیے باہر جارہا ہوں۔ میری یہ ملاقات عارضی الوداعی ہے۔“

روشنک نے اندر سے پریشان آواز میں پوچھا۔ ”باہر جارہے ہو؟ مگر کہاں اور کیوں...... اور کب تک واپس آجاؤ گے؟“

تردی نے روشنک کے دل میں اپنے لیے دکھ جو محسوس کیا تو بہت خوش ہوا، بولا۔ ”شاید میں ڈیڑھ دو ماہ بعد

واپس آجاؤں گا۔"

روشنک نے پوچھا۔ "اور وہ مقدمہ جو اب ہلاکو خان کے دربار میں پیش ہونے والا تھا، اس کا کیا ہوگا؟"

تردی نے جواب دیا۔ "روشنک! میں تجھ کو اجازت دیتا ہوں کہ تو میری عدم موجودگی میں بھی ہلاکو خان سے میرے جھوٹ سچ کی تصدیق یا تردید کر سکتی ہے۔ ویسے میں اب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی اور میں بیوی بچوں والا ہرگز نہیں۔"

روشنک نے شریر لہجے میں کہا۔ "میں یہ مسئلہ تمہاری موجودگی ہی میں صاف کرنا چاہتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم راہِ فرار اختیار کر رہے ہو؟"

تردی نے جواب دیا۔ "روشنک! میں تجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔ میں سچا ہوں اور میرے سچ کی تصدیق خود ہلاکو خان سے ہو جائے گی۔"

روشنک کے باپ نے کہا۔ "بہرحال اگر تو واقعی جا رہا ہے تو میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے، خدا تجھے واپس نہ لائے۔"

تردی مسکرایا، بولا۔ "خدا مجھے واپس بھی لائے گا اور میں واپس آتے ہی روشنک کو بھی حاصل کر لوں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔"

روشنک اچانک اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے دروازہ کھول دیا تھا اور اب روشنک اور تردی میں چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ تردی کو روشنک کی جرأت اور دلیری نے بہت متاثر کیا۔ بولی۔ "میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

تردی نے شکر آمیز لہجے میں کہا۔ "روشنک! میں تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں، تیرا باپ مجھ کو پسند نہیں کرتا اور جب بھی ملتا ہے دو چار جلی کٹی سنا دیتا ہے مگر تو ہے کہ اس کی کوئی پروا نہیں کرتی اور برابر میری ہمت افزائی اور دل جوئی کرتی رہتی ہے۔"

روشنک نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب وہ جا رہا تھا تو اس نے کئی بار گھوم گھوم کر روشنک کی طرف دیکھا۔ وہ دروازہ کھولے کھڑی اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بحیرۂ کیسپین کے جنوبی ساحل سے گھوم کر مغربی ساحل کے کنارے کنارے داغستان میں داخل ہو گیا۔ اس کا خیال تھا، برقائی کا نامور بھتیجا اس کو دریائے سمور کے کنارے لشکر ڈالے مل جائے گا لیکن اس نے دریائے سمور کے شمالی ساحل پر معمولی سے لشکر کو پڑاؤ ڈالے دیکھا اور نوگائی کی بابت یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ قفقاز کے شمالی دریا تیریک کے اس پار مزے لوٹ رہا ہے۔ یہ خاصا طویل سفر تھا۔ وہ کہیں آرام کیے بغیر دریائے تیریک کے کنارے پہنچ گیا۔ اس نے جنوبی کنارے سے، دوسری طرف ایک عظیم الشان لشکر کو پڑاؤ ڈالے دیکھا اور یہ سوچ کر بہت خوش ہوا کہ یہاں برقائی خان بھی ضرور موجود ہوگا۔

دریا کو عبور کرنا آسان نہیں تھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر نوگائی اور اس کی فوج کا قبضہ تھا اور کوئی بھی کشتی والا نوگائی کی اجازت کے بغیر کسی کو بھی ادھر سے اُدھر یا اُدھر سے ادھر نہیں لا، لے جا سکتا تھا۔ تردی کے لیے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ اس کو دریائے تیریک کو واپسی میں اس طرح عبور کرنا تھا کہ کسی کو اس کے عبور کرنے کی خبر تک نہ ہو سکے اور وہ ادھر سے ادھر بھاگ آئے۔ وہ اس چکر میں دریا کے کنارے دور تک چلا گیا۔ مشرق میں اتنی دور کہ کچھ دور اور چلا جاتا تو بحیرہ کیسپین کا کنارہ نظر آنے لگتا۔ اس نے یہاں سے نوگائی کے لشکر کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں نظر آیا۔ اب وہ دریا کے کنارے کسی کشتی کا منتظر تھا۔ کافی دیر بعد ایک کشتی شمالی ساحل کی طرف آتی دکھائی دی اور جب یہ ساحل پر آکر کھڑی ہوگئی تو اس میں سے پانچ آدمیوں نے ساحل پر کود کر کشتی کو خالی کر دیا۔ اب تردی نے کشتی کے ملاح سے اپنے کام کی بات شروع کر دی۔ اس نے کشتی والے سے دوسرے کنارے پر لے جانے کی اجرت پوچھی اور جب اس کو اس کی اجرت معلوم ہوگئی تو تردی نے کہا۔ "میں تجھ کو تیری منہ مانگی اجرت سے پانچ سات گنا زیادہ اجرت دے سکتا ہوں مگر اس کی ضروری شرط یہ ہے کہ جب میں واپس آؤں تو تجھ کو مجھے فوراً ہی دریا کے اس پار اتارنا ہوگا۔"

بات دونوں میں طے پا گئی تو تردی دریا کے دوسرے کنارے پر اتار دیا گیا۔ وہ یہاں سے مغرب کی طرف نوگائی کے لشکر کی جستجو میں بڑھا، یہاں تک کہ وہ نوگائی کے لشکر میں پہنچ گیا۔ نوگائی اس وقت اپنے لشکر میں موجود نہیں تھا۔ اس نے دوسرے سرداروں سے نوگائی کی بابت پوچھا تو کسی نے بھی تشفی آمیز جواب نہیں دیا لیکن شام سے ذرا پہلے اس کی نوگائی سے ملاقات ہوگئی۔ نوگائی نے اسے گلے لگالیا اور پوچھا۔ "تو، تو وفد کے ساتھ ہلاکو خان کے دربار میں گیا تھا، پھر تو اتنے دنوں کہاں رہا؟"

تردی نے فرضی داستان گھڑ کر سنا دی۔ ''میں گیا تو وفد کے ساتھ ہی تھا مگر وہ سرزمین مجھے بہت اچھی لگی۔ میں کسی کو لیے بغیر اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا کہ کسی نے مجھے قید کرلیا۔ میں نے قید خانے میں ہاتھ پاؤں مارے مگر ناکام رہا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے کہ اباقا خان کی شادی کی خوشی میں جب قیدی رہا کیے گئے تو ان رہا ہونے والوں میں میں بھی شامل تھا۔''

نوگائی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''تب تو تُو نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور اس منصوبے کا کیا ہوا جس کے ماتحت تجھ کو بھیجا گیا تھا؟''

تردی نے نہایت افسوس سے جواب دیا۔ ''جناب! آپ عجیب آدمی ہیں۔ جب میں آپ کو یہ بتارہا ہوں کہ میں نے اپنا پورا وقت قید خانے میں گزار دیا تو آپ کا مجھ سے یہ پوچھنا کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ اس منصوبے کا کیا ہوا جس کے ماتحت مجھ کو وہاں بھیجا گیا تھا۔''

نوگائی نے معذرت کرلی۔

تردی نے پوچھا۔ ''خان محترم برقائی خان ان دنوں کہاں تشریف فرما ہیں؟''

نوگائی نے جواب دیا۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں کیونکہ چچا اپنے منصوبوں سے ہر ایک کو لاعلم رکھتے ہیں۔''

تردی نے کہا۔ ''لیکن میں ان سے ہر قیمت پر ملنا چاہتا ہوں۔''

نوگائی نے حیرت سے پوچھا۔ ''تو چچا برقائی خان سے ہر قیمت پر ملاقات کرنا چاہتا ہے، خوب! مگر کیوں؟ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''میں اپنی داستانِ ناکامی انہیں سنانا چاہتا ہوں اور ان کی اجازت سے میں ایک بار پھر ان لوگوں میں واپس جانا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھے... خوامخواہ اتنے دنوں قید میں رکھا۔''

نوگائی نے کہا۔ ''تب پھر تو ہمارے پاس رہ، کسی دن یہیں چچا برقائی سے ملاقات ہوجائے گی۔''

تردی نے پوچھا۔ ''کچھ پتا ہے ان دنوں میرے بیوی بچے کہاں ہیں؟''

نوگائی نے جواب دیا۔ ''برقائی چچا کی قید میں۔''

تردی، نوگائی کی اجازت کے بغیر برقائی کے پاس نہیں جاسکتا تھا۔ اسے برقائی کے انتظار میں بیس دن ضائع کرنا پڑے۔ پھر معلوم ہوا برقائی آرہا ہے۔ برقائی کو کچھ پریشان کن خبریں ملی تھیں اور وہ ان کے سدباب کے لیے دریائے تیریک کے کنارے چلا آیا۔ یہاں نوگائی نے برقائی کو مطلع کیا کہ تردی واپس آچکا ہے۔

تردی کو اس بات کا انتظار تھا کہ برقائی سیر سپاٹے یا کسی سے ملنے کے لیے پڑاؤ سے سفر کرے تو وہ اس پر حملہ کرکے اس کا کام تمام کردے لیکن تردی کو کئی دن تک اس بات کا موقع نہیں مل سکا۔

ایک دن اس نے علی الصباح برقائی خان کو اپنے گھوڑے پر سوار دریائے تیریک کے ساحل کی طرف جاتے دیکھا۔ اس وقت برقائی کے ساتھ پانچ آدمی اور تھے۔ تردی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور تیزی سے برقائی کی طرف بڑھا۔ تردی گڑگڑا گڑگڑا کر کہہ رہا تھا۔ ''زریں خیل کے خان! میں آپ کے چچا کے بیٹے ہلاکو خان کا ایک سفارشی خط لے کر آیا ہوں۔''

برقائی خان اسے پہچان نہیں سکا، پوچھا۔ ''مگر تو ہے کون؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''تردی، وہی تردی جو گھوڑوں کی چوری میں پکڑا گیا تھا اور اس کے بیوی بچوں کو اس سے چھین لیا گیا تھا۔''

برقائی خان مسکرایا۔ ''اچھا تو، تُو تردی ہے مگر مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے تیرے سپرد کوئی کام کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟''

تردی نے برقائی کے پاس پہنچنے کی کوشش کی مگر برقائی کے آدمیوں نے اسے روک لیا اور کہا۔ ''لا وہ سفارشی خط کہاں ہے؟ ہم خان معظم کو دے دیں گے۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''مگر یہ خط میں خود اپنے ہاتھ سے دینا چاہتا ہوں۔''

برقائی کے آدمیوں نے تردی کی تلاشی لی اور اس کے خنجر کو لے کر اپنے قبضے میں کرلیا اور تردی سے پوچھا۔ ''یہ خنجر کیسا ہے تیرے پاس؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''اپنی حفاظت کے لیے، کیا خنجر رکھنا جرم ہے؟''

برقائی خان نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ ''اس کا خنجر اسے واپس کردو اور سفارشی خط مجھے دو۔''

تردی کو اس کا خنجر واپس مل گیا اور سفارشی خط برقائی کو دے دیا گیا۔

برقائی خان نے ہلاکو کا خط کھولا اور اسے پڑھنے لگا، تردی برقائی کے آدمیوں میں گھر چکا تھا۔ برقائی خان خط پڑھتا رہا۔ جب خط پڑھ چکا تو پوچھا۔ ''تردی! کیا تو یہ سمجھتا

ہے کہ میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا؟ میں نے بھی تیرے سپرد ایک کام کیا تھا، کیا تو نے میرا وہ کام کر دیا؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''جناب! میں وہاں بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ بس جس طرح نکلا ہوں اس کی قید سے کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ آخر میں ہلاکو خان مجھ پر بہت مہربان ہو گیا تھا۔''

برقائی نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''اس سے کہو میں یہاں راہ میں کوئی بات نہیں کروں گا، یہ میرے خیمے میں آئے۔''

تردی نے سوچا کیوں نہ برقائی پر خنجر سے وار کر دیا جائے لیکن اس نے برقائی کے پانچوں آدمیوں کو مستعد اور چاق و چوبند دیکھا۔ برقائی آگے بڑھ گیا اور تردی مایوس اور ناکام اپنی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

تردی نے اس کام کو بے حد آسان سمجھ رکھا تھا مگر جب عملاً اس کا وقت آیا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

دوسرے دن کے انتظار میں اس کو وقت گزارنا دوبھر ہو گیا۔ وہ ہلاکو خان کا سفارشی خط پڑھوا چکا تھا۔ اب وہ کس چیز میں برقائی کو محو رکھ کر وار کرے گا، اس کا بیشتر وقت اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ دوسرے دن جب وہ برقائی کے خیمے میں پہنچا تو اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ برقائی کو دو چار وار میں بھی ہلاک کر دینا بالکل آسان نہیں تھا اور اگر وہ برقائی کو ہلاک کر بھی دیتا تو فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں اور وہ بھاگ کر ہلاکو خان کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔

برقائی نے تردی کو دس قدم دور کھڑا رکھا اور پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ ہلاکو خان ہم پر حملہ کرنے کی سوچ رہا ہے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''میں نے ایسے آثار نہیں دیکھے۔''

برقائی نے تردی کو گھور کر دیکھا اور درشت لہجے میں پوچھا۔ ''تو ہلاکو خان کے پاس میرے لیے کوئی منصوبہ لے کر گیا تھا یا اپنے لیے سفارشی خط لینے؟''

تردی کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ وہ گڑگڑانے لگا۔ ''معزز خان! ہلاکو خان نے خود ہی سفارشی خط لکھ کر دے دیا۔ حالانکہ میں نے اس سے کسی قسم کی درخواست نہیں کی تھی۔''

برقائی نے چونکا دینے والا سوال کیا۔ ''تیرا وہ خنجر کہاں ہے جو کل تیری کمر سے اڑسا ہوا تھا؟''

تردی نے مردہ آواز میں جواب دیا۔ ''وہ اس وقت بھی میری کمر میں اڑسا ہوا ہے۔''

برقائی نے اس خنجر کو طلب کیا۔ ''وہ میرے حوالے کر دے کیونکہ ہتھیار رکھنا سپاہیوں کا کام ہے اور تو محض چور ہے۔''

تردی نے خنجر نکال کر برقائی خان کے حوالے کر دیا، بولا۔ ''خان معظم! میں ایک شریف انسان ہوں، مجھے چور نہ کہیے کیونکہ میں نے آج تک چوری نہیں کی۔ میری بدقسمتی کہ جب مجھے لوٹا گیا تو میں اس لائق نہیں تھا کہ اس کی اطلاع آپ کو دیتا اور جب میں نے اپنا نقصان پورا کیا تو مجھے چور کہہ کر سزا دے دی گئی۔''

برقائی نے شاید اس کی باتیں سنی ہی نہیں، اس نے اپنے ایک سردار کو آواز دی۔ ''قائدو! اس خنجر کو دیکھ اور بتا کہ اس میں کیا خاص بات ہے؟''

قائدو نے کچھ دیر خنجر کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور جواب دیا۔ ''خان معظم! خنجر زہر میں بجھا ہوا ہے اور یہ اس قسم کا خنجر ہے جو الموط کے شیخ الجبال اپنے فدائیوں کو دیا کرتے تھے۔''

برقائی نے تردی سے پوچھا۔ ''صاف صاف بتا تیرا کیا منصوبہ تھا؟''

تردی کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت منڈلاتی نظر آئی۔ گھگیا کر جواب دیا۔ ''میرا کوئی منصوبہ نہیں تھا، خان معظم! مجھ پر بلا وجہ شبہ نہ کیجیے۔''

برقائی نے تردی کا خنجر اسے واپس دلا دیا اور کہا۔ ''اگر تو نے کسی کے شہ دینے پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں اس خنجر سے ہلاک کیا جا سکتا ہوں تو یہ تیری اور اس شہ دینے والے کی بڑی بھول ہو گی۔''

تردی لاجواب اور بے بس کھڑا اپنی بدقسمتی اور کم ہمتی کو کوس رہا تھا۔ اس کا خنجر اسے واپس مل چکا تھا۔ برقائی خان نے حکم دیا۔ ''تردی کو آزاد رکھا جائے اور اس کو اس بات کی اجازت ہے کہ جہاں چاہے رہے۔ رہ گئے اس کے بیوی بچے، تو ان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

تردی کو برقائی کے خیمے سے نکال دیا گیا۔ برقائی کچھ دیر بعد باہر نکلا اور نوگائی سے اس کے لشکر میں ملاقات کی۔ اس نے اپنے بھتیجے کو سمجھایا۔ ''نوگائی! ابھی جنگ کا کوئی امکان نہیں۔ اباقا خان اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوگا، تو بھی اپنی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منا۔''

نوگائی نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا خیال ہے ہلاکو خان کو حملے کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا اور مجھے میرے مخبروں نے بتایا ہے کہ ہلاکو خان کے ہراول دستے

بحیرۂ خزر کے کناروں پر حرکت کر رہے ہیں اور قفقاز کے گھنے جنگلات میں راستے بناتے پھر رہے ہیں۔''

برقائی نے کہا۔ ''میں اپنے شہر واپس جا رہا ہوں۔ میں ہلاکو خان کے خلاف سمرقند و بخارا کے پُرجوش مسلمانوں کو بھرتی کر رہا ہوں۔ یہ مسلمان اس معرکے کو جہاد سمجھ کر سر کریں گے۔''

برقائی واپس چلا گیا۔ نوگائی کے عساکر میلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے تردی کو تلاش کروا کے اپنے خیمے میں بلوایا حالانکہ برقائی نے نوگائی کو تردی کی بابت یہ بتا دیا تھا کہ وہ ہلاکو خان یا کسی شہزادے کے ہاتھ بک چکا ہے۔ اس لیے وہ قابلِ اعتبار نہیں رہا اور وہ ہلاکو خان اور اس کے عزائم کے بارے میں جو کچھ بھی بتائے گا، وہ یقین کے لائق نہیں ہوگا مگر نوگائی کا خیال تھا کہ تردی سے بہت سے سوالات کر کے کام کی باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔

تردی اپنی ناکامی پر بہت زیادہ افسردہ تھا اور یہ افسردگی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ نوگائی نے پوچھا۔ ''تردی! میں دیکھ رہا ہوں کہ تو آج کل بہت زیادہ افسردہ ہے، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

تردی نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ''نوگائی بہادر! میں اپنے بیوی بچوں کی جدائی میں پریشان ہو رہا ہوں۔''

نوگائی نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے تیرے پاس سے ایک ایسا خنجر برآمد ہوا جو زہر میں بجھا ہوا تھا اور اس قسم کے خنجر شیخ الجبال اپنے فدائیوں کو دیا کرتا تھا۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ خنجر تبریز میں خریدا تھا اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ زہر میں بجھا ہوا تھا یا شیخ الجبال کے فدائیوں جیسا خنجر تھا۔''

نوگائی نے پوچھا۔ ''تردی! مجھے ایک بات اور بتا۔ ہلاکو خان تک رسائی حاصل کرنا آسان بات نہیں اور تو نے وہاں تک رسائی بھی حاصل کر لی اور چچا برقائی خان کے نام سفارشی خط بھی حاصل کر لیا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ دشوار کام کس طرح آسان ہوا؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''جب میں ہلاکو خان کی قید میں تھا تو میں نے قید خانے کے عملے کو رو رو کر اپنے بیوی بچوں کی جدائی کی داستان سنائی۔ ان لوگوں نے میری پُردرد داستان کسی طرح ہلاکو خان تک پہنچا دی اور معلوم نہیں کیوں ہلاکو خان کو مجھ پر رحم آ گیا۔ اس نے مجھے بلایا اور بڑی تسلیاں دیں اور ایک سفارشی خط بھی میرے حوالے کر دیا۔''

نوگائی تردی کو کہیں سے بھی پکڑ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک نیا سوال کر دیا۔ ''ان دنوں ہلاکو خان کی جنگی تیاریاں کس حال میں ہیں؟ کیا وہ مصر کے خلاف لشکر کشی کا ارادہ رکھتا ہے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''ہاں! وہ بیبرس کو تباہ و برباد کر دینے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔''

نوگائی نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تو ہلاکو خان تجھ سے اتنا بے تکلف ہو گیا تھا کہ اپنے اس ارادے کا ذکر بھی تجھ سے کر دیا؟''

تردی نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''جب میں دربار میں کھڑا تھا تو وہاں اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

نوگائی نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے تم واپس بھی جاؤ گے۔''

تردی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ آپ کو کس نے بتایا؟''

نوگائی نے جواب دیا۔ ''اس ملاح نے جس کو تو نے واپسی کا پیشگی کرایہ ادا کر دیا ہے۔''

تردی نے کہا۔ ''ایسا میں نے اس لیے کیا تھا کہ مجھے شبہ تھا کہ میں برقائی خان کے دربار سے بھگا دیا جاؤں گا۔''

نوگائی نے پھر ایک سوال کیا۔ ''وہاں تو نے کتنے دوست بنائے؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''ایک بھی نہیں کیونکہ وہ لوگ اس لائق نہیں کہ انہیں دوست بنایا جائے۔''

نوگائی نے کہا۔ ''تردی! مجھے کئی آنے جانے والوں نے بتایا کہ تو وہاں ایک دن بھی قید خانے میں نہیں رہا۔''

تردی چیخا۔ ''یہ مجھ پر اتہام ہے، تہمت ہے، الزام تراشی ہے، بہتان ہے۔''

نوگائی نے سوچا۔ تردی آدمی بہت پکا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ اس سے کون سا ایسا سوال کرے جس سے وہ گھر جائے۔ اس نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے مراغہ بڑی حسین جگہ ہے اور یہاں کچے پکے مکانات کے ساتھ ہی خیموں کا بھی ایک بہت بڑا شہر آباد ہے۔ تو نے مراغہ کو کیسا پایا؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''ہاں، وہاں خیموں کا شہر الگ اور کچے پکے مکانات کا شہر الگ آباد ہے اور شہر میں ہر مذہب و ملت کے لوگ آزادی سے رہ بس رہے ہیں۔''

نوگائی نے تردی کو چکر میں لے لیا تھا، اس جواب نے نوگائی کو بتا دیا تھا کہ تردی نے مراغہ کو آزادی سے گھوم پھر کر خوب اچھی طرح دیکھا ہے۔

وہ ابھی سوال جواب ہی میں مشغول تھا کہ اس نے دریائے تیریک کی طرف سے شور وغل کی آوازیں سنیں۔ وہ

بڑی تیزی سے باہر نکلا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لاتعداد کشتیاں دریا کی سطح پر تیرتی چلی آرہی ہیں۔ اس کے علاوہ ساحل پر بھی فوجیں اتر چکی تھیں۔ نوگائی پھرتی سے اٹھا اور نعرہ بلند کیا۔ ''دھوکا۔ ہلاکو خان نے ہم سے دھوکا کیا اور اس کے عساکر ہماری حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔''

طبلِ جنگ بج گیا اور برقائی کی سپاہ خیموں سے نکل نکل کر میدان میں پھیلنے لگی۔

نوگائی نے نہایت پھرتی سے قلب کو پیچھے ہٹایا اور اسے میلوں پیچھے ہٹالے گیا۔ وہ جس تیزی سے پیچھے ہٹا تھا، اس سے ہلاکو خان کی سپاہ کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ اس اچانک حملے کی تاب نہ لاکر بھاگ رہا ہے۔ ہلاکو خان کے عساکر کی قیادت شہزادہ اباقا خان کر رہا تھا۔ اس کے حوصلے بلند تھے۔

نوگائی کا قلب تو راہِ فرار اختیار کر چکا تھا اور میمنہ میسرہ میلوں میں پھیلے ہوئے جنگلات میں غائب ہو چکا تھا۔ نوگائی کے خیمے خالی پڑے تھے۔ اباقا خان نے ان خیموں پر قبضہ کر لیا اور اپنی افواج کو دور دور تک پھیلا کر مورچابندی شروع کر دی۔ وہ حیران تھا کہ برقائی خان کے عساکر کو آخر ہو کیا گیا ہے جو ان کے اچانک حملے کی تاب نہ لاکر فرار ہو گیا۔ اب اباقا خان اور اس کی افواج کے سامنے برقائی خان کا وسیع و عریض ملک تھا۔ مشرق میں کچھ ہی فاصلے پر استراخان تھا جو اس کا دوسرا ہدف بن سکتا تھا۔

نوگائی دائیں بائیں میلوں کا چکر لگا کے دریائے تیریک کے دوسرے کنارے اتر گیا اور جنوبی ساحل پر قبضہ جمالیا۔ گویا اب اباقا خان اتنی آسانی سے واپس نہیں جاسکتا تھا۔ دوسری طرف اس کے میمنہ اور میسرہ نے سمٹنا شروع کر دیا، نہایت پھرتی اور تیزی سے۔ جب یہ دونوں بازو دشمن کو گھیرے میں لے چکے تھے، اسی وقت قلب نے پلٹ کر اباقا کی افواج پر حملہ کر دیا۔ اب اباقا اور اس کی سپاہ ہر طرف سے گھر چکی تھی اور نوگائی اپنے دائرے کو تنگ کرتا چلا گیا۔

اباقا خان کو اپنی زندگی میں ایسے شاطروں سے پالا نہیں پڑا تھا۔ اس نے اپنی سپاہ کو لڑ مرنے کی تلقین کی اور خود بھی نوگائی کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ اباقا خان کے لشکر کا بڑی تیزی سے صفایا ہونے لگا۔ اس نے حکم دیا کہ بسرعت دریا کو عبور کر کے جنوبی ساحل پر مورچابندی کی جائے۔ نوگائی کی سپاہ نے دریا میں اتر جانے والی فوج کو تیروں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ ہلاکو خان کے سپاہیوں نے بھی تیروں کی بارش کر دی لیکن اسی وقت ان پر جنوبی ساحل سے بھی تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اب اس مفرور سپاہ میں مقابلے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ انہوں نے دریا میں کودنا شروع کر دیا لیکن نوگائی نے انہیں بھی نہیں بخشا اور انہوں نے جب بھی پانی پر سر اٹھایا۔ نوگائی کی فوج نے تیروں سے انہیں چھلنی کر دیا۔

اباقا خان کو شکستِ فاش ہو چکی تھی، وہ بمشکل اپنی جان بچا کر مراغہ چلا گیا۔

ہلاکو خان کو جب اس شکست کا علم ہوا تو گویا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس نے اباقا خان سے کہا۔ ''کیا خوش طالعی ہم سے روٹھ گئی۔ کیا مقدر نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا...... اب کیا ہوگا؟''

تردی نے فرار ہو کر ہلاکو خان کے پاس پناہ لی۔ ہلاکو خان نے تردی سے پوچھا۔ ''کیا تو نے برقائی خان کو ٹھکانے لگا دیا؟''

تردی نے جواب دیا۔ ''نہیں، کیونکہ برقائی خان نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں ایک بار پھر جاؤں گا اس کے پاس۔''

ہلاکو خان بہت اداس اور دل شکستہ تھا۔ اس نے تردی سے کہا۔ ''افسوس کہ تو ایک معمولی کام بھی نہیں انجام دے سکا۔''

تردی نے جواب دیا۔ ''جنابِ والا! برقائی خان کو ہلاک کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔''

ہلاکو خان اتنا اداس تھا کہ اس کے منہ سے صاف آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے تردی کو ایک طرف بٹھا دیا اور پوچھا۔ ''میں نے تجھ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کرتا مگر افسوس کہ روشنک تیری قسمت ہی میں نہیں۔''

تردی نے روتے ہوئے کہا۔ ''خان محترم! میں انتہائی بدقسمت انسان ہوں، میں نے جس کو چاہا وہ مجھ سے دور ہو گیا۔''

ہلاکو خان نے تالی بجائی تو دو کنیزوں نے جھک کر ہلاکو خان کو سلام کیا۔

ہلاکو خان نے کہا۔ ''روشنک کو حاضر کیا جائے۔''

تھوڑی دیر بعد روشنک کو حاضر کر دیا گیا۔ وہ کچھ کمزور ہو چکی تھی، اس نے ہلاکو خان کے سامنے تردی کو دیکھا تو تلملا کر رہ گئی۔

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، روشنک؟'' پھر تردی کی طرف اشارہ کیا، پوچھا۔ ''کیا تو اس شخص کو جانتی ہے؟''

روشنک نے آنکھیں بند کرلیں اور ایسا لگا گویا وہاں ارواحِ خبیثہ کا قبضہ ہوچکا ہے، بولی۔ ''ہاں، میں اس کو کچھ کچھ پہچانتی ہوں۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''ہم نے اس کے سپرد ایک کام کیا تھا۔ اگر یہ میرا وہ کام کردیتا تو میں تجھ کو اس کے حوالے کردیتا مگر یہ نہیں کرسکا۔ یعنی یہ تجھ کو نہیں حاصل کرسکا۔''

روشنک آنکھیں بند کیے کچھ دیر کھڑی رہی۔ ترودی کو اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔

یہ رات کا وقت تھا۔ اچانک باہر سے شوروغل کی آوازیں آنے لگیں۔ ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ''یہ کون گستاخ ہیں؟ یہ شوروغل کیسا؟ انہیں پکڑ کر قتل کردیا جائے۔''

تھوڑی دیر بعد اس کے خدمت گزاروں نے ہلاکو خان کو ایک عجیب وحشت اثر خبر سنائی۔ ہلاکو خان کو بتایا گیا۔ ''محترم ایل خان! آسمان پر ایک دم دار ستارہ نمودار ہوا ہے۔ اس ستارے کی تیز روشنی دیکھنے والوں کے دلوں پر خوف اور دہشت طاری کررہی ہے اور لوگ ڈر کر شوروغل کر رہے ہیں۔''

ہلاکو خان نے آہستہ سے کہا۔ ''سرخ دم دار ستارہ۔ کیا مطلب؟''

خدمت گار نے عرض کیا۔ ''جی حضورِ والا! تیز سرخ روشنی والا منحوس دم دار ستارہ۔''

اس وقت ہلاکو خان نے شراب پی رکھی تھی۔ اس نے روشنک سے کہا۔ ''میں اٹھنا چاہتا ہوں، مجھے سہارا دے۔''

روشنک نے اس کو سہارا دیا۔ ہلاکو خان اپنے خیمے سے باہر نکلا اور پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ تیز سرخ روشنی والا دم دار ستارہ؟''

باہر اباقا خان بھی موجود تھا۔ اس نے ہلاکو خان کو مشرقی افق کی طرف اشارہ کرکے بتایا۔ ''ادھر دیکھیے، وہ رہا دم دار ستارہ۔''

ہلاکو خان نے دیکھا۔ ایک سرخ روشنی والا دم دار ستارہ جس کا نچلا حصہ جھاڑو کی طرح سمٹا سکڑا تھا اور اوپری حصہ جھاڑو کے تنکوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ سطح سرخ تنکوں کی طرح نظر آرہی تھی۔ ہلاکو خان اسے دیکھ کر سہم گیا۔ وہ اسی جگہ جہاں کھڑا تھا سجدے میں گر گیا، بولا۔ ''او جاودانی نیلے آسمان رحم...... یہ کس بات کی نشانی ہے، مجھے اس سے مطلع فرمایا جائے۔''

قبائلی شامان (ساحر) ہلاکو خان کے آس پاس جمع ہوگئے۔ سجدے سے سر اٹھا کر اس نے شامانوں سے پوچھا۔

''محترم شامانو! کیا تم بتا سکتے ہو اس میں کیا راز پوشیدہ ہے؟''

ایک شامان نے جواب دیا۔ ''قراقرم کے جن قبائل کو خان اعظم نے جھاڑو کے تنکوں کی طرح یکجا اور متحد کردیا تھا، وہ عنقریب انتشار کے شکار ہوجائیں گے۔''

ہلاکو خان نے مسلمان نجومیوں سے پوچھا۔ ''اور اس سلسلے میں تمہارا علم کیا کہتا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ہمارا علم ہمیں بتاتا ہے کہ مشرق کا تاجدار اپنے جھگڑوں میں پھنس کر مزید فتوحات سے محروم ہوجائے گا اور مغربی ممالک مشرقی تاجدار کا کوئی ساتھ نہ دیں گے۔''

ہلاکو خان بڑی دیر تک سجدے میں سر ڈالے پڑا رہا۔

اباقا خان نے درخواست کی۔ ''اب آپ اپنے خیمے میں تشریف لے چلیں۔''

ہلاکو خان نے ولی عہد شہزادے سے کہا۔ ''مجھے سہارا دے، معلوم نہیں کیوں طاقت سلب ہوتی چلی جارہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کیا ہوتا جارہا ہے۔''

اباقا خان نے محسوس کیا کہ ہلاکو خان بے حد کمزور ہوچکا ہے۔ اس نے باپ کو خیمے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ اسی عالم میں اس نے اپنی چہیتی بیوی دوقوز کو طلب کیا۔ دوقوز اس کو صاحب فراش دیکھ کر پریشان ہوگئی، پوچھا۔ ''میرے آقا! یہ آپ کو کیا ہوگیا؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''آسمان کا یہ دم دار ستارہ میرے لیے جو پیغام بھی لایا ہو، میں اس کو خوش آمدید کہوں گا۔''

اس کے بعد ہلاکو خان کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ نصیرالدین طوسی نازک حالات کا اندازہ لگا کر چند دنوں کے لیے کہیں اور چلا گیا۔

اطبا نے ہلاکو خان کا علاج شروع کردیا۔ اس کو کیا مرض ہوگیا ہے، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پانچویں دن، رات کے پچھلے پہر ہلاکو خان نے دوقوز سے پوچھا۔ ''کیا وہ دم دار خونی ستارہ آج بھی آسمان پر موجود ہے؟''

''میرے آقا! وہ دم دار سرخ خونی ستارہ اس وقت بھی آسمان پر موجود ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

ہلاکو خان دوقوز اور روشنک کے سہارے باہر آیا اور مشرقی افق پر طلوع ہونے والے خونی ستارے نے ہلاکو خان کو ایک بار پھر خوف زدہ کردیا۔ اس نے اپنا سینہ پکڑ لیا اور کراہتے ہوئے کہا۔ ''کوئی میرا دل مسل رہا ہے۔''

دوقوز نے اسے تسلی دی۔ ''میرے آقا! یہ آپ کا

وہم ہے۔"

ہلاکو خان نے بڑے کرب سے کہا۔ "نہیں دوقوز! یہ بات نہیں۔ کوئی میرا دل مسل رہا ہے۔ یہ خونی ستارہ..... دیکھو اس کی دو خونی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ آہ! ان دونوں آنکھوں نے میرا سارا خون چوس ڈالا اور ان کی تیزی میرے دل میں پیوست ہوتی جارہی ہے۔"

دوقوز رونے لگی۔ "آپ بالکل ٹھیک ہیں میرے آقا!"

لیکن ہلاکو خان کی طبیعت گرتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہوکر زمین پر گر گیا۔ دوقوز رونے لگی اور چند منگول سرداروں نے اپنے آقا اور فاتح کو اٹھا کر خیمے میں پہنچا دیا۔

ہلاکو خان کافی دیر تک بے ہوش رہا۔ روشنک سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس کو ہوش آیا تو اس نے پوچھا۔ "نصیر الدین طوسی کہاں ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "اس نے آپ کے لیے ایک شاندار رصدگاہ تعمیر کی ہے اور اس کا نام رکھا ہے رصدگاہ ایل خانی۔ وہ چند اور بڑے بڑے کام آپ کے نام پر کرنا چاہتا ہے اور اسی سلسلے میں وہ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔"

ہلاکو خان نے وصیت کی۔ "اگر میں مرجاؤں تو نصیر الدین طوسی کو میرے ساتھ دفن نہ کیا جائے کیونکہ میرے نام کو زندہ رکھنے کے لیے اسے کئی بڑے کام انجام دینا ہیں۔"

دوقوز رونے لگی۔ "میرے آقا! ایسی باتیں نہ کیجیے۔"

ہلاکو خان نے اسے تسلی دی۔ "اگر میں مرگیا تو تجھ کو بہت جلد بلوالوں گا۔" پھر ولی عہد اباقا خان کو طلب کیا اور اسے ہدایت کی۔ "اگر تیرا بس چلے تو مصر کے بیبرس کو ہرگز معاف نہ کرنا اور برقائی خان سے ہوشیار رہنا۔"

ہلاکو خان مرگیا۔ سرخ دم دار موت کا ستارہ اسے آسمانی دریچوں میں لے کر غائب ہوگیا۔ مراغہ ہی میں اس کے لیے ایک شاندار تہ خانہ تعمیر کرایا گیا۔ ایک وسیع و عریض کمرے جیسا تہ خانہ۔ اس تہ خانے میں ہلاکو خان کی لاش رکھ دی گئی۔ ہلاکو خان کی خدمت اور دل بستگی کی خاطر بارہ کنیزیں بھی تہ خانے میں پہنچا دی گئیں اور اس کو باہر سے بند کردیا گیا۔ کنیزوں کے رونے چیخنے کی آوازیں اس وقت تک سنائی دیتی رہیں جب تک وہ بالکل بند نہیں ہوگیا۔

تردی کا سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ اب مراغہ میں اس کا کون رہ گیا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت جانی کہ واپس جاکر برقائی خان کی خوشامد کرے۔

وہ قفقاز کی سرسبز وادیوں کو عبور کرکے جب دریائے تیریک کے اس پار پہنچا تو برقائی اور نوگائی کو یہاں موجود پایا۔ اس نے عاجزی اور نیازمندی سے برقائی کے خیمے میں حاضری دی اور قدموں میں گر کر رونے لگا۔

برقائی نے پوچھا۔ "کیا ہلاکو خان مرگیا؟"

تردی نے جواب دیا۔ "ہاں میرے آقا...... میرے بادشاہ! وہ مرگیا۔"

برقائی خان نے اپنے بھتیجے نوگائی سے کہا۔ "تردی کو بتا کہ ہلاکو خان کس طرح مرا؟"

نوگائی تھوڑی دیر غائب رہ کر جب واپس آیا تو ہلاکو خان کی داشتہ روشنک اور اس کا باپ دونوں اس کے ساتھ تھے۔ تردی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، بے اختیار بولا۔ "روشنک، یہ تم! مگر تم یہاں کہاں؟"

نوگائی نے کہا۔ "ہلاکو خان حسین لڑکیوں کے ذریعے میرے عم محترم کو ہلاک کرنا چاہتا تھا، زہر دے کر۔ مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ یہی خطرناک اور جان لیوا حربہ اس پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔"

برقائی خان مسکرانے لگا اور تردی سے کہا۔ "تیرے بیوی بچے موجود ہیں۔ تیری سزا معاف کردی گئی۔ بیوی بچوں کو لے کر جہاں جانا چاہے، چلا جا لیکن خبردار اب گھوڑے نہ چرانا۔"

نوگائی نے اس کے بیوی بچوں کو بھی اس کے سامنے لاکھڑا کیا۔ روشنک نے پہلے تو تردی کو غصے اور نفرت سے دیکھا اس کے بعد بیوی بچوں کو دیکھنے لگی۔

تردی نظریں جھکائے بیوی بچوں کے ساتھ برقائی خان کے خیمے سے باہر نکلا اور اپنے آبائی گاؤں روانہ ہوگیا۔

ماخذات

تاریخ تمدنِ اسلام، جورجی زیدان۔ الفہرست، ابنِ ندیم۔ طبقاتِ ناصری، منہاج سراج۔ الفخری، ابن طباطبا۔ تاریخِ اسلام، شاہ معین الدین ندوی۔ تاریخ الخلفا، مولانا جلال الدین سیوطی



میری بات توسنو!

طاہر جاوید مغل

بعض اوقات کسی کمزور پر "دو دڑے اور" والی کہاوت بالکل درست بیٹھتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی منظر تھا جس کا پس منظر انتہائی غم ناک اور دل توڑ دینے والا تھا مگر کیا کہیے کہ نظر کا فریب عقل منداور دردمند دل رکھنے والوں کو بھی اتنا ہی سفاک بنا دیتا ہے جس پر انسان بعد میں چاہے جتنا بھی پشیمان ہو مگر اس گناہ کا کفارہ ادا نہیں کرسکتا جس کا وہ خطاوار ہو چکا ہو۔

ایک کمزور انسان کی مظلومیت اور اغواکاروں کی سفاکی کا احوال

کالونی کے پارک میں وہ شخص آج پھر چہل قدمی کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی عمر پچاس پچپن سال رہی ہوگی۔ اس کے کپڑے پرانے لیکن صاف ستھرے ہوتے تھے، شیو بڑھی ہوئی، بال لمبے لیکن منتشر۔ ہاتھ میں عموماً ایک سفید رنگ کا شاپر ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر بیگم صغراں کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ انہوں نے بے تاب نظروں سے اپنے چار سالہ پوتے حمزہ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ حمزہ پارک کی سلائڈ کے قریب دیگر بچوں کے ساتھ کھڑا تھا اور اپنی باری کا انتظار کر

رہا تھا۔ بیگم صغراں نے جلدی سے اپنی چادر سر پر اوڑھی اور حمزہ کو گھر لانے کے لیے پارک کا رخ کیا۔ سیڑھیوں کے قریب والی اس کھڑکی سے پارک کا منظر صاف نظر آتا تھا اور کم و بیش ایک سال سے بیگم حمزہ کا یہ معمول تھا کہ جب ان کا پوتا حمزہ پارک میں کھیلنے جاتا تو وہ اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس کو دیکھتی رہتیں۔ ان کی نگاہیں جیسے حمزہ کے ساتھ چپکی رہتی تھیں۔ حمزہ کے ساتھ ان کی محبت تھی ہی ایسی۔

بیگم صغراں جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت ان کا بیٹا ارسلان بہ مشکل دو سال کا ہوگا۔ ان کے شوہر شاہ عالمی کی ایک دکان پر سیل مین تھے۔ ایک صبح وہ اپنے معمول کے مطابق اپنی موٹر سائیکل پر کام پر گئے اور پھر کبھی واپس نہ لوٹے۔ ایک بس ڈرائیور کی غفلت اور جلد بازی نے ان کی جان لے لی۔ اس حادثے کے بعد بیگم صغراں کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ زندگی کی تمام مشکلات اور سختیاں جھیل کر انہوں نے نہ صرف ارسلان کو پال پوس کر جوان کیا اور تعلیم دلائی بلکہ اس کی شادی بھی کر دی...... آج کل ارسلان ملازمت کے سلسلے میں کویت میں مقیم تھا۔ بیگم صغراں اپنی بہو شازیہ اور پوتے حمزہ کے ساتھ اس خوب صورت فلیٹ میں رہائش پذیر تھیں۔ ان کی ساری محبتیں جیسے اپنے پوتے میں سمٹ آئی تھیں، وہ ان کی زندگی کا محور و مرکز تھا اور وہ اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔ سب لوگ انہیں بڑی آپا کہہ کر بلاتے تھے۔

اس اجنبی کو پارک میں دیکھنے کے بعد وہ حمزہ کو گھر لے آئیں۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ان کی بہو شازیہ نے کہا۔ ”کیا ہوا امی! آپ حمزہ کو واپس لے آئیں؟“

”وہ آج پھر پارک میں ہے۔“ بڑی آپا نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شازیہ کھڑکی کی طرف گئی۔ پارک میں جھانکا پھر واپس آ کر اپنی ساس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”امی! آپ بھی نا...... کچھ زیادہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ بندہ غلط نہیں لگتا۔ بچوں سے پیار کرتا ہے۔ بچے بھی اس سے باتیں کرتے ہیں......“

آپا نے تنک کر کہا۔ ”بچے اس سے باتیں کرتے ہیں تو کیا وہ ٹھیک ہو گیا؟ تم حالات کو نہیں دیکھتی ہو کہ کس طرح کے جا رہے ہیں۔ ہر روز بچے اغوا ہو رہے ہیں، ہر روز خبریں آ رہی ہیں۔ اب تو ظالم ایسے ہیں کہ ماں باپ کے ہاتھوں سے بچے چھین کر لے جاتے ہیں۔“

شازیہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے امی! لیکن آپ کو پتا ہے کہ میڈیا کچھ زیادہ ہی شور مچا دیتا ہے۔ خاص طور پر جب کوئی دوسرا ایشو نہ ہو تو کسی بھی ایشو کو پکڑ لیتے ہیں اور پھر اسے انتہا پر پہنچا دیتے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اخباروں اور ٹی وی وغیرہ کی ساری خبریں جھوٹی ہیں اور اس طرح کا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں؟“

”میں یہ نہیں کہہ رہی۔ میرا مطلب ہے کہ اس معاملے میں ہمیں ضرورت سے زیادہ خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ احتیاط ضرور کریں لیکن یہ تو نہ ہو کہ بچوں کو گھروں میں بند کر دیں، ان کی پڑھائی اور تفریح کو درہم برہم کر دیں۔ پرسوں میں بھی اس بندے سے ملی تھی۔ دو چار باتیں بھی کی تھیں۔ دل کا برا نہیں لگتا۔ اچھرہ کی طرف کہیں رہتا ہے۔ چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر آ نکلتا ہے......“

بات کرتے کرتے شازیہ نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور ذرا چونک کر بولی۔ ”وہ دیکھیں، اب بھی ان درختوں کے پاس نماز پڑھ رہا ہے۔“

آپا گھٹنوں پر زور دے کر اٹھیں اور کھڑکی سے جھانکا۔ وہ شاید عصر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ڈاڑھی کے سفید بال ڈھلتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ آپا نے ایک دو بار پہلے بھی اسے نماز پڑھتے یا قریبی مسجد کی طرف سے آتے دیکھا تھا۔ آپا نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کسی کو نماز پڑھتے دیکھ کر یہ سرٹیفکیٹ تو نہیں دیا جا سکتا نا کہ وہ ہر طرح سے نیک پاک ہے۔ دلوں کے راز تو اللہ ہی جانتا ہے۔ میں تمہیں صاف بتا دوں...... جب یہ بندہ پارک میں ہوگا، میں حمزہ کو پارک میں نہیں رہنے دوں گی۔“

شازیہ بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے منہ بنایا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے روز جب بڑی آپا بلڈنگ کے فلیٹ نمبر چوبیس میں گئیں تو وہاں بھی یہی بات ہو رہی تھی۔ دو تین اور خواتین بھی بیٹھی تھیں۔ آمنہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ کل اس پارک والے شخص نے اس کی تین سالہ پوتی کو ٹرائی سائیکل سے اتار کر گود میں لینے کی کوشش کی۔ بچی رونے لگی اور انہوں نے اس بندے کو جھڑک کر بچی واپس لی۔

اسی دوران میں فلیٹ نمبر بائیس کی حمیدہ بیگم جلدی سے اٹھ کر باہر گئیں۔ چند سیکنڈ بعد وہ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں کسی دوا کا سرخ ریپر تھا۔ ”یہ دیکھو کیا ہے؟“ انہوں

نے دیگر عورتوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔
کسی نے جواب نہیں دیا تو وہ بولیں۔ ''یہ نشے کی گولیاں ہیں...... اور یہ بندہ وہیں پارک میں بیٹھ کر کھاتا ہے۔ پرسوں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس نے پہلے گولیاں کھالیں، پھر شاپر سے پانی کی بوتل نکالی اور اکٹھی دو تین گولیاں نگل گیا۔''
''ہوسکتا ہے کہ نشے کی گولیاں نہ ہوں۔ کوئی دوا وغیرہ ہو۔'' حاجی نذیر صاحب کی بیوی بولی۔
''نہیں، میں نے خود پتا کیا ہے میڈیکل اسٹور والے سے۔ وہ کہتا ہے کہ نشے کی گولیاں ہیں، ہم نسخے کے بغیر نہیں دیتے...... بلکہ اکثر تو دیتے ہی نہیں۔''
خواتین بڑی فکرمندی سے کافی دیر گفتگو کرتی رہیں۔
عصر کی نماز کے وقت بڑی آپا اپنے فلیٹ میں واپس آئیں تو گولیوں والا سرخ ریپر ان کے پاس تھا۔ سیڑھیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے کھڑکی سے جھانکا۔ شاپر والا آج پارک میں موجود نہیں تھا (اس کا نام غیرارادی اور غیرمحسوس طور پر شاپر والا پڑ گیا تھا)
بڑی آپا نے سرخ ریپر بہو شازیہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو کیا ہے؟''
شازیہ نے استفسار کیا تو بڑی آپا نے ساری تفصیل بتائی۔ شازیہ گھریلو اشیا لینے کے لیے قریبی اسٹور تک جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سودا سلف لے کر واپس آئی تو اس کے چہرے پر قدرے اطمینان کی کیفیت تھی۔ اس نے بڑی آپا سے کہا۔ ''امی! یہ کوئی نایاب یا ممنوعہ گولیاں نہیں ہیں۔ نہ ہی نشے کی ہیں۔ یہ سکون آور دوا ہے۔ ہر میڈیکل اسٹور پر دستیاب ہے۔ آپ کہتی ہیں تو میں ابھی لاکر دکھا دیتی ہوں۔''
''سکون کی گولیاں بھی اکٹھی دو تین کھالی جائیں تو نشہ ہوجاتا ہے۔'' بڑی آپا نے نکتہ نکالا۔
''امی جی! کسی نے نشہ ہی کرنا ہو تو پھر وہ ایسی گولیاں نہیں کھائے گا۔ کھانسی کا کوئی تیز سا سیرپ چڑھا لے گا۔''
اگلے روز سہ پہر کے وقت شاپر والا پھر پارک میں موجود تھا۔ یہ ویک اینڈ تھا۔ وہ ایک پتھریلی بینچ پر بیٹھا تھا اور شاپر میں سے کیلا نکال کر کھا رہا تھا۔ ویک اینڈ پر تو حمزہ پارک میں ضرور جاتا تھا۔ آج بھی اس کے ہم عمر اس کے پہنچنے کا انتظار کررہے تھے۔ وہ ضد کرنے لگا...... لیکن بڑی آپا نے صاف کہہ دیا کہ وہ اسے پارک میں نہیں جانے دیں گی۔

حمزہ کا اصرار بڑھا تو شازیہ نے شال اوڑھ لی اور کہا۔ ''امی! میں اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔''
بڑی آپا، بہو سے زیادہ تکرار نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہوگئیں۔ شازیہ اور حمزہ کے باہر جانے کے کچھ دیر بعد وہ اٹھیں اور اس کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں جہاں سے پارک میں دیکھا جاسکتا تھا۔ حمزہ کھیل کود میں مصروف ہوچکا تھا۔ بڑی آپا نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ شاپر والا حمزہ پر خصوصی توجہ دیتا ہے...... یا شاید یہ ان کا وہم تھا۔ اب بھی وہ محویت سے حمزہ کو تک رہا تھا۔ شازیہ اس کے قریب ہی بینچ پر بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ شاپر والا بہت کم باتیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بہت کم بول رہا تھا۔ شازیہ بیس فقرے بولتی تو وہ جواب میں شاید ایک بولتا۔ اس دوران میں حمزہ ان دونوں کے پاس آیا تو شاپر والے نے اس سے بھی دو چار باتیں کیں اور شاپر سے ایک کیلا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ حمزہ نے لینے سے انکار کیا اور واپس جھولوں کی طرف بھاگ گیا۔ اسی دوران میں شاپر والے نے اپنے دودھیا شاپر میں سے کوئی ڈائری نما چیز نکالی اور اسے پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ گاہے بگاہے وہ کن انکھیوں سے بچوں کی طرف اور خاص طور سے حمزہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ آپا کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ بہو اور پوتا جلدی واپس آجائیں۔
آخر وہ آگئے اور آپا نے سکھ کی سانس لی۔ اس نے شازیہ سے اس گفتگو کے بارے میں پوچھا جو شاپر والے سے ہوئی تھی۔ شازیہ نے کہا۔ ''امی! میرے خیال میں تو وہ کوئی غلط بندہ نہیں ہے۔ وہاں اچھرہ کی طرف اپنے کسی بھتیجے کے ساتھ رہتا ہے۔ نئی بلڈنگ میں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ شور سے اسے بہت نفرت ہے، خصوصاً گاڑیوں کے شور سے۔ ہماری کالونی کا یہ پارک پُرسکون ہے، اس لیے پیدل چل کر یہاں چلا آتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ لوگوں کو اچھا نہیں لگتا تو نہیں آیا کروں گا...... میں نے کہا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔''
''تم نے یہ نہیں کہا کہ سارا دن ہی پارک میں گزارا کرو۔ بلکہ ہوسکے تو ہمارے گیٹ کے سامنے ہی ڈیرا ڈال لو۔'' آپا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ عام طور پر طنزیہ لہجہ اختیار نہیں کرتی تھیں لیکن اس موقع پر ان سے رہا نہیں گیا تھا۔
''امی! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔'' شازیہ نے

بُرا مانے بغیر کہا۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ وہ غلط سلط بندہ نہیں ہے۔ اگر......''

''وہ ڈائری میں کیا دیکھ رہا تھا؟'' آپا نے بہو کی بات کاٹی۔

''وہ ڈائری نہیں تھی۔ دعاؤں کی کتاب تھی۔ پڑھ رہا تھا۔ بچوں پر پھونک رہا تھا۔''

بڑی آپا چپ ہوگئیں مگر دل میں کھٹکے بدستور موجود رہے۔ انہوں نے بارہا اس کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کسی وقت آپا کو لگتا تھا کہ یہ بندہ بہت بُرا ہے یا پھر بہت اچھا ہے۔ کالونی میں بھی اس کے متعلق دو طرح کی رائے تھی۔ کچھ لوگ اس کو بالکل بے ضرر سمجھتے تھے اور کچھ کے نزدیک وہ مشکوک تھا۔ اس کو بے ضرر سمجھنے والوں میں کالونی کا چوکیدار محمد خان بھی شامل تھا۔ اس نے کالونی کے دو چار معتبر افراد کو شاپر والے کا شناختی کارڈ بھی دکھایا تھا اور بتایا تھا کہ وہ آبائی طور پر فیصل آباد کا رہنے والا ہے اور اس کے کوائف بالکل درست ہیں۔ اس کا نام سرمد احمد معلوم ہوا تھا۔

لیکن تنخواہ دار چوکیدار کی چھان پھٹک اور ایک متفکر دادی کی چھان پھٹک میں بہت فرق ہوتا ہے اور پھر دادی بھی ایسی جس کا کل سرمایہ اس کا پوتا ہو۔ اسی دوران میں ایک ایسی اطلاع بھی آئی جس نے بڑی آپا کو مزید پریشان کر دیا۔ ارشد جنرل اسٹور والے کی بیوی فرخندہ نے کہا کہ اسے شک ہے کہ شاپر والا اپنے شاپر میں کوئی پستول قسم کی چیز بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ پارک میں گئی تھی۔ چھوٹے بچے کو سلائڈ دینے کے لیے وہ بڑی سلائڈ کے اوپر چڑھ گئی۔ شاپر والا پاس ہی بینچ پر بیٹھا تھا۔ بلندی سے فرخندہ کی نظر شاپر پر پڑی۔ شاپر میں تین چار کینو تھے، بسکٹ کا ڈبا تھا۔ اس کے علاوہ اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی سیاہ سی شے تھی، جس کے بارے میں فرخندہ کا خیال تھا کہ وہ کسی پستول وغیرہ کا دستہ تھا۔ شاپر والے نے جب دیکھا کہ فرخندہ شاپر کو تاڑ رہی ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے شاپر کو جلدی سے لپیٹ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کے بعد فرخندہ اتنی خوفزدہ ہوئی کہ دونوں بچوں کو لے کر فوراً گھر آگئی۔

کچھ دیر بعد آپا کی بہو شازیہ بچے کو لے کر گھر آئی تو آپا نے اسے بھی یہ خبر سنائی۔ شازیہ نے ہمیشہ کی طرح اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بولی۔ ''امی جان! جب بندہ ڈرا ہوا ہو تو اسے رسی بھی سانپ لگنے لگتی ہے۔ اکثر اوقات ہم دھوکا کھاتے ہیں۔ جو ہمیں نظر آرہا ہوتا ہے، وہ اصل میں ہوتا نہیں ہے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو فرخندہ کو فوراً شور مچا دینا چاہیے تھا یا کم از کم اپنے شوہر کو بتاتی اور وہ جا کر دیکھتا۔''

''ہوسکتا ہے کہ اس نے بتایا ہی ہو۔''

''اگر بتایا تو کیا نتیجہ نکلا؟'' شازیہ نے پوچھا۔

نتیجے کا تو بڑی آپا کو پتا نہیں تھا، اس لیے وہ چپ ہوگئیں مگر چند گھنٹے بعد یہ بات بھی کلیئر ہوگئی۔ فلیٹ نمبر چوبیس والی آنٹی آمنہ ان کے فلیٹ میں آئیں اور انہوں نے بتایا کہ جنرل اسٹور والے کی بیوی نے جا کر اپنے شوہر کو بتایا تھا۔ شوہر ارشد نے اسی وقت کالونی کے چوکیدار محمد خان کو ساتھ لیا۔ دونوں پارک میں چلے گئے اور شاپر والے کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران میں گفتگو کرتے ہوئے ارشد نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ وہ شاپر کو ٹٹول کر بولا۔ ''اس میں کیا لیے پھرتے ہو سرمد چاچا۔'' شاپر والے نے شاپر دکھا دیا تھا۔ اس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ دعاؤں کی کتاب تھی، دو تین طرح کی میڈیسنز تھیں اور اسی طرح کی دیگر چیزیں......

سب کچھ بتا کر آخر میں آنٹی آمنہ نے کہا۔ ''لیکن سچ پوچھتے ہو بھئی! تو میری تسلی نہیں ہوئی ہے۔ اس بندے میں کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔''

بڑی آپا نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ فرخندہ کے جانے کے بعد وہ ہوشیار ہوگیا ہو اور اس نے ہتھیار شاپر سے نکال کر اپنے لباس میں چھپا لیا ہو۔ ان لوگوں کو اس کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔''

شازیہ بُرا سا منہ بناتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

یہ پستول والا واقعہ کل سہ پہر کو ہوا تھا۔ بڑی آپا نے وال کلاک کی طرف نگاہ دوڑائی۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں یہ پستول والی بات سننے کے بعد بڑی آپا کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ ان کا دل چاہا کہ وہ آج ہی اچھرہ کالونی جائیں اور پتا کریں کہ یہ شاپر والا واقعی وہاں نئی بلڈنگ میں رہتا ہے یا نہیں۔ وہ اکثر شاپنگ کے لیے اچھرہ بازار جاتی رہتی تھیں اور انہوں نے نئی بلڈنگ بھی دیکھ رکھی تھی۔

دوپہر کو چند نوالے لینے کے بعد وہ فوراً نکل کھڑی ہوئیں۔ بہو شازیہ کو انہوں نے یہی بتایا کہ وہ وحدت روڈ جا رہی ہیں، اپنی بہن سے ملنے۔ انہوں نے بڑی سڑک

سے رکشا پکڑا اور سیدھی اچھرہ پہنچ گئیں۔ نقی بلڈنگ تک جانے میں انہیں کچھ دشواری ہوئی کیونکہ ان کے دونوں گھٹنے درد کرتے تھے اور وہ ''ہائے ہائے'' کرتی ہوئی جارہی تھیں۔ نقی بلڈنگ میں نیچے دکانیں تھیں۔ بالائی تین منزلوں پر دفاتر اور بڑے شاندار کشادہ فلیٹ تھے۔ دس پندرہ فلیٹوں میں سے کسی شخص کے بارے میں معلوم کرلینا کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ شاپر والے نے اپنے بھتیجے کا نام عبدالحفیظ بتا رکھا تھا۔ اگلے دو گھنٹے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود نہ تو عبدالحفیظ کا کوئی سراغ ملا اور نہ ہی یہ پتا چل سکا کہ فلاں حلیے کا کوئی ادھیڑ عمر شخص یہاں رہتا ہے۔ شاپر والے نے اپنی رہائش کے بارے میں سراسر جھوٹ بول رکھا تھا۔ یہاں کوئی اور اچھرہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اور نقی بلڈنگ تھی۔

سہ پہر کے بعد جب بڑی آپا واپس لوٹیں تو بے حد پریشان تھیں۔ شاپر والا حسب معمول پارک میں موجود تھا۔ بہرحال یہ دیکھ کر انہیں تسلی ہوئی کہ شازیہ اور حمزہ پارک میں نہیں تھے۔ وہ اوپر فلیٹ میں چلی گئیں۔ انہوں نے بہو کو کچھ نہیں بتایا لیکن ان کے اندر ایک جوار بھاٹا تھا۔ آج شام کے بعد بلڈنگ کے مکینوں کی ماہانہ میٹنگ ہونے والی تھی۔ اس میں مکین چھوٹے بڑے مسائل ڈسکس کرتے تھے۔ کبھی کبھی یوسی ناظم صاحب بھی اس میں شریک ہوجاتے تھے۔ آپا نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس میٹنگ میں شاپر والے کا پول کھولیں گی اور کل پولیس کی مدد سے اس پر پکا ہاتھ ڈالا جائے گا۔ لیکن انہیں پتا نہیں تھا کہ آج ہی ایک ایسا واقعہ ہونے والا ہے جو سب کچھ الٹ پلٹ کر ڈالے گا۔

حمزہ کو ہلکا سا بخار تھا اس لیے اسے آج پارک میں نہیں جانا تھا اور یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ آج وہ اسے ہرگز نہ جانے دیتیں، چاہے شازیہ بھی اس کے ساتھ کیوں نہ ہوتی۔ وہ سیڑھیوں کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں اور کھڑکی میں سے پارک کا منظر دیکھنے لگیں۔ مغرب کے بعد شاپر والا چلا جاتا تھا لیکن کبھی کبھی مغرب کے بعد بھی پارک میں ہوتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی تھا۔ پارک میں گارڈن لائٹس روشن تھیں اور ان کی مدھم روشنی میں اِکّادکّا بچے اور ان کے ''بڑے'' اب بھی پارک میں نظر آرہے تھے۔ شاپر والا پتھریلی بینچ پر خاموش بیٹھا تھا۔ کسی وقت ٹوپی اپنے سر سے اتارتا، اپنے الجھے ہوئے بالوں کو کھجاتا اور ٹوپی دوبارہ سر پر رکھ لیتا۔ اس کی طرف سے بڑی آپا کا ذہن شکوک سے بھرا ہوا تھا اور ان شکوک کی ٹھوس وجوہات تھیں، پھر بھی ان کے دل ودماغ

میں کسی وقت بجلی سی کوند جاتی تھی اور وہ سوچنے لگتی تھیں کہ شاید وہ کچھ نہ ہو جو وہ سوچ رہی ہیں۔

پارک میں اب رونق نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بڑی آپا کی نگاہ ایک جوڑے پر پڑی۔ عورت کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ مرد جو یقیناً اس کا شوہر تھا، بیوی کا ہم عمر ہی لگتا تھا۔ اس نے پینٹ اور جرسی پہن رکھی تھی۔ عورت کی گود میں قریباً ڈیڑھ برس کی ایک خوب صورت بچی تھی۔ یہ لوگ غالباً اس کالونی کے ہی رہائشی تھے۔ اس اسمارٹ سی دراز قد عورت کو بڑی آپا نے ایک دو بار پہلے بھی کالونی کی مارکیٹ میں دیکھا تھا۔

دفعتاً آپا کی نگاہ چکرا گئی۔ انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ شاپر والا اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور عورت کی طرف جھپٹا۔ اپنی عمر کے لحاظ سے اس میں حیران کن پھرتی تھی، اس نے بچی کو عورت کی گود میں سے جیسے نوچ لیا۔ عورت چلاتی ہوئی اس پر جھپٹی اور بچی واپس چھیننے کی کوشش کی۔ مرد بھی سنبھل کر شاپر والے کی طرف آیا۔ شاپر والا الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ پکڑا جائے گا تو اس نے بینچ پر رکھے شاپر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ روتی چلاتی بچی بدستور اس کی گرفت میں تھی۔ بڑی آپا نے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ شاپر والے نے شاپر سے سیاہ رنگ کا ریوالور نکالا اور اس کا رخ عورت اور مرد کی طرف کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا، جیسے بھاگ نکلنے کی فکر میں ہو۔

بڑی آپا لڑکھڑاتی ہوئی اپنے فلیٹ کی بالکونی میں پہنچیں اور سینے کی پوری قوت سے چلائیں۔ ''پکڑو...... پکڑو...... دیکھو...... اس کمینے کو......''

سڑک سے گزرتے ہوئے لوگوں نے پہلے اوپر بڑی آپا کی طرف دیکھا پھر اس طرف دیکھا جدھر وہ اشارے کر رہی تھیں۔ کئی افراد پارک کی طرف دوڑے۔ ان میں سے جو سب سے آگے تھا، اس نے عقب سے شاپر والے کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ اسی دوران میں ارشد جنرل اسٹور پر کھڑے کئی اور لوگ بھی بھاگتے ہوئے پارک میں داخل ہو گئے۔ ایک نوجوان نے کرکٹ بیٹ کا بڑا بھرپور وار شاپر والے کے سر پر کیا، وہ گارڈن لائٹ کے عین نیچے گر گیا۔ بچی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ پھر بچی کی طرف بڑھا مگر اس مرتبہ ایک شخص نے اس کے سر پر اینٹ ماری۔ وہ سر پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ لوگ اس پر پل پڑے۔ اب پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ لوگ اسے بے دردی سے مارنے لگے۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''میری بات تو سنو...... میری بات تو سنو......''

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ اور سر بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب اس کی کوئی کوشش کامیاب ہونے والی نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے نقاب اٹھ چکا تھا۔ اس نے ایک معصوم بچی کو اس کے ماں باپ سے یوں چھینا تھا جیسے کوئی بے رحمی سے ننھی کونپل کو شاخ سے توڑتا ہے...... آج اس نے اپنا اصل روپ کالونی والوں پر عیاں کر دیا تھا۔

وہ ہجوم میں ڈوب چکا تھا۔ لوگ اسے مار رہے تھے، گھسیٹ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں تھیں، بلے تھے، اینٹیں تھیں۔ وہ غم و غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ آج اسے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ وہ شاید اسی جگہ انصاف کر دینا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے...... مجرم ''پولیس کو اور قانون کو'' چکما دیتے ہیں، وہ بچ جاتے ہیں، پھر سے لوگوں کا جینا حرام کرنے لگتے ہیں۔ شاپر والے کی آواز اب ڈوب چکی تھی۔ بس اس کا ایک ہاتھ کبھی کبھی ہجوم میں سے نظر آتا تھا۔ وہ جیسے اس زخمی ہاتھ کے ذریعے اب بھی اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر یہ ہاتھ بھی نظر آنا بند ہو گیا۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ پارک میں اور ساری کالونی میں جیسے کہرام سا مچ گیا تھا۔

آپا نے دیکھا بپھرے ہوئے ہجوم میں دو چار لوگ ایسے بھی تھے جو شاپر والے کو بچانے کی آخری کوشش کر رہے تھے لیکن غم و غصے کا یہ عالم تھا کہ کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔

''مر گیا ہے...... مر گیا ہے...... چھوڑ دو۔'' ایک چلاتی ہوئی سی آواز بڑی آپا اور شازیہ کے کانوں تک پہنچی۔

لیکن لوگ مارتے رہے پھر وہ اس کے کٹے پھٹے خونچکاں جسم کو گھسیٹ کر رنگ برنگے جھولوں کے قریب لے آئے۔ وہ پیٹرول یا مٹی کا تیل تلاش کر رہے تھے۔ وہ اسے نذر آتش کر دینا چاہتے تھے۔ پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔ قانون کے محافظوں نے شہریوں کو بہ مشکل آگ لگانے کے عمل سے روکا۔ پولیس آنے کے بعد بہت سے لوگ منتشر ہو گئے لیکن کچھ اب بھی موقع پر موجود تھے اور ڈنڈے وغیرہ لہرا رہے تھے۔ بچی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ اس کے ماں باپ۔ وہ شاید بہت خوف زدہ ہو گئے تھے۔ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر وہ بچی سمیت

موقع سے اوجھل ہو گئے تھے۔

گارڈن لائٹ کے نیچے ایک ناقابلِ شناخت انسانی جسم بے سدھ اور مردہ پڑا تھا۔ یہ شاپر والا تھا...... کھڑکیوں اور بالکونیوں میں سے اَن گنت وحشت زدہ نگاہیں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بڑی آپا اور شازیہ تادیر یہ منظر نہیں دیکھ سکیں اور اندر کمرے میں آگئیں۔ بڑی آپا نے کہا۔ ''دیکھ لیا نا شازیہ...... میں یہی کہتی تھی نا......؟''

شازیہ نے سوئے ہوئے حمزہ کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

یہ کہانی یہاں تک ہی رہتی تو شاید کچھ لوگوں کے لیے ٹھیک ہوتی لیکن یہ یہاں تک نہیں رہی اور اس نے ایک دردناک موڑ لے لیا۔ ٹی وی چینلز پر ایک اور درندے کے بارے میں خبریں چلیں، اگلے روز کے اخبارات میں بھی اس کی تصویر چھپی۔ یہ تصویر شاید اس کے شاپر میں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر فیصل آباد سے کچھ لوگ روتے پیٹتے کالونی میں پہنچے۔ ان میں دو مرد تھے اور ایک جواں سال عورت۔ مردوں میں ایک ستائیس اٹھائیس سالہ جواں سال شخص تھا۔ اس کا نام ذیشان تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ مرنے والا شخص اس کا والد تھا...... وہ کوئی بردہ فروش یا اغوا کنندہ نہیں تھا۔ وہ تو آٹھ ماہ سے خود اپنی پوتی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

کسی نے اس بات پر یقین نہیں کیا لیکن حقیقت زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ جب اس واقعے کی پرتیں کھلنا شروع ہوئیں تو لوگ دنگ رہ گئے۔ بے شمار پیشانیاں پسینے سے تر دکھائی دینے لگیں۔ پولیس کی تفتیش اور صحافیوں کے ذریعے جو اصل کہانی مکمل ثبوتوں کے ساتھ سامنے آئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔

سرمد صاحب کے تین بیٹے تھے مگر ایک کے سوا ابھی کوئی صاحب اولاد نہیں تھا۔ واحد ایک پوتی فاطمہ تھی جو سرمد صاحب کی زندگی کا محور تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ فیصل آباد میں ان کا کپڑے کا کام تھا، تاہم حج کے بعد اب وہ تقریباً ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ ایک دن سرمد صاحب اور ان کے گھر والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک سالہ فاطمہ کی والدہ اسے اپنے ساتھ گھنٹا گھر کے ایک بازار میں لے کر گئی اور روتی پیٹتی خالی ہاتھ واپس آگئی۔ فاطمہ گم ہو چکی تھی۔ وہ شب و روز ایسے اذیت ناک تھے کہ ان کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کون سا ایسا دروازہ تھا جو سرمد صاحب اور ان کے اہلِ خانہ نے نہ کھٹکھٹایا، کون سی ایسی جگہ تھی جہاں فاطمہ کو نہ ڈھونڈا گیا۔ مسجدوں میں اعلانات سے شروع ہونے والا یہ دردناک سفر پولیس تھانے اور اخبارات سے ہوتا ہوا پیروں فقیروں اور عاملوں تک دراز ہوتا چلا گیا۔ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے اور وہ لوگ بھی دیوانے تھے۔ خاص طور سے سرمد صاحب کے لیے تو پچھلی عمر میں یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ ان کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ وہ ایک زندہ لاش تھے اور گلی گلی، کوچہ کوچہ اپنی گمشدہ حیات کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ننھی فاطمہ کے کھلونے، جوتے اور کپڑے ان کا دل شق کر دیتے تھے۔

دعائیں دوائیں، کچھ کام نہ آئیں۔ تین چار ماہ کی سرتوڑ کوشش کے باوجود فاطمہ کا کوئی سراغ نہیں ملا پھر آہستہ آہستہ یہ تلاش ماند پڑنے لگی۔ آنسوؤں کے دھارے خشک تو خیر کہاں ہوتے تھے لیکن دھیمے پڑتے گئے...... یہ سفر انگاروں پر چلنے جیسا تھا۔ اسی طرح سات آٹھ ماہ گزر گئے۔ وہ لوگ تقریباً ناامید ہو چلے تھے جب ایک روز سرمد صاحب کے ایک بھتیجے نے انہیں لاہور سے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے فاطمہ کو لاہور کے ایک پارک میں دیکھا ہے۔ وہ ایک گہرے براؤن بالوں والی عورت کی گود میں تھی۔ وہ خود ''کار'' میں تھا، اس لیے فوری طور پر رک نہ سکا۔ جب گاڑی کو یوٹرن دے کر واپس پارک تک پہنچا تو عورت کہیں نظر نہیں آئی۔ اسی روز سرمد صاحب اور ان کے دو بیٹے فیصل آباد سے لاہور پہنچ گئے۔ انہوں نے پارک اور اردگرد کے علاقے میں بچی کی تلاش شروع کر دی۔ مقامی پولیس کو بھی مطلع کر دیا گیا۔ سرمد صاحب پارک میں بیٹھے رہتے تھے اور ان کے دونوں بیٹے علاقے میں فاطمہ کی ٹوہ لگانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ بھتیجا جو کسی کام سے لاہور آیا تھا، واپس جا چکا تھا۔ پندرہ بیس روز کی انتھک کوشش کے باوجود نہ تو پولیس کوئی سراغ دے سکی اور نہ وہ لوگ خود کوئی کھوج لگا سکے۔ دونوں بیٹے زیادہ دیر اپنے جاب اور کام سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ تو واپس فیصل آباد چلے گئے لیکن سرمد صاحب کسی موہوم امید کے سہارے یہیں پر لاہور میں موجود رہے۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ اپنا پرانا لائسنس یافتہ ریوالور فیصل آباد سے منگوا لیا تا کہ کسی برے وقت میں کام آسکے۔ گھر والے بہت کہتے رہے کہ وہ واپس آجائیں لیکن گھر میں اور فیصل آباد میں ان کے لیے

کیا رکھا تھا کہ وہاں جاتے۔ انہوں نے ایک آس کے ساتھ اس پارک میں آنا جاری رکھا۔ لاہور میں اپنی رہائش کے اخراجات کو کم رکھنے کے لیے وہ اسٹیشن کے قریب ایک سستے سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

سرمد صاحب کے دونوں بیٹوں اور بہو کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ سرمد صاحب اپنی دیوانی تلاش میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس براؤن بالوں والی لڑکی کے ساتھ اپنی پوتی فاطمہ کو دیکھ لیا تھا...... اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا، اس پر آنسو ہی بہائے جا سکتے تھے اور سوگ ہی کیا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات ذرائع ابلاغ لوگوں کو "ہائپر" کر دیتے ہیں...... ویسے بھی ہجوم کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اندھا بہرا ہو جاتا ہے...... مار پہلے دیتا ہے، نام اور جرم بعد میں پوچھتا ہے۔ بدقسمت سرمد صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ مظلوم سے ظالم بنا دیے گئے۔ انہیں اپنی پوتی کو سینے سے نہیں لگانے دیا گیا، اس کا منہ نہیں چومنے دیا گیا۔ اسے ان سے دور کر دیا گیا اور انہیں تشدد کر کے موقع پر ہی مار دیا گیا۔

پولیس نے بہت سرگرمی دکھائی کیونکہ اکثر "حادثوں" کے بعد ہی سرگرمی دکھائی جاتی ہے اور اس سے بڑا حادثہ کیا تھا کہ اس کیس کے ساتھ ایک بے گناہ شخص کی دردناک موت منتج ہو چکی تھی۔ پولیس نے کالونی کے قریبی علاقے سے براؤن بالوں والی لڑکی اور اس کے فرضی شوہر کا کھوج لگا لیا۔ انہوں نے ایک چھوٹا گھر کرائے پر لے رکھا تھا لیکن وہ واقعے کی رات ہی بچی سمیت اپنے گھر سے غائب ہو گئے تھے۔ پولیس تفتیش سے پتا چلا کہ وہ دونوں پیشہ ور مجرم تھے۔ بچوں اور خاص طور سے بچیوں کو اغوا کرنا اور آگے فروخت کر دینا ان کا مکروہ دھندا تھا۔

☆☆☆

بڑی آپا کھڑکی کے سامنے اداس بیٹھی رہتی تھیں۔ سارے دن میں پانچ چھ لقموں سے زیادہ نہیں لیتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہتے تھے۔ وہ منظر جیسے ان کے ذہن سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ لوگ اس کے بوڑھے جسم کو اندھا دھند ضربات لگا رہے تھے۔ وہ پکار رہا تھا...... "میری بات تو سنو...... میری بات تو سنو......" اور اس کا ہجوم میں سے بار بار اٹھتا ہوا بازو۔ وہ اس ناتواں بازو کے ذریعے شاید اپنا دفاع کر رہا تھا یا شاید اپنی پوتی کو تھامنا چاہتا تھا...... اور پھر وہ مر گیا تھا۔

اس دن بھی وہ کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی، پارک میں جھانک رہی تھیں اور آنسو بہا رہی تھیں۔ اچانک انہیں نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ہچکیاں لے کر بلند آواز میں رونے لگیں۔

"دادی! کیا ہوا؟" ننھے حمزہ نے انہیں اپنے ننھے منے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔

شازیہ بھی کچن سے دوڑی ہوئی آئی اور انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولیں۔ "شازیہ! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ منظر دھوکا دیتے ہیں...... ہم اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ جو ہمیں نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ اصل میں ہوتا نہیں ہے......"

اس رات عشا کی نماز کے بعد بڑی آپا سجدے میں گر گئیں۔ دیر تک مصلّے کو آنسوؤں سے تر کرتی رہیں اور گڑگڑاتی رہیں۔ "اے اللہ! مجھے معاف کر دے۔ اے اللہ! میری سن لے۔ وہ بچی جہاں کہیں بھی ہے اسے اپنوں میں واپس پہنچا دے۔ اے اللہ! آج میں تجھ سے لے کر ہی رہوں گی۔ میں اس وقت تک سر نہیں اٹھاؤں گی جب تک تو التجا قبول نہ کرے۔ اے رب! میری التجا سن لے...... یا پھر آج، اسی جگہ میری جان بھی لے لے۔ اے قادرِ مطلق...... اے قادرِ مطلق......" وہ ہچکیاں لیتی رہیں اور روتی رہیں۔

انہوں نے ایسی ضد پکڑی تھی کہ سر اٹھانے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا جب انہیں ایک دم اپنے دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہوا۔ انہیں لگا کہ کچھ بدل گیا ہے...... کچھ ہو گیا ہے۔

انہوں نے سجدے سے سر اٹھا لیا اور تہجد کی نماز کی تیاری کرنے لگیں۔

یہ تیسرے روز شام کی بات ہے جب شازیہ نے پکار کر آپا کو ٹی وی لاؤنج میں بلایا۔ ٹی وی پر نیوز چل رہی تھی کہ ننھی فاطمہ کو ملتان کے ایک علاقے سے بازیاب کرا لیا گیا ہے اور اسے اس کے والدین کے پاس واپس پہنچایا جا رہا ہے...... آپا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن اب یہ خوشی کے آنسو تھے...... وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئیں۔ پارک پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ انہیں لگا کہ شاپر والا آج پھر پتھریلی بینچ پر موجود ہے...... دعائیں پڑھ پڑھ کر بچوں پر پھونک رہا ہے...... اور خوش ہے...... اس کی روح خوش ہے۔ اپنی پوتی کے لیے اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔

سکونِ قلب

سلیم انور

کوئی بھی انسان محبت، ہمت اور ذہانت اس لیے خرچ کرتا ہے کہ زندگی میں چند لمحات سکون سے بھی گزار سکے اور جب... محبت سے بنائے ہوئے گھر میں بھی دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگے تو تمام دیواریں گرا دینے کا دل چاہتا ہے تاکہ حبس کا عالم ختم ہوسکے لہٰذا جب اس نے بھی اپنے اردگرد کھڑی ہر دیوار کو ڈھانے کا ارادہ کرلیا تو لمحے بھر کی قسمت کی اس مہربانی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک لمحے کی تاخیر بھی اسے گوارہ نہ ہوسکی۔

وحشتوں سے چھٹکارا پانے والے شوہر کی کاوشوں کا حال



میں اپنے آپ کو خود پسند اور برتری کے خبط میں مبتلا ثابت نہیں کرنا چاہتا لیکن حقیقت میں وہ مجھ سے کیا توقع کر رہی تھی؟ کیا وہ سچ مچ یہ سمجھتی تھی کہ میں اسے......

نہیں، اس کے متعلق ہم بعد میں بات کریں گے۔

سب سے پہلے اہم بات۔

میں ایک باغبان ہوں۔ پیشہ ور نہیں بلکہ صرف ویک اینڈز پر۔ وہ سنیچر کی صبح تھی جب یہ سب کچھ شروع ہوا۔ میں ٹماٹر اور کالی مرچ کے پودوں کی بوائی کر رہا تھا۔

کیاریاں میں نے ہفتوں قبل تیار کرلی تھیں۔ کھاد کی موٹی تہ میں پہلے ہی بچھا چکا تھا اور پھاوڑا بھی احتیاط کے ساتھ چلالیا تھا۔ ان کیاریوں کی قطاروں کے درمیان گھٹنوں کے بل جھک کر میں ہلکی نم سیاہ کھاد کو کھرپی سے نکال کر چھوٹے چھوٹے گڑھے بنا رہا تھا تاکہ ننھے پودے ان میں جما سکوں۔ پتوں کی کھاد ملی مٹی کی تیز مہک مجھے بہت بھلی محسوس ہورہی تھی۔

میں باری باری ہر ایک پودے کو گڑھے میں رکھ کر اس کے اطراف میں ہلکی بھرپور مٹی بھرتا جارہا تھا۔ اگر آپ ایک حقیقی باغبان ہیں تو آپ جانتے ہوں گے کہ اس سے بہتر اور کسی طریقے سے بوائی نہیں ہوسکتی۔

جب میں نے اپنا کام مکمل کرلیا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنی ایڑیوں کے بل وہیں بیٹھ گیا تھا اور اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا تھا۔ میں اپنے بقیہ باغ کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف سلاد کے تہ در تہ صاف ستھرے پتوں کی قطاریں تھی، گہرے سبز رنگ کے پالک کے پودے تھے، جالی دار ٹھاٹر پر چڑھی ہوئی مٹر کی بیلیں تھیں۔

یہ ابتدائی موسم بہار کی فصل تھی اور اب تقریباً مکمل ہوچکی تھی۔ میرے سامنے گاجریں اور مولیاں قطار در قطار دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک اچٹتی نگاہ اپنے عقب میں ڈالی۔ اس کیاری میں اسٹرابریز اب پوری طرح تیار ہوچکی تھیں۔ ہر روز صبح میں اس خوش ذائقہ شیریں پھل کی ضرورت سے زیادہ مقدار اپنے ناشتے کے لیے چن لیتا تھا۔ جو اسٹرابریز کھانے سے بچ جاتی تھیں انہیں میں بعد میں استعمال کرنے کے لیے موم کاغذ کی شیٹ پر بچھا کر فریزر میں محفوظ کرلیتا تھا۔

میں اپنے ہاتھ جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی ٹانگوں اور کمر کے اکڑے ہوئے مسلز کو لچکیلا بنانے کے لیے چند انگڑائیاں لیں اور واپس اپنے مکان کی جانب چل دیا۔ یہ صبح کا ایک اچھا کام ہوگیا تھا۔ راستے میں، میں بلیو بیری کی جھاڑیوں کے پاس رک گیا اور ان کا جائزہ لینے لگا۔ موسم بہار نم گزرا تھا اور شاخیں اب بھی سبز پھلوں سے لدی ہوئی تھیں۔ بعد میں اگر یہ بلیو بیریز چڑیوں کے کھانے سے بچ گئیں تو پھر یہ میرے ناشتے کے طور پر اسٹرابریز کی جگہ لے لیں گی۔

جب میں گھر کے عقبی دروازے سے کچن میں داخل ہوا تو میں سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ حقیقت میں گڑبڑ تو نہیں بلکہ کچھ مختلف کہہ سکتے ہیں۔ مجھے اس بات کا احساس ہونے میں ایک لمحہ لگا کہ مکان میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ٹیلی وژن بھی بند تھا۔ میری بیوی مارٹا ٹیلی وژن ہر وقت آن رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ کوئی پروگرام نہیں دیکھ رہی ہوتی تھی اور اس وقت بھی جب وہ مکان کے کسی اور حصے میں ہوتی تھی۔

میں نے بارہا اسے صوفے پر ٹانگیں پسارے اپنے پسندیدہ رسالوں میں سے کسی ایک کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا تھا جبکہ ٹیلی وژن چل رہا ہوتا تھا۔ یہ ایک بے معنی پس منظر ہوتا تھا۔ اگر میں ٹیلی وژن آف کردیتا تو وہ فوراً کہہ اٹھتی تھی۔ ''اے، میں یہ دیکھ رہی تھی!''

میں نے اپنی بیوی کا نام لے کر پکارا۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں متجسس ہوگیا اور بیڈروم میں چلا گیا۔ وہاں جاکر دیکھا تو اس کی الماری کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں موجود بیشتر ہینگر خالی لٹکے ہوئے تھے۔ جو کپڑے لٹکے ہوئے تھے وہ وہی تھے جو اس نے برسوں سے استعمال نہیں کیے تھے۔ چند بیل باٹم تھے جنہیں وہ رد کرنے اور پھینکنے کے حق میں نہیں تھی۔ ایک بلاؤز تھا جسے پہن کر بقول اس کے وہ موٹی دکھائی دیتی تھی۔ درحقیقت میرے خیال سے اب وہ اس کے لیے تنگ ہوگیا تھا۔ خاص طور پر پیٹ والے حصے کی جانب سے۔

پھر میں نے اس کے زیر جاموں کی دراز چیک کی۔ وہ خالی پڑی تھی۔ باتھ روم کے کاؤنٹر کا ٹاپ بھی تقریباً خالی تھا پھر میں ہال کی الماری کا جائزہ لینے بڑھ گیا۔ اس میں رکھا ہوا نرم تہوں والا سوٹ کیس اور ملبوسات کا بیگ اب وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ ٹریول کیس بھی غائب تھا جسے وہ اپنے کاسمیٹکس کے لیے استعمال کرتی تھی۔

میں کچن میں چلا گیا۔ میں نے بریڈ سلائس پر چیز اور مسٹرڈ لگانے کے بعد اس کے درمیان گوشت کا بڑا سا پارچہ رکھ کر ایک سینڈوچ تیار کرلیا۔ پھر ایک ہاتھ میں سینڈوچ اور دوسرے ہاتھ میں بیئر کا گلاس لیے میں ٹہلتا ہوا لیونگ روم میں آگیا۔

میری بیوی مارٹا موجود نہیں تھی، اس کا ثبوت ٹیلی وژن کی سپاٹ اسکرین تھی۔ یہ میرے لیے ایک خوش نصیبی تھی۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا مجھے کچھ کرنا چاہیے؟ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں حقیقت میں یہی چاہتا ہوں کہ اپنے سینڈوچ اور بیئر کے ساتھ وہاں بیٹھ کر اس پیاری، خوشگوار اور دلکش خاموشی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کروں۔

میں جانتا ہوں...... میں جانتا ہوں کہ لطف اندوز ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ تم نے یہ کیا کیا ہے۔ لیکن مجھے اس کی کیا پروا؟ تم اپنا جشن اپنے انداز سے مناؤ، میں اپنا جشن اپنے انداز سے مناؤں گا۔

☆☆☆

اس سہ پہر اس کی بہن آگئی۔ میں نے اسے دروازے پر ہی روک لیا۔ ''ماڑا یہاں نہیں ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''کیا مطلب ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے؟''

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن میں نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ نہیں دیا اور دروازہ روک کے کھڑا رہا۔ مجھے ماڑا کی بہن اینجلا بالکل بھی پسند نہیں تھی۔ وہ ایک نہایت بدمزاج اور گھٹیا عورت تھی۔ ہمیشہ بدظن رہتی تھی اور ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور ہمیشہ ہر ایک کے بارے میں بدترین سوچتی تھی۔ وہ اور ماڑا بڑی حد تک بالکل ایک جیسی تھیں۔

''وہ جاچکی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کہاں گئی ہے؟''

وہ دونوں یعنی اینجلا اور ماڑا سازشیوں کے مانند تھیں۔ ہمیشہ آپس میں سر جوڑ کر بیٹھتی تھیں اور اپنے راز اپنے تک محدود رکھتی تھیں۔ ان کے قہقہے بھی بے آواز ہوتے تھے جیسے کہ دنیا کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

''مجھے نہیں معلوم۔ وہ بس چلی گئی ہے۔''

''ویل، وہ کب تک واپس آئے گی؟'' وہ دروازے پر کھڑی تاک جھانک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ساتھ ہی کچھ سننے کے لیے اس نے اپنے کان بھی کھڑے کیے ہوئے تھے۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

میں اسے بتا سکتا تھا کہ ماڑا کے ملبوسات بھی موجود نہیں ہیں۔ مجھے بتا دینا چاہیے تھا لیکن میں اس کے مزید احمقانہ سوالوں کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے یہ بات نہیں بتائی۔

وہ اپنی نیم باز متشکک نظروں سے مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ ''وہ جب واپس آجائے تو اس سے کہنا کہ وہ مجھے فون کرلے۔''

''اگر میری اس سے ملاقات ہوگئی تو۔'' یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کرلیا۔

اینجلا نے اگلے روز مجھے فون کیا۔ ''ماڑا کو فون دو!''

''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''تو پھر وہ کہاں ہے؟''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہ چلی گئی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے ہمیشہ کے لیے؟''

''مجھے نہیں معلوم!''

''یہ فاش غلطی ہوئی۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اسے بھی بتانا چاہیے تھا۔''

پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ مجھے دوسری جانب سے اس کی ہیجان خیز لمبی سانسوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ پُرجوش لہجے میں پھٹ پڑی۔ ''تم حرام زادے! تم نے میری بہن کے ساتھ کیا، کیا ہے؟''

پھر اس کے بعد سے وہ روزانہ کم از کم ایک مرتبہ مجھے فون ضرور کرتی تھی اور ہر مرتبہ مختلف طریق کار آزماتی تھی۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے خیال کے مطابق پیچیدہ سوالوں سے مجھے جال میں پھنسانے کی کوشش کی پھر بہلانے پھسلانے پر اتر آئی۔ مجھے انسانیت کا واسطہ دینے لگی پھر دھمکیاں بھی دیں۔

پھر اس کے فون آنا بند ہوگئے۔

پولیس کی آمد ایک پستہ قد اور درخت کے تنے کے مانند گول مٹول فرد کی شکل میں ہوئی جس نے اپنا نام سراغ رساں وسپر بتایا۔ اس کے سر کے بالوں میں تیزی سے جھڑنے اور سپیدی اختیار کرنے میں جیسے دوڑ لگی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے بال سپیدی اختیار کرنے سے پہلے ہی جھڑ جائیں گے۔ البتہ اس کی گہری سیاہ اور گھنی بھویں اس دوڑ میں شامل نہیں لگ رہی تھیں۔ ان بھوؤں کے نیچے موجود اس کی دونوں آنکھوں میں کسی قسم کے جذبات عیاں نہیں تھے۔ بس وہ ہر شے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''بات صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس رپورٹ آئی ہے کہ تمہاری بیوی غائب ہے۔'' اس نے اپنی گرجدار آواز میں کہا۔ ''شاید ایسی بات نہ ہو لیکن ہمیں چیک تو کرنا ہوتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟''

میں نے اسے بیڈروم کی تقریباً خالی الماری، تمام درازیں اور باتھ روم دکھا دیے لیکن اس کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان چیزوں سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا ہے۔

''کیا اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ جا رہی ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تمہارے مابین تعلقات کیسے تھے؟ کیا لڑائی جھگڑا

ہوا کرتا تھا؟"

"نہیں۔"

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ آخر میں ہم بہ مشکل ایک دوسرے سے کچھ کہتے تھے۔

"تمہاری بیوی کے پاس اپنی کار تھی؟"

"نہیں۔ کار بس ایک ہی ہے اور وہ اب بھی یہیں موجود ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جب وہ گئی ہے تو تب بھی کار یہیں پر تھی؟"

"گیراج میں تھی۔" میں نے بتایا۔ تب مجھے اس بات کا دھیان آیا جو میں نے ابھی تک نہیں سوچی تھی۔

"ہوسکتا ہے کہ اس نے فون پر ٹیکسی کو طلب کیا ہو؟"

"یہ بات تم سوچ سکتے ہو لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اس بات کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ اس نے فون کرکے کوئی ٹیکسی طلب کی ہو۔"

ہم مکان سے باہر کھلے آنگن میں آ گئے۔ میں سراغ رساں ویسپر کی نظروں کا جائزہ لینے لگا جو دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں جیسے ہر منظر کو مکمل طور پر ذہن نشین کر رہی ہوں یا شاید رنگ برنگے پھولوں سے لدی ان خوشنما جھاڑیوں کو ستائشی انداز میں دیکھ رہی تھیں جو سلیقے سے قطار در قطار ایک دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔

پھر سراغ رساں کی نگاہیں باغ پر جم گئیں اور وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ مجھے اپنے پیٹ میں قدرے اینٹھن سی محسوس ہونے لگی۔ شاید یہ پیش آگاہی تھی۔

"ہوسکتا ہے کہ کوئی تمہاری بیوی کو آ کر اپنے ساتھ لے گیا ہو۔" سراغ رساں ویسپر نے کہا۔ "کوئی اس کا خاص دوست یا سہیلی ہے؟"

"وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنی بہن اینجلا کے ساتھ گزارتی تھی۔ اینجلا طلاق یافتہ ہے اس لیے اس کے پاس ڈھیروں وقت ہوتا ہے۔" میں نے بتایا۔

"وہ کہاں جاتی ہیں؟"

"یہ بات تمہیں اینجلا سے پوچھنی چاہیے۔"

سراغ رساں ویسپر کے چہرے کے تاثرات مجھے یہ بتا رہے تھے کہ وہ جو کچھ جاننا چاہتا تھا، اس سے کہیں زیادہ معلومات پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر باغ کی طرف دیکھا۔ ٹماٹروں اور کالی مرچوں کی نئی فصل گزشتہ ہفتے ہی پھوٹ چکی تھی۔ ہر شے اپنے شباب پر تھی۔ حتیٰ کہ سلاد کے ننھے پتے بھی نمایاں ہو چکے تھے۔

وہ مسکرا دیا اور بولا۔ "اتنے عمدہ باغ کو کھود ڈالنا بڑے شرم کی بات ہوگی۔"

میں یہی سمجھا کہ وہ یہ بات مذاق میں کر رہا ہے۔ اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ پلٹا اور واپس مکان کی جانب چل دیا۔

مکان میں داخل ہونے کے بعد وہ گویا ہوا۔ "سر! تمہاری بیوی غائب ہے اور تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کہاں، کیوں اور کس کے ساتھ گئی ہے...... یہ بات درست ہے؟"

"ہاں۔"

"اور اس کے باوجود جہاں تک میں دیکھ رہا ہوں، تم نے یہ معلوم کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا کہ وہ کہاں پر ہے؟"

"نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"کیا تم اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے؟"

کیا واقعی......؟ میں نے خود سے سوال کیا لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بس مجھے اس وقت خوشی محسوس ہوئی تھی جب مجھے پتا چلا کہ وہ جا چکی ہے۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے اسے تلاش کیوں نہیں کیا؟"

یہ ایک آسان سوال تھا۔ "مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے مل نہ جائے۔" میں نے جواب دیا۔

☆☆☆

دس منٹ بعد ہی میرے پاس اینجلا کا فون آ گیا۔ "اب تم صحیح طور پر نرغے میں آ گئے ہو۔ تمہیں پولیس سے بات کرنا کیسا لگا؟"

میں بھلا کیا کہہ سکتا تھا؟

"مجھے نہیں معلوم کہ تم نے میری بہن کے ساتھ کیا، کیا ہے لیکن تم سزا سے نہیں بچ سکو گے۔ کیا تم سن رہے ہو؟"

مجھے زندگی کی غیر ستائشی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں سے ایک خوشی اس وقت حاصل ہوتی تھی جب میں اینجلا جیسے لوگوں کو فون پر کوئی جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیتا تھا۔

☆☆☆

میں سراغ رساں ویسپر کے ہمراہ آنگن میں کھڑا پولیس کے جوانوں کو اپنے باغ کو کھودتا دیکھ رہا تھا۔ ویسپر کی تمام تر توجہ اس بات پر تھی کہ کوئی جگہ کھودے جانے سے رہ نہ جائے۔ خدا معاف کرے، انہوں نے ایک انچ جگہ بھی باقی نہیں رہنے دی تھی۔ میں اپنے باغ کی یہ تباہی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میری مجبوری تھی۔ میں زمین پر نگاہیں گاڑے مکان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا پھاوڑوں اور

بلبلوں کی آوازیں سن رہا تھا۔

''ہمارے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔'' سراغ رساں ویسپر نے کہا۔ ''تمہاری بیوی غائب ہے۔ گواہوں کا کہنا ہے کہ تم دونوں کی نہیں نبھ رہی تھی اور ہمارے پاس ایک باقاعدہ شکایت بھی آئی ہے...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمیں یہ پتا نہیں چل رہا کہ وہ گھر سے کس طرح نکل کر گئی ہے۔ اس کے پیدل جانے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''ہوسکتا ہے کوئی اسے لینے کے لیے آیا ہو؟''

اس بات پر سراغ رساں کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ ''کون؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

بھلا میں اس بات کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ لہٰذا میں خاموش رہا۔

''اور تم پر موت کا سا خوف طاری ہے کہ تمہارے باغ کو کھود کر اس کا جائزہ کیوں لیا جارہا ہے؟''

''یہ وہ پہلی احمقانہ بات ہے جو تم نے کہی ہے۔'' میں نے غراتے ہوئے جواب دیا۔

سراغ رساں ویسپر کی آنکھیں غصے سے تمتمانے لگیں لیکن اس نے اپنی آواز کو قابو میں رکھا اور بولا۔ ''تو پھر ایسا کیوں ہے؟''

''خدا کے لیے ذرا اپنے اطراف تو دیکھو!'' میں نے بھی اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لوگ پورا باغ تہس نہس کررہے ہیں۔ یہ میری برسوں کی محنت ہے جو تم اجاڑ رہے ہو۔''

جب انہوں نے اپنا کام مکمل کرلیا تو سراغ رساں ویسپر کا اعتماد ڈانواں ڈول ہوچکا تھا۔ اس نے اپنی گھنی بھوؤں کا رخ میری جانب پھیر دیا جیسے اپنے ذہن کو کچھ کہنے کے لیے تیار کررہا ہو۔

''شاید میں غلط تھا یا شاید نہیں۔ بہرحال میں نے جو تکلیف دی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔''

یہاں مجھے یہ بات کہنی چاہیے تھی۔ ''کوئی بات نہیں، تم تو بس اپنا فرض نبھار ہے تھے۔'' یہ جو کچھ ہوا تھا یہ درست نہیں تھا، ہرگز نہیں۔

ان کے جانے کے بعد میں اس تباہ شدہ باغ میں چلا گیا جہاں صبح تک ہر پودہ، پھل، پھول، کیاریاں سب ہی زندہ اور بے حد خوشنما تھے۔ انہوں نے کوئی بھی چیز نہیں چھوڑی تھی۔ ہر کیاری تاراج کردی تھی۔ تمام پھلوں، پھولوں اور سبزیوں کی جڑیں اکھاڑی جاچکی تھیں۔ ٹماٹر کے

اصل مسئلہ

ایک فوجی کی ایک ٹانگ محاذِ جنگ پر لڑائی میں کٹ گئی۔ انہوں نے لکڑی کی ایک اتنی عمدہ ٹانگ بنوائی جو بالکل اصلی لگتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک جھگڑے میں ان کی مصنوعی ٹانگ میں گولی لگ گئی تو ان کا دوست بولا۔ ''گھبراؤ نہیں، میں ابھی جراح یعنی سرجن کو بلاتا ہوں۔''

فوجی بولا۔ ''نہیں بھائی، کسی بڑھئی کو بلاؤ۔''

حسبِ حال

میدانِ جنگ میں جب نپولین کو شکست ہوئی تو ولنگٹن نے نپولین سے طنزاً کہا۔ ''جانتے ہو ہم انگریز عزت کے لیے لڑتے ہیں اور تم لوگ دولت کے لیے لڑتے ہو۔''

نپولین نے جواب دیا۔ ''ہاں، جس کے پاس جو چیز نہ ہو، وہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

ناک

ویسے تو بظاہر ناک سونگھنے کے کام آتی ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم جب سانس لیتے ہیں تو فضا میں جو گرد و غبار موجود ہوتا ہے، ناک کے اندر موجود بال ان کے راستے میں دیوار بن جاتے ہیں۔ ویسے اگر کسی کو تنگ کرنا مقصود ہو تو اس کی ناک میں دم بھی کیا جاسکتا ہے۔ یار لوگوں نے ناک کے اور بھی بہت سے مصرف دریافت کرلیے ہیں۔ اس کو اونچا رکھنے کے لیے قرض لے کر اپنی زیب و نمائش کی جاتی ہے۔ یہ کبھی کبھی کٹ بھی جاتی ہے لیکن اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ یہ اگر ستواں ہو تو خوب صورتی میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور اگر موٹی ہو تو لوگوں کو پکوڑے والی پھبتی کسنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی اسے موم کی ناک بھی بنا دیتا ہے پھر اسے جس طرح چاہے موڑا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگوں کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح ہوتی ہے لیکن انہیں طوطا چشم نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کسی وقت بند بھی ہوجاتی ہے اور سونگھنے کی حس سے محروم ہوجاتی ہے۔ اس لیے ڈریں اس وقت سے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

پودے جو تقریباً ایک فٹ اونچے ہو چکے تھے، ایک ڈھیر کی شکل میں ایک کنارے پڑے ہوئے تھے۔ اسٹرابیریز کی کیاری غائب ہو چکی تھی۔ اسی طرح بلیو بیریز کی کیاری بھی۔ میں نے دس برس تک بلیو بیریز کی جھاڑیوں کی اپنے بچوں کی طرح نگہداشت کی تھی۔

جبکہ ویسپر کا خیال تھا کہ میں نے ان جھاڑیوں کو کھود کر اپنی بیوی مائرا کو اس گڑھے میں ڈال دیا تھا اور ان جھاڑیوں کو دوبارہ بو دیا تھا۔ کیا اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا؟ نہیں، بائی گاڈ یہ سب کچھ ہرگز درست نہیں ہوا تھا۔

اس کے بعد آنے والے ہفتوں میں، میں اس بات سے باخبر رہا تھا کہ سراغ رساں ویسپر نے ابھی تک ہار نہیں مانی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے ساتھ کام کرنے والوں کے انٹرویو لیے گئے ہیں کیونکہ جب میں ان کے پاس ہوتا تھا تو وہ عجیب بے چین سے ہو جاتے تھے اور مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کرتے تھے۔

اس کے علاوہ پڑوس کی بعض خواتین مجھے دیکھ کر یا تو اپنی نظریں پھیر لیتی تھیں یا پھر اپنی نگاہیں مجھ پر جما کر مجھے گھورتی رہتی تھیں۔ میں بھی جب کسی پولیس مین کو دیکھتا تھا تو مجھے خاص طور پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میری نگرانی کر رہا ہے۔

ادھر اینجلا بھی بلاشبہ ہر روز مجھے فون پر اپنی احمقانہ دھمکیاں دیتی رہتی تھی۔

☆☆☆

سراغ رساں ویسپر کچن ٹیبل کی ایک سائڈ پر اور میں اس کی مخالف سمت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک نیلا لفافہ کھولا اور اس کے اندر سے آٹھ بائی دس کی ایک رنگین تصویر باہر نکال لی۔ نصف تصویر ایک بزنس لفافے سے ڈھکی ہوئی تھی جسے ایک پیپر کلپ سے منسلک کیا ہوا تھا۔

ویسپر نے وہ بزنس لفافہ ایک طرف کھسکا دیا اور تصویر میرے سامنے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟''

وہ تصویر قدرے اونچائی سے کھینچی گئی تھی۔ منظر کسی قسم کے اسٹور کے اندر کا تھا۔ مجھے تصویر میں ڈھلے کاؤنٹر کا ایک کنارہ دکھائی دے رہا تھا جس پر پوٹیٹو چپس، کارن چپس اور اسی قسم کے دیگر پیکٹ سجے ہوئے تھے۔ اس کے برابر میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ دراز قامت، سانولی رنگت...... وہ نہایت چوکنا نظر آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی چوکسی کا تعلق اس گن سے ہے جو اس کے ہاتھ میں دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا اس شخص کو کبھی دیکھا ہے؟'' سراغ رساں ویسپر نے سوال کیا۔

''نہیں، میرے خیال میں کبھی نہیں دیکھا۔''

تب سراغ رساں ویسپر نے کلپ نکال دیا اور لفافہ علیحدہ کرنے کے بعد ایک دوسری تصویر باہر نکال لی۔

اس تصویر میں بھی کاؤنٹر پر مختلف اشیا بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی کیش رجسٹر بھی نمایاں تھا۔ کیش رجسٹر کے پاس ایک کلرک موجود تھا جس کی پشت کیمرے کی جانب تھی۔ وہ کاؤنٹر پر رقم ڈھیر کر رہا تھا اور اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ ہتھیار تھامے ہوئے دراز قامت سانولے شخص کے برابر میں ایک عورت کھڑی تھی جس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

''اس عورت کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' سراغ رساں ویسپر نے پوچھا۔

میں اس تصویر کو تکتا رہ گیا۔ ''ہاں، یہ مائرا ہے۔ اسے کوئی گزند تو نہیں پہنچی؟''

تب سراغ رساں ویسپر نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ''وہ اس شخص کے ہمراہ آئی تھی اور اسی کے ساتھ واپس بھی چلی گئی تھی۔''

''یہ تصویر کب اتاری گئی ہے؟''

''دو روز قبل۔ کیا تمہاری بیوی نے تم سے کوئی رابطہ کیا ہے؟''

''نہیں، وہ کیوں رابطہ کرے گی؟''

''جس وقت وہ دونوں اس اسٹور سے نکل رہے تھے تو شیرف کا ایک ڈپٹی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسٹور میں کوئی واردات ہوئی ہے لیکن اس ڈپٹی کی آمد نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ اس لیے وہ اپنا لباس لینے کے لیے واپس اس موٹیل میں بھی نہیں گئے جہاں ان کا قیام تھا۔''

''کیا تم نے یہ تصویر مائرا کی بہن کو دکھائی ہے؟''

''نہیں، ابھی تک تو نہیں دکھائی۔''

''کیا تم اسے دکھا دو گے؟ شاید تب وہ مجھے اپنے احمقانہ فون کرنا بند کر دے۔''

اس بات پر سراغ رساں ویسپر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ ''غالباً مجھے دکھا دینی چاہیے۔ اگر تمہاری بیوی تمہارے پاس واپس آجائے تو کیا تم مجھے اس کی خبر کر دو گے؟''

''کیوں؟''

''اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ میرے خیال سے اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ ہم اس شخص کے بارے میں مزید جاننا

چاہتے ہیں۔ بے شک اگر تمہاری بیوی اب بھی اس شخص کے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن یہ کچھ اچھا نہیں ہوگا۔''

میں نے شانے اچکا دیے۔

''میں معافی چاہتا ہوں تمہیں پریشان کیا۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کوئی بھی اپنے اوپر قتل کا الزام پسند نہیں کرتا لیکن تمام باتوں پر لعنت بھیجو۔ بس میں اس بارے میں پُریقین تھا۔ میں شاذونادر ہی غلطی پر ہوتا ہوں۔ میں ایمان داری سے کہہ رہا ہوں، میں یہی سمجھا کہ تم نے اسے ٹھکانے لگادیا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔ گرمیوں کے اختتام پر میں خزاں کی چند فصلیں بوائی کرنا چاہتا ہوں جیسے مولی، گاجر، بند گوبھی، پھول گوبھی وغیرہ اور ایسی ہی دیگر سبزیاں۔ اگر تم باغ کو دوبارہ کھودنے کا ارادہ رکھتے ہو تو میری خواہش ہے کہ تم اس وقت تک انتظار مت کرنا کہ ان کی بوائی ہوجائے اور پھر تم اسے دوبارہ کھود ڈالو۔''

☆☆☆

کام سے واپسی پر جب میں نے اپنی گاڑی گیراج میں کھڑی کی تو انجن کا سوئچ آف کرتے ہی مجھے وہ آواز سنائی دی۔

ٹیلی ویژن آن تھا۔

میں ایک منٹ تک کار کے اندر ہی بیٹھا رہا اور خود کو صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگا پھر اندر چلا گیا۔

مائرا صوفے پر گھٹنے سمیٹے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک میگزین تھا اور وہ اس کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ ٹی وی کی اسکرین پر کسی سافٹ ڈرنک کا ٹین ایج کمرشل دکھایا جارہا تھا اور ٹی وی کی آواز حسبِ معمول تیز تھی۔

جب میں اندر داخل ہوا تو مائرا کے ہونٹوں پر ایک تھکی سی مسکراہٹ اُمڈ آئی اور وہ بولی۔ ''ہائے، کیا تم مجھے مس کررہے تھے؟''

میں نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھالیا اور آف کا بٹن دبا دیا۔ وہ شکایت کرنا ہی چاہ رہی تھی لیکن عین وقت پر اپنا ارادہ بدل لیا۔

''تم کہاں تھیں؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے حقیقت میں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس وقت اس سے اور کیا کہوں۔

''بہت سی جگہوں پر۔''

''تنہا تو نہیں تھیں۔''

''میں ہوسکتی ہوں۔''

''نہیں، تم نہیں ہوسکتیں۔''

اس نے اپنا سر قدرے خم کیا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں واقعی میری کوئی پروا نہیں ہے۔ ہے نا؟''

''کوئی خاص نہیں۔''

''ویل، اگر تم لازمی جاننا چاہتے ہو تو میں کسی کے ساتھ تھی۔ وہ مجھے ایک بار میں ملا تھا۔ کیا تمہیں یہ سن کر شاک پہنچا؟'' مائرا نے پوچھا۔

''تمہاری بہن کو معلوم نہیں تھا کہ تم جارہی ہو؟''

''میں انجیلا کو ہر بات نہیں بتاتی۔''

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میری یہ عادت مائرا کو ہمیشہ بے چین کردیتی تھی۔ اس کی نظریں ٹی وی کے ریموٹ کو تلاش کرنے لگیں، تب اس نے دیکھا کہ ریموٹ بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔

''ویل، لعنت بھیجو! تم مجھے سیروتفریح کے لیے کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں لے گئے۔ سو میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی جو سیروتفریح کا دلدادہ تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ چلی گئی تھی تو پھر کیا ہوا؟ تم نے تو کبھی میری پرواہی نہیں کی۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے گھورنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں قائم نہ رہ سکی۔ ''سنو، ہمیں لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' ساتھ ہی میری طرف اپنی بھرپور لجادینے والی بناوٹی مسکراہٹ سے دیکھنے لگی۔

میں خاموش رہا۔

''میں واپس آگئی ہوں۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''وہ شخص کہاں ہے؟''

اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں چرائیں پھر دوبارہ نظریں ملاتے ہوئے بولی۔ ''وہ جاچکا ہے۔''

میں اس کی نظروں سے نظریں ملائے اس کے مزید کچھ کہنے کا منتظر رہا۔ وہ قدرے توقف کے بعد گویا ہوئی۔ ''ہمیں کچھ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑگیا تھا۔ وہ کتیا کا بچہ ساتھ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا لیکن اب یہ قصہ تمام ہوچکا ہے۔ اب سب کچھ پہلے کی طرح ہوگا۔ میں واپس آچکی ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''نہیں، تم واپس نہیں آئی ہو۔''

''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''اس کا مطلب ہے کہ میں تمہیں یہاں واپس نہیں چاہتا۔''

"ویل، یہ تو بہت بری بات ہے۔ ہے نا؟"
"تمہاری بہن سمجھتی ہے کہ میں تمہیں قتل کر چکا ہوں اور یہی خیال پولیس کا بھی ہے۔" میں نے کہا۔
وہ ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آگئی پھر تڑخ کر بولی۔ "کیا تم؟ یہ تو ایک لطیفہ ہے۔ تمہارے اندر......"
"وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے تمہیں قتل کر دیا ہے اور تمہیں باغ میں دفن کر دیا ہے۔"
اس بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ "تم سنجیدہ نہیں ہو۔"
"وہ پھاوڑے اور بیلچے لے کر یہاں آئے تھے۔ تمہاری لاش کی تلاش میں انہوں نے سب کچھ کھود کر رکھ دیا تھا۔ پورا باغ تہس نہس کر ڈالا تھا۔ کوئی بھی جگہ باقی نہیں چھوڑی تھی۔ حتیٰ کہ بلیو بیری کی وہ جھاڑیاں بھی جو برسوں سے وہاں موجود تھیں۔ ہر چیز بے جان کر دی...... ہر چیز تباہ کر دی۔"
وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔ "اوہ! یہ تو واقعی بڑی تمسخر انگیز بات ہے۔ حقیقت میں تو تمہیں بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ یہ خیال ہی بڑا مضحکہ خیز ہے۔ تم تو مجھے جانتے ہو...... میں اس باغ کے اندر مردہ نہیں پائی جا سکتی۔"
میں قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ تب اس لمحے پہلی مرتبہ یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس وقت تک تو میں اس کے گھر میں موجود نہ ہونے سے صرف لطف اندوز ہوا تھا اور اب......
میں اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں دھیرے دھیرے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر لے گیا۔ میں نے اپنی انگلیاں اس کے گال پر رکھ دیں اور انگلیوں کی پشت سے اس کے رخسار کو سہلانے لگا۔ ساتھ ہی بولا۔ "کیا تم یہ یقین سے کہہ رہی ہو؟"
اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کرے یا الجھن میں پڑ جائے۔ "کس بارے میں یقین کا کہہ رہے ہو؟"
میں مسکرانے لگا۔ میرا ہاتھ اس کے کان کے شیپ کا جائزہ لیتا ہوا نرمی سے پھسلتا ہوا اس کی گردن کے خم پر آگیا۔ "باغ کے بارے میں۔"
وہ یہ سنتے ہی تن کر بیٹھ گئی اور اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ "کیا؟"
میری انگلیاں پھسلتی ہوئی اس کی گردن کے عقب میں پہنچ گئیں۔ میرا انگوٹھا سامنے نرخرے پر آگیا۔ "باغ نہایت عمدہ ہے۔ وہاں پر بے حد سکون ہے۔"

اس وقت تک وہ بالکل سیدھی اور تن کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی خوف اور دہشت کے تاثرات امڈ آئے تھے جیسے کہ اس تصویر میں تھے جب وہ اس شخص کے ہمراہ اسٹور میں تھی اور وہ ڈکیتی کی واردات کر رہا تھا۔
میں اس کے اور قریب ہوگیا۔ میرا دوسرا ہاتھ میرے پہلے ہاتھ سے ملنے کے لیے آگے بڑھنے لگا۔

☆☆☆

اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔
میں یہاں بیٹھ کر اپنے اجڑے ہوئے باغ کو دیکھ رہا ہوں۔ جو کچھ بچ رہا ہے وہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بلیو بیریز کی مختلف ورائٹیز اور نئی جھاڑیاں حاصل کر سکتا ہوں تاکہ ان کی صحیح طور پر بوائی ہو جائے پھر موسم خزاں میں، میں نئے پھل، پھول اور سبزیوں کی بوائی کر سکوں گا۔ اگلی مئی تک نئے پودوں کی تازہ کھیپ اگنا شروع ہو جائے گی۔ پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے گا۔ پھلوں، پھولوں اور سبزیوں سے لدا خوشنما باغ۔ آپ مشکل ہی سے تمیز کر پائیں گے کہ یہ وہ پہلا باغ ہے یا نیا باغ!
میری محنت ایک بار پھر رنگ لے آئے گی۔
نہیں، نہیں...... آپ سمجھ نہیں رہے۔ مائرا اس وقت غالباً اپنی بہن کے پاس ہوگی اور اسے بتا رہی ہوگی کہ میں کتنا نفسیاتی ہوں۔ میں نے آخری بار جب اسے دیکھا تھا تو وہ اپنی گداز چھوٹی ٹانگوں سے تیز تیز چلتی ہوئی داخلی دروازے سے باہر لپک رہی تھی اور بار بار یوں پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے اچانک میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں اور میرے دانت ڈریکولا کے مانند لمبے اور نکیلے ہو گئے ہوں۔
جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا، میں اپنے آپ کو خود پسند اور برتری کے خبط میں مبتلا ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ مجھ سے کیا توقع کر رہی تھی؟ کیا وہ سچ مچ یہ سمجھتی تھی کہ میں اسے قتل کر دوں اور اسے اپنے باغ میں دفن کر دوں گا؟
ہرگز نہیں! یہ میرا باغ تھا...... میرا اپنا باغ۔ اس میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جیسے کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ اب میں قطعی پرسکون اور بالکل مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی اور نہ ہی میں اس کی واپسی چاہتا تھا۔
میں زندگی بھر سکونِ قلب کا متمنی رہا تھا اور اب مجھے آئندہ زندگی کے لیے سکونِ قلب حاصل ہوگیا تھا۔



قسط:17

شیش محل

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی وارداتِ قلبی کی عکاس دلچسپ داستان



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیامِ پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں ولدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے ولدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق رمن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دورانِ ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھاٹیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ رمن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھاٹیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھاٹیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ رمن دادا محلے کی ایک بیوہ ثریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے۔ مجو دادا اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو غنڈوں کے ذریعے رمن کے ایک آدمی کو قتل کرا دیتا ہے۔ رمن کو اب مجو کی تلاش ہوتی ہے۔ رمن جولیٹ سے ملاقات کے دوران کچھ سوالات کرتا ہے جس سے اسے جولیٹ کی زندگی تباہ کرنے والے کے بارے میں چھان بین کا موقع مل جاتا ہے۔ بملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر رمن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو اٹھا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس رمن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے۔ رمن جولیٹ کا بدلہ لینے کے لیے پنجاب میں ولدار آغا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے لیکن ولدار آغا ملک سے باہر ہوتا ہے اس لیے رمن کو واپس آنا پڑتا ہے۔ رمن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدرآباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر اس کی تلاش میں اسٹیشن پر معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہیں وہ چاند بانو کے ایکسیڈنٹ کے ذمے دار گنیش کو دیکھ لیتا ہے۔ دونوں کے درمیان دھینگا مشتی میں گنیش جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ فاروق بملا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ فاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ حویلی میں آپا بیگم کا بیٹا اختر جولیٹ کو پامال کرنا چاہتا ہے تاہم جولیٹ کے شور مچانے پر وہ پکڑا جاتا ہے۔ اسی وقت جولیٹ انکشاف کرتی ہے کہ وہ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور آگے کا فیصلہ نواب سلیم اللہ کی حویلی آمد تک موقوف ہو جاتا ہے۔ تاہم نواب صاحب ہندو بلوائیوں کے حملے میں شدید زخمی ہو جاتے ہیں اور حویلی میں تاحال صورتِ حال تبدیل ہو جاتی ہے۔ ادھر رمن فاروق کی تلاش کرتے کرتے اصل حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے اغوا میں بھاٹیہ سیٹھ کی بیٹی بملا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ادھر بملا فاروق کو خود کو اپنانے پر زور دیتی ہے۔ فاروق اسے انکار کر دیتا ہے۔ بملا کے ہاتھ میں چاقو ہوتا ہے۔ وہ اس سے آخری الفاظ ادا کرتی ہے اور اس کا چاقو والا ہاتھ حرکت میں آتا ہے۔ فاروق کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

فاروق کے لیے یہ صورتِ حال قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بملا اس کے چاقو کو اس طرح استعمال کرے گی۔ وہ حیرت اور دکھ کے جذبات کے ساتھ خون کے اس فوارے کو دیکھ رہا تھا جو بملا کے سینے سے پھوٹ رہا تھا اور وہ ماہیِ بے آب کی طرح بستر پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا موت کا فرشتہ اس کمرے سے خالی ہاتھ نہیں جائے گا اور فاروق سمجھا تھا کہ وہ اس کی جان کے درپے ہے۔ بملا کے سابقہ کردار کو دیکھتے ہوئے وہ یہی سوچ سکتا تھا لیکن وہ واقعی حیران کن عورت تھی اور اپنے دعوے کے مطابق اس نے وہ کر ڈالا تھا کہ فاروق مرتے دم تک اسے نہیں بھول سکتا تھا۔ لوگ محبت میں جان دینے کے زبانی دعوے کرتے ہیں لیکن اس نے تو سچ مچ جان دے ڈالی تھی۔ وہ حقیقتاً فاروق پر مرمٹی تھی۔ وہ اسے اس حد تک مطلوب تھا کہ اس کے انکار کے بعد اپنی انتہا پسند طبیعت کے باعث اسے زندہ رہنا ہی منظور نہیں رہا تھا۔ اس پاگل پن اور دیوانگی کو دل میں کیا مقام دیا جائے؟ یہ فیصلہ تو فی الحال فاروق نہیں کرسکتا تھا لیکن صورتِ حال کی نزاکت کا اسے شدت سے احساس ہوگیا تھا۔ بملا کی حالت سے ظاہر تھا کہ بس وہ چند پل کی مہمان ہے اور وہ اس کی لاش کے ساتھ یہاں پایا جاتا تو بہت جھنجٹ میں پڑ جاتا۔ تفتیش، وضاحتیں، قانونی موشگافیاں جانے کن کن مسائل سے اسے نمٹنا پڑتا اور وہ یہ سب نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو ابھی دلدار آغا سے نمٹنا تھا۔ جولیٹ کے پیچھے جانے نہ جانے کا فیصلہ ابھی وہ نہیں کرسکا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ جولیٹ کے مجرم کو کسی صورت معاف نہیں کرے گا اور اسے اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود آزاد رہے۔

یہ سب سوچ کر اس نے فوری طور پر وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا اور جدوجہد شروع کردی۔ ہوش میں آنے کے بعد سے وہ مستقل بملا کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہا تھا اس لیے اسے اپنی بندشوں کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جو اس نے ان پر توجہ دی تو احساس ہوا کہ اسے بہت اناڑی پن کے ساتھ کرسی سے باندھا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ کام بملا نے کیا تھا اور وہ ایسے کسی کام میں مہارت نہیں رکھتی تھی۔ اس نے ایک نظر بملا پر ڈالی۔ اس کا جھٹکے کھاتا وجود اب آہستہ آہستہ ساکت ہوتا جارہا تھا اور وہ بہت مشکل سے سانس لے رہی تھی لیکن اس عالم میں بھی اس کی نظریں فاروق پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ حسرت و کرب کی تصویر وہ آنکھیں، فاروق نے اپنے دل میں کھبتی ہوئی محسوس کیں۔ بمبئی کے جانے مانے سیٹھ کی اکلوتی بیٹی بملا بھاٹیہ جسے یقینی طور پر اپنی امارت پر ناز تھا، کیسے اپنی ناتمام تمناؤں اور آرزوؤں کو اپنے دل میں لیے اس دنیا سے خالی ہاتھ واپس جارہی تھی۔ فاروق کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے شاید مسکرانے کی کوشش کی لیکن تکلیف کی شدت کے باعث اس کے ہونٹ بس ذرا سے ٹیڑھے ہوکر رہ گئے اور پھر اس کے جسم نے آخری زوردار جھٹکا کھا کر روح کو اپنی قید سے آزاد کردیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی فاروق پر مرکوز رہ گئیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی دردناک موت پر فاروق کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپک گیا۔ کل عالم کو اپنی جاگیر سمجھنے والی کا یہ انجام بہت ہی دردناک تھا۔ اس کے انجام پر رنجیدہ فاروق ایک بار پھر اپنی آزادی کی فکر میں مبتلا ہوا اور سر جھکا کر پہلے اپنے دائیں ہاتھ کی بندشوں کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ دانتوں کی مدد سے رسی کی گرہیں کھولنے کی کوشش کررہا تھا۔ زیادہ مضبوط گرہیں نہ ہونے کے باوجود اس طرح ایک رخ پر جھک کر صرف دانتوں کی مدد سے یہ کام کرنا اتنا بھی آسان نہیں تھا، وہ بھی ایسی صورتِ حال میں کہ اس کے عین سامنے بملا کی خون میں تربتر لاش پڑی تھی۔

گرہیں کھولتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں لیکن بہرحال تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ ایک ہاتھ آزاد ہوا تو باقی کے کام میں بالکل بھی مشکل نہیں رہی اور اس نے ایک ایک کر کے اپنا بایاں ہاتھ اور دونوں پیر کھول لیے۔ کرسی سے اٹھ کر پہلے اس نے ہاتھ پیروں کو حرکت دے کر خون کی روانی کو بحال کیا اور پھر درمیانی فاصلہ طے کر کے بستر کے قریب پہنچا۔ بستر کی چادر خون میں تربتر تھی۔ اس نے اپنی آستینیں اوپر چڑھائیں اور بہت احتیاط سے بملا کے سینے میں گھپا اپنا چاقو کھینچا۔ چاقو نکالنے پر اس کے سینے سے مزید خون کا اخراج ہوا جس نے فاروق کے ہاتھ کو بھی بھگو دیا۔ فاروق نے بستر کی چادر کے ایک صاف کونے سے اپنا ہاتھ اور چاقو دونوں اچھی طرح صاف کیے اور چاقو دوبارہ جیب میں واپس ڈال لیا۔ چاقو جیب میں ڈالتے ہوئے اسے جیب میں بٹوے کی موجودگی کا احساس ہوگیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے اغوا کرنے کے بعد اس کی جیبوں کی تلاشی لینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی اور بملا نے صرف اس کا چاقو باہر نکالا تھا۔ اپنا چاقو فاروق کو بڑا عزیز تھا اور وہ زیادہ تر اسے اپنی جیب میں ہی رکھتا تھا۔ یوں بھی چاقو جیب

میں رکھنا اڈے کی روایت کا حصہ تھا اور وہ اڈے سے اپنی وابستگی کے باعث اس روایت کا پاسدار تھا۔

ربن اوروں کی طرح اس سے کام نہیں لیتا تھا لیکن اسے چاقو بہت عمدہ مہیا کر رکھا تھا۔ فاروق خود اس چاقو کو بہت خیال اور احتیاط سے رکھتا تھا اور اس کی کارکردگی سے واقف تھا کہ یہ کیسے سخت سے سخت شے کو مکھن کی طرح کاٹ ڈالتا ہے۔ بملا کے سینے سے چاقو نکالتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ بملا نے اپنے اناڑی پن کے باعث ویسا وار نہیں کیا تھا جیسا کوئی ماہر کرتا ہے۔ اگر وہ ماہر ہوتی تو چاقو اس طرح اس کے سینے میں اترتا کہ دل کا کام تمام کر دیتا اور وہ اتنا تڑپ کر مرنے کے بجائے سیکنڈوں میں جان سے چلی جاتی۔ بہرحال اس کے نصیب میں جیسی موت لکھی تھی وہ ویسے ہی مری۔ فاروق اس کے مرنے پر دل میں افسوس محسوس کرنے کے علاوہ اب اس کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا۔ اسے جو کرنا تھا اب اپنے لیے کرنا تھا چنانچہ پہلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا اور بال سنوار کر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے باہر نکلا۔ وہاں چھائے سناٹے سے اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ بنگلا خالی ہے اور شاید یہاں اس کے سوا کوئی ذی نفس موجود نہیں ہے۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکنے پر اسے پورچ میں کھڑی بملا کی گاڑی نظر آئی۔ بہت نوعمری کے دور میں اس نے اچھی خاصی گاڑی چلانا سیکھ لی تھی لیکن اب مشق نہیں رہی تھی۔ یوں بھی اسے گاڑی کی چابی کا علم نہیں تھا۔ ممکن تھا چابی بملا کے پرس میں موجود ہو لیکن وہ گاڑی میں جانے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا تو چابی کس لیے ڈھونڈتا۔ وہ دبے قدموں باہر نکلا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے اپنے قدم آگے بڑھائے۔ تین چار قدم ہی آگے چلا ہوگا کہ یکدم چوکیدار سامنے آگیا۔

''کہاں جاتے ہو صاحب؟'' چوکیدار نے اس سے دریافت کیا تو اس کے الفاظ، لہجے اور چہرے کے تاثرات سے فاروق کو اندازہ ہوا کہ چوکیدار کو اس کی صحیح حیثیت کا علم نہیں ہے اور نہ ہی اسے اس کے متعلق کوئی واضح ہدایات دی گئی ہیں اس لیے وہ اس کے ساتھ اپنے برتاؤ کے معاملے میں تذبذب کا شکار تھا۔ وہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کر کے چوکیدار کے اس تذبذب کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے یہی کیا اور سنجیدہ و باوقار لہجے میں بولا۔

''مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔''

''اور مالکن......'' چوکیدار تھوڑا سا الجھا۔

''وہ ابھی سو رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بہت تھک چکی ہیں اور دیر تک سونا چاہتی ہیں اس لیے کوئی انہیں پریشان نہ کرے۔'' فاروق نے باوقار لہجے میں ایسے احکامات صادر کیے کہ چوکیدار لمبے وقت تک اندر نہ جائے اور بملا کی لاش دریافت ہونے کا دورانیہ بڑھ جانے سے خود اسے زیادہ مہلت مل جائے۔

''ٹھیک ہے صاحب! اپن دھیان رکھے گا۔'' چوکیدار نے حسبِ عادت فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر فاروق نے قدم آگے بڑھائے، چوکیدار نے دوڑ کر گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔

''آپ بولو تو آپ کے لیے ٹیکسی دیکھ کر لے آؤں۔'' چوکیدار اس کے اعتماد سے مکمل طور پر متاثر ہو چکا تھا اور اب اس سے ایسا برتاؤ کر رہا تھا جیسا کسی معزز مہمان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود آگے سے ٹیکسی لے لوں گا۔''

فاروق نے جواب دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ کل رات چاند بانو کے کوٹھے سے نکل کر اغوا ہونے کے بعد اب اسے کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں اغوا کیا گیا تھا اور اب ہر سو صبح کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے کلائی موڑ کر گھڑی میں وقت دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ گھڑی بے شک موجود تھی لیکن وقت بتانے کے لائق نہیں رہی تھی۔ اس کا ڈائل اچھا خاصا برباد ہو گیا تھا۔ البتہ وہ سورج کی شعاعوں کی تیزی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ آٹھ بجے کے بعد کا وقت ہے۔ فضا میں سمندری نمی کا احساس بہت گہرا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد اطراف کا جائزہ لینے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ جوہو کے علاقے میں ہے۔ بمبئی میں اتنے برس گزارنے کے بعد وہ اس کے ہر علاقے سے واقف ہو چکا تھا۔ اب بھی اسے ٹیکسی اسٹینڈ کا رخ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہاں پہنچ کر ایک ٹیکسی کرنے کے بعد اس نے سیدھا اڈے کا رخ کیا۔ بعد میں وہ خود کو روپوش کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھاتا فی الحال اڈے جانا ضروری تھا کہ اسے معلوم تھا، وہاں اس کے غیاب پر ایک کہرام سا مچا ہوا ہوگا۔ اپنے چاہنے والوں کو اپنی شکل دکھا کر تسلی کروانے کے بعد ہی وہ کہیں اور کا رخ کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اختر حویلی کی مغموم فضا کی وجہ سے سخت بوریت کا

شکار تھا۔ لندن کی آزاد فضاؤں میں رہ کر اسے حویلی کی گھٹی بندھی زندگی ویسے ہی اچھی نہیں لگتی تھی اور وہ مارے باندھے ہی کچھ عرصے کے لیے یہاں آیا کرتا تھا۔ یہاں آنے کی وجوہات میں سے ایک وجہ تو اس کی ماں ندرت جہاں کا اصرار ہوتا تھا۔ اکلوتے بیٹے کی یاد سے بے قرار ہو کر وہ بار بار اسے خط بھجواتی تھیں کہ بہت مہینے گزر گئے تمہاری صورت نہیں دیکھی، کچھ دن کے لیے آ کر ماں کا کلیجا ٹھنڈا کر جاؤ۔ اسے ماں کے جذبات سے چاہے غرض تھی یا نہیں لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ان کی بات ماننے میں ہی فائدہ ہے۔ وہ اس سے خوش ہوں، اسی صورت میں اس کا اکاؤنٹ اور جیبیں بھری رہ سکتی تھیں۔ دوسرے اسے اپنے ماموں اور سسر نواب سلیم اللہ کو بھی مطمئن رکھنا ہوتا تھا کہ وہ عرصے بعد ہی سہی حویلی میں قدم رنجہ فرما کر ان کی بیٹی کے حقوق ادا کرتا رہتا ہے۔ عالیہ بھی اس کے لیے ہمیشہ ایک فرمانبردار اور وفا پرست بیوی ثابت ہوئی تھی۔ جائداد میں حصے دار ہونے کے ناتے انہیں زمینوں کی آمدنی سے باقاعدہ حصہ دیا جاتا تھا۔ اس رقم کو خرچ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی کہ ان کے جملہ اخراجات تو حویلی سے ہی پورے ہو جاتے تھے اور زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی کے بعد بھی اچھی خاصی رقم ان کے پاس محفوظ رہتی تھی۔ شوہر ہونے کے ناتے اختر اس رقم کے بڑے حصے پر بھی آسانی سے قبضہ کر لیتا تھا، یوں لندن میں اس کی زندگی نہایت عیش وآرام سے گزر رہی تھی۔ حویلی کا ایک دورہ اسے مالامال کر دیتا تھا، اس کے علاوہ چند دن کے مہمان کی حیثیت سے اس کی جو آؤ بھگت ہوتی تھی وہ اپنی جگہ تھی لیکن اس بار اسے ہمیشہ جیسی اہمیت نہیں مل رہی تھی۔ ایک تو آتے کے ساتھ اس نے نشے کی حالت میں جولیٹ کے ساتھ جو بدتمیزی کی، اس کی وجہ سے بدمزگی پھیل گئی اور ہمیشہ کی تابعدار بیوی نے یکسر آنکھیں پھیر لیں۔ باقی لوگ بھی اس کے کردار کا یہ پہلو سامنے آنے کے بعد اس سے کچھ کھنچے کھنچے تھے اور صرف ندرت جہاں ہی تھیں جو بیٹے کو بے قصور تسلیم کرتی تھیں لیکن وہ بھی نواب سلیم اللہ کو پیش آنے والے حادثے کے بعد ایسی مصروف ہو گئی تھیں کہ ان کے پاس بیٹے کے ناز نخرے اٹھانے کی مہلت نہیں تھی۔ انہوں نے اس حویلی میں جو مقام بنا رکھا تھا اسے برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس موقع پر وہ سب سے زیادہ فعال نظر آئیں اور ضعیفی کے باوجود وہ ایسا کر رہی تھیں۔ ان کی سب سے بڑی مصروفیت تو عیادت کے لیے آنے والوں سے ملاقات کرنا تھی۔ مہمانوں کے ہجوم میں گھڑی وہ بیٹے کے لیے کہاں سے وقت نکال پاتیں۔

صورت حال ایسی تھی کہ اختر فوری طور پر واپسی کا بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ نواب صاحب کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ لندن روانہ ہو جاتا تو عالیہ اور ان کے بھائیوں کے دل میں اس کے لیے مزید برائی آ جاتی اس لیے وہ بوریت کے باوجود مصلحتاً حویلی میں ٹکا ہوا تھا۔ یہاں قیام کے دوران اس کا بار بار جولیٹ سے بھی سامنا ہو جاتا تھا اور وہ ہر بار ہاتھ مل کر رہ جاتا تھا کہ حسن ورعنائی سے بھرپور یہ پیکر اس کی آغوش میں آتے آتے پھسل گیا۔ موقع ملنے پر اس کی نظریں جولیٹ کا ہی تعاقب کرتی رہتی تھیں اور وہ دل میں سوچتا رہتا تھا کہ کس طرح ایک بار پھر اس پر ہاتھ ڈال سکے۔ اس روز اسد اللہ کے ہاتھوں ہونے والی بے عزتی کے بعد اس کے سفلی جذبات کے ساتھ ساتھ منتقمانہ جذبات بھی جاگ گئے تھے اور وہ جولیٹ کو مسل کر اپنے نفس کی تسکین کے ساتھ ساتھ انتقام کی آگ بجھانے کی بھی منصوبہ بندی کرتا رہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کے باعث وہ ہر وقت جولیٹ کی تاک میں رہتا تھا چنانچہ ایک رات جب سب تھک ہار کر سونے کے لیے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، وہ جولیٹ کو تنہا چھت پر جانے والی سیڑھیوں کا رخ کرتا دیکھ کر چوکنا ہو گیا۔ وہ خود کچھ دیر پہلے ہی نواب صاحب کی طبیعت معلوم کرنے کی رسم نبھا کر آیا تھا۔ آج ان کی حالت زیادہ ہی خراب تھی اور نواب زادی عالیہ سمیت نواب زادہ صفی اللہ اور اسد اللہ بھی ان کے کمرے میں ہی رکے ہوئے تھے۔ حویلی کے دوسرے مکینوں کو البتہ انہوں نے بااصرار آرام کے لیے بھیج دیا تھا۔ اختر بھی آرام کی غرض سے اپنی خواب گاہ میں جا رہا تھا کہ جولیٹ کو اوپر کی طرف جاتا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ادھر جولیٹ اس کی نظروں سے بے خبر تھی سو بے خوف وخطر اوپر چلی گئی تھی۔ اسے جوزفین کی ڈائری سے اوپر موجود اس کمرے کے بارے میں معلوم ہوا تھا جہاں جوزفین اور اسد اللہ اکثر اپنی خفیہ ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ حویلی آنے کے بعد کئی روز گزر جانے کے باوجود اس نے ابھی تک وہ کمرا نہیں دیکھا تھا البتہ اسد اللہ سے اس کے بارے میں گفتگو ضرور ہوئی تھی اور انہوں نے اسے بتایا تھا کہ اس کمرے کو جوزفین کی یادگار کے طور پر انہوں نے جوں کا توں رکھا ہوا ہے اور صفائی کے لیے جانے والی ملازمہ کے علاوہ کسی کو اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے پھر انہوں نے بڑی شفقت سے کمرے کے تالے کی چابی جولیٹ کے حوالے

کرکے اسے وہاں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

چابی مل جانے کے باوجود جولیٹ کو وہاں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔خصوصاً نواب سلیم اللہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بعد تو وہ بہت مصروف ہوگئی تھی لیکن اس روز عشرت جہاں کے دیے طعنوں نے اسے اتنی الجھن میں ڈال دیا تھا کہ مصروفیت کے باوجود اس کا ذہن مسلسل اس بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ جوزفین اور جوزف کے ساتھ رہ کر وہ عیسائی مذہب کی ہی پیروکار تھی لیکن اب اسے خیال آرہا تھا کہ جوزفین نے اس کی تربیت کرتے ہوئے کبھی بھی مذہب کو بہت زیادہ ترجیح نہیں دی تھی۔ وہ نہ تو اسے پابندی سے چرچ لے جاتی تھی اور نہ ہی اسے عیسائیت کی تبلیغ کرتی تھی، بس وہ اس کی بیٹی ہونے کے ناتے عیسائی تھی اور وہ بھی اپنی کمیونٹی کی دیگر لڑکیوں سے خاصی مختلف۔ جوزفین نے اسے ہمیشہ جسم کو ڈھانپنے والا مکمل لباس پہنایا تھا اور وہ اسے لباس کے ساتھ اسکارف کا بھی باقاعدگی سے استعمال کرواتی تھی۔ ایسا شاید وہ اس وجہ سے کرتی تھی کہ اسے احساس تھا کہ جولیٹ ایک مسلمان باپ کی بیٹی ہے اور اسے اس کی اصل سے الگ نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ خود مذہب اسلام سے متاثر ہو اور اسد اللہ سے شادی کی صورت میں مذہب تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتی ہو لیکن پھر قسمت نے ساتھ ہی نہیں دیا اور وہ جوزف کی زندگی کی ساتھی بن گئی۔ جوزف کو اپنانے کے بعد بھی اس نے اسد اللہ کو اپنے دل سے نہیں نکالا تھا اور بیٹی کے لیے اپنی داستانِ حیات تحریر کرکے اس بات کا انتظام کردیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنے باپ کے پاس چلی جائے۔ اسے اندازہ ہوگا کہ باپ کے پاس جانے کی صورت میں جولیٹ کے سامنے مذہب کے انتخاب کا مسئلہ ضرور آئے گا اسی لیے اس نے اسے عیسائیت کی طرف زیادہ راغب نہ کرکے اس کے لیے یہ گنجائش چھوڑی تھی کہ وہ وقت آنے پر دونوں ادیان کا تقابلی جائزہ لے کر اپنے لیے کسی ایک مذہب کا انتخاب کرلے۔

ماں کے کردار کے اس پہلو کو سوچتے ہوئے جولیٹ کو بہت شدت سے اس کی یاد آئی تھی اور اس یاد ہی نے اسے چھت پر بنے اس کمرے کا رخ کرنے پر مجبور کیا تھا جو اسد اللہ اور جوزفین کی محبت کا امین تھا۔ جس کے بارے میں اسد اللہ کا دعویٰ تھا کہ وہاں انہیں آج بھی جوزفین کی خوشبو آتی ہے۔ وہ بھی اپنی ماں کی خوشبو کی چاہت میں وہاں گئی تھی اور قطعی انجان تھی کہ شکاری گھات لگائے بیٹھا ہے۔

اندھیرے میں کمرے کا قفل کھول کر اندر داخل ہونے کے بعد اس نے وہاں روشنی جلائی تو ایک نہایت صاف ستھرا لیکن سادگی سے سجا کمرا اس کے سامنے تھا۔ کمرے میں ایک مسہری اور لکھنے کی میز کے سوا کوئی فرنیچر موجود نہیں تھا۔ مسہری پر ہلکے رنگ کی بے شکن چادر بچھی ہوئی تھی اور فرش پر قدرے گہرے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ جولیٹ نے حویلی کے قیمتی سازوسامان سے سجے کمرے دیکھے تھے۔ خود اس کے زیر استعمال کمرا بھی بہت شاندار تھا لیکن یہ سادہ سا صاف ستھرا کمرا عجیب ہی انفرادیت لیے ہوئے تھا۔ اسے لگا کہ سچ مچ وہاں جوزفین کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ شاید اسد اللہ کی چاہت نے اس خوشبو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کمرے میں محفوظ کردیا تھا۔ وہ کسی سحرزدہ سے شخص کی طرح دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بستر پر جا بیٹھی اور یونہی اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اسے لگا کہ وہاں اب بھی جوزفین کا لمس اور اس کے جسم کی حرارت موجود ہے۔

اپنی ماں کو اس انداز میں محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے جنہیں اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرکے وہ بستر سے اٹھی اور لکھنے کی میز کے ساتھ رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔ اسد اللہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ لندن سے اپنے ساتھ ایک کیمرا لائے تھے اور اس کیمرے سے انہوں نے دیگر اہلِ خانہ کے علاوہ جوزفین کی بھی کچھ تصویریں اتاری تھیں۔ یہ تصویریں ایک البم میں محفوظ میز کی دراز میں موجود تھیں۔ جولیٹ نے میز کی پہلی دراز کھینچی تو اس کے نتھنوں سے مسحورکن خوشبو ٹکرائی۔ اس نے دیکھا دراز میں پھولوں کے سوکھے ہوئے گجرے، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے اور ایک تہ کیا ہوا زنانہ رومال رکھا ہوا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ یہ ساری چیزیں جوزفین کی ہیں جو اسد اللہ نے بہت سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ اس نے ان چیزوں کو کسی مقدس امانت کی طرح محسوس کیا اور دراز کو آہستہ سے بند کرکے نیچے والی دراز کھولی۔ اس دراز میں مخملی فوٹو البم موجود تھا۔ اس نے البم نکال کر میز پر رکھا اور احتیاط سے اسے کھولا۔ سب سے پہلی تصویر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون کی تھی۔ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی پھر بھی اندازہ ہورہا تھا کہ انہوں نے بہت قیمتی ساڑی اور زیورات پہن رکھے ہیں۔ جولیٹ ان خاتون کو پہچانتی تھی۔ اس نے حویلی کی دیواروں پر جو تصویریں سجی دیکھی تھیں، ان میں ایک تصویر ان خاتون کی بھی تھی اور اسے معلوم تھا کہ یہ اس کی دادی تھیں جنہیں یہاں نواب بیگم کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرِ پیکار رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

بہت جلد

ماہنامہ **سرگزشت** کے صفحات پر ملاحظہ کریں

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L۔5 / 79 ڈاکخانہ 5.L / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

اس سے اگلی دو تین تصویریں خاندان کے افراد کے گروپ فوٹو تھے جن میں سے بڑوں کو تو وہ پہچان سکتی تھی البتہ جو بہت چھوٹے تھے، انہیں شناخت کرنے میں اسے دشواری پیش آرہی تھی۔ سچی بات یہ تھی کہ اس نے اس سلسلے میں کوشش بھی نہیں کی اور سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ اسے اس وقت سب سے زیادہ جوزفین کی تصویر دیکھنے کی خواہش تھی اور اگلے صفحے پر اس کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔ چوڑی دار پاجامے اور کرتے میں چنا ہوا دوپٹا اوڑھے کھڑی جوزفین ایک دبلی پتلی، نازک سی نوعمر لڑکی کی صورت اس کے سامنے تھی۔ اسے اپنی ماں کی نوجوانی کی تصویر دیکھنا بہت اچھا لگا۔ تصویر میں اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے ان میں وہ تھوڑی گھبرائی اور تھوڑی شرمائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً اس نے پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تھا اور پھر تصویر کھینچ بھی اسد اللہ رہے تھے اس لیے اس کی یہ کیفیت تھی۔ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد اس نے اس خیال سے دوسرا ورق پلٹا کہ وہاں بھی جوزفین ہی براجمان ہوگی لیکن غیر متوقع طور پر وہاں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکے کی تصویر موجود تھی۔ لڑکے نے کھیل کا لباس پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں ہاکی اسٹک اٹھا رکھی تھی۔ تصویر کھنچواتے ہوئے وہ بہت اعتماد سے مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خود اعتمادی اور ذہانت کی جھلک تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر وہ الجھن اور تجسس میں مبتلا ہوگئی۔ اس نے اتنے عرصے میں خاندان کے تمام افراد کی مختلف ادوار کی تصویریں دیکھ رکھی تھیں لیکن یہ لڑکا اسے ان تصویروں میں کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کے لیے شناسائی محسوس کر رہی تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے اس لڑکے کو کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہاں؟ وہ اس پر غور کر پاتی، اس سے قبل ہی اختر دبے قدموں اس کے پیچھے پہنچا اور اس کی محویت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خاموشی سے اتنی مضبوطی کے ساتھ اس کا منہ دبوچا کہ وہ اپنے منہ سے معمولی سی بھی آواز نہیں نکال سکی۔

☆☆☆

بھابیہ کی کوٹھی سے نکل کر فاروق سیدھا اڈے پر پہنچا تو اسے دیکھ کر سب کھل اٹھے اور بھینچ بھینچ کر گلے ملنے لگے۔ اکبر تو باقاعدہ رو پڑا۔

"ارے، ارے یہ کیا؟ بہادر بنو یار...... میں صحیح سلامت تمہارے سامنے کھڑا ہوں پھر کیوں آنسو بہاتے ہو۔" فاروق اسے بہلانے لگا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ آپ صحیح سلامت لوٹ آئے لیکن اتنے عرصے میں مجھ پر کیا گزری، یہ تو بس میں اور میرا رب ہی جانتے ہیں۔ مجھ خالی دامن کے پاس آپ کے سوا ہے ہی کیا۔ آپ ہی سے تو مجھے جینے کا حوصلہ ملتا ہے ورنہ میں کہاں اتنے حوصلے والا تھا کہ سب کھو کر بھی جیتا رہتا۔" اکبر کے لہجے میں اس کے دل کی سچائی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اپنی محبوبہ پارو کو کھونے کے بعد وہ فاروق کی ہمدردی اور محبت کے نتیجے میں ہی خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

"میں تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں اکبر لیکن یاد رکھو کہ فقط کوئی ایک شخص چاہے وہ آپ کو کتنا ہی عزیز ہو، سب کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے بھری یہ اتنی بڑی دنیا بنائی ہے تو اس کا بھی کوئی سبب ہے۔ ایک کے بعد ایک جینے کے سہارے وہ خود پیدا کر دیتا ہے۔ بس انسان کو اس کی مصلحت کو سمجھ کر تھوڑے سے حوصلے اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جو آپ کے لیے خاص ہے، وہ ہمیشہ خاص ضرور رہتا ہے لیکن اس کے ہونے سے زندگی کو مشروط کرنا اللہ کی نعمتوں کی ناشکری ہے۔ اس مالک نے انسان کو پیدا کیا ہے جو جینے کے اسباب بنانا بھی خوب جانتا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں نہ بھی رہا تو اس اڈے کا ہر فرد تمہارا ویسے ہی خیال رکھے گا جیسے میں رکھتا ہوں بلکہ میں تو پھر بھی تھوڑا بے پروا انسان ہوں، یہ لوگ مجھ سے بہت زیادہ ذمے دار ہیں۔ کیوں جانی...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" اکبر کو سمجھاتے سمجھاتے وہ جانی سے مخاطب ہوا تو وہ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

"سب ٹھیک بولے تم فاروق استاد! پر یہ تو اپن بھی بولتا ہے کہ تمہارے کو گاڈ نے کچھ اسپیشل دیا ہے۔ تمہاری والی بات کسی دوسرے بندے میں نہیں آسکتی۔" اس کے جواب پر فاروق زور سے ہنس دیا اور اکبر کا شانہ تھپک کر منہ بسورے کھڑے گولو کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کیوں دور دور کھڑے ہو بھائی! سب کی طرح پاس کیوں نہیں آتے؟"

"اپن کسی سے نہیں بولتا۔ یہ سب لوگ اپن سے جھوٹ بولا۔ بولتا تھا فاروق بھائی کام سے گیا ہے، شام تک آجائے گا پر اپن سمجھ گیا ہے کہ سب گڑبڑ تھا۔" سب کو ٹوٹ کر فاروق سے ملتے دیکھ کر اسے سمجھ آگئی تھی کہ اسے اب تک جھوٹ بول کر بہلایا جاتا رہا ہے اس لیے منہ پھلا کر شکوہ کیا لیکن فاروق کے بلانے پر اس کے قریب ضرور آگیا۔ فاروق نے خود کھینچ کر اسے گلے لگالیا اور پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"ناراض نہیں ہو یار۔ ان لوگوں نے تمہیں پریشانی سے بچانے کے لیے اصل بات نہیں بتائی ہوگی اور یہ انہوں نے بہت اچھا کیا تھا۔" گولو تھوڑا سا نخرا دکھا کر مان گیا۔ ان سب سے فارغ ہو کر فاروق نے ربن کے بارے میں دریافت کیا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ ربن اڈے پر موجود نہیں ہے ورنہ وہ بھی اس سے ملنے آچکا ہوتا۔ اس کے پوچھنے پر جانی نے اس کی تلاش کے سلسلے میں ہونے والی ساری اٹھا پٹخ کی تفصیل، ربن کے بھامیہ سیٹھ کی طرف روانگی تک کہہ سنائی جسے سن کر خود فاروق تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ربن کوئی معمولی آدمی نہیں ہے جسے کوئی تر نوالے کی طرح نگل سکے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دولت مندوں کے اپنے سو ڈھنگ ہوتے ہیں اور ان کی دولت کی طاقت وہ، وہ کچھ کر دکھاتی ہے جو بظاہر مشکل دکھائی دیتا ہے۔

اڈے کے سامنے پولیس والوں، رامو اور ربن کے درمیان ہونے والی بحث اور انسپکٹر وکرم کی گمشدگی کے بارے میں بھی اسے علم ہو گیا تھا اور یہ اندازہ بھی تھا کہ اس سلسلے میں پولیس کا ربن پر شک درست ہی ہوگا، اس لیے اس کی تشویش مزید بڑھ گئی تھی لیکن اس وقت وہ خود کیا کرے، اسے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ ربن کے پیچھے بھامیہ کی طرف دوڑ نہیں لگا سکتا تھا اور یہاں بھی زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اپنے طور پر وہ انتظام کر کے آیا تھا کہ چوکیدار بنگلے کے اندرونی حصے میں نہ جائے لیکن ایسا کب تک ہو سکتا تھا۔ اپنی مالکن کی طرف سے مسلسل خاموشی اسے تشویش میں مبتلا کر کے اندر کی طرف لے جا سکتی تھی یا کوئی اتفاق اسے ویسے ہی اندر لے جاتا اور وہ اندر جاتا تو بملا کی لاش دریافت ہو جاتی۔ بملا نے خودکشی کی ہے یہ صرف وہ جانتا تھا۔ لاش دیکھنے والوں کو تو یہی شک گزرتا کہ وہ بملا کو قتل کر کے وہاں سے فرار ہوا ہے۔ لاش دریافت ہونے کے بعد اسے قاتل قرار دے کر پولیس کے یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ پولیس ویسے ہی آج کل اڈے کی طرف سے بگڑی ہوئی تھی اس لیے اس سے کسی رو رعایت کی امید نہیں تھی۔ وہ لوگ اس پر قتل کا سنگین مقدمہ بنا کر کڑی سے کڑی سزا دلوانے کی کوشش کرتے۔ ایسی صورت میں اس کی بے گناہی کے ثبوت و دلائل پیش کرنے اور رہائی عمل میں لانے کے لیے ربن اور وکیل دونوں کو پتا نہیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے اور وقت مزید اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ جولیٹ کے مجرم کو آزاد پھرنے کے خیال سے اس کا سینہ ویسے ہی ہر وقت آگ میں جلتا رہتا تھا اور اسے کیفر کردار تک پہنچائے بغیر یہ آگ سرد ہونے والی تھی بھی نہیں۔

"فاروق بھائی! آپ نہا دھو کر کپڑے بدل لو، اتنے میں بجو ناشتا تیار کر دیتا ہے۔" وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ گولو نے اس کا بازو ہلا کر اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ناشتے کی اسے خواہش نہیں تھی حالانکہ اس نے کل رات چاند بانو کے ہاں کھانا کھانے کے بعد سے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔ بملا کی کرب ناک موت نے اس کے دل و دماغ پر اچھا خاصا اثر ڈالا تھا اور کھانے کے خیال سے ہی اسے ابکائی آرہی تھی۔ ہاں نہا کر حلیہ درست کرنے کا خیال اچھا تھا۔ امید تھی کہ شاید اس دوران ربن لوٹ آئے اس لیے اس نے ناشتے سے انکار کرتے ہوئے نہانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ گولو حسب معمول خدمت کے لیے سرگرم ہو گیا۔ وہ نہا کر فارغ ہوا تو حسبِ توقع ربن اور رامو واپس آچکے تھے۔ وہ ربن کے سامنے پہنچا تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کھنڈی دیکھی۔ ربن نے اس کے سلام کا جواب دیا اور کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر بولا۔

"تو اپنے ساتھ چل۔ تیرے کو اور یہاں نہیں رکنے کا ہے۔" اس نے فاروق کو مہلت دیے بغیر اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر کا رخ کیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے حالات کی سنگینی کا پوری طرح علم ہے۔ اس کی معلومات کے ذریعے کا فاروق کو بھی درست اندازہ نہیں تھا، خود اس نے تو ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور اپنے غیاب کے بارے میں ہونے والے اِکّا دُکّا سوالات کو بھی نظر انداز کر گیا تھا۔ کسی نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا تھا کہ ان کے لیے سب سے اہم بات یہی تھی کہ فاروق صحیح سلامت ان کے درمیان موجود ہے۔

"کہاں جانا ہے کچھ بتاؤ تو۔ ایسے بنا کسی تیاری کے کہاں لے جا رہے ہو؟" اپنے اندر ہوتی اکھاڑ پچھاڑ سے مجبور ہو کر اس نے ربن سے پوچھ ہی لیا۔

"تیرے دشمن نہیں ہیں۔ تیرا بھلا ہی سوچ رہے ہیں۔ تیرا تھوڑا سا سامان گولو سے کہہ کر تانگے میں رکھوا دیا ہے۔ باقی بعد میں جو چاہیے ہو منگوا لینا۔ ابھی تو بس ادھر سے نکلنا ہے۔" ربن نے ڈیوڑھی پر رک کر اسے عجلت میں سمجھایا۔

"پر کیوں......؟" فاروق کے لبوں سے سرسراتے لہجے میں پھسلا۔

"اپنے پیچھے بملا کی لاش چھوڑ کر آنے کے بعد بھی

پوچھتا ہے کہ کیوں......؟" ربن کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ فاروق تو سن کر ہی ٹپٹا گیا۔

"اپن اپنی آنکھوں سے اس کی لاش دیکھ کر آیا ہے۔ اب تو ساری بحث چھوڑ اور ادھر سے نکل۔ باقی کی تفصیل بعد کو کہہ سن لیں گے۔"

اس بار فاروق اس سے کچھ نہیں کہہ سکا اور خاموشی کے ساتھ پہلے سے تیار تانگے میں ربن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ تانگے والے کو یقیناً منزل کا علم تھا چنانچہ ربن کا اشارہ ملتے ہی اس نے گھوڑے کو چابک رسید کر کے اپنا تانگا آگے بڑھا دیا۔ سفر خاموشی سے طے ہوا اور ایک جگہ تانگا رکنے پر ربن نے اسے اترنے کا اشارہ کیا تو وہ اپنے سامان کا بیگ لے کر اتر گیا۔ یہ بیگ تانگے میں بیٹھتے ہی اس کی نظروں میں آ گیا تھا۔ تانگے کو فارغ کرنے کے بعد ربن اسے پیدل ہی لے کر چل پڑا۔ فاروق سمجھ رہا تھا کہ انہیں اسی علاقے میں کہیں جانا ہے لیکن اس کے اندازے کے برخلاف ربن نے ایک اور تانگا روکا اور اس میں بیٹھ کر کوچوان کو اپنی منزل سے آگاہ کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ ربن حد سے زیادہ محتاط ہے اور ہرگز بھی یہ نہیں چاہتا کہ پولیس کو اس کا کوئی سراغ مل سکے۔ نئی منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے ایک ایسی عمارت کا رخ کیا جس کی دونوں منزلوں پر اوپر نیچے بہت سے کمرے بنے ہوئے تھے اور یہ کمرے کرائے پر دیے جاتے تھے۔ زیادہ تر ان کمروں میں دور دراز علاقوں سے بمبئی میں قسمت آزمائی کے لیے آنے والے چھڑے چھانٹ ہی رہتے تھے یا پھر وہ غربت زدہ خاندان تھے جو مناسب رہائش کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے دس دس یا اس سے بھی متجاوز افراد پر مشتمل ہونے کے باوجود کھولی نما مختصر کمروں میں مشترکہ طور پر رہنے پر مجبور تھے۔

"یہ بھاؤ یہ سیٹھ کی بلڈنگ ہے۔ اپن تیرے کو ادھر اس لیے لایا ہے کہ ادھر تیرے ہونے کا کسی کو بھی مشکل سے شک پڑے گا۔ اچھو والی طرف پچھلے دنوں پولیس بہت آ جا رہی ہے اس لیے اپن آج کل ادھر کا رخ نہیں کر رہے ہیں۔ کچھ پتا نہیں کہ ادھر گلیوں میں پولیس کا کوئی ٹاؤٹ رہتا ہو اور مخبری کر ڈالے۔ دوسرے ٹھکانے پر اس حرام خور دکرم کی لاش پڑی ہے اس لیے ادھر جانا بھی ٹھیک نہیں۔ تیسری جگہ کا تیرے کو خود معلوم ہے کہ ادھر ابھی تک کسی کو دیکھ بھال کے لیے نہیں رکھا ہے اور تو ٹھہرا شہزادہ۔ تو خود کیسے اپنے لیے کھانے پینے اور دھلائی صفائی کی جھنجٹ میں پڑ سکتا ہے اس لیے اپن کو یہی ٹھیک لگا ہے کہ تو ادھر ٹھہر جائے۔ ادھر کام کرنے والے ملتے ہیں جو روپے لے کر سارا کام کر دیتے ہیں۔ آگے اپن تیرے لیے کوئی اور انتظام کر دے گا۔" عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ربن نے اسے بتایا اور مزید بولا۔

"ادھر پہلی منزل پر آدمی بیٹھتا ہے۔ تو خود جا کر اس سے کمرے کے لیے بات کر لے۔ اپن کو وہ پہچانتا ہوگا اس لیے اپن سامنے نہیں جانا چاہتے۔" فاروق نے اس کی ہدایت پر عمل کیا جبکہ ربن خود منہ چھپائے برآمدے میں ہی رکا رہا۔ وہ سیٹھ کے لیے کرایوں کی وصولی کا کام کرتا رہا تھا اس لیے کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ فاروق کمرے کی چابی لے کر آیا تو دونوں نے بتائے ہوئے کمرے کا رخ کیا۔

"اب بتا کہ تجھ پر کیا بیتی اور بملا کیسے اپنی جان سے گئی؟" چھوٹے سے سیلن زدہ کمرے میں پہنچ کر گویا ربن نے سکون کا سانس لیا اور اس سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے دھیرے سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ جواب میں ربن نے بھی اسے سب بتا دیا کہ کیسے وہ اور رامو اس بنگلے تک پہنچے جہاں بملا نے فاروق کو رکھا ہوا تھا۔ وہاں بملا کی لاش دیکھ کر سیٹھ کو بے ہوش کر کے نکل جانے کا ماجرا بھی اس نے بیان کر دیا اور بولا۔

"ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اپن تیرے کو ابھی بمبئی سے باہر نکال دیتے لیکن اپنے کو تیرے اندر کا بھی سب پتا ہے، تیرے کو جولیٹ کی بھی فکر لگی ہے اور اس کے پیچھے جانے کا ہے۔ اپن اب تک جو کھوج لگائے ہیں، اس سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ وہ حیدرآباد کی طرف ہی گئی ہے لیکن یہ بھی بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے والی بات ہے۔ ایسی تلاش میں نکلنے کے لیے آدمی کے پاس انتظام بھی اچھا ہونا چاہیے۔ اپن اس کے لیے ہی تیرے کو تھوڑا روکے ہیں۔ اپن سفر کا سارا انتظام کر کے تیرے کو جانے کا بولتے ہیں۔ تو بس اپنے کو یہ بول کہ کس کس کو اپنے سنگ لے کر جائے گا؟" اپنی بات کے اختتام پر ربن نے اس سے دریافت کیا۔ جواب میں فاروق فوری طور پر کچھ نہیں بولا اور کچھ دیر یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اچانک ہی سر اٹھا کر بولا۔

"مجھے لندن جانا ہے۔ میں دلدار آغا کے واپس آنے کا مزید انتظار نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے انجام تک پہنچائے بغیر جولیٹ کا سامنا کر سکتا ہوں اس لیے بہتر ہے کہ اس کے پیچھے جانے کے بجائے آغا کے پیچھے جاؤں۔ جولیٹ کی کھوج میں تم کسی اور کو بھیج دینا۔" وہ اس نہج پر سوچتا رہا تھا

اس لیے ربن کے سامنے اظہار میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی لیکن خود ربن ششدر تھا۔

"یہ کیا بولتا ہے رے؟ ادھر پردیس میں جا کر کہاں سر پھوڑے گا۔ آغا مل گیا اور تو نے اسے اس کے کیے کی سزا دے بھی ڈالی تو خود اپنی جان بچانے کو کیا کرے گا؟ سنا ہے ادھر کی پولیس یہاں سے بہت تیز ہے۔ وہ تیرے کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیں گے اور ادھر کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی۔" اس نے فاروق کے ارادے کی فوری طور پر مخالفت کی۔

"ایسے سینے پر بوجھ لے کر جینے سے بہتر ہے میں کچھ کر کے حوالات میں بند ہو جاؤں۔ رہی پردیس جانے کی بات تو کہاں کا پردیس۔ یہاں بھی ملکہ کی حکومت ہے اور وہاں بھی۔" اس نے ربن کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"حکومت جس کی بھی ہو، دونوں طرف کے حالات میں فرق ہے۔ ادھر انگریزوں کے قدم اکھڑ چکے ہیں اور بس کچھ وقت جاتا ہے کہ وہ ادھر سے نکل جائیں گے لیکن ادھر تو ان کا راج پکا ہے۔ ادھر تو وہ اپنے قاعدے قانون پر پورا عمل کرتے ہوں گے اور اشوک بچن جیسا کوئی وکیل قانون کو اپنے ڈنڈے سے ہانکنے کے لیے نہیں ملے گا۔" ربن کی تشویش اپنی جگہ تھی۔

"تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ میرے ساتھ لازمی کچھ برا ہوگا۔ لندن والوں کی مہارت تمہاری تربیت سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ بے فکر رہو، میں کامیاب ہی لوٹوں گا۔ یہاں رہ کر گھٹ گھٹ کے جینے سے تو بہتر ہی ہے نا کہ میں کچھ ہاتھ پیر چلا کر ہی دیکھ لوں۔" وہ ربن کو قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

"پر ادھر سب کا پتا ہے نا تجھے۔ سالوں کا کیسے تجھ میں دم اٹکا رہتا ہے۔" وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ میری خاطر نہ جا لیکن اوروں کا احساس ضرور دلایا۔

"میں بھی خود کو ان سے الگ نہیں سمجھتا۔ میرے لیے اب تم لوگ ہی میرا خاندان ہو۔ مجھے لوٹ کر تم لوگوں کے درمیان ہی آنا ہے، بس مجھے کچھ دن کی رخصت دے دو۔" اس کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ ربن مزید کچھ نہیں کہہ سکا اور اس کا شانہ تھپتھپا کر ہولے سے بس اتنا ہی بولا۔

"چل جیسے تیرا من بولے۔ اپن تیرے ادھر سے نکلنے کا بندوبست کرتا ہے۔"

"شکریہ دادا! تم نے ہمیشہ میرا بہت خیال کیا ہے۔" فاروق سچ مچ اس کا ممنون ہوا کہ اگر وہ اجازت نہ دیتا تو وہ لاکھ چاہنے کے باوجود کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

"شکریہ بول کر غیروں جیسی بات کی تو دوں گا ایک الٹے ہاتھ کا۔" ربن کی ناراضی میں بھی محبت تھی۔ فاروق بے ساختہ ہی اس سے لپٹ گیا۔ ربن نے اپنا سینہ گداز ہوتا ہوا محسوس کیا لیکن بغیر کسی جذباتیت کا اظہار کیے دھیرے سے اس کی پیٹھ تھپک کر اسے خود سے الگ کر دیا۔ اس کا منصب اسے اظہار کی اجازت ہی کہاں دیتا تھا البتہ فاروق سے جدا ہو کر جاتے ہوئے اس کے دل پر جو گزر رہی تھی، اسے وہ ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

"دو ٹکے کی لڑکی خود کو نواب زادی سمجھتی ہے۔ آج میں تجھے تیری اوقات یاد دلاؤں گا۔ تیری جیسی ناجائز اولادیں کوٹھوں کی زینت بننے کے لائق ہوتی ہیں۔ اسد اللہ کی طرح کوئی نواب زادہ اپنے گناہ کی نشانی کو ایسے گلے نہیں لگاتا۔ نوابوں کے ایسے شوق خاک میں رلنے کے لیے ہوتے ہیں اور آج میں تجھے رول کر رہوں گا۔"

اختر نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبایا ہوا تھا اور دوسرے سے اسے جکڑے ہوئے انگریزی میں مغلظات بکتا جا رہا تھا۔ جولیٹ بالکل بے خبری میں اس کا نشانہ بنی تھی اس لیے باوجود مزاحمت کے اس کے چنگل سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ اسے یہ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ پتا نہیں اس الگ تھلگ کمرے میں اس دن کی طرح کوئی اس کی مدد کو پہنچ بھی سکے گا یا نہیں۔ وہ بے طرح خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور اختر پوری قوت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اپنی اپنی جدوجہد میں مصروف ان دونوں کو علم نہیں ہو سکا کہ کب نواب زادی عالیہ کمرے میں داخل ہوئیں اور اندر کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصے سے کھولتے ہوئے انہوں نے کمرے میں ایک نظر دوڑائی تو ان کی نظر لکھائی کی میز پر رکھے سنگِ مرمر کے قلم دان پر پڑی۔ یہ قلم دان ایک بحری جہاز کے ماڈل کی شکل میں تراشا گیا تھا اور خاصا وزنی تھا۔ نواب زادی عالیہ نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوری قوت سے اختر کے سر پر پچھلی جانب دے مارا۔ اس کے حلق سے فوراً ہی ایک دردناک چیخ نکلی اور تکلیف کی شدت سے تڑپ کر اس نے جولیٹ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس کی چیخ پر جولیٹ نواب زادی عالیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ قہر برساتی آنکھوں سے اختر کو گھورتے ہوئے دوبارہ اس پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ جولیٹ کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اختر کے پہلے ہی مجروح ہو جانے والے سر پر ایک وار اور کر دیا۔ اختر جو پہلے وار کے بعد ڈگمگا رہا تھا، اس بار خود کو سنبھال نہیں سکا اور تیورا کر نیچے گر گیا۔ جولیٹ نے دیکھا کہ اس کی کھوپڑی کا پچھلا حصہ کھل گیا تھا اور خون اتنی سرعت سے بہہ رہا تھا کہ نیچے بچھے قالین پر فوری طور پر ایک بہت بڑا دھبا نمودار ہو چکا تھا لیکن نواب زادی عالیہ پر تو شاید جنون طاری ہو گیا تھا۔ اب وہ جھک کر اختر پر تیسرا وار کرنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ جولیٹ نے گھبرا کر ان کے ہاتھوں کو جکڑ لیا۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ ایسے تو یہ مر جائیں گے۔''

''ایسے گھٹیا آدمی کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ جسے خاندان کی عزت و ناموس کا خیال نہیں اور جو رشتے میں بھتیجی لگنے والی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اس کا وجود اس حویلی کے لیے ایک بوجھ ہی ہے۔'' عالیہ اس کی گرفت میں بری طرح ہانپتی ہوئی ہذیانی لہجے میں بول رہی تھیں۔ اختر وہ شخص تھا جس کے نام انہوں نے اپنی دوشیزگی کے سارے جذبات لکھے تھے اور جسے پانے کے لیے اپنی ذات کی سچائی تک کی قربانی دے ڈالی تھی۔ اگر اختر کے حصول کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ کیونکر جوزفین کے خلاف سازش میں شریک ہوتیں۔ اختر کو پانے کے لیے انہوں نے ساری زندگی کی شرمندگی اپنے حصے میں لکھ لی تھی اور جواب میں کیا پایا تھا؟ بے اولادی کا دکھ، شوہر سے طویل عرصے کی جدائیاں اور اس کی بے وفائی کے شکوک۔ کوئی انہیں بتاتا یا نہ بتاتا، وہ سمجھ سکتی تھیں کہ اختر سنہری زلفوں کی چھاؤں میں رہنے کی خاطر ہی ہمیشہ لندن میں رہنے کو ترجیح دیتا رہا ہے۔ برسوں کا لاوا آج ایک ضرب لگنے پر پھٹ گیا تھا اور محبت کی گہرائی سے جنم لینے والی نفرت نے اپنا رخ دکھا دیا تھا۔

''میں مانتی ہوں کہ یہ شخص قابلِ نفرت ہے لیکن ایک گھٹیا آدمی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر آپ کیوں خود کو مشکل میں ڈالتی ہیں۔ اس کے مرنے سے بات پولیس اور کورٹ تک بھی جا سکتی ہے اور ایسا ہونے پر آپ کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تکلیف اور مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔'' جولیٹ نے ان پر سے اپنی گرفت کمزور نہیں کی تھی اور بہت نرمی سے انہیں سمجھا رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی نظریں اختر کے وجود پر بھی ٹکی ہوئی تھیں۔ نیچے گرنے کے بعد وہ دو تین بار تڑپا تھا اور پھر ساکت ہو گیا تھا البتہ اس کے سر سے خون کا اخراج مسلسل جاری تھا اور اب یہ خون قالین میں جذب ہونے کے بجائے ایک چھوٹے سے تالاب کی صورت اختر کے اطراف میں جمع ہوتا جا رہا تھا۔ یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ اس نے نواب زادی عالیہ کو چھوڑا اور اختر کی دست درازی کے دوران الٹ کر گر جانے والی کرسی کو سیدھا کر کے انہیں اس پر بٹھاتے ہوئے نرمی سے بولی۔

''آپ یہاں بیٹھیں اور پلیز میرے واپس آنے تک یہاں سے ہلیے گا نہیں۔'' عالیہ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور ٹکٹکی باندھ کر اختر کو دیکھتی رہیں۔ جولیٹ نے بھی ایک بار پھر اختر کو دیکھا اور مزید تاخیر کو نامناسب جانتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے پہنچی اور سیدھے نواب سلیم اللہ کی خواب گاہ کا رخ کیا۔ وہاں طبی عملے کے دو افراد کے ساتھ صفی اللہ اور اسد اللہ دونوں موجود تھے۔ جولیٹ کے دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے پر دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ دونوں ہی چونک گئے۔

''کیا بات ہے جولیٹ! آپ اور اس وقت؟''

انہوں نے حیرت اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں اس سے سوال کیا۔ وہ اپنے والد کی وجہ سے بھی پریشان تھے جن کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اور نرس مسلسل ان کی طرف متوجہ تھے لیکن کچھ دیر قبل ہی ڈاکٹر نے اسد اللہ کو ایک طرف لے جا کر انہیں یہ روح فرسا خبر سنا دی تھی کہ دوا جتنی کی جا سکتی تھی، کی جا چکی تھی اور اب قدرت کی رضا کے آگے میڈیکل سائنس کی شکست کا لحہ قریب تھا۔ ڈاکٹر کی بات سن کر ان کے دل پر ایک قیامت گزر گئی تھی، اس کے باوجود انہوں نے حوصلے سے کام لیا تھا اور سب سے پہلے نواب زادی عالیہ کو زبردستی کچھ دیر آرام کرنے کے بہانے باہر بھجوا دیا تھا۔ اصل میں یہی وہ وقت تھا جب اختر جولیٹ کے پیچھے دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہا تھا۔ عالیہ کو جولیٹ کے اوپر جانے کا تو علم نہیں تھا لیکن انہیں اختر کا انداز مشکوک لگا تھا اس لیے کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد وہ خود بھی اوپر پہنچ گئی تھیں اور اختر کو اس کے خطرناک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

''پلیز! آپ میرے ساتھ آئیں۔'' جولیٹ نے اسد اللہ کے سوال کے جواب میں سراسیمہ سے لہجے میں کہا تو ان کے ساتھ صفی اللہ بھی چونک گئے اور ان کے شانے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر انہیں جولیٹ کے ساتھ باہر جانے کا اشارہ کیا۔ انہیں شک تھا کہ نواب صاحب کی حالت کے پیش نظر کہیں اسد اللہ انکار نہ کر دیں۔ بڑے بھائی کا اشارہ پا کر اسد اللہ باہر نکل گئے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر طبی عملے کی موجودگی کی وجہ سے جولیٹ نے انہیں باہر بلوایا ہے۔

''آپ کو میرے ساتھ اوپر چلنا ہوگا۔'' باہر آ کر ان کے کوئی سوال کرنے سے قبل جولیٹ نے ان سے کہا تو وہ مزید الجھ گئے اور الجھن زدہ لہجے میں بولے۔

''آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں کہ کیا مسئلہ ہے؟ اس وقت ہم ویسے ہی بہت پریشان ہیں اور ابا جان کو نزع کی حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتے۔''

''اوپر بھی اختر صاحب کچھ ایسی حالت میں ہیں۔ اگر انہیں فوری میڈیکل ایڈ نہیں دی گئی تو ان کی جان بچنا مشکل ہو جائے گا۔'' جولیٹ نے دھیمی آواز میں ان پر انکشاف کیا۔

''کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے انہیں؟'' اسد اللہ کی حیرانی میں مزید اضافہ ہوا لیکن اب ان کے قدم حرکت میں آ گئے تھے اور وہ اوپر جانے والے راستے کی طرف گامزن تھے۔

''میں اوپر کمرے میں تھی۔ وہ پتا نہیں کیسے وہاں آ گئے اور پہلے والی حرکت دہرانے کی کوشش کی۔ بائے لک نواب زادی صاحبہ وہاں آ گئیں اور انہوں نے پیچھے سے اختر صاحب کے سر پر کسی بھاری چیز سے اٹیک کیا جس کی وجہ سے ان کا سر پھٹ گیا اور بلیڈنگ ہونے لگی۔ میں انہیں بہت سیریس حالت میں چھوڑ کر آپ کو انفارم کرنے آئی تھی۔'' ان کے ساتھ ساتھ چلتی وہ انہیں حالات سے آگاہ کرتی جا رہی تھی۔ اس کی فراہم کردہ ان اطلاعات پر اسد اللہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تاہم انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور اپنی محبت کے گواہ کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرے میں نواب زادی عالیہ ابھی تک کرسی پر بیٹھی ساکت نظروں سے اختر کو دیکھ رہی تھیں۔ اسد اللہ ان سے مخاطب ہونے کے بجائے اختر کی طرف بڑھے اور پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ بالکل ساکت پڑا تھا۔ انہوں نے اس کی دل کی دھڑکن اور نبض چیک کی۔ وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک نظر وہاں بننے والے خون کے تالاب کو دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ جولیٹ سے مخاطب ہوئے۔

''آپ نواب زادی عالیہ کو ان کے کمرے میں لے کر جائیں اور ان کے ساتھ ہی رہیں۔ اس معاملے کو ہم خود دیکھ لیں گے۔''

جولیٹ ان سے اختر کی حالت کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن ان کے لہجے کی قطعیت نے اسے ان کی ہدایت پر عمل کرنے کے علاوہ کچھ بھی کرنے کی ہمت نہیں

احتیاط

ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون آیا کہ ''ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے نے ریت کھا لی ہے۔ میں نے اسے پانی پلا دیا ہے، بتائیں میں اور کیا کروں؟''

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ ''اب آپ صرف یہ احتیاط کیجیے کہ وہ سیمنٹ ہرگز نہ کھانے پائے۔''

طریقہ

''ہاں، تو بیٹا! آج تم نے کیا سیکھا؟'' ماں نے بڑے شوق سے پہلے روز اسکول سے واپس آنے پر بچے سے پوچھا۔

بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''مرغا بننے کا طریقہ۔''

مراسلہ نگار: ریحان شیخ، پنڈی

ہونے دی اور وہ نواب زادی عالیہ کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر نیچے جانے کے لیے روانہ ہوگئی۔ اسد اللہ ماتھے پر بل ڈالے کچھ دیر وہیں کھڑے رہے اور اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب وہ دونوں نواب زادی عالیہ کے کمرے میں پہنچ چکی ہوں گی، خود حرکت میں آگئے۔ انہوں نے حویلی کے مردانے کی طرف جانے والی سیڑھیوں کا رخ کیا تھا۔ ذرا دیر میں ان کی دو وفادار ملازموں کے ساتھ واپسی ہوئی۔ ان ملازمین کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی جان دے سکتے ہیں لیکن ان کی مرضی کے خلاف زبان سے ایک لفظ نہیں نکال سکتے۔ ان کی ہدایت پر ملازمین نے اختر کو اٹھایا اور لے کر نیچے کی طرف روانہ ہوئے۔ اختر کے سر سے اب بھی خون کے قطرے ٹپک رہے تھے لیکن پہلے جیسی روانی نہیں رہی تھی۔ اسد اللہ کی ہدایت پر اختر کو ایک قریبی کمرے میں لے جایا گیا اور ایک ملازم ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑا۔ ڈاکٹر فوراً ہی آگیا۔ اس نے اختر کا معائنہ کیا اور فوری اعلان کر دیا۔

''ہی از نو مور۔ چوٹ بہت شدید ہے اور میرے خیال میں بہت زیادہ خون بہہ جانے کے علاوہ دماغ کے متاثر ہونے سے بھی ڈیتھ ہوئی ہے۔ کون ہیں یہ اور کیا حادثہ پیش آیا ان کے ساتھ؟'' ڈاکٹر اپنے تجسس کو زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکا۔

''یہ ہمارے پھپھی زاد بھائی اور بہنوئی دونوں ہی ہیں۔ شاید سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پیر پھسلنے سے گر گئے اور سر پر چوٹ لگ گئی۔ سب لوگوں کے اپنی اپنی خواب گاہوں میں ہونے کی وجہ سے فوری طور پر حادثے کا علم نہیں ہو سکا اور خون زیادہ بہہ گیا۔'' اسد اللہ نے بجھے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر کو بتایا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ یہی داستان ہر ایک کو سنانی ہے اس لیے ملازمین کو پہلے سے ہدایت دے دی تھی اور وہ ڈاکٹر کی آمد کے بعد بہ سرعت خون کے ان قطروں کو صاف کرنے کے لیے حرکت میں آگئے تھے جو اوپر والے کمرے سے یہاں تک ایک قطار کی صورت میں چلے آئے تھے۔

''بہت افسوس ہوا جان کے۔ میں بہت رنجیدہ ہوں کہ حویلی والوں کو ایک ساتھ دو اہم شخصیات کی جدائی کا صدمہ سہنا ہوگا۔'' ڈاکٹر کے الفاظ پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ابھی لمحہ بھر قبل ہی نواب صاحب بھی زندگی کی جنگ ہار گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے جیسے ان کی نگاہ کا سوال پڑھ کر جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر اسد اللہ تیر کی طرح نواب صاحب کے کمرے کی طرف دوڑے۔ وہاں بھی موت اپنا وار کر کے جا چکی تھی اور صفی اللہ باپ کے بستر کے سرہانے رنج والم کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

''بھائی جان......'' اسد اللہ نے انہیں پکارا اور پھر دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو پڑے۔ انہیں معلوم تھا کہ بس یہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب وہ اپنے باپ کے لیے یوں آنسو بہا سکتے ہیں، بعد میں ذمے داریوں کا بوجھ انہیں غم منانے کی بھی اجازت نہیں دے گا۔

☆☆☆

ربن اڈے واپس پہنچا تو ایک اے ایس آئی اور دو سپاہی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اے ایس آئی اسے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''سنا تھا ربن دادا اپنے وعدے کا بڑا پکا ہے، پر دکھائی تو کچھ اور دے رہا ہے۔''

''سارا نظر کا ہیر پھیر ہے۔'' ربن نے اس کے طنز کا بے نیازی سے جواب دیا۔

''ایسا خود پر ناز ہے تو ادھر بھائیہ سیٹھ کی کوٹھی پر پولیس والوں کو جل دے کر کیوں نکل گئے؟'' اے ایس آئی نے اپنی جانب سے اس پر کاری وار کیا۔

''جس کام کی مہلت لے کر گئے تھے، اسی کو پورا کرنے نکلے تھے اور چھپ کر نہیں نکلے تھے۔ تمہارے سپاہیوں کی آنکھوں پر ہی پٹی بندھی تھی تو اپن کیا کرتے۔'' ربن نے اس کے وار کا اطمینان سے جواب دیا۔

''اگر سارے کام انجام پا چکے ہیں تو کیا جناب تھانے پدھارنے کا کشٹ اٹھانا پسند کریں گے۔ ادھر کب سے آپ کی راہ دیکھی جا رہی ہے۔''

''ادھر سے ادھر ہی جانے کا تھا بس ادھر دو منٹ کا کام تھا اس لیے پہلے ادھر آگئے تھے۔ سوچا نہ جانے پولیس والوں کو کتنے دن اپنے کو مہمان بنا کر رکھنے کا ارادہ ہے، اس لیے اچھا ہے سب ضروری کام نمٹاتے چلیں۔'' اس کی طنزیہ باتوں کا وہ نہایت سکون سے جواب دے رہا تھا۔

''اب بھی کچھ کام باقی ہے؟'' اے ایس آئی نے منہ بنایا۔

''بولا نا ایک ضروری کام سے ہی ادھر آئے تھے ورنہ سیدھے تھانے ہی پہنچتے۔'' ربن نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے جانی کو جلدی جلدی کچھ ہدایات دیں اور پھر شان سے پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

''بڑا صاحب اندر انتظار کرتا ہے۔'' تھانے پہنچتے ہی ایک سپاہی نے سرگوشی میں اے ایس آئی کو اطلاع دی تو وہ یکدم ہی بہت چوکس نظر آنے لگا اور سخت لہجے میں ربن سے بولا۔

''ڈی ایس پی راٹھور خود تھانے میں موجود ہیں اور تمہارا انتظار کر رہے ہیں...... تو سمجھ لو تم گئے کام سے۔ آج تمہاری ساری دادا گیری ناک کے راستے باہر نکل جائے گی۔''

ڈی ایس پی کی موجودگی کی خبر نے ربن کو بھی چوکنا کر دیا۔ وہ وکرم والے معاملے کی وجہ سے فکر مند نہیں تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس معاملے میں پولیس اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکے گی لیکن بملا کی موت سے جو مسئلہ کھڑا ہوا تھا، وہ اس کی گمبھیرتا کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ بملا نے خودکشی کی تھی، اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ہاں پہلے فاروق اور بعد میں وہ اور راموجس طرح بنگلے سے فرار ہوئے تھے، ان کے لیے شکوک کے در کھل گئے تھے۔ اس واقعے کو کئی گھنٹے پیش آ چکے تھے اور اس بات کا پورا پورا امکان تھا کہ اب تک بات کھل چکی ہو۔ بھاٹیہ سیٹھ جس پائے کا آدمی تھا، اس کی بیٹی کی موت کا معاملہ کسی عام پولیس والے کے بجائے ڈی ایس پی جیسے عہدے پر فائز بندے کو ہی دیکھنا چاہیے تھا۔ وہ دل میں بہت سے وسوسے لیے اے ایس آئی کے پیچھے دفتر میں داخل ہوا۔

''ربن دادا حاضر ہے سر!'' اے ایس آئی نے مؤدب لہجے میں شاندار شخصیت کے مالک ڈی ایس پی راٹھور کو اطلاع دی۔ وہ بہت نیچے کا آدمی تھا لیکن اسے اپنے کسی سینئر کے بجائے سیدھے ڈی ایس پی راٹھور کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم ملا تھا۔

''اوہ ربن دادا۔ بہت ویٹ کروایا تم نے مجھے۔'' راٹھور نے فوراً ہی سر اٹھا کر ربن کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں طنز اور اشتیاق کی ایسی آمیزش تھی کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کس چیز کا اثر غالب ہے۔ ربن نے تولتی ہوئی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور پہلے ہی مرحلے پر وہ اسے بہت گہرا آدمی محسوس ہوا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ راٹھور بھی اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

''تم جاؤ راہول۔ میں دادا سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں۔'' لمحہ بھر کی جانچ کے بعد اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا اور اس کے باہر نکلتے ہی ربن کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس سے بولا۔

''کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ تم سے لمبی بات ہونی ہے، کھڑے کھڑے نہیں ہو سکے گی۔'' ربن خاموشی سے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ راٹھور نے کرسی کی پشت گاہ سے آرام دہ انداز میں ٹیک لگائی اور گہری نظروں سے ربن کو دیکھتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں ابھی چند ہفتے پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہوں۔ بمبئی بڑا شہر ہے اور یہاں کے بڑے مسئلے ہیں۔ بمبئی کے بارے میں جانکاری کرتے کرتے تمہارے بارے میں بھی بہت کچھ سننے کو ملا اور ملاقات کا شوق من میں جاگا۔ ملاقات کے لیے بہانے تو بہت سے تھے لیکن میں ذرا بزی رہا اس لیے تم کو بلوا نہیں سکا۔ اب ایک نیا بہانہ بن گیا تو میں نے کہا چلو تم سے مل ہی لیتے ہیں۔'' وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے ربن کا کوئی پرستار ہو لیکن اس کے لہجے کی گہرائی میں کہیں طنز کی کاٹ بھی تھی جو بس ربن جیسا شخص ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے محسوس کیا لیکن ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر اس کی ستارہا جواب کہہ رہا تھا۔

''تمہارے باقی سارے دھندے ایک طرف لیکن ہم اپنی کتھا انگریز افسر ولیم کے اغوا سے شروع کرتے ہیں۔ حکومت برطانیہ کے اس اہم نمائندے کو اغوا کر کے اتنے تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ اس حادثے کا الزام تمہارے اوپر آیا لیکن تم مضبوط گواہوں اور اپنے چالاک وکیل کی وجہ سے بچ گئے۔ اس کے علاوہ بھی شہر میں کچھ چھوٹے بڑے ایسے واقعات ہوئے جس میں تم یا تمہارے آدمیوں کا نام لیا جاتا رہا لیکن پولیس ثبوت نہ ہونے کے کارن تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ اب پھر تم ہمارے ایک انسپکٹر وکرم کی گمشدگی کے معاملے میں مشکوک ہو اور آثار کہتے ہیں کہ اس کے کڈنیپ ہونے میں تمہارا ہی ہاتھ ہے کیونکہ وکرم بہت سختی سے تمہارے گرد دائرہ تنگ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وکرم کے کولیگز چاہتے ہیں کہ اس بار تمہیں گرفتار کر کے لاک اپ میں بند کر دیا جائے اور تمہاری اتنی مرمت کی جائے کہ تم سب کچھ اگل دو اور تمہارے چالاک وکیل کو عدالت میں تمہیں بے گناہ ثابت کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔''

''پھر دیر کاہے کی ہے۔ اگر آپ کے پاس اپنے الزام کا ثبوت ہے تو بند کروا دیجیے لاک اپ میں۔'' ربن نے اسے مشورہ دیا۔

''ثبوت ہوتا تو تمہیں سامنے بٹھا کر بات کرنے کی نوبت کہاں آتی۔ میں اپنے ماتحتوں کی رائے مان کر تمہیں

زبان کھولنے کے لیے ان کے حوالے بھی نہیں کرسکتا کہ میں ایک قانون اور انصاف پسند آدمی ہوں۔'' راٹھور نے اسے جتایا۔

''آپ کی انصاف پسندی تو ادھر ہی کھل گئی جب آپ نے انگریز افسر ولیم کے اغوا سے اپنی کتھا شروع کی۔ آپ اپنے کہے جیسے ہوتے تو قصہ ادھر سے شروع کرتے جدھر اپن کا نقصان ہوا تھا اور گورے ولیم نے اپنے بچے کو غیر قانونی طور پر تھانے میں رکھ کر اس پر ایسا ظلم ڈھایا تھا کہ اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے۔'' ربن نے بغیر لگی لپٹی کے اسے تلخی کے ساتھ جواب دیا۔ اس کی بات پر راٹھور نے پہلو بدلا اور بات بناتے ہوئے بولا۔

''ایسی کوئی بات ہمارے ریکارڈ میں موجود نہیں ہے۔''

''اپنے کیے کا کون حساب رکھتا ہے۔ یہ حساب تو اسی کو رکھنا پڑتا ہے جس کا نقصان ہوا ہو۔'' ربن نے اس بار بھی کوئی رعایت نہیں کی۔

''سوچ لو دادا! ایسی بات کر کے تم خود ہی مان رہے ہو کہ اپنے آدمی کا بدلہ لینے کے لیے تم نے ہی ولیم کو اس حال تک پہنچایا تھا۔''

''آپ کا قانون ثبوت مانگتا ہے۔ آپ بولو کہ آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟'' ربن کے اطمینان اور اعتماد میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ راٹھور نے اس کی بات پر اس کی طرف غور سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

''ثبوت ہوتا تو میں تمہیں اپنے سامنے یوں کرسی پر بٹھا کر تم سے بات نہیں کر رہا ہوتا۔''

''آپ اپنے کو کرسی پر بٹھائے یہ آپ کا بڑا پن ہے پر اپن کو ابھی تک یہ سمجھ نہیں آیا کہ آپ اپنے سے کیا چاہتے ہو؟'' ربن کی زیرک نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ کچھ بین السطور بھی ہے اور ڈی ایس پی جیسا افسر محض تبصروں اور تجزیوں کے لیے اس سے گفتگو نہیں کر رہا۔ اس لیے صاف الفاظ میں اس سے اس کا مدعا دریافت کیا۔

''تمہارا وہ بندہ فاروق کدھر ہے؟ بمبئی سے نکال آئے ہو کیا اسے؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے راٹھور نے جس معنی خیز لہجے میں پوچھا، اس نے ربن کا ماتھا ٹھنکا دیا۔ وہ مان ہی نہیں سکتا تھا کہ فاروق کے متعلق یہ تفتیش بلا جواز ہے اور پہلا جواز بملا کی موت کی صورت خود اس کے ذہن میں موجود تھا۔

''آپ کیوں پوچھتے ہو فاروق کو؟'' اس نے اپنے اندرونی خلفشار کو لہجے سے ظاہر ہونے سے روکنے کی پوری کوشش کی۔

''کہنا کیا ضروری ہے؟ کارن تم خود بھی جانتے ہو۔ بھاٹیہ سیٹھ بہت طیش میں ہے اور چاہتا ہے گھڑی کی چوتھائی میں تمہیں اور فاروق کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جائے۔ تم سمجھ سکتے ہو دادا کہ یہ کیس اتنا کچا نہیں ہے کہ تم آسانی سے اپنے ہاتھ پیر بچالو۔ پولیس کے پاس گواہ بھی ہے اور بھاٹیہ سیٹھ جیسی مضبوط پارٹی بھی۔'' راٹھور نے اس کے اس خدشے کی تصدیق کر دی کہ بملا کا کیس پولیس کے پاس پہنچ چکا ہے اسی لیے راٹھور جیسا افسر خود تفتیش کے لیے تھانے میں موجود ہے لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ پولیس اپنے روایتی طریقہ کار پر عمل کرنے کے بجائے اس طرح کا طرزِ عمل کیوں اپنائے ہوئے ہے۔

''اپن کے ہاتھ صاف ہیں اس لیے ہاتھ پیر بچانے کا انتظام بھی ہو ہی جائے گا۔ آپ بھروسا کرو یا نہ کرو، پر سچ یہ ہے کہ سیٹھ کی لڑکی نے آپ اپنی جان لی تھی۔'' ربن نے اسے پوری بات بلا کم و کاست سنا ڈالی۔

''اچھی کہانی ہے، پر آسانی سے ثابت نہیں کی جاسکتی۔ ہاں پولیس آسانی سے ثابت کر سکتی ہے کہ یہ آتما ہتھیا نہیں بلکہ مرڈر کا کیس ہے۔'' راٹھور نے جیسے اس کی بات ہوا میں اڑا دی۔ اس کے انداز پر ربن اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا کہ وہ چاہتا تھا اب راٹھور خود ہی تھیلے سے بلی کو باہر لے آئے۔ راٹھور نے لمحہ بھر کے لیے ربن کے چہرے کے تاثرات جانچے اور میز پر دونوں کہنیاں ٹکا کر ذرا سا اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''ہم تمہاری سنائی کتھا کو سچ مان سکتے ہیں اگر تم بھی ہماری مان لو۔''

''کیا چاہتے ہو آپ اپن سے؟'' ربن نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ کسی اونچے درجے کی ہی سودے بازی ہوگی کہ معاملہ بھاٹیہ جیسے بڑے سیٹھ کی بیٹی کی موت کا تھا۔

''سنا ہے فاروق تمہارا بڑا لاڈلا ہے اور تم اسے بالکل اولاد کی طرح چاہتے ہو۔ اولاد کو بچانے کے لیے تو آدمی بڑی سے بڑی قیمت دینے کو راضی ہو جاتا ہے۔ دیکھتے ہیں تم کیا فیصلہ کرتے ہو۔'' راٹھور جیسے اس کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آپ اپنی بات بولو۔'' ربن نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''جناح کے ایک قریبی ساتھی کو ٹھکانے لگانا ہے۔

اس کام کے لیے ہاں بولو تو دوسرا کام بھی بتاتا ہوں۔"

"کیا گناہ کیا ہے اس بندے نے۔" ربن نے بے نیازی سے دریافت کیا لیکن اندر ہی اندر وہ بے چین ہو اٹھا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہندو اپنی روایتی نفرت کے اظہار کے لیے اس سے یہ کام لینا چاہتے ہیں لیکن وہ اس مطالبے کو مان کر ہندوستان کی ایک بڑی سیاسی جماعت سے بیر نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ ذاتی طور پر ہندوستان چھوڑنے کے لیے راضی نہیں تھا لیکن تحریک پاکستان کے مخالفوں میں سے بھی نہیں تھا اور سمجھتا تھا کہ اگر مسلمان یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو بلاجواز بھی نہیں کر رہے۔ ایسے میں وہ ان کے کسی اہم راہنما کو قتل کر کے اپنے ضمیر پر بوجھ کیوں لیتا۔ وہ بلاجواز بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے والا آدمی نہیں تھا۔

"جناح کا ساتھی ہونے سے بڑھ کر کیا پاپ ہو سکتا ہے۔ جناح اور اس کے ساتھی حالات کو اس رخ پر لے آئے ہیں کہ بھارت ماتا دو ٹکڑے ہونے کو ہے۔ ان لوگوں کو اپنے اس پاپ کا بھگتان تو دینا ہوگا۔ میں نے تمہیں جس بندے کا بولا ہے، اس کو مارو گے تو جناح اور سارے مسلمان تڑپ اٹھیں گے اور یہی ہماری اچھا ہے۔" راٹھور کے لہجے سے اس کی دلی نفرت جھلک رہی تھی۔

"اور دوسرا کام کیا ہے؟" ربن نے اس سے دریافت کیا۔

"مسلمانوں کے دو چار علاقوں میں بلوے کروانے ہیں۔ ان میں سے بہت سے یہاں سے جانے کو اپنا سامان باندھے بیٹھے ہیں۔ بلوے میں جو مال ہاتھ آئے، وہ تمہارا ہوگا بس اپنے کو زیادہ سے زیادہ مسلوں کی لاشیں چاہیے ہیں۔" وہ جو دیکھنے میں شاندار اور مہذب شخصیت کا مالک تھا، اندر سے کیسا کینہ پرور اور شقی القلب تھا، یہ دو منٹ میں ربن کے سامنے آگیا۔ ایسے آدمی کے سامنے سچ بولنا خطرناک ہوتا ہے لیکن ربن کب کسی خطرے سے ڈرتا تھا۔ سب کچھ سنا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔

"آپ اپنی غلط جانچ کیے ہو صاحب۔ اپن بھاڑے کا قاتل نہیں ہے جو قصائیوں کی طرح لوگوں کے گلے کاٹتا پھرے۔ اپن دادا ہے اور اپنے اصولوں پر داداگیری کرتا ہے۔"

"سوچ لو دادا! ہمارا کام تو کوئی بھی کر دے گا پر تمہارے لیے اپنی مشکل سے نکلنے کا راستہ بند ہو جائے گا۔" راٹھور نے اسے دھمکایا۔

"موت سے زیادہ بندے کے ساتھ بھلا کیا برا ہو سکتا ہے اور موت سب کو ایک دن آنی ہی ہے تو اس کے ڈر سے آدمی دوسرے کی غلامی کیوں کرے۔" ربن کا جواب بھی واضح تھا۔

"ابھی میں تم کو تھوڑا ٹائم دیتا ہوں۔ تم جاؤ اور کل سوچ سمجھ کر مجھے جواب دو۔" راٹھور بھی جیسے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ربن نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور پھر دوبارہ بند کر لیے۔ راٹھور سے بحث کرنے سے بہتر تھا، وہ ملنے والی مہلت کا فائدہ اٹھا لیتا۔

"کیا بولتے ہو؟" راٹھور نے اسے ٹٹولا۔

"ٹھیک ہے، اپن کل تک سوچ کر بتاتا ہے۔" ربن نے اس بار اس کو نرم لہجے میں جواب دیا لیکن جب وہ تھانے سے واپس اڈے جا رہا تھا تو اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔

☆☆☆

نواب زادی عالیہ اپنی خواب گاہ میں مسہری کے سرہانے سے پشت لگائے بالکل ساکت اور لب بستہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ اختر اور نواب سلیم اللہ کی موت کو آج چوتھا دن تھا۔ نواب صاحب کے لیے تو پھر بھی سب ذہنی طور پر تیار تھے کہ کسی بھی وقت سانس کی ڈوری ٹوٹ سکتی ہے لیکن اختر کی موت ایک سانحہ ثابت ہوئی تھی۔ ہر کوئی انگشت بدنداں تھا کہ کیسے ایک صحت مند اور توانا آدمی یکدم زندگی کی بازی ہار گیا۔ سب کو یہی معلوم تھا کہ رات کے کسی پہر اختر ہواخوری کے لیے چھت پر جا رہے تھے کہ پاؤں پھسلنے سے سر کے بل گر گئے۔ حویلی کے مکین اور ملازمین سب ہی اس پہر سو رہے تھے اس لیے فوری طور پر اس حادثے کا علم نہیں ہو سکا اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ اس قصے میں سے جولیٹ کا نام سرے سے نکال دیا گیا تھا اور لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ نواب سلیم اللہ کی خدمت میں موجود ان کی تینوں اولادوں میں سے عالیہ کو نواب صاحب کے آخری وقت میں دونوں بھائیوں نے خود ہی بہانے سے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ اپنی خواب گاہ میں واپس آ کر جب عالیہ نے اختر کو غائب پایا تو ان کی فکر میں باہر نکلیں اور انہیں سیڑھیوں کے قریب خون میں لت پت دیکھ کر بھائیوں کو اطلاع دی۔ نواب صاحب کی خدمت پر مامور ڈاکٹر نے ہی اختر کا معائنہ کیا اور اس بات کی تصدیق کی کہ ان کی موت واقع ہو چکی ہے۔

حویلی کے مکینوں کو یہ داستان اس اضافے کے ساتھ سنائی گئی تھی کہ اختر بے حد نشے کے عالم میں تھے اس لیے اپنا

توازن برقرار نہیں رکھ سکے اور سیڑھیوں سے پھسل گئے۔

اس حادثے پر حیرت اور افسوس کا اظہار کرنے والے بہت تھے لیکن شک کون کرتا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس واقعے کی مرکزی کردار عالیہ تھیں اور انہوں نے اتنا مکمل سکوت اختیار کر رکھا تھا کہ سوئم تک کسی نے ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا۔ ان کی اس حالت کو دہرے صدمے سے ہونے والا سکتہ قرار دے کر خواتین نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح عالیہ کو رلا سکیں لیکن ان کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔ اسد اللہ کو ان کی ذہنی حالت کا اچھی طرح احساس تھا اور وہ مردانے میں ہونے کے باوجود ان کی مکمل خبر گیری کرتے رہے تھے۔ ان ہی کی ہدایت پر عالیہ کو بہت دیر تک خواتین کے درمیان بیٹھنے نہیں دیا جا رہا تھا کہ کہیں وہ کسی کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر جائیں۔ میتیں اٹھنے کے بعد تو ڈاکٹر کے مشورے سے انہیں باقاعدہ سکون آور دوا دے کر سلا دیا گیا تھا۔ یہ سکون آور ادویات ندرت جہاں اور عشرت جہاں کو بھی دینی پڑی تھیں۔ اکلوتے بیٹے اور بھائی کی ناگہانی موت پر دونوں ماں بیٹی خوب بین کر کر کے روئی تھیں۔ ان دونوں کی حالت ایسی تھی کہ دیکھنے والوں کا کلیجا منہ کو آنے لگتا تھا لیکن وہی بات تھی کہ ہمدردی کے اظہار کے علاوہ کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔

صفی اللہ اور اسد اللہ اپنی پھپھی زاد بہن کا غم بانٹنے کی حتی الامکان کوشش کرتے رہے تھے۔ ماں اور بہن کو صبر آنا آسان نہیں ہوتا لیکن قدرت کے وضع کردہ اصول کے مطابق ہر گزرتا دن خود ہی غم کی شدت کم کرتا چلا جاتا ہے۔ سسکیاں اور دبی دبی آہیں اب بھی تھیں لیکن پہلے دن والے بین اور نوحے دم توڑ چکے تھے۔ سوئم کی فاتحہ کے بعد پُرسے کے لیے آئے ہوئے زیادہ تر عزیز و اقارب اور احباب اپنے گھروں کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور چند ایک قریبی لوگ ہی حویلی میں رہ گئے تھے جن کی بھی جلد روانگی متوقع تھی۔ ان حالات میں جولیٹ نے اپنی بساط سے زیادہ ذمے داریاں اٹھائی تھیں اور ہر پل متحرک رہی تھی۔ خصوصاً نواب زادی عالیہ پر اس کی بھرپور توجہ مرکوز تھی۔ اس کی کوشش رہی تھی کہ زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزارے اور اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ان کی خواب گاہ میں موجود تھی۔

کچھ دیر قبل ہی اس نے ان کا لباس تبدیل کروا کر ان کے بالوں میں کنگھی کی تھی اور اب ان کی چیزیں سمیٹ کر رکھ رہی تھی۔ حالات نے اس کی حیثیت کا اعلان نہیں ہونے دیا تھا لیکن اسد اللہ کی مہربانیوں نے بہرحال حویلی کے مکینوں اور جملہ ملازمین کو یہ باور کروا دیا تھا کہ اس کی ایک خاص اہمیت اور مقام ہے چنانچہ کوئی بھی اس کے کہے کو ٹالنے کی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ نواب زادی عالیہ کے ساتھ اس نے خود رہنے کا فیصلہ سنایا تھا تو پھر کسی ملازمہ کی یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ کسی قسم کی مداخلت کر سکے۔ سروری سمیت تمام ملازمائیں اپنی حد میں تھیں اور بس اسی حد تک خدمت بجا لا رہی تھیں جتنا انہیں حکم دیا جا رہا تھا۔ اب بھی ایک ملازمہ نواب زادی عالیہ کا دھلا دھلایا صاف ستھرا لباس مہیا کر کے واپس چلی گئی تھی اور ان کے ساتھ ان کے کمرے میں صرف جولیٹ موجود تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

''کون؟'' اس نے بلند آواز میں استفسار کیا۔

''ہم ہیں اسد اللہ......'' باوقار لہجے میں سنائی دینے والے اس جواب پر اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سر جھکا کر مؤدب لہجے میں خالصتاً حیدر آبادی لہجے میں انہیں آداب کہا۔ اس کے اس انداز پر اسد اللہ کو بے ساختہ ہی جوزفین یاد آئی۔ وہ بھی تو چند دنوں میں ہی یہاں کے ادب و آداب سیکھ کر یہاں کے ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ جولیٹ نے شروع میں خود کو اس ماحول سے جدا رکھا تھا لیکن جب سے انہوں نے اسے اپنی بیٹی تسلیم کیا تھا، وہ بھی خود کو اس ماحول میں ڈھال رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی اپنی انفرادیت تھی جو اسے دوسروں سے زیادہ پُرکشش اور پُراعتماد ظاہر کرتی تھی۔

''جیتی رہیے۔'' لمحہ بھر میں ماضی اور حال کا سفر طے کرتے ہوئے انہوں نے شفقت سے جولیٹ کے سر پر ہاتھ رکھا اور کمرے میں داخل ہوئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی پھپھی جان کی؟'' جولیٹ متذبذب تھی کہ یہاں ٹھہرے یا باہر نکل جائے کہ اسد اللہ کے سوال نے اسے چونکایا۔

''بس پہلے دن ہی کی طرح کا حال ہے، کچھ بولتی ہی نہیں ہیں۔ کھانا بھی بہت اصرار پر چند لقموں سے زیادہ نہیں کھاتیں۔'' جولیٹ نے انہیں عالیہ کی کیفیت سے آگاہ کیا۔

''کیا بات ہے عالیہ! کیوں آپ نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب آپ خود کو سنبھالیے۔ آپ کی یہ حالت ہمارے اور بھائی جان کے لیے ذہنی دباؤ کا باعث بن رہی ہے۔ ابا جان کی رحلت نے پہلے ہی ہمیں بہت بڑا دھچکا پہنچایا ہے، اب آپ کی

حالت مزید تشویش کا باعث بن رہی ہے۔ ہم نے حاضر دماغی سے کام لے کر حالات کو قابو میں رکھا ہوا ہے لیکن آپ کی طرف سے خوف زدہ ہیں کہ آپ اپنی کیفیت کے باعث کسی بھی وقت خود پر قابو نہ کھو بیٹھیں۔ ہونے والی بات ہو چکی۔ اب حویلی کی عزت اسی میں ہے کہ جو ہوا اس پر پردہ پڑا رہے۔ بھائی جان کی بھی یہی خواہش ہے اور آپ جانتی ہیں کہ ابا جان کے بعد اب وہی حویلی کے مختار کُل ہیں۔'' اسد اللہ مسہری کے ساتھ رکھی ایک منقش کرسی پر بیٹھ چکے تھے اور اب بہت دھیمی آواز میں عالیہ سے مخاطب تھے۔ پہلے تو عالیہ سر جھکائے ان کی بات سنتی رہیں پھر جب وہ خاموش ہوئے تو انہوں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور گلوگیر لہجے میں بولیں۔

''آپ ہماری طرف سے تشویش میں مبتلا نہ ہوں بھائی جان۔ ہم مرتے مر جائیں گے لیکن کبھی اس حویلی کی آن اور عزت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ اگر ہمیں یہ گوارا ہوتا تو اپنے ہاتھ سے اپنا سہاگ کیونکر اجاڑتے۔ ہمارے سکوت کو آپ ہماری ذہنی حالت کی خرابی پر محمول مت کیجیے۔ یہ خاموشی تو ہمارے گرد کھنچی وہ فصیل ہے جو کسی کو بھی ہم تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہے۔ ہم نے ہمیشہ اختر کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ہمارے اختیار میں تھا۔ ان کی تمام تر کوتاہیوں اور بے نیازی کے باوجود ہم اپنی طرف سے بیوی ہونے کا فریضہ احسن طریقے سے ادا کرتے رہے لیکن انہوں نے جواب میں کیا کیا......؟ ہمارے ہی بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالا...... پہلے ان کا جرم پھر بھی قابلِ معافی تھا کہ وہ جولیٹ کی حیثیت سے واقف نہیں تھے لیکن واقف ہونے کے بعد بھی ایسی گھناؤنی حرکت کر کے انہوں نے خود کو ہماری نظروں میں اتنا گرا لیا تھا کہ ہمیں ان کا وجود روئے زمین پر بوجھ معلوم ہونے لگا۔ ہمیں ان کے قتل کے الزام میں دار پر لٹکا دیا جائے تو بھی ہمیں کوئی افسوس نہ ہوگا لیکن ہم نے اس حویلی کی عزت کی خاطر اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہے۔ اس سکوت کی آڑ میں ہم بیوی کی حیثیت سے ان کا نوحہ کرنے کی زحمت سے بھی بچے ہوئے ہیں ورنہ یہ تو ہمارا دل جانتا ہے کہ ہم اپنے پیارے ابا جان کی جدائی میں کتنے دل گرفتہ ہیں اور ہمارے دل پر کتنے آنسو گر رہے ہیں لیکن ہم صرف اس لیے نہیں روتے کہ کہیں ابا جان کے لیے بہائے گئے آنسوؤں کو کوئی اختر کے لیے نہ سمجھ لے۔ وہ ہمارے لیے اتنے قابلِ نفرت ہو چکے ہیں کہ ہمیں ان کے لیے ایک آنسو بھی بہانا گوارا نہیں ہے۔''

اے انسان

☆ رات کے اندھیرے سے ڈرتے ہو، قبر سے کیوں نہیں۔

☆ جنت میں جانا چاہتے ہو، مسجد میں کیوں نہیں۔

☆ رشوت دیتے ہو، غریب کو کھانا کیوں نہیں۔

☆ دنیا کی کتابیں پڑھتے ہو، قرآن پاک کیوں نہیں۔

☆ گانا گاتے ہو، درود پاک پڑھتے کیوں نہیں۔

☆ دنیاوی امتحان کے لیے ساری رات جاگتے ہو۔ آخرت کے امتحان میں پاس ہونے کے لیے کیوں نہیں۔

☆ بے تحاشا فضول خرچیاں کرتے ہو، زکوٰۃ نکالتے کیوں نہیں۔

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل پور

مالک کے کام

باز اور شکروں کی موجودگی کے باوجود چڑیا کے بچے پرورش پاتے رہتے ہیں۔ آندھیاں سب چراغ نہیں بجھا سکتیں۔ شیر دھاڑتے رہتے ہیں اور ہرن کے خوب صورت بچے کلیلیں بھرتے رہتے ہیں۔

یہ سب اس مالک کے کام ہیں......

اس کی پیدا کردہ مخلوق اپنے اپنے مقرر شدہ طرزِ عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ فرعون نے سب بچے ہلاک کرا دیے مگر وہ بچہ بچ گیا جو اس کے لیے خطرہ تھا، یہ سب قدرت کے کام ہیں۔

زمانہ ترقی کر گیا ہے مگر...... مکھی...... مچھر اور چوہے اب بھی پیدا ہوتے ہیں۔ طب مشرق و مغرب میں بڑی ترقی ہوئی۔

جراثیم کش دوائیں نئے جراثیم پیدا کرتی ہیں۔

بیماریوں میں اضافہ ہوا...... انسان کل بھی دکھی تھا اور آج بھی سکھی نہیں ہے۔

انتخاب۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

بولتے بولتے عالیہ کی آواز رندھنے لگی۔ آج پورے تین دن بعد انہوں نے اپنے لب کھولے تھے اور اپنے اندر کی ہر بات کہہ ڈالی تھی۔ اسد اللہ نے ان کے اندرونی کرب کو پوری شدت سے محسوس کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آکر ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ان کے ہاتھ کا لمس پاکر عالیہ اور بھی زیادہ شدت سے رو پڑیں اور اتنے دنوں کا روکا ہوا سیلِ آب بہہ نکلا۔ اسد اللہ پوری ہمدردی اور خلوص سے انہیں دلاسا دیتے رہے۔ اس جذباتی منظر پر جولیٹ کی اپنی آنکھیں بھی جھلملا گئیں لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور ان دونوں کو پانی پیش کیا۔ پانی پی کر دونوں کے جذبات قابو میں آنے لگے۔

''اللہ آپ کو جزا دے بیٹی! آپ نے ان مشکل حالات میں ہماری بیٹی ہونے کا حق خوب ادا کیا۔ ہم نے آپ کے سلسلے میں بھی بھائی جان سے مشاورت کی تھی۔ ابا جان ہوتے تو فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہوتا لیکن بھائی جان نے سب کچھ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم کس انداز سے آپ کو اپنی بیٹی کی حیثیت سے متعارف کرواتے ہیں۔ فی الحال حویلی کی فضا سوگوار ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی کا اعلان ان حالات میں کریں۔ ہم نے طے کرلیا ہے کہ ابا جان کے چہلم کے بعد باقاعدہ ایک تقریب منعقد کرکے آپ کی حیثیت کا اعلان کریں گے۔ ہوسکتا ہے اس موقع پر ایک اور اہم اعلان کردیا جائے لیکن اس کے لیے آپ کی اجازت درکار ہوگی۔'' اسد اللہ کی مخاطب اب جولیٹ تھی جس نے ان کی آخری بات پر نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''ہم اور بھائی جان دونوں ہی سمجھتے ہیں کہ آپ کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے آپ کو کسی کے ساتھ منسوب کردیا جائے۔ بھائی جان نے پورے خلوص سے ہم سے کہا کہ اگر ان کے چھوٹے صاحب زادے محب اللہ حویلی میں موجود ہوتے تو وہ بخوشی آپ کو اپنی بہو بنالیتے۔ محب اللہ ہماری بھی اولین ترجیح ہوتے لیکن ان کی غیر موجودگی میں ہم آصف خان کے رشتے پر غور کرنے پر مجبور ہیں۔ آصف خان ہمارے عزیز دوست کے بیٹے ہیں اور ہمارے لیے اپنے سگے بھتیجوں جیسے ہی ہیں۔ آپ کی آصف خان سے ملاقات ہوچکی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تقریب کے انعقاد سے قبل آپ ان کے رشتے پر غور کرکے کوئی فیصلہ کرلیں تو ہمیں بھی آسانی رہے اور ہم بھی اسی حساب سے انتظامات کرسکیں۔''

وہ اتنا کچھ طے کرچکے تھے اور جولیٹ اپنی جگہ ششدر کھڑی تھی۔ وہ یہ سب سوچ کر یہاں کب آئی تھی۔ وہ تو اسد اللہ کا احتساب کرنے آئی تھی اور یہاں سے جاکر اسے دلدار آغا سے اپنا حساب کتاب چکتانا تھا لیکن اب سب کچھ بدلنے لگا تھا۔ انتقام کے سرخ شعلوں کی جگہ سنہری خواب دل میں جگہ بنانے کو بے چین تھے۔ اسے آصف خان سے ہونے والی اپنی گفتگو یاد تھی۔ وہ دل سے اسے اپنانے کا خواہش مند تھا اور اس نے یہ بھی بھانپ لیا تھا کہ جولیٹ کے دل میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ وہ ہر معاملے میں اس کا ساتھ دینے کا اشارہ بھی دے چکا تھا۔ تو کیا وہ آصف خان کا ساتھ قبول کرلے؟ اس کے دل نے اس سے چپکے سے سوال کیا تو ایک دوسرا سوال خودبخود ذہن میں چلا آیا۔ بھلا یہ محب اللہ کون ہے اور کہاں ہے؟ جو اس کے لیے اس کے باپ کی پہلی ترجیح ہوتا؟ اس نے اس بارے میں اسد اللہ سے استفسار بھی کرڈالا۔

''یہ محب اللہ کہاں ہوتے ہیں پاپا! ہم نے تو کبھی یہاں ان کا ذکر تک نہیں سنا۔''

''یہ بھی اس حویلی کی المناک داستانوں میں سے ایک ہے۔ ہم پھر کبھی فرصت میں آپ کو اس بارے میں بتائیں گے۔ ابھی اجازت دیجیے۔ کچھ احباب کو ملاقات کے لیے آنا تھا اور ہم صرف عالیہ سے گفتگو کی مہلت لے کر یہاں آئے تھے۔'' اسد اللہ نے اسے جواب دیا اور خود وہاں سے رخصت ہوگئے۔ پیچھے جولیٹ کے ذہن میں الجھن سی رہ گئی۔

☆☆☆

ربن تھانے سے باہر نکلا تو بے حد متفکر تھا۔ اس کی پریشانی کا سبب ڈی ایس پی راٹھور تھا۔ اس کا اب تک جتنے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا، راٹھور اسے ان سب سے زیادہ خطرناک اور عیار محسوس ہوا تھا اور کمال یہ تھا کہ اس نے اپنی اس خطرناک اور عیار شخصیت کو نرمی اور تہذیب کی آڑ میں چھپالیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا تھا اور ربن کا تجربہ تھا کہ ایسے لوگ جب وار کرتے ہیں تو سامنے والے کو اس وقت تک پتا ہی نہیں چل پاتا جب تک وہ شکار نہیں ہوجاتے۔ وہ اپنے سے زیادہ فاروق کے لیے تشویش میں مبتلا تھا۔ اگر وہ راٹھور کے مطالبات تسلیم نہیں کرتا تو راٹھور اسے بملا کے قتل کے کیس میں پھنسا دیتا لیکن راٹھور نے جو مطالبات کیے تھے انہیں تسلیم کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ٹھیک ہے، وہ ایک دادا تھا اور اس نے زندگی چاقو کے

زور پر ہی گزاری تھی لیکن وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے چاقو نے کبھی کسی بے گناہ اور معصوم شخص کے خون کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ وہ ان ہی لوگوں کے خلاف اپنا چاقو استعمال کرتا تھا جو خود کسی نہ کسی جرم میں ملوث ہوتے تھے اور قتل وغارت گری کی نوبت تو بہت کم ہی آپاتی تھی۔ اس نے اپنے لیے خود ہی کچھ اصول وضع کر رکھے تھے اور ان پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ اس کے اصولوں میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی کہ وہ راٹھور کے کہنے پر کسی مسلمان لیڈر کو بلاوجہ قتل کر ڈالتا اور نتیجے میں مسلمانوں کے مشتعل ہوجانے کے باعث ہندوستان کے بگڑتے ہوئے حالات کو مزید خراب ہوتا دیکھتا۔ پھر مسلم آبادیوں پر بلوے کا مطالبہ تھا جو اس کے لیے قطعی ناقابلِ قبول تھا۔ مسلمان ہوں یا ہندو، وہ کسی بھی مذہب اور فرقے سے تعلق رکھنے والے نہتے اور بے قصور افراد کو نشانہ بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''چاچاجی......!'' تھانے سے نکل کر کسی سواری میں بیٹھنے کے بجائے وہ سوچوں میں ڈوبا یونہی چلا جارہا تھا کہ ایک موٹر گاڑی اس کے قریب آکر رکی اور اندر سے کسی نے اسے پکارا۔ پکار پر وہ متوجہ ہوا تو دیکھا پکارنے والی شکنتلا ہے۔ وہی کم سن اور کھلنڈری سی لڑکی جو فاروق کی بیماری کے دنوں میں اسے شملہ چھوڑنے کے لیے جاتے وقت ریل گاڑی میں ملی تھی۔ اسے ماجد علی نامی ایک شخص دھوکے سے ورغلا کر گھر سے بھگا کر لے جارہا تھا۔ ربن کی نگاہوں نے ماجد علی کی اصلیت کو پہچان کر شکنتلا کو اس کے پنجوں سے نکالا اور باعزت طور پر اسے اس کے باپ سیٹھ انوپم اگروال کے حوالے کیا۔ اس کے اس احسان پر شکنتلا اور اس کا باپ دونوں ہی اس کے بے حد شکرگزار تھے اور انہوں نے اس سے بے حد اصرار کیا تھا کہ بمبئی واپس آنے کے بعد وہ ان سے رابطہ ضرور کرے لیکن اپنے جھمیلوں میں الجھے ربن کو فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ ملاقات کے لیے جا پاتا بس ایک بار منو اور اکبر کی ضمانت کے لیے سیٹھ انوپم اگروال کو زحمت دی تھی اور اب سرِراہ ان لوگوں سے ملاقات ہورہی تھی۔ ربن نے دیکھ لیا تھا کہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر خود انوپم اگروال موجود ہے۔

''نمسکار چاچاجی! ایسے اکیلے پیدل کدھر جارہے ہیں؟'' شکنتلا پھرتی سے دروازہ کھول کر نیچے اتری اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ربن کو نمسکار کیا۔

''جیتی رہ بٹیا! کیسی ہے تو اور سیٹھ آپ کیسے ہو؟'' ربن نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دونوں باپ بیٹی کو باری باری مخاطب کیا۔ بیٹی کے پیچھے انوپم اگروال خود بھی گاڑی سے اتر کر آگیا تھا اور مسکراتا ہوا ربن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہم لوگ بالکل ٹھیک ہیں چاچاجی اور آپ کو ابھی کے ابھی اپنے ساتھ اپنے گھر لے جارہے ہیں۔'' شکنتلا نے جواب دینے میں تیزی دکھائی اور مضبوطی سے ربن کا بازو پکڑ لیا۔

''ارے...... ارے بٹیا! یہ کیا کرتی ہو۔ ابھی اپن کو جانے دو۔ اپن کسی اور سمے فرصت سے تیرے کنے آئیں گے۔'' ربن نے پہلو بچانے کی کوشش کی۔ اس وقت وہ اتنی بڑی مشکل میں گھرا ہوا تھا اور اپنے دستِ راست راموسے مشورہ کرکے نجات کی کوئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس بھلا شکنتلا کی دعوت قبول کرنے کا کہاں موقع تھا۔

''سمے ہی تو نہیں ہے چاچاجی۔ آج آپ نہ بھی ملتے تو میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا تھا کہ آج ہر حال میں چاچاجی اور فاروق بھیا کو کھانے پر بلوانا ہے۔ آپ موٹر میں بیٹھیں، فاروق بھیا کو بھی ہم راستے سے لے لیں گے۔'' شکنتلا اپنے اصرار پر قائم رہی۔

''آخر ایسا کیا ہے کہ تو آج ہی ہمیں اپنے ہاں بلانے کو اتاؤلی ہورہی ہے اور تھوڑا انتظار نہیں کرسکتی۔'' ربن نے گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے اس سے دریافت کیا۔

''میں بتاتا ہوں مسٹر رب نواز کہ شکنتلا کے اتاؤلے پن کا کارن کیا ہے۔ ایسا ہے کہ شکنتلا پڑھنے کے لیے لندن جانا چاہتی ہے۔ اکیلی لڑکی کو بھیجنا اپنے کو ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس کی ماں سے بولا کہ تو بھی بیٹی کے ساتھ ہی چلی جا۔ اپن خود بھی ان دونوں کو چھوڑنے اور ادھر سیٹل کروانے کے لیے ساتھ جائے گا پھر بعد میں واپس آکر ادھر سے اپنا بزنس وائنڈاپ کرکے خود بھی لندن شفٹ ہوجائے گا۔ ہندوستان ویسے بھی اب رہنے کی جگہ نہیں رہا ہے۔'' اس بار سیٹھ انوپم اگروال نے گفتگو میں مداخلت کی اور شکنتلا کے اس قدر اصرار کی وجہ بتائی۔ وجہ سن کر ربن کے کان کھڑے ہوگئے اور فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک امکان روشن ہوگیا۔ اس امکان نے اسے شکنتلا کی دعوت قبول کرنے پر مجبور کردیا اور وہ مزید مزاحمت کیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''فاروق بھیا کدھر ہیں چاچاجی؟ آپ ان کا پتا بتائیں تو ہم انہیں بھی راستے سے لے لیں گے۔'' انوپم اگروال نے گاڑی آگے بڑھائی تو شکنتلا نے ربن سے دوسرا مطالبہ کیا۔

''اسے بعد کو بلوالیں گے۔ ابھی اپنے کو تیرے بپتا سے کچھ بات کرنی ہے۔'' ربن نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا اور ہمہ تن گوش ہو جانے والے سیٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اپن اس وقت بڑی مشکل میں ہے سیٹھ اور آپ کے لندن جانے میں اپنے کو اپنی مشکل کا حل نظر آرہا ہے اسی لیے اپن آپ کی موٹر میں بیٹھ گئے ہیں۔ پر زور زبردستی کوئی نہیں ہے۔ آپ کا من بولے تو اپنی بات ماننا۔ نہ بھی مانے تو اپنے کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''ایسا کیا ہے مسٹر رب نواز! آپ بولو اپنے سے جو بن پڑا اپن ضرور کرے گا۔'' سیٹھ کی توجہ گاڑی چلانے پر تھی۔ اس کے باوجود وہ ربن کی بات بھی توجہ سے سن رہا تھا۔ ربن نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے کل حالات اختصار سے کہہ سنائے اور آخر میں بولا۔

''فاروق لندن جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اپنے کو خطرہ ہے کہ پولیس راہ میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔ اسے اگر آپ کی فیملی کا ساتھ مل جائے تو وہ آسانی سے نکل جائے گا۔ باقی بعد کو اپن ادھر کے حالات سے خود نمٹ لیں گے۔'' اس کی خواہش جان کر انوپم اگروال ایک لمبے وقفے کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ شکنتلا بھی سانس روکے بیٹھی رہی کہ اتنے گمبھیر حالات میں وہ اپنے باپ کو کوئی مشورہ دینے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ آخر سیٹھ نے خود ہی سکوت توڑا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ اپن فاروق کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اپن تمہاری بات نہیں ٹال سکتے۔ اپنے کو وشواس ہے کہ تم نے جو کچھ بتایا بالکل سچ ہے۔ اپن خود بھی ہندوستان کے حالات دیکھ رہا ہے جب ہی تو بولا تھا کہ ہندوستان اب رہنے کی جگہ نہیں رہی۔ اب بھی دیکھو کہ پولیس کا کام جنتا کو پروٹیکشن دینا ہے اور ادھر پولیس ہی بلوے کروانا چاہتی ہے۔ اپن ہندوستان کے بٹوارے کے خلاف ہے، پر ایسا ظلم کرنے کو بھی ٹھیک نہیں بول سکتا۔'' سیٹھ کے فیصلے نے گاڑی میں چھا جانے والے بوجھل پن کو ختم کر دیا اور سب سے پہلے شکنتلا چہکی۔

''تھینک یو ڈیڈی! آپ نے میرے من کی بات مان لی۔ فاروق بھیا کتنے نائس آدمی ہیں، اس کی مجھے اچھی طرح خبر ہے۔ کسی کا مرڈر تو دور کی بات، وہ کوئی بھی غلط کام نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم لندن میں بھی انہیں اپنے ساتھ ہی رکھیں گے تاکہ آپ کے واپس ہندوستان آنے کے بعد بھی ہم وہاں تنہا نہ رہیں۔''

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری اچھا۔'' سیٹھ مسکرا کر بیٹی سے بولا اور پھر ربن سے مخاطب ہوا۔ ''اب آپ بولو کہ فاروق کو کدھر سے بلوانا ہے۔ ہم لوگ کوٹھی کے قریب پہنچ چکے ہیں، وہاں سے ڈرائیور کو فاروق کو بلوانے کے لیے بھیج دیں گے۔''

''شکریہ سیٹھ! آپ جو کچھ کر رہے ہو وہ اپنے اوپر آپ کا احسان رہے گا اور جندگی (زندگی) نے موقع دیا تو اپن اس احسان کا بدلہ بھی چکا دے گا۔'' ربن سچ مچ اس کا شکر گزار تھا اور ہرگز یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ سیٹھ خود پر کیے گئے احسان کا بدلہ چکا رہا ہے۔ اس احسان کو کر کے تو وہ خود فراموش کر چکا تھا۔

☆☆☆

نواب صاحب اور اختر کی اموات کو تھوڑے دن گزر چلے تھے۔ حویلی کی فضا میں اب بھی غم کے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن اب یہ بادل اتنے گہرے نہیں رہے تھے اور آہستہ آہستہ افراد خانہ زندگی کے معمولات میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعداد میں بھی بتدریج کمی آتی جا رہی تھی البتہ ندرت جہاں کی حالت ٹھیک نہیں تھی اس عمر میں اکلوتے بیٹے کی جدائی کے غم نے انہیں بالکل بستر سے لگا دیا تھا۔ افراد خانہ علاج اور دلجوئی کی اپنی سی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن بڑھاپا اور جدائی کا غم دونوں امراض لاعلاج تھے۔ عشرت جہاں بھی ماں کی حالت کے پیش نظر اپنے سسرال واپس نہیں گئی تھیں اور بچوں سمیت چہلم تک یہیں رکنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ موقع ایسا تھا کہ ان کے سخت گیر سسرالیوں اور نخریلے میاں کو بھی مروت سے کام لیتے ہوئے انہیں رکنے کی اجازت دینی پڑی تھی۔ ان دونوں اموات کے اہم ترین متاثرین میں نواب زادی عالیہ بھی شامل تھیں لیکن وہ چپ کی بکل مارے بیٹھی تھیں اور کوئی چاہتا بھی تو ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا کہ ان کی طرف سے کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ صرف جولیٹ تھی جو ان کی خاموشی کے باوجود ان کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزار لیتی تھی۔ وہی تھی جو ان کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔ عالم جنون اور طیش میں اپنے ہاتھوں ہو جانے والے اختر کے قتل پر اگرچہ وہ نادم نہیں تھیں لیکن ایک عام انسان پر اپنے ہاتھوں چلی جانے والی

انسانی جان کا جو بوجھ ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ تھا۔ جولیٹ کو اندازہ نہیں تھا کہ عالیہ پر یہ بوجھ کس طرح اثرانداز ہوگا البتہ اس نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ وہ ہذیانی کیفیت کا شکار نہیں ہیں چنانچہ اس بات کا اندیشہ بھی نہیں تھا کہ وہ کسی کے سامنے سچائی کا اظہار کردیں گی۔

صفی اللہ اور اسد اللہ دونوں نے مشترکہ فیصلہ کیا تھا کہ اس بات کو ہمیشہ راز میں رکھنا ہے کہ اختر کی موت عالیہ کے ہاتھوں ہوئی ہے اور جولیٹ کو بھی اس سلسلے میں سختی سے تاکید کردی گئی تھی۔ جولیٹ پہلے ہی ایک مرد کی ہوسناکی کا شکار ہو چکی تھی چنانچہ اختر کی صورت سامنے آنے والے ویسے ہی دوسرے مرد کے انجام پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ عشرت جہاں کی طرف سے ملنے والے کافرہ کے طعنے کے بعد سے وہ کسی اور ہی فکر میں تھی اور اپنی اصل کی تلاش میں آج کل مذہب اسلام کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس مطالعے سے ہی اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ اختر جیسے عزت کے لٹیروں کے لیے مذہب اسلام نے سنگساری جیسی سخت سزا تجویز کی ہے۔ اس حساب سے اسے پھر بھی ہلکی ہی سزا ملی تھی۔ اس کا جو کردار سامنے آیا تھا، اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی تھی کہ جو شخص حویلی کے قواعد وضوابط والی زندگی میں ایسی آوارگی کا مظاہرہ کر گیا تھا، وہ لندن کی آزاد فضاؤں میں تو نہ جانے کیا کیا گل کھلاتا رہا ہوگا۔ ایسے شخص کے انجام پر جولیٹ اپنے دل و دماغ پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کر رہی تھی اور پوری یکسوئی سے مذہب اسلام کے مطالعے میں مصروف تھی۔ مطالعے کے علاوہ اسے دوسرا کام آصف خان کے رشتے کے بارے میں غور کرنے کا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے باپ کی بات مان کر یہ رشتہ قبول کرلے اور سب عورتوں کی طرح سکون سے گھر گرہستی کرے لیکن دوسری طرف اسے لگتا تھا کہ اس کے لیے یہ سب ممکن نہیں ہے۔ دلدار آغا کو اس کے انجام تک پہنچائے بغیر وہ سکون سے رہ ہی نہیں سکتی تو گھر بسانے کا کیا سوال......؟

اس وقت بھی وہ ایک کتاب سامنے رکھے لائبریری میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کا ذہن کتاب سے زیادہ اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اسے سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اگر وہ انتقام کی راہ پر چلنا چاہے تو اس کے لیے کیا تدبیر اختیار کرے۔ پہلے کی بات اور تھی، وہ بمبئی میں بالکل آزادانہ زندگی گزار رہی تھی چنانچہ آغا تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پیر بھی مارتی رہی تھی لیکن اب اسد اللہ کی بیٹی کی حیثیت سے وہ اتنی آزاد نہیں رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اب اسد اللہ اسے بمبئی واپس جانے اور پہلے کی طرح تنہا زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اسے اپنا آپ ان دیکھی بندشوں میں جکڑا ہوا محسوس ہونے لگا تھا اور کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی تھی کہ ان بندشوں سے خود کو آزاد کروا سکے۔ بات زور زبردستی کی ہوتی تو وہ اپنی فطری بے باکی اور خود اعتمادی کے سہارے اڑان بھر جاتی لیکن یہاں معاملہ محبت کا تھا۔ اسد اللہ نے اسے اپنی شفقت اور محبت کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا اور وہ خود میں ہمت نہیں پارہی تھی کہ برسوں تنہائی اور نارسائی کا دکھ سہنے والے اپنے باپ کو کوئی دکھ دے سکے۔ وہ نفرت ومحبت کی کشمکش میں پھنس گئی تھی اور ہر وقت الجھن کا شکار رہنے لگی تھی۔

اب بھی وہ کتاب سامنے رکھے الجھی ہوئی بیٹھی تھی کہ دستک کی آواز کے ساتھ کتب خانے کا دروازہ کھلا اور اسد اللہ اندر داخل ہوئے۔

''آداب!'' آواز پر متوجہ ہونے والی جولیٹ انہیں دیکھ کر فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''جیتی رہیے۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟'' اسد اللہ نے شفقت سے جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' جولیٹ نے اختصار سے جواب دیا۔

''ابا جان کی رحلت کے بعد سے مصروفیات کا سلسلہ اتنا دراز ہوگیا ہے کہ ہم چاہتے ہوئے بھی آپ سے ملاقات کے لیے وقت نہیں نکال پاتے۔ بھائی جان کی بھی بہت سی ذمے داریاں ہمیں ہی انجام دینی ہوتی ہیں۔ وہ پہلے ہی اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ ذمے داریوں کا زیادہ بوجھ ان کی ذات پر رہے۔ یوں تو حسیب اللہ بھی بساط بھر کوشش کرتے ہیں لیکن ابھی وہ ناتجربہ کار ہیں اس لیے انہیں بھی ایک حد سے زیادہ ذمے داریاں نہیں سونپی جاسکتیں۔'' جولیٹ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں اس سے کہا تو اس نے غور کیا کہ وہ بہت تھکے ہوئے اور شکستہ نظر آرہے ہیں حالانکہ لباس اور دیگر معاملات میں آج بھی وہی نفاست اور رکھ رکھاؤ تھا جو اول روز سے دیکھتی چلی آرہی تھی۔

''مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے اس لیے دل میں آپ کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے۔'' اس نے اپنی طرف سے انہیں تسلی کروائی۔

''جیتی رہیے۔ آپ کی صورت اللہ نے ہماری عمر بھر کی محرومیوں کا ازالہ کردیا ہے۔ آپ کو دیکھتے ہیں تو

ہمارے دل میں ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے اور حقیقی طور پر احساس ہوتا ہے کہ اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اپنی یہ سرشاری ہمیں بھائی جان کے دکھ کا اور بھی زیادہ شدت سے احساس دلاتی ہے۔ کہنے کو وہ حسیب اللہ اور عافیہ کی خوشیاں دیکھ رہے ہیں اور انہیں پوتے پوتی اور نواسہ نواسی کی صورت ڈھیروں نعمتیں ملی ہوئی ہیں لیکن وہ جوان کے دل کا ایک گوشہ ان سے الگ ہو گیا ہے، اس کا دکھ اتنا بھاری ہے کہ خوشی میں بھی ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ایسے میں ابا جان کی جدائی کا غم سہنا ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس لیے ہم زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' اسد اللہ کی اس بات نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ اسے یاد آیا کہ پہلے بھی انہوں نے آصف خان کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے اس سے صفی اللہ کے چھوٹے بیٹے محب اللہ کا ذکر کیا تھا لیکن واضح طور پر کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب دوبارہ اسی طرح کا ذکر چھڑا تو اس کی الجھن سوال بن کر لبوں پر چلی آئی۔

''آپ نے بھی بتایا نہیں کہ بڑے ابا کو کیا دکھ ہے؟ کیا ان کے چھوٹے صاحب زادے کی ڈیتھ......''

''اللہ نہ کرے بیٹی! ہمارے محب اللہ زندہ ہیں۔ بے شک وہ ہم سب کی نگاہوں سے دور چلے گئے ہیں لیکن اس بات کا ہم سب کو یقین ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں، بخیریت اور زندہ سلامت ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور وہ ہمارے دلوں کی ٹھنڈک لوٹانے کے لیے واپس ہمارے پاس آجائیں۔'' اسد اللہ نے اسے اپنا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا اور تڑپ کر اس کی بات کاٹ ڈالی۔

''سوری! مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ ایکچو لی کسی نے ان کے بارے میں کچھ بتایا نہیں اور کچھ عجیب سی باتیں سامنے آئیں تو مجھے شک ہوا کہ......'' اس بار جولیٹ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ کی غلطی نہیں ہے۔ ادھوری اور مبہم باتوں سے کوئی بھی شخص غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ اصل میں محب اللہ کی ذات سے ایک اتنا تکلیف دہ واقعہ جڑا ہوا ہے کہ ہم سب شرمندگی کے باعث ان کا ذکر ہی نہیں کر پاتے۔ دوسرے بھائی جان کی بھی یہی خواہش ہے کہ بار بار محب اللہ کا ذکر کر کے ان کے زخم کو نہ کریدا جائے اس لیے سب نے اس موضوع پر اپنے لب سی لیے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تصویریں بھی چھپا دی گئی ہیں، اسی لیے حویلی میں قیام کے باوجود آپ اب تک ان سے ناواقف تھیں۔''

''آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ محب اللہ اس حویلی کا فرد ہوتے ہوئے بھی یہاں سے الگ ہو گئے؟'' اسد اللہ کے الفاظ اور یاسیت زدہ لہجے نے جولیٹ کے تجسس کو مزید ہوا دی۔

''یہ جن دنوں کا قصہ ہے ان دنوں ہم انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی ہمارا وہاں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا اور قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس بار ہمارے پیچھے اتنا بڑا سانحہ پیش آجائے گا۔ ان دنوں محب اللہ یہی کوئی پندرہ سولہ سال کے تھے اور اپنی عمر کے اعتبار سے بے حد جذباتی اور جوشیلے بھی۔ مصلحت پسندی اور دروغ گوئی جیسی باتوں سے وہ گویا آشنا ہی نہیں تھے۔ شاید یہاں ملازماؤں یا حویلی کے کسی فرد کے ذریعے ہی آپ کے علم میں آیا ہو کہ پھپھی بیگم ملازماؤں کو ان کی غلطیوں پر عجیب وغریب سزائیں دینے کی عادی ہیں۔ حویلی میں ایک کم عمر آسیہ نامی ملازمہ ہوا کرتی تھی۔ اسے پھپھی بیگم نے خاص اپنی خدمت کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور وہ دن رات کا بیشتر حصہ ان کی خدمت میں گزارتی تھی۔ ایک روز پھپھی بیگم نے اپنے زیورات اجلوانے کے لیے نکالے اور خود ہی کہیں رکھ کر بھول گئیں لیکن انہیں لگا کہ ہو نہ ہو، ان زیورات کو آسیہ نے چرا لیا ہے۔ انہوں نے بغیر کسی ثبوت کے اس بے چاری پر الزام لگا کر اس سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے زیورات واپس کرے۔ زیورات اس کے پاس تھے ہی نہیں تو وہ واپس کیسے کرتی۔ رو رو کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی رہی لیکن پھپھی بیگم کو اس پر رحم نہ آیا اور انہوں نے حکم دیا کہ آسیہ کو رسی سے باندھ کر اس وقت تک کنوئیں میں الٹا لٹکا دیا جائے جب تک وہ سچ نہ اگل دے۔ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ کنوئیں میں لٹکی آسیہ وہاں سے بھی رو رو کر دہائیاں دیتی رہی لیکن ہمیں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی ہو رہی ہے کہ پھپھی جان ایک نہایت سنگ دل خاتون واقع ہوئی ہیں اور ہم نے کبھی انہیں کسی پر رحم کھاتے نہیں دیکھا۔ آسیہ کی دہائیوں کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب معلوم نہیں کہ رسی کمزور تھی یا آسیہ کو ٹھیک سے باندھا نہیں گیا تھا کہ وہ بے چاری کئی فٹ گہرے کنوئیں میں جا گری۔ جب تک اسے کنوئیں سے نکالنے کی تدبیر کی جاتی۔ وہ اپنی جان سے چلی گئی۔ ادھر پھپھی جان کے کمرے میں ان کے زیورات کی تلاش میں مصروف اکا بیگم کو ان ہی کے کمرے کے ایک طاقچے میں رکھے ہوئے زیورات مل گئے۔ پھپھی بیگم نے الزام لگایا کہ زیورات آسیہ نے ہی وہاں چھپائے تھے لیکن سب سمجھتے ہیں کہ یہ درست نہیں تھا۔ بہر حال آسیہ

کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جسے زنان خانے میں ہی دبا دیا جاتا۔ اس کا باپ جو حویلی ہی کا ملازم تھا، ابا جان کے سامنے دہائیاں دینے لگا کہ اس کی بن ماں کی بچی آپا بیگم کے ظلم کا شکار ہوگئی ہے۔ ابا جان کے لیے وہ بہت نازک وقت تھا۔ وہ غیر منصف نہیں تھے لیکن حویلی کی عزت اور بہن کی محبت کی خاطر انہیں مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے آسیہ کے باپ کے سامنے پھپھی بیگم کے موقف کی تائید کی اور اسے یہ باور کروایا کہ اس کی بیٹی اپنی ہی غلطی کے باعث انجام کو پہنچی ہے پھر بھی انہیں احساس ہے کہ اس کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس نقصان کی تلافی کے لیے انہوں نے آسیہ کے باپ کو کثیر رقم قبول کرنے پر مجبور کیا ورنہ اس کے لیے دوسری صورت یہ تھی کہ وہ خالی ہاتھ حویلی سے نکل جاتا اور جہاں چاہتا جا کر دہائی دیتا۔ آسیہ کا باپ حویلی والوں کی طاقت اور اختیار سے واقف تھا کہ ان کے سامنے اس غریب کی ہرگز بھی نہیں سنی جائے گی چنانچہ اس نے ابا جان کی پیشکش کو قبول کرنا منظور کر لیا۔ محب اللہ اپنی کم سنی کے باعث مردانے اور زنانے دونوں جگہ آزادانہ آتے جاتے تھے۔ انہوں نے خود اپنے کانوں سے آسیہ کی چیخیں سنی تھیں اور پھپھی بیگم سے استدعا کی تھی کہ اگر وہ چور بھی ہے تو اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے لیکن پھپھی بیگم نے ان کی یہ استدعا قبول نہیں کی اور اسی اثنا میں آسیہ کنوئیں میں گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ محب اللہ کو اس بات کا بھی علم ہو گیا کہ زیورات چوری نہیں ہوئے تھے بلکہ پھپھی بیگم خود ہی انہیں رکھ کر بھول گئی تھیں۔ بس وہ جوش میں آ گئے اور برملا ہی نہیں بلکہ پھپھی بیگم کو مجرم قرار دیتے ہوئے ابا جان کے سامنے بھی اڑ گئے کہ وہ اپنی بہن کی پشت پناہی نہ کریں۔ محب اللہ سب کی طرح ابا جان کو بھی بے حد عزیز تھے لیکن معاملہ حویلی کی عزت اور ساکھ کا تھا اس لیے انہوں نے محب اللہ کو سختی سے خاموش رہنے کا حکم سنا ڈالا۔ جوش و رنج میں مبتلا محب اللہ نے انہیں دھمکی دی کہ اگر انہوں نے ظلم کا ساتھ دیا تو وہ حویلی چھوڑ دیں گے۔ ابا جان اس دھمکی کو پوتے کی جذباتیت سے زیادہ کچھ نہیں سمجھے اور یہی خیال کیا کہ محب اللہ حویلی سے نکلے بھی تو چار چھ گھنٹے کہیں گزار کر واپس آ جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس دن کے حویلی سے نکلے محب اللہ کبھی واپس نہیں آئے۔ بعد میں انہیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ نہیں ملے۔ دو تین سال بعد یہ کوششیں بھی ترک کر دی گئیں اور یہی فیصلہ ہوا کہ حویلی میں محب اللہ کا ذکر ترک کر دیا جائے۔ بس اسی لیے آپ نے ان کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں سنا۔ ہمارے یادگاری البم میں محب اللہ کی ایک بہت خوب صورت تصویر ہے۔ کسی دن ہم آپ کو وہ تصویر دکھائیں گے۔"

پوری داستان سنانے کے بعد اسد اللہ نے اس سے کہا تو اس کی آنکھوں میں چھم سے اس لڑکے کی تصویر اتر آئی جس کے لیے اس نے شناسائی محسوس کی تھی۔ وہ اس تصویر کو ہی دیکھ رہی تھی جب اختر کسی آفتِ ناگہانی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا اور بعد میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ جولیٹ کے ذہن سے وہ تصویر ہی محو ہو گئی لیکن اب اسے پوری جزئیات کے ساتھ وہ تصویر یاد آ گئی تھی اور ساتھ ہی ذہن میں ایک دریچہ بھی روشن ہوا تھا۔ بے اختیار ہی اسے وہ دو گہری بھوری آنکھیں یاد آ گئی تھیں جو ہر دم اس کی راہ میں بچھی رہتی تھیں لیکن اس نے تو کبھی اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا۔

"تو کیا وہ...... جسے میں بڑی حقارت سے ٹھکراتی رہی تھی، محب اللہ تھا۔ اس حویلی کے وارثوں میں سے ایک......؟" اس کے ذہن میں سوال جاگا اور وہ بے اختیار ہی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر رہ گئی۔

"محب اللہ ہمیں خاندان کے سارے بچوں میں سب سے زیادہ پیارے تھے۔ وہ تھے ہی ایسے دل موہ لینے والی شکل و صورت اور عادات کے مالک کہ کوئی بھی انہیں پسند کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ ذہانت میں بھی وہ سب بچوں سے آگے تھے۔ جوز فین بھی ہمیشہ محب اللہ کی بہت تعریف کرتی تھیں اور سب کا یہی خیال تھا کہ وہ تعلیمی میدان میں بہت آگے تک جائیں گے لیکن افسوس کہ وہ جوش و جذبات میں حویلی ہی چھوڑ گئے۔ ابا جان نے اپنی بزرگی کے رعب میں شاید انہیں چند سخت جملے کہہ دیے تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ پھپھی بیگم نے بھی طنز کے تیر چلائے تھے کہ حویلی سے نکل کر محب اللہ کو کہیں جائے پناہ نہیں ملے گی اور وہ منہ کی کھا کر خود ہی واپس آ جائیں گے۔ ہمیں لگتا ہے کہ ان ہی ساری باتوں نے انہیں کبھی واپس نہیں آنے دیا ورنہ حویلی کی طرف آنے والے راستے انہیں بھولے تو نہیں ہوں گے۔ وہ کم سن تھے مگر اتنے بھی نہیں کہ دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جاتے۔ بس انہوں نے کبھی واپس لوٹنا نہیں چاہا اور جو خود سے گم ہو جائے اسے کوئی کیسے ڈھونڈ سکتا ہے۔ پھر بھی ہم جب بھی حیدرآباد سے باہر نکلتے ہیں ہماری نگاہیں ہر سو بھٹکتی رہتی

ہیں کہ کہیں تو وہ نظر آجائیں گے لیکن برسوں سے مایوسی ہی ہمارا نصیب ہے۔ کاش کہ وہ یہاں ہوتے تو آپ کے لیے ہمارا انتخاب ان کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا۔''

اس کی حالت سے بے خبر اسد اللہ بولے جارہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ جسے حقیر جان کر ہمیشہ ٹھکرایا، وہ تو مجھ سے کہیں بڑھ کر عزت و مرتبے کا مالک تھا لیکن اس نے کبھی جتایا نہیں اور اتنی خاموشی سے مجھ سے محبت کرتا رہا کہ کبھی اپنی زبان سے بھی اظہار نہیں کیا۔ اس کا دل چاہا کہ اسد اللہ کو بتادے کہ آپ کا محب اللہ واقعی خیریت سے ہے اور میں آپ کو اس تک پہنچا سکتی ہوں لیکن پھر ایک خیال نے اس کا دامن تھام لیا۔ اس نے سوچا کہ اگر محب اللہ حویلی پہنچ گئے تو وہ اپنے ساتھ میری بربادی کی داستان بھی لے کر آئیں گے اور میں جو اس حویلی کے کچھ لوگوں کے نزدیک ویسے ہی حقیر ہوں اور بھی کمتر سمجھی جانے لگوں گی۔ سب سے بڑھ کر میرے والد نواب اسد اللہ کو صدمہ ہوگا۔ انہوں نے اتنی مدت بعد کسی خوشی کی شکل دیکھی ہے۔ محب اللہ کے یہاں آنے سے ان کی خوشی روٹھ جائے گی۔

''کیا بات ہے بیٹی، آپ اچانک اتنی خاموش کیوں ہوگئیں؟'' اسد اللہ نے اسے سوچوں میں گم صم پایا تو ٹوک بیٹھے۔

''نہیں، کچھ نہیں...... بس میں اس داستان کو سن کر اداس ہوگئی تھی۔'' جولیٹ نے بہانہ بنا کر اصل بات چھپالی لیکن اس کے اندر بڑی زور کی جنگ چھڑ گئی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ حقیقت چھپا کر مجھ سے ایک جرم کا ارتکاب ہو رہا ہے۔

☆☆☆

ربن، فاروق کو سیٹھ انوپم اگروال کی کوٹھی میں منتقل کروانے کے بعد بہت ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ اب اسے اطمینان سا تھا کہ فاروق بغیر کسی مشکل کے ہندوستان سے نکل جائے گا۔ سیٹھ اور اس کے گھر والے حقیقتاً ان کے بہت احسان مند تھے اور سیٹھ کی پتنی نے بھی انہیں بہت عزت دی تھی۔ وہ سارا وقت ربن کو بھائی اور فاروق کو بیٹا کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی۔ کھانے پر بھی خاص اہتمام کروایا گیا تھا۔ شکنتلا سب سے زیادہ پُرجوش تھی اور چہکتی پھر رہی تھی۔ ربن نے موقع دیکھ کر اسے فاروق پر خصوصی نظر رکھنے کا کہہ دیا تھا۔ فاروق آغا کے خلاف جذبۂ انتقام دل میں لے کر لندن جارہا تھا اور ربن اس کے کسی نئی مصیبت میں مبتلا ہونے کے خلاف تھا۔ بہر حال اس وقت تو اسے یہی مناسب لگ رہا تھا کہ فاروق ہندوستان سے نکل جائے تو کم از کم یہاں کے پیچیدہ حالات سے اس کی جان چھوٹ جائے گی اسی لیے وہ خاصا مطمئن تھا۔ اسے بے فکری ہوگئی تھی کہ اب اسے دباؤ میں رہ کر ڈی ایس پی راٹھور کے گھناؤنے مطالبات تسلیم نہیں کرنے پڑیں گے اور وہ اسے صاف انکار کرسکے گا۔ اس نے اکبر کو بھی فاروق کے ساتھ لندن بھجوانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ ناتجربہ کار لڑکا تھا لیکن فاروق سے شدید محبت کرتا تھا اس لیے امید تھی کہ وہ کسی مصیبت میں فاروق کا بھرپور ساتھ دے گا۔ اکبر کے انتخاب کی دوسری وجہ اس کا اڈے سے متعلق نہ ہونا بھی تھا۔ اڈے کے لوگوں کو پولیس والے پہچانتے تھے اس لیے اگر وہ ان میں سے کسی کو فاروق کا ہمسفر بنانے کی کوشش کرتا تو اس کے نظر میں آنے کا ڈر تھا۔

سیٹھ اگروال کے ہاں سے لوٹتے ہی اس نے اکبر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا تھا جس پر اکبر بہت خوش تھا۔ منو نے البتہ اس موقع پر اس سے واپسی کی اجازت طلب کی تھی۔ وہ بہت عرصے سے چندی گڑھ سے نکلا ہوا تھا اور اب اس کا واپس لوٹ جانا ہی مناسب تھا۔ ربن نے خوش دلی سے اسے واپسی کی اجازت دے دی اور اس رات سکون کی نیند سویا لیکن صبح اس کے لیے نئی پریشانی لے کر آئی۔ جس ٹھکانے پر انہوں نے وکرم کو رکھا تھا وہاں سے ایک بندہ گھبرایا ہوا آیا اور اطلاع دی کہ جو بندے رات وکرم کی لاش ٹھکانے لگانے نکلے تھے، وہ واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ یہ ایک تشویش ناک خبر تھی۔ ربن نے فوراً ہی اپنے آدمیوں کو دوڑایا کہ وہ احتیاط سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں لیکن کہیں سے کوئی خبر نہیں مل سکی۔ لاش کے بارے میں البتہ معلوم ہوا کہ صبح کے قریب ایک کچرا گھر سے مل گئی تھی اور پولیس والے اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ لاش کا ملنا اور اسے ٹھکانے لگانے والوں کا غیاب ایک معما سا بن گیا۔ ربن کی پیشانی کے بل بڑھ گئے۔ ایسے میں اسے راٹھور کی طرف سے تھانے پہنچنے کا حکم ملا تو وہ وہاں چلا گیا۔ ملاقات پہلے والے کمرے میں ہی ہوئی اور پہلے ہی کی طرح راٹھور نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا۔

''پھر کیا سوچا دادا تم نے...... ہمارے لیے کام کرو گے یا نہیں؟'' پہلے ہی کی طرح اس نے کرسی پر آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے ربن سے دوستانہ لہجے میں گفتگو چھیڑی لیکن ربن نے محسوس کیا کہ آج اس کی آنکھوں کی چمک پہلے سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

''جواب تو اپن آپ کو کل ہی دے دیے تھے کہ اپن

خوشخبری

شاعری انٹرنیشنل انتخاب بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے

داستان دل ڈائجسٹ کی ٹیم شاعری انٹرنیشنل انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں سب شاعر شامل ہو سکتے ہیں اور جو شاعر نہیں وہ کسی بھی شاعر کی دو غزلیں انتخاب کر سکتے ہیں انشاءاللہ یہ کتاب بہت جلد مارکیٹ میں آرہی ہے شامل ہونے کے لیے آج ہی ہم سے رابطہ کریں

اہم نوٹ: اس بک کے لیے دو غزلیں یا نظم دے سکتے ہیں اور ایک ہزار فیس ہوگی ان پیسوں کی کتابیں سینڈ کی جائیں گی

مزید معلومات کے لیے رابطہ

03225494228
abbasnadeem283@gmail.com

سلسلہ انچارج

اردو نینا اقبال، سحرش علی نقوی، آمنہ رشید، ملائکہ خان، ندیم عباس ڈھکو، نزہت جبیں ضیاء، نور بخاری، ریحانہ اعجاز، داستان دل ٹیم

اس انتخاب میں شامل لازمی ہوں انشاءاللہ یہ کتاب پاکستان کے علاوہ امریکہ، دوبئی، سعودی عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں پڑھی جائے گی انشاءاللہ۔ اس میں ہر ممالک سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اور شامل ہونا بھی آسان ہے آپ اپنی پسند کی دو غزلیں دے سکتے ہیں اور جو فیس دیں گئیں ان کی کتابیں مل جائیں گے ایسا چانس بار بار نہیں ملے گا اس لیے سب سے اپیل ہے کہ آپ سب شامل ہوں مزید معلومات کے لیے واٹس اپ 03225494228 یا فیس بک 03377017753 پر رابطہ کریں شکریہ

منجانب: داستان دل ڈائجسٹ ٹیم

بھاڑے کے قاتل نہیں ہیں جو کسی کے بھی کہنے پر نرودوش لوگوں کو قتل کرتے پھریں۔ اپن اپنے طریقے سے کام کرتے ہیں۔" ربن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج ڈی ایس پی کل سے بھی زیادہ پُراعتماد ہے کہ ربن سے اپنے مطالبات تسلیم کروالے گا، اس کے باوجود اس نے اسے کھرا جواب دیا۔ فاروق کی طرف سے اطمینان کے بعد وہ ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔

"واہ بھئی واہ! کیا بات ہے ربن دادا کی۔ اپنے طریقے سے جس کی چاہے جان لے لے، جسے چاہے عمر بھر کے لیے اپاہج کردے، جسے چاہے سڑک پر لے آئے لیکن ہم کہیں تو انکار کردے۔" راٹھور نے طنز بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ربن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو اور وہ اس کے ساتھ کوئی دلچسپ کھیل کھیل رہا ہو۔

"آپ جیسا چاہے سمجھو۔ اپن آپ کو اپنا جواب بول دیلے ہیں۔" ربن ردعمل میں پرسکون ہی رہا۔ راٹھور بھی اس بار زبان سے کچھ نہیں بولا اور میز پر دھری گھنٹی کو ہاتھ بڑھا کر بجایا۔

"یس سر!" گھنٹی کے جواب میں فوراً ہی ایک سپاہی جن کی طرح نازل ہوا۔

"خاص مہمانوں کو لے کر آؤ۔" راٹھور نے حکم دیا تو سپاہی فوراً باہر نکل گیا۔ ذرا سے توقف کے بعد ربن کو تھانے لانے والا اے ایس آئی ہتھکڑی لگے دو افراد کو اپنے ساتھ لیے وہاں پہنچ گیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ربن نے ایک گہرا سانس لیا۔ یہ وہی دونوں تھے جنہیں وکرم کی لاش کہیں پھینکنے کی ڈیوٹی سونپی گئی تھی اور وہ واپس نہیں لوٹے تھے۔ یقیناً وہ پولیس کے ہتھے لگ گئے تھے۔ ربن نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے اور ان کی حالت اتنی ابتر ہے کہ وہ ڈھنگ سے کھڑے بھی نہیں ہو پا رہے ہیں۔ حقیقتاً اگر وہ ربن کے تربیت یافتہ نہیں ہوتے تو اس وقت کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ ربن جانتا تھا کہ اتنے تشدد کے بعد آدمی کے لیے اپنی زبان بند رکھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس کے اڈے سے وابستہ لوگ اگرچہ بہت مضبوط تھے لیکن تھے تو بہرحال انسان ہی اور انسان کا کیا بھروسا ہوتا ہے کہ کب ہار جائے۔ وہ دونوں بھی ہار گئے تھے اور اب ربن سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ ان دونوں کو یہاں دیکھ کر ربن کو راٹھور کے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کی وجہ بھی سمجھ آگئی۔ راٹھور اس وقت اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ ربن کو ڈرا دھمکا کر اس سے اپنا کام نکلوا سکتا ہے۔

"کیوں دادا! یہ تمہارے ہی آدمی ہیں نا؟" راٹھور نے اپنے سابقہ طنزیہ لہجے میں ربن سے دریافت کیا۔

"ہیں تو سہی، پر آپ لوگوں نے انہیں آدمی کہاں رہنے دیا ہے۔ مار مار کر بھرکس بنا دیا ہے سالوں کا۔" ربن نے کہا تو راٹھور ہنس دیا پھر بولا۔

"کیا کرتے دادا! بہت موٹی چمڑی ہے تمہارے پٹھوؤں کی۔ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے پھر بھی بہت مشکل سے اپنا جرم مانے۔"

"ایسا کیا جرم کر ڈالا تھا ان غریبوں نے کہ سرکار کو اتنی زحمت کرنی پڑی۔" ربن نے تجاہل سے کام لیا۔

"واہ...... تو دادا کو نہیں خبر کہ اس کے بندے شہر میں کیا کرتے پھرتے ہیں۔" راٹھور نے پھر طنز کیا۔

"خبر رکھنے کو آپ جو ہو۔" ربن کے اطمینان میں سرِمو فرق نہیں آیا۔ یہی اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ مخالف حالات میں بھی جبکہ خود اس کے اپنے اندر ہلچل مچی ہو، وہ سامنے والے کو آسانی سے پکڑائی نہیں دیتا تھا۔

"ہمیں تو خبر ہے ہی۔ ہم نے انہیں وکرم کی لاش کو کچرے میں پھینکتے ہوئے پکڑا تھا اور انہوں نے مانا ہے کہ یہ ایسا تمہارے حکم پر کررہے تھے۔" راٹھور کا انداز جتانے والا تھا۔

"ایسی چار چوٹ کی لگانے کے بعد آپ ان سے بولو گے کہ یہ جو دوسری جنگِ عظیم چھڑی ہے، یہ ربن کے کہنے پر چھڑی ہے تو ان بے چاروں کو ماننا ہی پڑے گا۔" ربن کے ترے سے دیے گئے جواب پر راٹھور تلملا گیا اور بولا۔

"تم کہنا چاہتے ہو کہ ہم تم پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں ورنہ تم دودھ کے دھلے ہو۔ پر یاد رکھو، انہوں نے اور بھی بہت کچھ اگلا ہے۔ پولیس تمہارے اس خفیہ ٹھکانے پر پہنچ چکی ہے جہاں تم نے وکرم کو رکھا تھا۔ وہاں سے بھی بہت سے ثبوت مل جائیں گے۔" راٹھور کی کارکردگی زبردست تھی۔

"اڈے کے سوا پورے بمبئی میں کسی مکان کو ربن کا ٹھکانا ثابت کرسکو تو یہ آپ کا کارنامہ ہوگا۔ رہی ثبوتوں کی بات تو یہ تو آپ پر ہے کہ چاہو تو کہیں سے توپ بھی نکال ڈالو اور بولو کہ یہ ربن نے چھپائی تھی۔" وہ بڑی کامیابی سے راٹھور سے نمٹ رہا تھا اور اس کا ثبوت راٹھور کے چہرے کے بگڑتے ہوئے تاثرات تھے لیکن بہرحال وہ بھی کچھ ایسا

کم نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور اے ایس آئی کو ربن کے دونوں ساتھیوں سمیت وہاں سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ذرا سا آگے کی طرف جھکا اور ربن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''بھاٹیہ سیٹھ کو میں نے بڑی مشکل سے لارے لپّے دے کر روک رکھا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کا خون معاف کرنے کو تیار نہیں ہے اور کہتا ہے کہ بہت اوپر جا کر اس معاملے کو اٹھائے گا۔ سیٹھ کو کیسے روکنا ہے، یہ مجھے معلوم ہے لیکن شرط وہی ہے کہ تم بھی تو ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرو۔''

''سیٹھ سے اپن نمٹ لے گا۔ کورٹ کچہری اپنے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ اپن کا وکیل بھی تجربے والا ہے۔'' ربن کسی دھمکی میں نہیں آنے والا تھا۔

''تم اوور کانفیڈینس کا شکار ہو دادا۔ ہم نے تم سے کوئی ایسا کام نہیں بولا تھا۔ ادھر یہ سب کرنے والے بہت ہیں، بس میرا من بولا تھا کہ تم کو دوستی کا ایک چانس دوں پر تم نے اس چانس کو کھو دیا۔ اب تم جاؤ اور ہماری دشمنی کا انتظار کرو۔'' راٹھور کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے یکدم ہی گفتگو کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

''دشمن بہادر ہو اور سامنے سے وار کرنا جانتا ہو تو دشمنی کا مزہ آتا ہے۔ اپن دیکھتا ہے کہ آپ بہادروں کی طرح دشمنی نبھاتے ہو یا بزدلوں کی طرح پیچھے سے وار کرتے ہو۔'' ربن اس کے حکم پر فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا لیکن چیلنج کرنے والے انداز میں راٹھور سے یہ سب کہنا نہیں بھولا۔ وہاں سے نکلتے ہوئے اسے یقین تھا کہ راٹھور کو سخت غصے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر کے نکلا ہے لیکن سچ یہ تھا کہ وہ خود بھی متفکر تھا اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہندوستان کے بگڑتے ہوئے حالات کی طرح اسے اور اس کے ساتھیوں کو بہت سخت حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

☆☆☆

جولیٹ نے اپنے سامنے موجود تصویر کو بغور دیکھا۔ لمبا قد، صاف رنگت، خوب صورت نقوش، سیاہ بال اور سیاہ ہی خود اعتمادی و ذہانت کی چمک لیے آنکھیں...... پہلے بھی اس نے یہ تصویر دیکھی تھی اور اس وقت بھی اس کے لیے شناسائی محسوس کی تھی اور جب آج دوبارہ دیکھ رہی تھی تو مکمل پہچان کا مرحلہ طے کر چکی تھی حالانکہ وہ اسے پہچاننا نہیں چاہتی تھی اور دل میں کہیں یہ خواہش تھی کہ یہ وہ نہ ہو جسے وہ شناخت کر چکی ہے لیکن یہ وہی تھا۔ بڑھتی عمر نے اس کے اندر کچھ تبدیلی تو کی تھی۔ قد مزید لمبا ہو گیا تھا، دبلا پتلا جسم بھر کر مضبوط کاٹھی میں تبدیل ہو گیا تھا اور رنگت میں ہلکی سی سنولاہٹ آ گئی تھی جو یقیناً بمبئی کی سمندری ہوا اور زندگی کی سختیوں کی دین تھی لیکن باقی سب کچھ تو ویسا ہی تھا اور وہ کسی طرح انکار نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے اس تیرہ چودہ سالہ محب اللہ کو بمبئی کی گلیوں میں فاروق دادا یا فاروق استاد کے روپ میں دیکھا ہے۔ بات صرف اس شناخت کے اعتراف کی تھی اور وہ کشمکش میں تھی کہ کیا کرے...... یہاں آتے ہوئے وہ اس حویلی میں مستقل رہنے کا ارادہ کر کے نہیں آئی تھی لیکن اسد اللہ کی محبت نے اس کے دل کو جکڑ لیا تھا۔ جوزفین اور اپنی محبت کی نشانی کے طور پر اسے قبول کر کے انہوں نے اس کا دل جیت لیا تھا۔ اس کے ساتھ دلدار آغا والا حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو وہ ہمیشہ باپ کی شفقت کے سائے میں رہنا پسند کرتی۔ اسے آغا کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے یہاں سے جانا تھا لیکن دل کچھ عرصہ یہیں پڑاؤ ڈال لینے پر بضد تھا۔

وہ جو زندگی سے بالکل خالی ہو گئی تھی، ایک بار پھر زندگی کو محسوس کرنے لگی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ محب اللہ یہاں آیا تو وہ یہاں نہیں رہ سکے گی۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی ہستی کے عیاں ہو جانے کے بعد بھی یہاں رہ سکے لیکن سچ چھپانے پر بھی وہ اپنے آپ سے ناراض تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس حویلی کے مکین برسوں سے محب اللہ کی راہ دیکھ رہے ہیں اور وہ ذرا سا سچ بول کر ان کی خوشیاں لوٹا سکتی ہے۔ وہ جس کا ذکر زبان سے نہیں کیا جاتا لیکن جو سب کے دلوں میں بستا ہے، اگر حویلی لوٹ آتا تو اس حویلی کی رونق ہی اور ہوتی لیکن وہ اپنے وقتی پڑاؤ کی خاطر اس حقیقت کا انکشاف کرنے سے ہچکچا رہی تھی کہ وہ محب اللہ کے ٹھکانے سے واقف ہے۔

''اگر یہاں والوں کو پتا چلا کہ اس انجیب الطرفین خاندان کا فرد ہوتے ہوئے محب اللہ بمبئی کے ایک اڈے پر بیٹھا دادا گیری کر رہا ہے تو انہیں بہت صدمہ ہو گا اس لیے بہتر ہے کہ میں انہیں اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔'' اس کے دماغ نے بچاؤ کی ایک راہ سجھائی۔

''میں نہیں بتاؤں گی تو وہ ہمیشہ اپنی اصل سے کٹ کر جیتا رہے گا اور یہاں والے اس کی یاد میں مر مر کر جیتے رہیں گے۔'' اس کے دل نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا تو وہ بے ساختہ ہی اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دل و دماغ کی اس کشمکش نے اسے نڈھال کر دیا تھا تب ہی آج وہ دوبارہ اسد اللہ اور جوزفین کی محبت کے گواہ اس کمرے میں آ بیٹھی تھی اور

دوبارہ اس البم کو دیکھ کر اپنے شکوک وشبہات کو کسی حتمی نتیجے پر پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی اور نتیجہ وہی تھا جو وہ پہلے ہی جانتی تھی۔ محب اللہ اور فاروق ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، اسے خود سے یہ اعتراف کرنا پڑ رہا تھا اور اب کوئی الجھن باقی تھی تو صرف یہ کہ وہ اس حقیقت کا انکشاف کرے یا نہ کرے۔ اس الجھن کا شکار وہ اپنا سر تھامے بیٹھی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز سن کر چونکی۔

''کون؟''

''ہم ہیں اسد اللہ۔''

''پلیز اندر آجائیں۔'' وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''ہم آپ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ سروری نے بتایا کہ آپ یہاں ہیں تو ہم یہیں چلے آئے۔'' اسد اللہ اسے بتا رہے تھے کہ ان کی نظر کھلے ہوئے البم پر پڑی۔

''یہ محب اللہ ہیں۔ ہمارے سب سے پیارے بھتیجے۔'' انہوں نے گویا جولیٹ کا اس سے تعارف کروایا، جواب میں وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

''آیئے، وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' میز کے ساتھ صرف ایک کرسی رکھی تھی اس لیے اسد اللہ نے مسہری کی طرف اشارہ کیا۔ اختر کی موت کے بعد بہت خاموشی سے اس کمرے کی صفائی کردی گئی تھی اور خراب ہوجانے والے قالین کی جگہ دوسرا قالین ڈال دیا گیا تھا۔ جولیٹ ان کے کہنے پر مسہری پر آبیٹھی لیکن البم اس کے ہاتھ میں تھا اور محب اللہ کی تصویر والا ورق کھلا ہوا تھا۔ وہ کچھ گم صم سی تھی۔

''ہم آپ سے آصف خان کے رشتے کی بابت رائے لینا چاہتے تھے۔ آپ کی رائے ہی ہمارا فیصلہ ہوگا۔ آپ آصف خان سے مل چکی ہیں اس لیے ہمارے خیال میں آپ کو ان کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے زیادہ وقت درکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہم آپ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر ہی چکے ہیں کہ ہم اباجان کے چہلم کے بعد باقاعدہ ایک تقریب منعقد کر کے آپ سے اپنے رشتے کے اعلان کے علاوہ آپ کی نسبت ٹھہرنے کا اعلان بھی کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ کی رائے جاننے کے لیے عجلت میں مبتلا ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اس تقریب میں آصف خان کے والدین بھی شامل ہوں اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ انہیں جلد از جلد اطلاع کردی جائے۔ پشاور سے یہاں تک کا سفر طے کرنے کے لیے انہیں کچھ مہلت درکار ہوگی۔'' اسد اللہ اپنی کہے جا رہے تھے اور وہ گم صم سی محب اللہ کی تصویر پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔ وہ ان سے کیا کہتی کہ وہ ان چند دنوں میں اتنی الجھی ہوئی رہی تھی کہ آصف خان کے رشتے کے بارے میں سوچنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔ اس کے رشتے پر غور کرنا تو دور کی بات وہ آج کل اس کا سامنا کرنے سے بھی گریز کر رہی تھی کہ اپنے اندر اس کی سوال کرتی نگاہوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔

''کیا بات ہے جولیٹ! آپ ہماری بات توجہ سے نہیں سن رہیں، کسی پریشانی میں مبتلا ہیں؟'' اسد اللہ نے اس کی غائب دماغی کو محسوس کر کے اسے ٹوکا۔

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' وہ جیسے لمحوں میں کسی نتیجے پر پہنچ گئی اور اپنے خیالات سے نکل کر صاف آواز میں بولی۔

''ٹھیک ہے، ہم منتظر ہیں۔'' اسد اللہ ہمہ تن گوش ہوئے۔

''میرا خیال ہے کہ میں جانتی ہوں کہ محب اللہ کہاں ہیں۔'' اس کے الفاظ اسد اللہ کے لیے دھماکے کے مانند ثابت ہوئے۔

''کیا...... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' شدتِ جذبات سے ان کی آواز لرز گئی۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے انہیں بمبئی میں دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں انہیں بالکل صحیح شناخت کر رہی ہوں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ سچ بول دینے کے بعد وہ ہلکی پھلکی ہوگئی تھی اور اب روانی سے محب اللہ عرف فاروق کے بارے میں سب کچھ بتاتی جا رہی تھی۔ اسد اللہ نہایت جذباتی کیفیت میں لیکن توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ وہ خاموش ہوئی تو بولے۔

''یا اللہ! محب اللہ ایسے لوگوں کے درمیان جا چھپے تھے جب ہی تو باوجود کوشش کے انہیں تلاش نہیں کیا جاسکا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ وہ ایسی کسی جگہ ہوں گے۔ بہرحال ان کا پتا معلوم ہوگیا، یہی کافی ہے۔ ہم انہیں حویلی واپس لاکر دوبارہ اپنے ماحول میں ڈھال لیں گے۔'' پُرجوش سے اسد اللہ کو خود بھی بھول گیا تھا کہ وہ یہاں اس سے آصف خان کے رشتے کے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے۔

''آپ کو یقین ہے نا جولیٹ کہ بمبئی کے فاروق ہی ہمارے محب اللہ ہیں؟'' وہ خوش بھی تھے اور بے یقینی کا شکار بھی۔ جولیٹ نے ایک بار پھر سر ہلا کر تصدیق کی۔

''ہم محب اللہ کو لانے کل ہی بمبئی روانہ ہوجاتے ہیں

لیکن ابھی یہاں کسی کو اس بارے میں مطلع نہیں کریں گے۔ خدانخواستہ آپ سے شناخت میں غلطی ہوئی ہو یا کسی اور مسئلے کی وجہ سے ہم محب اللہ کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو آس باندھنے والوں کو سخت مایوسی ہوگی۔ آپ ہمیں اپنا بمبئی کا پتا اور اہم لوگوں کے نام وغیرہ ایک ورق پر لکھ کر دے دیجیے۔ باقی ہم خود دیکھ لیں گے۔" اسد اللہ اب آہستہ آہستہ معمول پر آتے جا رہے تھے۔ جولیٹ خاموشی سے رائٹنگ ٹیبل تک گئی اور ایک کاغذ پر اسد اللہ کی مطلوبہ معلومات درج کرنے لگی۔ سب کچھ کاغذ پر منتقل کرنے کے بعد اس نے کاغذ اسد اللہ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے ایک نظر ڈال کر اپنا اطمینان کیا اور اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اپنے اندازے کے مطابق بولے۔

"ہم جانتے ہیں کہ آپ کے دل میں بمبئی جانے اور اپنے پرانے گھر کو دیکھنے کی خواہش مچل رہی ہوگی لیکن آج کل جو حالات ہیں، ان میں ہم آپ کو اپنے ساتھ سفر پر لے جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ ہوسکتا ہے آپ ہماری عدم موجودگی میں یہاں رکنے کے خیال سے پریشانی میں مبتلا ہوں لیکن ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ آپ بھی اپنے دیگر کزنز کی طرح اس حویلی پر پورا حق رکھتی ہیں اور ہماری غیر موجودگی میں بھائی جان آپ کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔ یوں بھی اس حویلی میں آپ کی سب سے بڑی مخالف پھپھی جان تھیں اور اختر کے بعد ان میں اتنے کس بل نہیں رہے ہیں کہ وہ کسی اور کو نشانہ بنا سکیں بلکہ ہماری اطلاعات کے مطابق تو وہ آج کل خود احتسابی کے مرحلے سے گزر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے پہلی بار بھائی جان کے سامنے محب اللہ کے غیاب پر افسوس کا اظہار بھی کیا ہے۔ سچ ہے جب انسان کے اپنے دل کو لگتی ہے تب ہی اسے احساس ہوتا ہے۔ اپنا بیٹا کھو کر برسوں بعد پھپھی جان کو احساس ہوا ہے کہ ان کی وجہ سے بھائی جان کو اپنی اولاد کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔" اسد اللہ اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی۔

"آپ اپنے بھائی کے جس درد کا علاج کرنے جا رہے ہیں، واپسی میں آپ کو خود اس درد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ فاروق کو لے کر یہاں آئیں اور میں اس کا سامنا کر سکوں۔ مجھے ویسے بھی یہاں سے جانا تھا کہ مجھے اپنے سینے میں بھڑکتی انتقام کی آگ بجھانی ہے۔ میں تو آپ کی محبت کی زنجیر پیر میں پڑنے سے رک گئی تھی لیکن اب مجھے یہ زنجیر توڑنی ہی پڑے گی۔ مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔"

☆☆☆

ربن خاموشی سے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر بھی وہ آج قبل از وقت بستر پر لیٹ گیا تھا۔ آج فاروق کی بمبئی میں آخری رات تھی۔ رات کے آخری پہر وہ، اکبر اور سیٹھ انوپم اگروال کا خاندان لندن جانے والے بحری جہاز میں سوار ہو جاتے۔ راٹھور سے ہونے والی آخری ملاقات کے بعد ربن اتنا محتاط ہو گیا تھا کہ دوبارہ انوپم اگروال کی کوٹھی کا رخ نہیں کیا تھا کہ مبادا کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ جائے اور فاروق کی وہاں موجودگی ظاہر ہو جائے۔ اس نے تھانے سے آتے ہی منو کو چندی گڑھ اور اکبر کو سیٹھ کی کوٹھی پر روانہ کر دیا تھا۔ اکبر کے ذریعے ہی اس نے فاروق کو ضرورت کا اہم سامان اور کافی بھاری رقم اس ہدایت کے ساتھ بھجوادی تھی کہ اب بھول کر بھی اڈے کا رخ نہ کرے اور نہ ہی روانگی سے قبل سیٹھ کی کوٹھی سے باہر نکلے۔ اس نے اکبر کو یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ حالات بہتر نہیں ہوئے تو وہ روانگی کے وقت ان لوگوں سے الوداعی ملاقات کے لیے بھی نہیں آئے گا اور وہ سچ مچ نہیں گیا تھا۔ اس کے بیٹے جیسا فاروق اس سے جدا ہو کر سمندر پار جا رہا تھا اور اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فاروق اس کا منتظر ہوگا۔ ابھی کل ہی اس نے سیٹھ کے کسی آدمی سے ایک رقعہ بھجوایا تھا۔ اس رقعے میں ربن کے لیے پیغام تھا کہ اگر وہ کسی کو جولیٹ کی تلاش میں حیدر آباد بھیجے تو بہتر ہوگا کہ تلاش کے لیے جانے والا ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے سیدھا نواب سلیم اللہ کی حویلی پہنچ جائے۔ رقعے میں یہ بھی استدعا کی گئی تھی کہ ربن الوداعی ملاقات کے لیے آئے تو اس سلسلے میں کوئی گفتگو کرے۔

ربن کو فاروق کی طرف سے دی گئی اتنی یقینی اطلاع پر حیرت تو تھی لیکن اس نے فوری طور پر جانی کو اس سلسلے میں ہدایت دے کر حیدر آباد کے لیے روانہ ہونے کا حکم دے دیا تھا اور خود اپنے دل پر جبر کیے اڈے پر ہی رکا ہوا تھا۔ گولو کو بھی اس نے کسی نہ کسی طرح بہلا لیا تھا۔ باقی کسی میں تو اس سے سوال کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ جو اور جتنا چاہے اپنی مرضی سے ہی بتاتا ہے اور اس بار تو وہ بہت زیادہ خاموش تھا۔ اڈے سے باہر بھی بہت کم نکل رہا تھا۔ اسے راٹھور کی طرف سے کسی ردعمل کا انتظار تھا اور حیرت انگیز طور پر اس کی طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ اس

نے اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھا کر کسی قسم کی قانونی کارروائی تک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور ربن خاموشی میں چھپے طوفان کی آہٹیں محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنے گرد نادیدہ سائے ناچتے محسوس ہوتے تھے، سو وہ اپنے دل پر جبر کیے پڑا تھا کہ کہیں الوداعی ملاقات کو جانے کی صورت میں کوئی سایہ اس کے ساتھ لگ کر فاروق تک نہ پہنچ جائے۔

احتیاط کی اس راہ نے اس کے دل کو سخت مضطرب کر رکھا تھا اور وہ بستر پر چت لیٹا خود پر جبر کر رہا تھا۔ رات بہت آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی پھر بھی اپنے آخری پہر تک پہنچ ہی گئی اور پہلی بار ربن کے ضبط کی طنابیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ وہ اچانک ہی بستر سے اٹھ بیٹھا اور چپلیں پیروں میں ڈالیں۔ پتا نہیں کیوں اس کے دل میں خیال جاگا تھا کہ آج فاروق کو نہ دیکھا تو پھر کبھی اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ دل میں جاگنے والا یہ خیال اتنا پختہ تھا کہ اس کی ہستی کی دیوار ڈھا گیا اور وہ خود پر ضبط کھو کر باہر کی طرف چل پڑا۔

''دادا......'' اس وقت اسے باہر جاتے دیکھ کر کسی نے سوال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ کے اشارے سے سوال کرنے والے کو خاموش کروا کر باہر نکل گیا۔ سواری کے لیے اس نے خود ٹیکسی اسٹینڈ پر جا کر ایک ٹیکسی کے اونگھتے ہوئے ڈرائیور کو جگایا اور اسے بندرگاہ تک چلنے کا حکم دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بس دور ہی سے فاروق کو ایک نظر دیکھ کر واپس لوٹ آئے گا۔ وہ اب بھی نادیدہ سایوں کو اپنے ساتھ چلتا محسوس کر رہا تھا لیکن دل میں جاگنے والی خواہش اتنی شدید تھی کہ باقی ہر اندیشہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی خواہش پر بہت تیزی سے فاصلہ طے کیا۔ ڈرائیور کو کرایہ دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اپنا چہرہ اس نے ایک بڑے سے رومال نما کپڑے سے چھپا لیا تھا اور وہاں موجود چہل پہل اور روشنیوں سے ہٹ کر اپنے لیے ایک قدرے تاریک گوشہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اس گوشے میں چپ چاپ کھڑا وہ وہاں موجود چہروں میں فاروق کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار اس کا یہ انتظار ختم ہوا اور اس نے سیٹھ انوپم اگروال کے خاندان کے افراد کے ساتھ فاروق اور اکبر کو آتے ہوئے دیکھا۔ فاروق کی آنکھوں میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت تھی اور وہ بار بار یوں اردگرد دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا متلاشی ہو۔ ربن کے دل نے گواہی دی کہ وہ اسے ہی تلاش کر رہا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر فاروق کو گلے لگا لے لیکن بروقت اس نے خود کو لگام ڈال دی اور وہیں اپنی جگہ دبکا رہا۔ فاروق کی متلاشی نگاہیں بھٹکتی ہوئی ایک پل کے لیے اس گوشے پر بھی ٹھہریں جہاں ربن موجود تھا۔ اس کی نگاہوں کو ٹھہرتے دیکھ کر ربن کا دل زور سے دھڑکا لیکن اسی لمحے شکنتلا نے کچھ بولتے ہوئے فاروق کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کی طرف کھینچا تو اس کی نگاہیں اس گوشے سے ہٹ گئیں اور وہ اوروں کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔

ربن اپنی جگہ دبکا اس وقت تک اس کی جانب دیکھتا رہا جب تک اس کی معمولی سی جھلک بھی دکھائی دیتی رہی پھر وہ ہجوم میں کھو گیا تو ربن نے بھی اپنی جگہ سے نکل کر واپسی کی راہ لی۔ واپسی کے سفر میں اسے کوئی جلدی نہیں تھی اس لیے وہ پیدل ہی وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ رات کی تاریکی نے چھٹنا شروع کر دیا تھا اور سمندر کی ٹھنڈی ہوا کو جسم پر محسوس کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کچھ دور چلنے کے بعد سواری لے لے گا۔ سواری نہ بھی ملتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی ٹانگوں میں اتنا دم تھا کہ وہ گھنٹوں پیدل چل سکتا تھا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور کافی آگے جانے کے بعد اسے ایک تانگا مل گیا۔ وہ تانگے میں سوار ہو کر آنکھیں موند کے بیٹھ گیا۔ بند آنکھوں کے پیچھے یکدم ہی اس کی مرحومہ ماں اور بہن کی شبیہیں جاگ گئیں۔ ایک پیارا جدا ہوا تھا تو باقی پیارے بھی خود بخود ہی یاد آنا شروع ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے اس ریلے میں بہا جا رہا تھا کہ یکدم ہی تانگا رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' ربن کی حسیات فوراً ہی جاگ گئیں۔

''آنے جانے کا راستہ نہیں ہے۔'' تانگے والے نے خوف زدہ لہجے میں اسے مطلع کیا تو اس نے سر گھما کر اردگرد دیکھا۔ تانگے کے آگے ایک گاڑی کھڑی تھی اور اطراف میں بھی دو ٹیکسیاں نظر آ رہی تھیں۔ ربن نے ایک ٹیکسی کے ڈرائیور کو شناخت کر لیا۔ یہ وہی تھا جو اسے اڈے سے بندرگاہ لے گیا تھا۔

''مخبر!'' اس کے ذہن میں فوراً ایک لفظ گونجا اور وہ راہ روکنے والوں کو اپنی اپنی گاڑیوں سے اترتے ہوئے دیکھنے لگا۔ نادیدہ سائے جو اس کے اردگرد ناچتے رہے تھے، اس لمحے مجسم ہو کر اس کے سامنے آ گئے تھے۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

پلاٹ

تنویر ریاض

کہانی کوئی بھی ہو... اگر پلاٹ مضبوط ہو تو عمارت کی دلکشی قابل دید ہوتی ہے مگر... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے پلاٹ کسی ایک کا ہوتا ہے اور کہانی کے لکھاری دو ہوتے ہیں جس کا ہر موڑ ایک نئے اور منفرد منظرنامے سے روشناس کراتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی مقابلہ تھا جس کے نتیجے میں ایک پلاٹ پر دو مختلف کہانیوں نے جنم لیا جن کے جداگانہ انجام نے ہر ایک کو چونکا دیا۔

حقائق کے منافی، مفاد کی بنیاد پر خبر شائع کرنے والے بے خبروں سے انتقام



اس عورت نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس تمہارے لیے ایک بڑی خبر ہے جسے لیڈ اسٹوری بنایا جاسکتا ہے۔ اس کا میک اپ زدہ چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا اور عام طور پر خشک رہنے والے بالوں میں بھی اس وقت چمک نظر آرہی تھی۔

ٹریور پاورز نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ عورت دوبارہ بولی۔ ”کیا تم اسے لکھنے کی اجازت دو گے؟“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ شاید تم تنخواہ کی بات کرو گی۔“

اس نے روشنی کی طرف چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے حیرانی ہے کہ تم یہ سن کر پریشان کیوں ہو گئے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ محض تمہارا وہم ہے۔“ اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

نکول سیمسن ایک ماہ قبل اس کے پاس بغرضِ ملازمت آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کی بلاگ سروس دی پاورز لنچ کی زبردست مداح ہے۔ یہ سن کر وہ بہت متاثر ہوا۔ نکول صحافت کی طالبہ تھی اور رات میں کام کر کے اپنی گزر اوقات کر رہی تھی۔ اب اسے عملی تجربہ درکار تھا۔ اس نے اس کی لکھی ہوئی خبریں پڑھیں جو بہت اچھی تھیں لیکن اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی معاون نہیں رکھ سکتا۔ میری اتنی آمدنی نہیں اور نہ ہی اشتہارات ہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے نقصان ہو رہا ہے۔“

اس کا خیال تھا کہ وہ شکریہ ادا کر کے چل دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ بولی۔ ''میں چند ماہ یہاں کام کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے میرے تجربے میں اضافہ ہوگا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک تینتالیس سالہ مطلقہ عورت زیرِ تربیت کارکن کے طور پر کام کرسکتی ہے؟''

''کیا تم تنخواہ کے بغیر کام کرنے کے لیے تیار ہو؟''

''میں صرف تجربہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔''

نکول بہت اچھی تحقیقی معاون اور ایڈیٹر ثابت ہوئی۔ اسے لکھنا آتا تھا اور اس کی تحریریں پُرمغز ہوتی تھیں۔ وہ ٹیلی فون پر معلومات لیتی اور انہیں اس پیرائے میں لکھتی کہ بیان کا غلط مطلب نہ لیا جائے لیکن کبھی اس کے لکھے ہوئے مضامین پر کوئی بات نہیں ہوئی جن پر اس کا نام نہیں ہوتا تھا۔ ہر ہفتے اس کی تقریباً آٹھ یا اس سے بھی زیادہ خبریں لگتی تھیں اور وہ ان سب پر اپنا نام دینا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔

پاورز نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''پہلے مجھے آئیڈیا بتاؤ۔''

نکول نے میز کی سطح پر دباؤ ڈالا اور کھڑی ہوگئی۔ پھر اس نے گھوم کر اپنی جیب سے ایک بزنس کارڈ نکالا، اس پر لکھا ہوا نام پڑھا اور اس کی کئی تہیں کر کے میز کی ٹانگ کے نیچے رکھ دیا تاکہ اس کا لیول برابر ہو جائے پھر اس نے اپنی پشت پر لٹکے ہوئے تھیلے میں ہاتھ ڈالا جس پر اسپائیڈر مین لکھا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر لطف اندوز ہوتا کیونکہ یہ اس کا واحد خبط تھا۔ وہ عجیب و غریب شخصیت کی مالک تھی۔ انٹرویو کے دوران جب نکول نے اپنی عمر بتائی تو وہ بہت حیران ہوا کیونکہ وہ اسے قدرے کم عمر سمجھ رہا تھا۔ البتہ طلاق والی بات سمجھ میں آتی تھی۔ گو کہ وہ اب بھی پُرکشش تھی لیکن لباس کے معاملے میں بہت بدذوق تھی۔ وہ موٹے بھدے سویٹر اور خراب فٹنگ والے اسکرٹ پہنا کرتی تھی۔ اس کے جوتے بوسیدہ ہوتے اور وہ ایسی خوراک لیتی جس سے اس کے جسم پر چربی چڑھ رہی تھی۔ وہ بے تحاشا میک اپ کرتی تھی، اس کے باوجود اس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نکول اپنی دانش ورانہ فطرت کے سبب کسی سے سمجھوتا نہیں کرسکتی تھی۔

اس کے تھیلے سے ایک نوٹ بک برآمد ہوئی۔ اس نے اس پر نظر دوڑائی اور سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مائیکل کیسلر......''

پاورز کو اپنے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔ ''کیسلر......''

اب اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ دفتر سے باہر اس جگہ کیوں ملنا چاہ رہی تھی۔ کئی سنسنی خیز اور متنازعہ موضوعات بلاگ کرنے کی وجہ سے کچھ نام نہاد پارسا اور خود ساختہ معزز لوگ اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور پاورز کو یقین تھا کہ وقتاً فوقتاً اس کے چھوٹے سے دفتر میں ہونے والی گفتگو ٹیپ کی جاتی ہے۔ ان لوگوں میں اس کے کاروباری حریف، سیاستدان، ان کمپنیوں کے سربراہان جن کے بارے میں اس نے لکھا اور ممکنہ طور پر حکومتی اہلکار بھی شامل تھے۔ حال ہی میں اس نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن وہ کچھ دریافت نہیں کرسکا۔ اس کے باوجود وہ کیسلر کے بارے میں کچھ لکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

''کیسلر کے بارے میں تمہارے پاس کیا معلومات ہیں؟'' اس نے دوبارہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ گلاس پر اس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔

''میں اپنی رات کی ڈیوٹی پر تھی کہ میری نظر ایک شخص پر گئی جس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ پہلی نظر میں اسے نہیں پہچان سکی لیکن مجھے یاد آگیا کہ اس کی تصویر ٹائمز میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ پچاس کے پیٹے میں تھا۔ اس نے عمدہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے انداز و اطوار سے تحکم پسندی جھلک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو اس سے چند سال چھوٹی نظر آرہی تھی۔ مرد اور عورت الگ الگ مشروب سے شغل کر رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ ان کے نام کیوں نہ جان سکی۔ تمہیں معلوم ہے پھر کیا ہوا؟''

''کہتی رہو۔''

''مجھے امید تھی کہ وہ نقد ادائیگی نہیں کریں گے چنانچہ میں اس کے کریڈٹ کارڈ سے معلوم کرسکتی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے اپنا کریڈٹ کارڈ نکالا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کیسلر ڈیولپمنٹ۔ دوسری عورت اس کی بہن تھی۔''

''بہن!'' پاورز نے چونکتے ہوئے کہا۔

''یہ میں نے گوگل سے معلوم کیا۔ اس کا نام سارہ ہے۔ میں نے اس کی تصویریں بھی دیکھیں۔ وہ اس کی کمپنی کی چیف فنانشل آفیسر ہے۔''

''بہت خوب! تمہیں تو بہت اچھی ٹپ ملی ہوگی؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' نکول نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''میں کارڈ لے کر بارٹینڈر کے پاس گئی اور جب ان کی میز پر واپس آئی تو وہ آگے کی طرف جھک کر باتیں کر رہے تھے۔

لگتا تھا جیسے وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کی گفتگو سنے۔ کم از کم میں یہی سمجھ رہی تھی۔ لہٰذا ان کی میز سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ اس کے باوجود میں تھوڑی بہت باتیں سن سکتی تھی۔"

"کیا یہی وہ خاص بات ہے جس کے لیے تم مجھے مجبور کررہی ہو کہ اسے لکھنے کی اجازت دے دوں؟"

اس کی نیلی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "میں ریسرچ کے علاوہ بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

غالباً اس کا پوشیدہ مفہوم یہ تھا کہ اگر وہ اسے تنخواہ نہیں دے رہا تو کم از کم اسے آگے بڑھنے کا موقع تو دے اور شاید وہ ایسا کرسکتی تھی لیکن کیا اس کے لیے یہی مناسب وقت تھا کہ وہ ایک دھماکا خیز خبر سے آغاز کرے۔ یقیناً وہ ایک اچھی صحافی ہوسکتی تھی۔ عمدہ مضامین لکھ سکتی تھی اور اس کا عزم پختہ تھا لیکن اس کے پاس ایسا کیا مواد تھا جسے لے کر وہ مائیکل کیسلر کے خلاف کچھ لکھ سکتی۔

دوسرے کئی لوگوں کی طرح ٹریور پاورز بھی یہی سمجھتا تھا کہ کیسلر کی یہ شان و شوکت اس کی لالچی فطرت کی بدولت ہے۔ اس نے یہ شاندار مرتبہ ان لوگوں کو شکست دے کر حاصل کیا تھا جو اس کے مخالف تھے یا اسے دھمکیاں دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس میں سو فیصد حقیقت نہ ہو لیکن اس کے بارے میں اس قسم کی افواہیں گردش کرتی رہتی تھیں۔

پاورز نے فیصلہ کرلیا کہ وہ نکول کو اس کی اجازت نہیں دے گا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پاورز یہ اعتراف نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کیسلر کے بارے میں لکھی ہوئی کہانی پر اپنا نام دینا نہیں چاہتا۔ گو کہ اس نے اپنے طالب علموں کو یہ لیکچر نہیں دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ رپورٹنگ کی دنیا میں انا سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ اس نے نکول سے بے تکلفی کے انداز میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے نکول...... وہ بہت بڑا اور خطرناک شخص ہے۔ اگر وہ بپھر گیا تو ہم تباہ ہوجائیں گے۔ تم اس کے علاوہ کسی اور موضوع پر بھی لکھ سکتی ہو۔"

نکول خاموش رہی تو اس نے کہا۔ "میں مذاق نہیں کر رہا۔ وہ واقعی بہت خطرناک ہے اور انتہائی بے رحم بھی۔ اسے کسی پر ترس نہیں آتا۔ اگر تمہارے لکھے ہوئے سے اسے تکلیف پہنچی تو وہ تمہیں اس سے بھی زیادہ تکلیف پہنچائے گا۔"

پاورز نے بار کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور اس جانب دیکھا۔ ایک دبلی پتلی سنہرے بالوں والی نوجوان لڑکی اندر داخل ہورہی تھی۔ اس نے پرانی چمڑے کی جیکٹ اور جینز

دوستی

دوستی: موسم نہیں جو اپنی مدت پوری کرے اور رخصت ہوجائے۔

دوستی: ساون کی بارش نہیں جو ٹوٹ کے برسے اور پھر تھم جائے۔

دوستی: آگ نہیں جو سلگے، بھڑکے اور بجھ جائے۔

دوستی: گلاب کا پھول نہیں جو کھلے، مسکائے اور مرجھا جائے۔

دوستی تو سانس کی ڈور ہے، جو چلے تو زندگی اور رکے تو موت آجائے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

پہن رکھی تھی۔ کندھے پر تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ پاورز نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور وہ چلتی ہوئی ان کی میز پر آگئی۔ پاورز نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "میری! یہ نکول ہے۔"

میری نے خوش دلی سے مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ پاورز نے کہا۔ "یہ میری اسٹوڈنٹ ہے اور نکول میرے ساتھ کام کرتی ہے۔ یہ بھی صحافت پڑھ رہی ہے۔"

میری نے نکول سے پوچھا۔ "تم کس شعبے میں جانا چاہو گی؟"

"بلاگنگ یا پوڈکاسٹ...... اور تم؟"

میری نے کہا۔ "میں پروفیسر پاورز کی نیو میڈیا کلاس میں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے براڈکاسٹ کے شعبے میں جانا چاہیے۔"

پاورز نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کے بھی شاگرد جانتے تھے کہ وہ ٹی وی اور ریڈیو کی رپورٹنگ کو پسند نہیں کرتا۔ اس لڑکی نے قہقہہ لگایا اور اپنے بیگ میں سے ایک سرخ پلاسٹک کا لفافہ نکالتے ہوئے بولی۔ "اضافی وقت دینے کا شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے رپورٹ لے لی اور اس کا عنوان پڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ میری نے اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد اسے خوب صورت پیرائے میں لکھا ہوگا۔ وہ اس انیس سالہ لڑکی کی صلاحیتوں پر حیران تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تمہاری ماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"کافی بہتر ہے۔ کل اسے اسپتال سے ڈسچارج کردیا جائے گا۔ ایک بار پھر تمہارا شکریہ پروفیسر۔"

"ٹھیک ہے۔تم سے کلاس میں ملاقات ہوگی۔"

اس کے جانے کے بعد کنول بولی۔ "تمہیں پڑھانے میں مزہ آتا ہے؟"

"بالکل۔میرے لیے یہ ایک تفریح ہے۔"

"ہم اصل موضوع پر واپس آتے ہیں۔ اگر کیسلر کے علاوہ کچھ لکھوں گی تو اس پر میرا نام ہوگا۔ کیا تم اس کا وعدہ کرتے ہو؟"

"ہاں، مجھے منظور ہے۔اس کی ذمے داری بھی تم پر ہی ہوگی۔"

"مجھے اگلے شمارے میں پہلے صفحے پر نمایاں جگہ چاہیے۔اس پر صرف میرا نام ہوگا۔کسی اور کی شراکت مجھے قبول نہیں۔"

پاورز کو ان شرائط کا اندازہ نہیں تھا لیکن اس پر یہ بھی واضح ہوگیا تھا کہ وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں، اس لیے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "تم نے کیا سنا تھا؟"

"وہ بار میں ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہتے ہوئے سنا۔ یہ ایک شاندار پلاٹ ہے۔تم نے بہت اچھا کام کیا ہے، شکریہ۔ یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔"

پاورز کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ کیسلر کسی سازش کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ بہت ہی مزے دار اسٹوری تھی۔اس نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"وہ اپنی بہن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا...... ہمیں بہت احتیاط کرنا ہوگی۔ اس میں کچھ رکاوٹیں ہیں لیکن یہ کارآمد ہوگا۔"

پاورز بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "پلاٹ...... کچھ اندازہ ہے کہ وہ فون پر کس سے بات کر رہا تھا؟"

"نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے چھپ کر باتیں سنتے ہوئے نہ دیکھ لیں چنانچہ میں ان کی میز پر گئی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، میں نے کریڈٹ کارڈ کا بل ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے اپنے دستخط کیے اور دونوں وہاں سے چلے گئے۔"

پاورز نے اپنی کمر کرسی کی پشت سے لگائی اور بار کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دوسرے صحافیوں کے برعکس جو عام طور پر جینز، ٹی شرٹ اور خاص مواقع پر اسپورٹس کوٹ پہنتے ہیں، اس نے ہمیشہ کی طرح نیوی بلیو رنگ کا سوٹ اور آسمانی رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ لباس اسے یاد دلاتا تھا کہ وہ ایک معزز پیشے سے وابستہ ہے اور ان بدعنوان، لالچی اور دھوکے باز لوگوں سے ہزار درجے بہتر ہے جن کے بارے میں وہ بلاگ لکھا کرتا ہے۔ وہ کیسلر جیسے ہی لوگ تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ پلاٹ کس نوعیت کا ہوسکتا ہے، اس بارے میں امکانات کی کوئی کمی نہیں تھی۔

مائیکل کیسلر جائداد کا کاروبار کرتا تھا۔ اسے اپنے باپ سے ورثے میں کافی دولت ملی تھی جو صنعت کار تھا اور دس سال قبل انتقال کرگیا تھا۔ گوکہ وہ بہت ہوشیار اور محنتی تھا لیکن اس کے بیٹے نے ورثے میں ملی بے رحمی کو ایک نئے وصف سے آشنا کیا۔ وہ جانتا تھا کہ لوگوں کی خواہشات لامحدود ہیں اور وہ ان کی ضرورتیں پوری کرکے خوش ہوتا تھا۔ لوگ دیہاتوں سے بینٹ ہاؤس اور چھوٹے گھروں سے بڑے اپارٹمنٹس میں منتقل ہونا چاہتے تھے۔ کیسلر نے سستے داموں زمین خرید کر اس پر لوگوں کی ضروریات کے مطابق مکانات اور اپارٹمنٹس تعمیر کیے اور انہیں کرائے پر چڑھا دیا۔ وہ اپنے کرایہ داروں پر کڑی نظر رکھتا تھا اور اس کے لیے اس نے پرائیویٹ جاسوسوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ایسے کرایہ دار جو قانون کی خلاف ورزی کرتے یا بجلی، گیس اور ایئرکنڈیشننگ میں گھپلے کرتے... ان سے وہ فوری طور پر مکان خالی کرواتا اور اگر کوئی مزاحمت کرتا تو اسے مختلف طریقوں سے ہراساں کرتا۔ یہ سب کچھ کیسلر کے کاروبار کا حصہ تھا۔

دوسری جانب اگر کوئی سیاست دان یا بااثر شخص یہ سمجھتا کہ کیسلر کی تعمیرات اور زمینوں کی خریداری قانون کے مطابق ہے تو اس کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی تھی اور ان کی پسندیدہ جگہ پر مارکیٹ سے کم قیمت پر اپارٹمنٹ دے دیا جاتا۔ اس کے خلاف کئی مدعیان نے ناجائز تعمیرات، خطرناک حالات اور کرایہ داروں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کے حوالے سے مقدمات دائر کیے لیکن سب ایک ایک کرکے خارج ہوگئے۔ کوئی بھی ڈسٹرکٹ اٹارنی اس پر جرم ثابت نہیں کرسکا۔ وہ کوئی عفریت نہیں تھا۔ وہ نیویارک کے ثقافتی اداروں کو بھاری رقوم عطیے میں دیا کرتا لیکن جب بات کاروبار کی ہو جسے وہ اپنے لیے زندگی کی حرارت سمجھتا تھا تو اس پر وہ کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد پیسا کمانا تھا گوکہ وہ ابھی ملک کے نامی گرامی سرمایہ داروں جتنا دولت مند نہیں ہوا تھا لیکن اس نے کبھی یہ چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ایک روز وہ ان سب کو پیچھے چھوڑ دے گا۔

پریس بھی اس کی کمزوریاں تلاش کرنے میں لگا رہتا

تھا جیسا کہ حال ہی میں ایک اخبار نے سرخی لگائی تھی۔

''ڈیولپر کی کینسر میں مبتلا دادی کو مکان سے نکالنے کی کوشش کیونکہ کرایہ ادا کرنے میں ایک ہفتے کی تاخیر ہوگئی تھی لیکن یہ اخبارات کا روایتی انداز تھا۔ کوشش کے باوجود کوئی بھی رپورٹر کسی ایسی کارروائی کا سراغ نہ لگا سکا جو قابلِ گرفت ہوتی اور نہ ہی اس کی برائی کے بارے میں کوئی پُرمغز مضمون شائع ہوا۔ اس طرح کیسلر تحقیقاتی رپورٹروں کو بھی دھوکا دینے میں کامیاب رہا۔

ان تمام باتوں کے بارے میں سوچتے ہی پاورز پُرجوش ہوگیا۔ اس نے نکول سے پوچھا۔ ''کیا تم بار کے دوسرے عملے سے بات کرسکتی ہو؟ اگر کسی نے اسے وہاں پہلے دیکھا ہو۔ وہ کن لوگوں سے ملتا رہا ہے؟''

''یہ کام میں پہلے ہی کرچکی ہوں۔ ان کا جواب نفی میں تھا۔ کسی نے اسے وہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

پاورز نے مشروب کا گھونٹ لیا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟''

نکول نے اسے چند کہانیوں کے بارے میں یاد دلایا جن پر کام ہونا باقی تھا۔ ان میں سے ایک ان اداروں کے سربراہان کے بارے میں تھی جو سیاست دانوں کی دعوتیں کررہے تھے۔ دوسری ان ریسٹورنٹ مالکان سے متعلق تھی جو ہیلتھ انسپکٹروں کو رشوتیں دیتے تھے۔ ان میں واحد بڑی کہانی نیویارک کے ایک کانگریس مین کے بارے میں تھی جس کی غیر نصابی سرگرمیاں قابلِ اعتراض حد تک بڑھ گئی تھیں۔

پاورز کو اس کہانی میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ اس کا کہنا تھا کہ کانگریسی رکن ایک ہوشیار اور باصلاحیت شخص ہے اور اس نے اپنے حلقے کی نمائندگی اچھے انداز میں کی ہے۔ اس نے اپنی جو متنازعہ تصویریں ٹوئٹ کی ہیں، ان کا اس کے کام سے کوئی تعلق نہیں۔ پاورز کا کہنا تھا کہ اصل کہانی اس کے نیم عریاں لباس کے بارے میں نہیں ہے بلکہ سارا مسئلہ یہ ہے کہ اس بلاگ کے پوسٹ ہونے کے بعد اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ کیا وہ یہ سب برداشت کرسکے گا یا چلّائے گا، ہتک عزت کا دعویٰ کردے گا یا انتقامی کارروائی پر اتر آئے گا۔ اس نے نکول کو بتایا۔ ''اگر اس نے غلط مطلب لیا تو اس کا اثر میری ملازمت پر پڑسکتا ہے۔''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ان کہانیوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اب ہم کیسلر اور اس کے خفیہ پلاٹ پر توجہ دیں گے۔ تم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرو۔'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تم جس بار میں کام کرتی ہو، وہاں کریڈٹ کارڈ کی سلپ پر تمہارا نام ہوتا ہے؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، گاہک کو سروس دینے والے فرد کا پہلا نام سلپ پر درج ہوتا ہے۔''

''اور تم نے اس کے باوجود عملے کے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ اسے شبہ ہوسکتا ہے کہ کوئی رپورٹر خبر کی تلاش میں ہے اور تم اس کے لیے ایک ذریعہ ہو۔ لہٰذا تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''وہ مجھے خوفزدہ نہیں کرسکتا ٹریور۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس نے پاورز کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ ایک ماہ کے عرصے میں یہ پہلا موقع تھا کہ نکول نے اس کے جسم کے کسی حصے کو ہاتھ لگایا تھا۔ اچانک ہی وہ بالکل مختلف نظر آنے لگی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں انتہائی خوفناک لگ رہی تھیں۔ وہ پُرکشش ضرور تھی لیکن اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بھوکی شیرنی کو شکار مل گیا ہو۔

☆☆☆

وہ اپنے بستر میں لیٹا ہوا باہر سے آنے والے ٹریفک کا شور سن رہا تھا۔ غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی جس سے اس کی سوچوں کا سلسلہ منتشر ہورہا تھا۔ کل وہ اس مواد پر کام شروع کرنے والے تھے جو نکول نے کیسلر کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس میں سے کیا برآمد ہوتا ہے؟ کیا ایک اور واٹر گیٹ اسکینڈل سامنے آنے والا تھا؟

لیکن فی الوقت اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے کیسلر کے پلاٹ کے بارے میں قیاس آرائی سے توجہ ہٹائی اور سرہانے رکھی ہوئی ایک کتاب کو دیکھنے لگا جس کا عنوان تھا ''دی نیو جرنلزم'' اور وہ یہ سوچنے لگا کہ اس کا پیشہ کس طرح تبدیل ہوگیا۔ بیس سال قبل جرنلزم کی ڈگری لینے کے بعد اس نے بھی اپنے بیشتر کلاس فیلوز کی طرح روایتی میڈیا میں کیریئر بنانے کی کوشش کی لیکن اس کا کسی بڑے اخبار سے رابطہ نہ ہوسکا اور وہ ایک چھوٹے ٹی وی چینل سے منسلک ہوگیا لیکن وہ کام کے معیار سے مطمئن نہیں تھا۔ ایک دن کھانے کے وقفے میں ایک کار حادثے کی ویڈیو کو پچاسویں مرتبہ چلتے دیکھ کر وہ چپٹا گیا اور اس نے نشریات کی دنیا سے علیحدہ ہونے میں دیر نہیں لگائی اور اشتہارات کے شعبے سے منسلک ہوگیا جہاں سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی لیکن اس دوران وہ مسلسل یہی سوچتا رہا کہ کس طرح اس پیشے میں رہ کر اپنی خواہشات کی تسکین کرے جس

میں آگے بڑھنے کے مواقع محدود ہوتے جا رہے ہیں۔

اس کا دھیان انٹرنیٹ کی جانب گیا جس کے ذریعے بلاگز اور آن لائن میڈیا کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس نے بہت جلدی محسوس کر لیا کہ صحافت کا مستقبل اسی شعبے سے وابستہ ہے۔ یہی ان لوگوں تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا جنہوں نے روایتی رپورٹنگ پر انحصار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ لوگ ان خبروں، مضامین اور اسٹوریز کی سچائی پر یقین رکھتے تھے جو یوٹیوب، اسنیپ چیٹ یا ٹوئٹر کے ذریعے ان تک پہنچتی تھی چنانچہ پاورز نے اپنی ملازمت چھوڑ دی۔ ایک نیا لیپ ٹاپ خریدا۔ اپنی ویب سائٹ بنائی اور دی پاورز لنچ کے نام سے لانچ کر دی۔

بہت جلد اس کا شمار امریکا کی دس بڑی بلاگ سائٹس میں ہونے لگا۔ اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی تھی جبکہ بیس لاکھ افراد روزانہ اسے اتفاقیہ طور پر دیکھتے تھے۔ اس بلاگ سائٹ پر عموماً یہ تنقید کی جاتی تھی کہ یہ زیادہ تر سنسنی خیز موضوعات کا انتخاب کرتی ہے اور ان بلاگز کا انداز جارحانہ ہوتا ہے۔ یقیناً ایسی کچھ مثالیں تھیں جیسے ایک پوسٹ میں پاورز نے ایک نوجوان کا معاملہ اٹھایا جس پر دہشت گردوں سے ہمدردی کرنے کا الزام تھا۔ پاورز نے سرکاری وکیل کے دلائل میں خامیوں کی نشاندہی کی اور وہ نوجوان ضمانت پر رہا ہو گیا لیکن بدقسمتی سے ایک ماہ بعد وہ ایک کار میں بم نصب کرتے ہوئے پکڑا گیا پھر اس نے ایک اکاؤنٹنٹ کے بارے میں ایک تحقیقاتی رپورٹ پوسٹ کی جو کیتھولک خیراتی ادارے کے فنڈ میں خرد برد کر رہا تھا۔ اس کی سرخی سے یہ مطلب لیا گیا کہ وہ بچوں کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو رہا تھا جبکہ درحقیقت وہ چرائی گئی رقم سے ان لوگوں کی مدد کر رہا تھا جن کے ساتھ ناجائز سلوک ہوا لیکن اس طرح کی مثالیں بہت کم تھیں۔

پاورز کے لیے اس سے زیادہ مشکل صورت حال وہ تھی جب وہ پہل کرنے میں ناکام رہا۔ مثال کے طور پر ایک حریف بلاگ سائٹ نے اس سے پہلے نیویارک سٹی واٹر سسٹم کے بارے میں ایک اسٹوری پوسٹ کر دی جس پر وہ خود بھی کام کر رہا تھا اور اس طرح پاورز کی ساری محنت ضائع ہو گئی۔ اسی طرح ایک اور بلاگ سائٹ ''پوسٹ'' نے بھی ایک بدزبان باسکٹ بال کے کھلاڑی کے بارے میں اسٹوری پوسٹ کر کے اسے پیچھے چھوڑ دیا جس نے اپنی بیوی کا جبڑا توڑ دیا تھا کیونکہ اس نے مذاق میں دوسری ٹیم کے کھلاڑی کی تعریف کر دی تھی۔ اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ ایسے واقعات کا اعادہ نہ ہونے پائے جو اسے بلندی کی جانب بڑھنے سے روک سکتے ہیں اور اگر مائیکل کیسلر کی اسٹوری پوسٹ ہو گئی تو وہ ایک ہی جست میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے گا۔

باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے دروازے کے نیچے سے آتی ہوئی روشنی کی طرف دیکھا اور کمبل ایک طرف کر کے بستر پر جگہ بنائی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ''ہیلو!'' اس کے ساتھ ہی باتھ روم کا دروازہ کھلا اور اس میں سے میری برآمد ہوئی۔ پاورز نے بستر کی جانب اشارہ کیا اور دوبارہ فون سننے لگا۔ دوسری جانب سے نکول بول رہی تھی۔

''ٹریور! معاف کرنا، کافی دیر ہو گئی لیکن مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں جاگ رہا ہوں۔'' اس نے میری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے پوری توجہ اس کی جانب مبذول کر لی۔

''میں اس وقت یونین کلب میں ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کیسلر بھی اس کلب کا ممبر ہے چنانچہ میں نے وہاں کے اسٹاف اور ویٹرز سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک جان پہچان کا ویٹر مل گیا۔ وہ مجھے کلب کے عقبی حصے میں لے گیا اور میں نے اسٹاف کے کچھ لوگوں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا کیسلر یہاں اکثر و بیشتر آتا رہتا ہے اور کیا کسی نے حال ہی میں اسے اس جگہ پر دیکھا ہے۔ سب نے اس بارے میں لاعلمی ظاہر کی البتہ ایک ویٹر نے بتایا کہ گزشتہ روز ایک اور شخص بھی اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ کسی بلاگ کا رپورٹر تھا اور ایک مہمان کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ ویٹر نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے لیکن اس نے حلیہ بتایا۔ اس کے مطابق وہ پستہ قد، گنجا اور سلوٹ دار سوٹ پہنے ہوئے تھا۔''

''اوہ میرے خدا۔ یہ تو ڈینیل لیویٹ کا حلیہ ہے۔'' وہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ڈینیل کا تعلق ''آل دی نیوز'' بلاگ سے تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے کئی بار اسے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

''ممکن ہے کہ اس نے بھی کسی سے پلاٹ کے بارے میں سن لیا ہو۔'' نکول نے کہا۔

''ہمیں تیزی سے کام کرنا ہوگا۔ کل تم مجھ سے ملو۔ کیا

آٹھ بجے تک آسکتی ہو؟''

''یقیناً...... ہاں، ایک بات اور۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ لیویٹ اپنے حریفوں کی جاسوسی کرنے کے لیے لوگوں کو استعمال کرتا ہے۔ کیا تم نے بھی کوئی ایسی بات سنی ہے؟''

''نہیں لیکن مجھے یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی۔'' یہ کہہ کر پاورز نے میری کی طرف دیکھا جو اپنے بیگ سے ٹیلی فون اور چھوٹا لیپ ٹاپ نکال رہی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اس نے ہماری گفتگو ریکارڈ کرلی؟ لیکن اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے اپنی گفتگو میں کیسلر یا اس کی اسٹوری کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم سے کل ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اگلے روز کول ٹھیک آٹھ بجے اس کے دفتر پہنچ گئی اور پاورز نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے...... خیریت تو ہے؟''

اس نے اس کی میز پر ایک بھاری ڈبا رکھا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کچھ لوگ میرا پیچھا کررہے تھے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی سایہ میرے پیچھے ہے۔ میں جیسے ہی رکی وہ بھی رک گئے۔''

''تم نے دیکھا کہ وہ کون تھے؟''

''نہیں، انہوں نے گہرے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میں بہت زیادہ خوفزدہ ہوگئی۔ جیسے ہی ایک ٹیکسی نظر آئی، میں جھٹ اس میں سوار ہوگئی لیکن اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کیسلر سب کچھ جانتا ہے۔''

پاورز نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا لیکن اسے کوئی مشتبہ بات نظر نہیں آئی۔ پھر بھی اس نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم کچھ عرصے کے لیے روپوش ہوجاؤ۔ اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ دو اور اپنی ملازمت سے کچھ دنوں کی چھٹی کرلو۔''

''میں یہ افورڈ نہیں کرسکتی ٹریور۔ میرا بہت نقصان ہوجائے گا۔''

''میں تمہارا نقصان پورا کردوں گا۔ چند ہفتوں کے لیے کسی ہوٹل میں چلی جاؤ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم کہو۔''

پاورز نے دو ہزار ڈالرز کا چیک لکھ کر اس کے حوالے کیا اور بولا۔ ''ایک طرح سے یہ ہم دونوں کے لیے اچھی خبر ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟'' کول نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کوئی بڑا کام کرنے

جارہے ہیں۔'' اس نے کارٹن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''اگر میں حقیقت جاننے میں کامیاب ہوگیا تو ہماری سرکولیشن آسمان کو چھونے لگے گی اور تم ملک کی سب سے زیادہ بااثر بلاگ سے وابستگی میں فخر محسوس کروگی۔''
نکول کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولی۔ ''یقیناً۔ میں امید ہی کرسکتی ہوں کہ شہرت کا مزہ چکھنے کے لیے لمبی عمر پاؤں۔''
نکول کے جانے کے بعد پاورز نے بھی احتیاط برتنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنا کمپیوٹر پیک کیا اور بھاری کارٹن سمیت سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کارٹن میں کیسلر کے بارے میں تحقیقی مواد تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور کو مختلف راستوں پر گھماتا ہوا شہر کے وسط میں واقع ایک ہوٹل پہنچا اور تین دن کے لیے ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ اس نے روم سروس سے کافی منگوائی اور کمرا بند کرنے کے بعد کارٹن کھول کر دیکھا۔ واقعی نکول نے بڑی محنت سے مواد جمع کیا تھا۔
اس کارٹن میں درجنوں فائلیں تھیں جن میں کم وبیش دو ہزار کاغذات لگے ہوئے تھے۔ جیسا کہ نکول نے بتایا کہ ان میں مضامین، بلاگ پوسٹ، ٹویٹر، فیس بک اور دیگر سوشل میڈیا پوسٹ کا ریکارڈ تھا۔ اس کے علاوہ کیسلر کے قریبی لوگوں کے انٹرویوز سے بھی اقتباسات لیے گئے تھے۔ پاورز نے ان کاغذات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ان میں کیسلر کی پوری زندگی، اس کی کاروباری اور سماجی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ نکول نے اتنے بڑے پیمانے پر تحقیق کی تھی کہ پاورز متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلے تو وہ اس کی ضخامت دیکھ کر گھبرا گیا پھر اسے یاد آیا کہ نکول کوئی تربیت یافتہ صحافی نہیں ہے۔ ویسے بھی کم ہونے کے مقابلے میں زیادہ مواد بہتر تھا اور اس میں سے کئی کام کی چیزیں مل سکتی تھیں۔ ان میں کچھ عنوانات ایسے تھے جن سے واضح طور کیسلر کے کسی سازش میں ملوث ہونے کا اظہار ہورہا تھا۔
اس کے جرم کی حقیقت جاننے کے لیے اس مواد میں سے بہت کچھ پڑھنے کی ضرورت تھی۔ ہوسکتا ہے کسی ناجائز طریقے سے نیویارک کے مدعی کو دھمکایا جارہا ہو جو گیس لائن دھماکے کے بارے میں الزام عائد کرنے پر غور کررہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یورپین یا جنوبی امریکا کے حکام کو ترغیب دی جارہی ہو کہ وہ اس کی کم آمدنی والے لوگوں کے لیے سرمایہ کاری اسکیم میں رکاوٹ نہ ڈالیں اور ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ اپنی چند عمارتوں کے بارے میں کمشنر کو دھمکی دے رہا ہو جو پرانی اور غیر منافع بخش عمارتوں کو منہدم کرکے بنائی گئی تھیں۔
پاورز نے روم سروس کو کھانے اور کافی کا آرڈر دیا پھر فائلوں میں سے غیر ضروری معلومات الگ کرنے لگا جن کا کیسلر کی سازش سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس طرح کی رپورٹیں پڑھنے والوں کو کیونکر متاثر کرتی ہیں۔ نیک مقصد کے لیے عطیہ دینا، تقریبات یا کسی قریبی عزیز کی موت کی خبر سے کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ یہ صحافت نہیں بلکہ ان لکھنے والوں کی طرف سے خانہ پری تھی جو تحقیقی رپورٹنگ نہیں کرسکتے تھے۔
کھانا کھانے اور کافی پینے کے دوران بھی وہ ان کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہوگئی۔ کافی ختم ہوگئی تھی اور اسے بھوک بھی لگنے لگی تھی لیکن اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا اور وہ سب کچھ بھلا کر مائیکل کیسلر کی سازش کی کھوج میں لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی صبح کا سورج طلوع ہوا، وہ اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں ان فائلوں میں سے ایک پر تھیں جو نکول نے ڈاؤن لوڈ کی تھیں۔ اس نے تلاش جاری رکھی اور مزید تین فائلیں مل گئیں پھر اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

☆☆☆

''میں نے معلوم کرلیا کہ وہ کیا سازش کررہا ہے۔''
''اوہ ٹریور! مجھے بتاؤ، اس کا منصوبہ کیا ہے؟''
دوسری جانب سے نکول نے پوچھا۔ وہ اس وقت ایک کافی شاپ میں تھی جو اس کے ہوٹل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔
''اگلے مہینے الیکشن ہونے والے ہیں، وہ سینیٹ کی ایک سیٹ میں دھاندلی کا منصوبہ بنارہا ہے۔''
''مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے الیکشن کے بارے میں بھی کچھ مضامین دیکھے تھے لیکن مجھے ان کی تفصیل یاد نہیں۔ اس نشست کے لیے کون امیدوار ہے؟''
''یہ مین ہٹن کی ایک نشست ہے۔ ڈیموکریٹ کے امیدوار نے غیر مساوی آمدنی کو اپنے منشور کا حصہ بنایا ہے۔ وہ دولت مند لوگوں بشمول ایک کروڑ سے زیادہ مالیت کی جائداد پر بھاری ٹیکس لگانے کی حامی ہے۔ کیسلر کی زیادہ تر کمپنیاں اور جائدادیں اسی علاقے میں ہیں اور اس خاتون امیدوار کی تجاویز اسے معاشی طور پر تباہ کردیں گی۔''
''پھر بھی...... وہ سازش کیا ہے؟''
''اس معاملے میں بہت ہوشیاری دکھائی گئی ہے۔ اسے

سن کر تم بھی کیسلر کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکو گی۔ تم نے اس کے چینل کے بارے میں بھی ایک اسٹوری تلاش کی ہے جو اس حلقے کے ریپبلکن امیدوار کے حق میں اشتہارات اور پروپیگنڈا مہم چلا رہا ہے لیکن میں نے ایک اور چینل تلاش کیا ہے جو اسی ڈسٹرکٹ میں ڈیموکریٹ امیدوار کے اشتہار دکھا رہا ہے۔"

"کیا یہ حیران کن نہیں ہے؟"

پاورز مسکراتے ہوئے بولا۔ "بالکل نہیں، سوائے اس کے کہ دونوں چینلز کا پتا ایک ہی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کیسلر کا چینل مخالف امیدوار کے اشتہارات بھی دکھا رہا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"میں سمجھاتا ہوں۔ ڈیموکریٹ امیدوار نے ان احتجاجی مظاہروں میں شرکت کی جو غیر مسلح اقلیتوں پر پولیس فائرنگ کے خلاف ہو رہے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا حلقے کے ووٹروں پر اچھا اثر پڑ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی ایک پرانی ویڈیو بھی دکھا دی گئی جس میں وہ ایک پولیس والے کی تدفین کے موقع پر تقریر کر رہی ہے۔ اس وقت وہ پولیس کی میئر تھی۔ اس تقریر میں وہ تشدد کے خلاف بول رہی تھی۔"

"اب میں سمجھی۔ کیسلر کے چینل پر چلنے والے اشتہار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیموکریٹ امیدوار مکمل طور پر امن وامان قائم رکھنے کی حامی ہے اور اس نے اقلیتوں سے زیادہ پولیس کا ساتھ دیا ہے۔ اس سے ووٹروں پر خراب اثر پڑے گا اور اس ڈسٹرکٹ میں اس کے ووٹ کم ہو جائیں گے۔ اس طرح کیسلر کا امیدوار جیت جائے گا۔"

"بالکل یہی بات ہے۔"

"کیا یہ اشتہارات اب بھی دکھائے جا رہے ہیں؟ تم ان کے کچھ حصے اپنے بلاگ میں شامل کر سکتے ہو۔"

"نہیں۔ فی الحال انہیں روک دیا گیا ہے۔ اب یہ الیکشن سے چند روز قبل دکھائے جائیں گے لیکن میں اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ لیویٹ کو بھی اس کی سن گن مل گئی ہے لیکن اس بار میں اسے کوئی موقع نہیں دوں گا۔ واقعی تم نے زبردست کام کیا ہے۔"

"مجھے اس میں بہت مزہ آیا لیکن یہ مت بھولنا کہ تم نے میرے نام سے ایک اسٹوری پوسٹ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمہیں اس کا موقع ضرور دوں گا۔" پاورز نے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"تم اس جگہ پر محفوظ تو ہو؟"

"میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ میرا تعاقب کر رہے تھے جب میں ہوٹل سے کافی ہاؤس جانے کے لیے نکلی لیکن جب میں ایک بلاک آگے نکل آئی تو وہ جا چکے تھے۔" پھر اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اپنے طالب علموں کو یہ پڑھاتے ہو کہ یہ جنون صحافت کے لیے ضروری ہے؟"

"نہیں لیکن مجھے بتانا چاہیے۔ ٹھیک ہے، اب میں لکھنے بیٹھ رہا ہوں۔ تم محتاط رہنا۔"

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد پاورز دوبارہ اپنے کمپیوٹر پر بیٹھ گیا اور دو گھنٹے میں اس نے اسٹوری مکمل کر لی۔ اب اسے ایک زوردار سرخی لگانا تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ الیکشن اگلے ماہ کے پہلے منگل کو ہونے والے تھے۔ اس مناسبت سے اس نے سرخی جمائی۔

"منگل پلاٹ، مائیکل کیسلر نے مخالف امیدوار کی انتخابی مہم تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔"

پھر اس نے بٹن دبا کر اسٹوری کو اپ لوڈ کر دیا۔

☆☆☆

پانچ بجے کے قریب کنول وال اسٹریٹ کے قریب واقع اسٹین فورڈ ہوٹل میں واپس آئی اور لفٹ کے ذریعے تیرھویں منزل پر واقع کمرا نمبر 3002 پر پہنچ گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا پھر اس نے اپنی جیکٹ اتاری اور فریج سے مشروب کی بوتل نکالی۔ اس نے ڈھکنا کھولا ہی تھا کہ ایک دبلی پتلی عورت سیاہ کپڑوں میں ملبوس باتھ روم سے برآمد ہوئی۔ کنول نے اسے دیکھ کر گہری سانس بھری۔ وہ اس کی بہن کیتھی تھی۔

"معاف کرنا۔" کیتھی نے کہا۔ "میرا مقصد تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں تھا۔"

"اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔"

دونوں بہنیں گرم جوشی سے بغل گیر ہوئیں۔ کنول نے کیتھی کو مشروب کا گلاس پکڑاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری خریداری کیسی رہی؟"

"بہت اچھی۔ اب بچوں کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" کیتھی نے کئی بڑے تھیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ممی شہر گھومنا چاہ رہی تھیں لیکن بچوں نے اسٹار وارز اور لیگاس کو ترجیح دی۔"

"میری خواہش تھی کہ اس بار میں بھی ان سے مل سکتی۔" کنول نے کہا۔

"وہ چند ماہ بعد آنٹی نکی کے ساتھ دوبارہ آئیں گی۔" کیتھی اصل موضوع کی طرف آنا چاہ رہی تھی۔ کنول

اس کا مطلب سمجھ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے توقع کے مطابق کامیابی ہوئی۔ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر نکول نے لیپ ٹاپ کھولا اور ایک ویب سائٹ کو کلک کر کے اس کا رخ اپنی بہن کی طرف کر دیا اور خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ وہ پاورز کی حریف ویب سائٹ ''آل دی نیوز'' تھی اور لکھنے والا ڈینیل لیویٹ تھا۔ اس بلاگ کا عنوان تھا ''ایک بلاگر کا اوچھا قدم!''

''کچھ گناہ اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بلاگر ٹریور پاورز نے صحافتی اخلاقیات کی قیمت پر شہرت حاصل کی اور اس کیڑے نے خود ہی اسے کاٹ لیا۔ میں مائیکل کیسلر کے بارے میں لکھے گئے اس بلاگ کی بات کر رہا ہوں جو آج صبح اس کی ویب سائٹ دی پاورز تھ پر دکھایا گیا۔ گو کہ میں کیسلر کا مداح نہیں ہوں لیکن کسی ایسی تحریر کو نظرانداز نہیں کرسکتا جو صحافتی قدروں کے منافی ہو۔''

''پاورز نے کیسلر پر ایک پلاٹ کا الزام لگایا ہے جس سے اس کی مراد سازش ہے اور اس مضمون کی بنیاد ان حقائق پر رکھی گئی ہے جو سیاق وسباق سے ہٹ کر ہیں اور اخبارات میں کسی تحقیق کے بغیر شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس سازش کا خلاصہ یہ ہے کہ کیسلر نے اپنے چینل پر ڈیموکریٹک امیدوار کی انتخابی مہم چلانے کے لیے وقت خریدا تھا۔ پاورز کا دعویٰ ہے کہ یہ چوری کی اشتہار بازی ہے اور اس کا مقصد ڈیموکریٹک امیدوار کی انتخابی مہم کو سبوتاژ کرنا اور ریپبلکن امیدوار کی حمایت کرنا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کیسلر کے چینل نے خفیہ طور پر کوئی اشتہار نہیں خریدا بلکہ انہوں نے صرف ریپبلکن امیدوار کے لیے وقت مخصوص کیا تھا۔ ڈیموکریٹک امیدوار کی اشتہاری مہم کے لیے ایک دوسرے چینل سے وقت خریدنے کا منصوبہ تھا جس کا کیسلر سے کوئی تعلق نہیں۔ پاورز نے صرف یہ بات نوٹ کی کہ دونوں چینلز کا پتا ایک ہی ہے اور وہ میڈیسن اسکوائر پر واقع ہیں اور اس بنیاد پر یہ فرض کرلیا کہ دونوں چینل کیسلر کی ملکیت ہیں۔ اس نے یہ جاننے کی زحمت نہیں کی کہ اس عمارت میں تیس کے قریب انتخابی کمیٹیوں، لابنگ فرموں اور اشتہاری ایجنسیوں کے دفاتر ہیں جو ڈیموکریٹ اور ریپبلکن دونوں کے لیے کام کرتی ہیں۔''

''پاورز کو اس سارے معاملے میں سازش نظر آئی جو خلافِ عقل ہے۔ کیسلر کو ڈیموکریٹک امیدوار سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر وہ جیت بھی جاتی اور بڑے کاروباری اداروں کے خلاف کوئی قانون بنانے کی کوشش کرتی تو نیویارک کا ریپبلکن گورنر اسے ویٹو کر دیتا۔''

''جب اس رپورٹر نے اس ''پلاٹ'' کے بارے میں جاننا چاہا تو کیسلر خاندان کے ایک ترجمان نے بتایا...... ہاں، حال ہی میں خاندان کے افراد، ایک پلاٹ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے ہیں اور یہ بات خبروں میں بھی آچکی ہے۔ شاید مسٹر پاورز نے یہ لفظ وہیں سے سنا ہوگا جب حال ہی میں مائیکل اور سارہ کی آنٹی گبریلا ہومز کا انتقال ہوا تو ان کی تدفین کے سلسلے میں کچھ مشکلات پیش آگئیں۔ لانگ آئی لینڈ میں واقع ان کے خاندانی قبرستان میں پتھروں اور دوسری رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے بہت زیادہ کھدائی کی ضرورت تھی تاکہ ہومز کو اس پلاٹ میں دفن کیا جاسکے جہاں وہ چاہتی تھی۔ بہرحال وہ جگہ صاف ہوگئی اور پروگرام کے مطابق اس کی تدفین کر دی گئی۔ یہ تھا وہ پلاٹ جسے غلطی سے سازش سمجھ لیا گیا۔ میں مسٹر پاورز سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی انہوں نے صحافت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی؟''

''آج تین بجے دی پاورز تھ بند ہوگیا اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ مائیکل کیسلر نے پہلے ہی کئی اونچے درجے کے وکیلوں سے ہتک عزت کا دعویٰ کرنے اور لاکھوں ڈالرز ہرجانے کا مطالبہ کرنے کے سلسلے میں مشاورت کرلی ہے۔''

''اوہ نکی!'' کیتھی نے ایک ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم کامیاب ہوگئی ہو۔ یہ بہت بڑا کام تھا جو تم نے کر دکھایا۔''

یہ سچ ہے کہ منصوبہ بالکل واضح تھا اور نکول خود بھی حیران تھی کہ اس پر اتنی آسانی سے عمل ہوتا چلا گیا۔ کیتھی کا شوہر سام کیتھولک چرچ میں اکاؤنٹنٹ تھا اور غبن کر کے گمنام طریقے سے ان متاثرین میں وہ رقم تقسیم کر دیتا جو پادریوں کی زیادتی کا شکار ہوتے تھے۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا، وہ گرفتار ہونے اور سزا پانے کے لیے پوری طرح تیار تھا لیکن وہ پاورز کے بلاگ میں لگائے گئے داغ کو نہ دھو سکا جس نے شاید نادانستگی میں اسے ہی زیادتی کا مجرم قرار دے دیا۔ یہ ایک سفید جھوٹ تھا لیکن ایک بار یہ داغ لگ جائے تو کبھی نہیں مٹتا۔ سام اس کے خلاف کارروائی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے زندگی میں پہلی بار شراب پی اور نشے کی حالت میں گاڑی چلاتے ہوئے جھیل میں ڈوب گیا۔

نکول اسٹون (اس نے پاورز کو اپنا نام غلط بتایا تھا)

کیلی فورنیا میں وکالت کرتی تھی۔ اس نے اپنی بہن پر زور دیا کہ وہ پاورز کے خلاف ہرجانے کا دعویٰ کرے اور معذرت یا وضاحت کا مطالبہ بھی کرے۔ کیتھی نے اس کے کہنے پر عمل کیا لیکن اس کا دعویٰ خارج ہوگیا جس کا نکول کو ڈر تھا۔ اس کے باوجود کیتھی سوشل میڈیا کے ذریعے اپنے شوہر کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن تھک ہار کر خاموش ہوگئی البتہ اس کی بہن نے پاورز کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لی اور پاورز کی بلاگ سائٹ بلکہ اس کے کیریئر کو تباہ کرنے کا عزم لے کر نیویارک چلی آئی جو سنسنی خیزی اور آدھے سچ کو صحافت کا نام دیتا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو جزوقتی صحافت کا طالب علم اور کاک ٹیل ویٹرس ظاہر کیا اور پاورز کے یہاں تنخواہ کے بغیر زیر تربیت ایڈیٹر کے طور پر کام کرنے لگی۔ اس نے پاورز کی وہ تمام پوسٹ پڑھ ڈالیں جو اس نے گزشتہ چند برسوں میں لکھی تھیں۔ اس طرح اسے اس کی کمزوریوں کا علم ہوگیا۔ اسے کسی بھی سازش کا اشارہ ملتا، چاہے وہ سچ ہو یا جھوٹ، وہ اس پر لکھ دیا کرتا تھا۔ اسے اس کے اثرات یا نقصانات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے پاورز کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ ایک مکمل اور بے داغ منصوبہ بنانا چاہتی تھی۔ اسے حال ہی میں اخبار میں شائع ہونے والا مضمون یاد آیا جس میں کیسلر کے خاندانی قبرستان کا ذکر تھا اور یہ کہ انہیں اس پلاٹ کو حاصل کرنے میں کچھ مشکل پیش آرہی تھی جو ان کی مرنے والی آنٹی کے لیے مخصوص تھا۔

بار میں کیسلر اور اس کی بہن سارہ اسی پلاٹ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے لیکن نکول نے اسے ایک سنسنی خیز کہانی کا روپ دے کر پاورز کو اس طرح سنایا جیسے وہ کسی سازش کا پلاٹ بنا رہے تھے۔ اسے سن کر پاورز کی بھوک چمک اٹھی اور اس نے نکول کو اس بارے میں مواد اکٹھا کرنے کے لیے کہا۔ اس نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں کاغذ جمع کیے جو کیسلر کے بارے میں خبروں اور دیگر معلومات پر مشتمل تھے اور پاورز اس جال میں پھنس گیا۔

وہ کیتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''جو کچھ میں نے اسے دیا، وہ سب سچ تھا۔ یہاں تک کہ کیسلر کی آنٹی کے انتقال اور قبرستان کے بارے میں بھی خبر شامل کردی۔''

''اگر وہ اسے پڑھ لیتا۔'' کیتھی نے کہا۔ ''تو وہ جان سکتا تھا کہ یہ قبرستان کے پلاٹ کی بات ہو رہی تھی۔''

''ہاں لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کی پوری توجہ سازش پر مرکوز تھی۔ وہ وہی کچھ دیکھ رہا تھا جو دیکھنا چاہتا تھا۔ البتہ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں بھی بے قصور نہیں تھی۔ میں نے ڈینیل لیویٹ کو بتا دیا کہ شاید پاورز ایک مشتبہ اسٹوری دینے والا ہے اور پھر پاورز کے کان میں بھی یہ بات ڈال دی کہ لیویٹ اس معاملے کی بو سونگھتا پھر رہا ہے جو کہ غلط نہیں تھا۔''

''اسی لیے پاورز نے تیزی دکھائی اور پوری طرح حقائق معلوم نہیں کیے جو کہ اسے کرنا چاہیے تھے۔''

''اسے جھوٹی شان اور انا نے مار دیا۔'' نکول نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس کے ساتھ ایک اور حرکت کی۔''

''وہ کیا؟''

''وہ خبیث اپنی ایک شاگرد کے ساتھ عشق لڑا رہا تھا۔ میں نے اسے فون پر بتایا کہ لیویٹ اس کی کہانی چرانے کے لیے کسی کو استعمال کر رہا ہے۔ اس کا شک اس لڑکی پر گیا اور ان میں علیحدگی ہوگئی۔''

''اب اس کے ساتھ کیا ہوگا؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی لیکن وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔ اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔'' کیتھی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''سام ایک رحم دل شخص تھا۔ اسی لیے اس نے وہ رقم خرد برد کی تھی۔ وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا جو کچھ ہم نے پاورز کے ساتھ کیا۔''

نکول کے فون پر پیغام آیا۔ ''تم لوگوں سے کرسمس پر ملاقات ہوگی۔ امید ہے کہ میرے خلاف یہ مقدمہ جلد ختم ہوجائے گا۔''

دونوں بہنیں بغل گیر ہوگئیں۔ کیتھی نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''مجھے ابھی معلوم ہوا ہے۔ یہ بھی پلاٹ تھا۔ میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کرسکتی۔''

''سام کے ساتھ یقیناً انصاف ہوگا۔ مجھے اپنی عدالتوں پر پورا یقین ہے۔''

''تم نے ہی اسے روپوش ہوجانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ اس پر لگا ہوا داغ دھندلا ہوجائے۔ اب یہ گرد ہٹ چکی ہے اور وہ قانون کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔''

''میرا کام ختم ہوگیا۔'' نکول قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''میں کل صبح کیلی فورنیا چلی جاؤں گی۔ اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

نظر فریب

مرزا امجد بیگ

بات شخصیت کی ہو یا کسی بھی جوڑ کی اگر... متوازن ہو تو سب کچھ اچھا لگتا ہے مگر جہاں اس توازن میں اونچ نیچ ہوئی وہیں نگاہوں کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔ جو اپنا لگتا ہے اچانک غیر ہو جاتا ہے۔ گویا غیر متوازن انداز میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ تقدیر نے کچھ ایسا ہی جوڑ اس کا بھی بنا دیا تھا یا پھر اس نے جان بوجھ کر اپنی آنکھوں پر فریب کی پٹی باندھ لی... ان دونوں کا کوئی جوڑ نہ تھا جسے زبردستی باندھ تو لیا گیا مگر اسے ایک نہ ایک دن ٹوٹ جانا تھا اور پھر اس ایک لمحے میں اس جوڑ توڑ نے ان کی زندگی کا منظرنامہ ہی بدل ڈالا۔ یہ اور بات کہ مرغی جان سے گئی اور کھانے والے کو سواد ہی نہیں آیا مگر... ہر بار ایسا نہیں ہوتا کہ صرف مرغی خاموشی سے ذبح کردی جائے۔ کبھی کبھی رائگاں جانے والی قربانی بڑی شدت سے اپنا حساب مانگتی ہے۔

پُرخلوص جذبوں کی تذلیل کرنے والے ایک فریبی کا

عبرت اثر انجام

وقت بادشاہ ہے اور...... یہ بادشاہ، بادشاہوں کے بادشاہ مالکِ کائنات کے حکم پر انسانوں سے کھیلتا ہے۔ وقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دولت کی طرح یہ کسی کے پاس کم اور کسی کے پاس زیادہ نہیں ہوتا۔ ہر دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور ہر ہفتے میں سات دن۔ یہ الگ بات کہ زیرک اور چابک دست انسان موقع شناس ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو پرکھنے اور برتنے کا ہنر جانتے ہیں لہٰذا وہ سمجھداری کا مظاہرہ کر کے وقت کو اپنے لیے سودمند بنا لیتے ہیں جبکہ نالائق اور عاقبت نااندیش افراد اپنی کوتاہیوں اور غلط فیصلوں کے باعث وقت کو ضائع کر دیتے ہیں۔ وقت اپنی فطرت کے مطابق ہمیشہ آگے کی سمت سفر کرتا ہے اور گزرا ہوا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ قبل اس کے کہ وقت ہماری مخالفت میں کوئی فیصلہ سنا دے، ہمیں اپنے معاملاتِ زندگی کا قبلہ درست کر لینا چاہیے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ اس سال اپریل کے آغاز ہی سے گرمی نے زور پکڑ لیا تھا۔ ویسے تو کراچی میں پورا سال ہی اے سی کی ضرورت بہرحال موجود رہتی ہے لیکن اگر محتاط اندازہ بھی لگائیں تو آٹھ سے دس ماہ کہیں نہیں گئے، خاص طور پر مارچ سے اکتوبر تک ان لوگوں کی زندگی میں اے سی کا عمل دخل رہتا ہے جو اسے افورڈ کر سکتے ہیں۔

لگتا ہے، اے سی اور کاٹن کے سوٹ کی زمانہ قدیم سے کوئی خاص رشتے داری ہے۔ انہیں حاصل کرنا اتنا دشوار نہیں ہوتا جتنا بعد میں بھگتنا۔ اگر بجلی چوری نہ کریں اور سوٹ کی کلف دار دھلائی کروائیں تو دونوں کے بلز دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

ان دنوں میرے آفس کا اے سی سروس کے لیے گیا ہوا تھا لہٰذا سیلنگ فین سے گزارہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی ایک تپتی ہوئی حبس زدہ سہ پہر تھی۔ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ سیکریٹری نے بتایا، صدیقی صاحب کی کال ہے۔ میں نے اسے کال ٹرانسفر کرنے کے لیے کہہ دیا۔ اگلے ہی لمحے صدیقی صاحب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''بیگ صاحب! السلام علیکم......''

مظہر صدیقی سے میری بہت پرانی یاد اللہ تھی۔ وہ ایک فلاحی تنظیم کے روحِ رواں تھے۔ جواباً میں نے شائستہ لہجے میں ان سے کہا۔

''وعلیکم السلام!''

''آپ کیسے ہیں؟'' صدیقی نے پوچھا۔ ''کام کیسا



چل رہا ہے؟''
''اللہ کا کرم ہے، آپ سنائیں۔''
''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے بتایا پھر پوچھا۔ ''آپ آج کتنے بجے تک آفس میں موجود رہیں گے؟''
''کم از کم نو بجے رات تک تو ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد کا انحصار کلائنٹس کی آمد پر ہے۔''
''میں آپ کے پاس ایک بندے کو بھیج رہا ہوں۔ اس کا نام شاکر علی ہے۔'' صدیقی صاحب نے کہا۔ ''اس کی ایک عزیزہ کسی قانونی مسئلے میں پھنسی ہوئی ہے۔ آپ ان لوگوں کے لیے وقت نکال لیجیے گا۔''
''جی، میں ضرور وقت نکال لوں گا لیکن آپ کو پتا ہے نا......''
''جی، مجھے بالکل پتا ہے۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے خوش دلی سے بولے۔ ''کہ آپ فیس کے بغیر کسی کیس میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔''
''اللہ آپ کا بھلا کرے۔'' میں نے بھی جواباً زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''فیس کی وصولی کے علاوہ بھی میرا ایک اصول ہے۔''
''وہ کیا؟'' انہوں نے استفسار کیا۔
''میں صرف اسی شخص کے کیس میں ہاتھ ڈالتا ہوں جس سے مطمئن ہو جاتا ہوں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔
''یہ آپ کا حق ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولے۔ ''اگر آپ کو اطمینان محسوس نہ ہو تو آپ اس کیس کو چھوڑ سکتے ہیں اور فیس کے لیے بھی بے فکر ہو جائیں۔ یہ کوئی چیریٹی ایشو نہیں ہے جو میں آپ سے فیس میں رعایت کے لیے درخواست کروں۔ آپ کلائنٹ سے اپنی پوری فیس وصول کیجیے گا۔''
میں نے صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اختتامی کلمات کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہو گیا۔
ٹھیک آٹھ بجے مظہر صدیقی کا بھیجا ہوا وہ بندہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ شاکر علی کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس اور پچاس کے درمیان قائم کیا۔ وہ ایک خوش لباس اور دراز قامت شخص تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ موجود تھا۔ صحت مناسب اور سر کے بال درمیان سے خاصی حد تک رخصت ہو چکے تھے۔ شاکر علی نے بعدازاں مجھے بتایا کہ طارق روڈ پر اس کا ایک ریسٹورنٹ تھا جو خوب چلتا تھا۔ اس کی رہائش گلشن اقبال کے علاقے میں تھی۔ اپنی وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے وہ ایک آسودہ حال اور خوش باش شخص دکھائی دیتا تھا۔
میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرنے کے بعد پوچھا۔ ''جی، شاکر صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''
''صدیقی صاحب نے آپ کو میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟''
''بس یہی کہ آپ کی کوئی عزیزہ کسی قانونی جھمیلے میں پھنس گئی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اور آپ اسی سلسلے میں میری مدد چاہتے ہیں۔''
''جی بالکل، یہی بات ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نادرہ سے میرا کوئی باقاعدہ رشتہ تو نہیں لیکن آپ اسے ہمدردی یا انسانیت کا ناتا کہہ سکتے ہیں۔ بے چاری بہت ہی دکھی اور مظلوم ہے۔''
میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''نادرہ کے ساتھ کس نوعیت کا مسئلہ ہے؟''
''نادرہ اس وقت قتل کے ایک کیس کے سلسلے میں عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔'' شاکر علی نے جواب دیا۔
''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''نادرہ پر کس شخص کے قتل کا الزام ہے؟''
''اس کے شوہر کامران کے قتل کا الزام۔'' شاکر نے بتایا۔ ''اور اس واقعے کے عینی شاہد بھی موجود ہیں۔''
''تو یوں کہیں نا کہ نادرہ قتل کی ملزمہ نہیں بلکہ مجرمہ ہے۔'' میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ چاہتے ہیں کہ میں نادرہ کو بچا لوں۔''
''جی، بالکل...... میں یہی چاہتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''قتل کی یہ واردات میری نگاہ کے سامنے ہوئی ہے یعنی میں بھی اس وقت جائے وقوعہ پر موجود تھا۔ وہ جو کچھ بھی ہوا اس میں نادرہ کا کوئی قصور نہیں۔ اس کی جگہ جو کوئی بھی ہوتا، وہ اسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کرتا۔''
''شاکر صاحب! توجیہہ اور وضاحت سے کسی کیس کی سنگینی کم نہیں ہو جاتی۔'' میں نے کہا۔ ''اگر کسی نے قتل کیا ہے تو وہ ہر حال میں قاتل ہی کہلائے گا۔ ہر جرم کا کوئی نہ کوئی سبب یا محرک ضرور ہوتا ہے۔''
''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''جب آپ اس کیس کے پس

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



منظر سے آگاہ ہوں گے تو مجھے یقین ہے، آپ کو بھی نادرہ سے ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ آپ اس کے معاملے میں گہری دلچسپی لینے پر تیار ہو جائیں گے۔''

''اور وہ پس منظر کیا ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''بے چاری نادرہ کے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔'' شاکر علی نے بتایا۔ ''کامران نے پہلے ایک فریب سے نادرہ کے ساتھ شادی کی پھر اس کا بنگلا بیچ ڈالا اور ایک سازش کے تحت لاہور سے فرار ہو کر کراچی آگیا اور یہاں آنے کے بعد اس نے فوزیہ نامی ایک طرح دار حسینہ سے شادی کر لی اور......''

''ایک منٹ شاکر صاحب۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ ''کیا آپ کی اس عزیزہ نادرہ کا تعلق لاہور سے ہے؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اور کامران کو اس نے کہاں قتل کیا ہے؟''

''کراچی میں۔'' اس نے بتایا۔ ''بہادر آباد کے علاقے میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ کامران اپنی دوسری بیوی فوزیہ کے ساتھ بہادر آباد کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے رف پیڈ پر اہم نوٹس لینے کے بعد کہا۔ ''آپ اپنی بات جاری رکھیں شاکر صاحب۔''

''کامران، نادرہ کو لوٹنے کے بعد لاہور سے کراچی آگیا تھا۔'' وہ سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں اس نے خود کو چاول کا ایک بیوپاری ظاہر کیا اور بہادر آباد کے ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ چند روز بعد فوزیہ نامی ایک لڑکی سے اس کی ملاقات ہوئی اور جلد ہی ان کے بیچ خاصے مضبوط تعلقات استوار ہو گئے جو شادی پر منتج ہوئے اور اب......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور اب وہ فوزیہ کے ہمراہ پاکستان سے امریکا جانے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ نادرہ لاہور سے کراچی پہنچ گئی۔ وہ کامران سے کڑی باز پرس کرنے آئی تھی لیکن اس ملاقات پر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ نادرہ نے طیش کے عالم میں کامران کو قتل کر ڈالا۔''

''نادرہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ کامران کراچی میں موجود ہے اور اس نے دوسری شادی کر لی ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''یہ معلومات میں نے اپنے ایک رشتے دار صفدر علی تک پہنچائی تھیں۔'' اس نے بتایا۔ ''صفدر علی، نادرہ کا لاہور میں پڑوسی رہا ہے۔''

''تو کیا آپ کراچی میں کامران سے ملتے جلتے رہتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''جو آپ کو اس کے بارے میں یہ سب معلومات تھیں؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ایک اتفاق تھا کہ چند روز پہلے میں نے کامران کو ایک دلکش عورت کے ساتھ اپنے ریسٹورنٹ میں دیکھا۔ میں لاہور میں ایک مرتبہ نادرہ اور کامران سے مل چکا تھا۔ یہ بس سرسری سی ملاقات تھی لہٰذا میں جانتا تھا کہ کامران نادرہ کا شوہر ہے۔ میری یادداشت بہت اچھی ہے چنانچہ کامران کا چہرہ میرے ذہن میں نقش تھا۔ جب میں نے اسے اپنے ریسٹورنٹ میں دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ کامران مجھے دیکھ نہیں پایا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر ساری صورتِ حال سے صفدر علی کو آگاہ کر دیا۔''

''اور پھر نادرہ نے کراچی پہنچ کر کامران کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے اس بات کا یقین ہے وکیل صاحب کہ نادرہ اس کی جان لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''بس سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، پیش آمدہ حالات کی روشنی میں نادرہ کے لیے کافی گنجائش نکالی جاسکتی ہے...... مطلب یہ کہ اسے پھانسی لگنے یا عمر قید سے بچایا جاسکتا ہے اور یہی میرا مقصد بھی ہے۔''

''ہوں......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''نادرہ کی فیملی میں اس کیس کی پیروی کون کرے گا؟''

''اس کی فیملی میں کوئی بھی قریبی رشتے دار زندہ نہیں ہے۔'' شاکر علی نے بتایا۔ ''اور اگر کوئی زندہ ہے بھی تو اس کی کوئی خیر خبر نہیں۔ یوں سمجھیں کہ اس کیس میں نادرہ کی پشت پر میرے عزیز صفدر علی کا ہاتھ ہے اور یہاں کے سارے معاملات میں دیکھوں گا۔ آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کا جو بھی ایشو ہو، وہ آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔''

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں شاکر صاحب۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نادرہ کے کیس میں ہاتھ ڈالنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سلسلے میں میری ایک شرط ہے......''

''کیسی شرط وکیل صاحب؟'' وہ سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''صدیقی صاحب نے بتایا

تھا کہ آپ فیس ایڈوانس میں لیتے ہیں تو وہ میں ابھی ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"صدیقی صاحب نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "لیکن اس وقت میں نے کسی اور شرط کی بات کی ہے۔"

"جی، آپ حکم کریں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"میں اپنے کلائنٹس کے ساتھ بہت فیئر رہتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ کلائنٹس بھی میرے ساتھ بالکل فیئر رہیں۔" میں نے کہا۔ "منافقت اور دروغ گوئی مجھے قطعاً پسند نہیں لہٰذا آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔ کامران، نادرہ اور فوزیہ کے بارے میں آپ جو کچھ بھی جانتے ہیں، وہ سب مجھے بتادیں تاکہ میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرسکوں۔"

"جی ضرور......" اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں خود بھی بہت اصول پسند شخص ہوں۔ لگتا ہے اپنی خوب جمے گی۔"

اس روز شاکر علی کی زبانی اس کیس کے حوالے سے مجھے جو ابتدائی معلومات حاصل ہوئیں، میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس مقدمے کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہوجائیں۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں نے ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے انہیں بھی شامل کرلیا ہے۔

اسی طرح بعض باتیں میں نے چھپا بھی لی ہیں جنہیں عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر میں آپ کے سامنے لاؤں گا تاکہ کہانی کا سسپنس اور سنسنی خیزی برقرار رہے۔

☆☆☆

جیسا کہ آپ یہ جان چکے ہیں کہ نادرہ نامی اس خاتون کا تعلق لاہور سے تھا۔ نادرہ کی رہائش نہر کے کنارے واقع شادمان کالونی میں تھی۔ یہ ایک بیس مرلے کی خوب صورت کوٹھی تھی۔ کراچی کے باسی اسے لگ بھگ پانچ سو گز کا بنگلا سمجھ لیں۔ کوٹھی اور بنگلا ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ لاہور میں جس رہائش کو کوٹھی کہا جاتا ہے، کراچی میں اسے بنگلے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بعض انگریزی زدہ افراد اسے تھوڑا سا منہ بگاڑ کر بینگلو بھی کہتے ہیں۔

نادرہ کے شوہر ملک وحید کی گلبرگ مارکیٹ میں جیولری کی دکان تھی۔ کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لہٰذا روز و شب امن و آشتی سے گزر رہے تھے۔ ان دونوں کی زندگی میں صرف ایک ہی کمی تھی اور وہ یہ کہ ان کی نسل آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ شادی کے کئی سال گزر جانے کے باوجود بھی ان کے آنگن میں کسی معصوم کی قلقاریوں کی آواز گونجنے کا سامان نہیں ہوسکا تھا۔ یہ محرومی ان کا دل خون کردیتی تاہم وہ قدرت سے جنگ نہیں کرسکتے تھے لہٰذا صبر و شکر کا دامن تھامے زندگی کا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

ان کی جمی جمائی زندگی میں بھونچال اس وقت آیا جب ایک شام ملک وحید کی دکان پر ڈکیتی کی خونی واردات پیش آئی۔ تین چار مسلح ڈاکو اس کی دکان میں داخل ہوئے اور ملک وحید سمیت دونوں ملازمین کو گن پوائنٹ پر رکھ کر انہوں نے دکان کا صفایا کرڈالا۔ تمام سونا اور نقدی سمیٹنے کے بعد وہ واپسی کی راہ ناپنے ہی والے تھے کہ ملک وحید کا نصیب خراب کہ اچانک اس نے بہادری دکھانے کی کوشش کی۔ یہ اس کی ایک اضطراری حرکت تھی۔ ڈاکوؤں نے جتنی آسانی اور سہولت سے اپنا کام کر دکھایا تھا، اس کے پیش نظر وہ ملک وحید کی جانب سے اس قسم کی مزاحمت کی توقع نہیں رکھتے تھے لہٰذا یہ مہم جوئی ملک صاحب کو بہت مہنگی پڑی اور ڈاکوؤں کے ردعمل کے طور پر ملک صاحب کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔

اس سانحے نے نادرہ کو توڑ کر رکھ دیا۔ ڈاکو گلبرگ مارکیٹ والی دکان میں جھاڑو پھیر گئے تھے چنانچہ اس بزنس کو جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ دکان بھری پری بھی ہوتی تو ملازمین کے رحم و کرم پر اس کام کو آگے بڑھانا نادرہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی سی گھریلو عورت تھی۔ کاروبار اور دکان داری اس کے اختیار سے باہر تھا۔

مرحوم ملک وحید نے نادرہ کے لیے شادمان کالونی والی کوٹھی کے علاوہ کچھ رقم بینک میں بھی چھوڑی تھی۔ یہ اتنا اماؤنٹ تھا کہ اس سے حاصل ہونے والا ماہانہ منافع نادرہ کی گزر بسر کے لیے کافی تھا لہٰذا اسے کسی قسم کی مالی تنگی یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ماہ و سال اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے کہ ملک میں انویسٹمنٹ کمپنیز کا ایک سیلاب سا آگیا۔ مختلف ناموں سے کھلنے والی یہ انویسٹ کمپنیز عام بینکوں کی بہ نسبت بہت زیادہ منافع دے رہی تھیں چنانچہ ان دنوں لوگوں نے بینکوں میں سے اپنی رقوم نکال کر ان برساتی کمپنیز میں لگانا شروع کردی تھیں۔ شرح منافع اتنی دلفریب، پُرکشش اور ہوش ربا تھی کہ بعض ندیدے افراد نے تو اپنا زیور، گھر بار

اور تمام قیمتی اشیا فروخت کر کے بھاری رقوم ان کمپنیوں کے پاس رکھوا دی تھیں۔ مذکورہ کمپنیوں نے بالآخر اپنے کھاتے داروں کے ساتھ کیا "سلوک" کیا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس عبرت ناک تاریخِ ماضی سے آپ سب اچھی طرح واقف ہیں۔

لالچ انسان کی فطرت کا لازمی جزو ہے اور مال و دولت کا لالچ دیگر اشیائے ضرور یہ پر ہمیشہ سبقت رکھتا ہے کیونکہ سکہ رائج الوقت سے انسان کے ننانوے فیصد مسائل حل ہو جاتے ہیں چنانچہ کسی خیال کے تحت نادرہ نے بھی ایک انویسٹمنٹ کمپنی کا رخ کیا۔

نادرہ کی جو رقم بینک میں رکھی تھی، اس پر ملنے والے منافع سے دوگنا منافع ایک انویسٹمنٹ کمپنی دے رہی تھی لہٰذا انسانی فطرت سے مجبور ہو کر اس نے بینک سے رقم نکال کر اس انویسٹمنٹ کمپنی میں لگا دی۔ مذکورہ کمپنی کا نام آپ "اوورنائٹ انویسٹرز" فرض کر لیں...... مطلب راتوں رات امیر بنا دینے والی کمپنی!

جب دو تین ماہ تک طے شدہ منافع نادرہ کے ہاتھ میں آتا رہا تو اس کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں موجود یہ خدشہ بھی نکل گیا کہ کہیں "اوورنائٹ انویسٹرز" والے اس کے ساتھ کوئی ہاتھ نہ کر جائیں۔ ہر ماہ دگنا منافع ملنے لگا تو ذہن و دل کے تمام اندیشے رخصت ہو گئے۔ وہ مطمئن اور پُرسکون ہو گئی لیکن یہ سکون کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

اوورنائٹ انویسٹرز کے آفس میں نادرہ کی کامران سے ملاقات ہوئی۔ کامران مذکورہ کمپنی میں ملازم تھا۔ کامران کی عمر تیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ بہت ہی ہینڈسم اور اسمارٹ شخص تھا۔ اس پر مستزاد اس کی خوش اخلاقی نے نادرہ کو بہت متاثر کیا۔ کامران کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک دل آویز مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور وہ سامنے والے کی بات بہت توجہ سے سنتا تھا۔ اس کے رویے کو دیکھ کر کوئی اس کی عیاری اور خباثت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا چنانچہ سادہ لوح نادرہ بھی اس کی لچھے دار باتوں میں آ گئی۔ نتیجتاً وہ بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے اور یہ قربت گل کھلائے بنا نہ رہ سکی۔

اس وقت کامران کی عمر تیس سال تھی جبکہ نادرہ چالیس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی مگر عمروں کا یہ تفاوت ان کی ملاقاتوں کے جوش و جذبات پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ کامران ایک ہوشیار اور چالباز شخص تھا۔ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی اداکاری میں اتنی جان تھی کہ نادرہ کو ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نیت پر شک نہیں ہوا۔ کامران نے نادرہ پر اپنی محبت کا جال پھینکنے سے پہلے اس کے بارے میں مکمل چھان بین کر لی تھی۔ کسی منصوبے کا ہوم ورک اچھا ہو تو کامیابی کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

کامران نے خود کو ایک دل گرفتہ اور محبت میں ناکام بلکہ محروم شخص کی حیثیت سے نادرہ کے سامنے پیش کیا اور اپنی چرب زبانی کے طفیل نادرہ کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ نادرہ سے شدید نوعیت کی محبت کرنے لگا ہے۔ نادرہ واجبی سی شکل و صورت کی مالک تھی۔ اسے اپنے سے کم عمر کا ایک وجیہہ و شکیل عاشق میسر آیا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو زنگ لگ گیا۔ جواباً نادرہ کو بھی کامران سے محبت ہو گئی۔ چند ملاقاتوں میں نادرہ پر کامران کا ایسا رنگ چڑھا کہ وہ اس سے شادی کے لیے تیار ہو گئی۔

اس شادی کی خبر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کیونکہ ان دونوں کی ملاقاتیں لوگوں کے علم میں آ چکی تھیں۔ نادرہ کی فیملی کا کوئی چھوٹا بڑا اس کے آس پاس موجود نہیں تھا جو ان دونوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے مراسم میں کوئی رکاوٹ ڈالتا یا کوئی سوال اٹھاتا۔ پڑوسی صفدر علی کے کانوں تک جب نادرہ کے ارادوں کی خبر پہنچی تو اسے بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ مرحوم ملک وحید کے ساتھ صفدر علی کے اچھے مراسم تھے لیکن ظاہر ہے، وہ نادرہ کو کھل کر منع تو نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی ملک وحید کے انتقال کے بعد سے نادرہ نے اپنے پڑوسیوں سے میل ملاقات بہت کم کر دی تھی۔ سچی بات تو یہ کہ نادرہ آزاد اور خود مختار عورت تھی۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں ہر فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔ اگر اس نے ایک خوبرو جوان مرد سے شادی کرنے کی ٹھان لی تھی تو اس نیک کام سے کون اسے روک سکتا تھا۔ قصہ مختصر، ایک سادہ سی تقریب میں ان کی شادی ہو گئی۔

روایت تو یہی ہے کہ لڑکیاں بیاہ کر اپنی سسرال میں جاتی ہیں لیکن یہاں کامران بیاہ کر رہنے کے لیے نادرہ کی کوٹھی میں چلا آیا تھا۔ نادرہ بہت خوش تھی جیسے یہ شادی کر کے اس نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے لیا ہو۔ ہنی مون کا عرصہ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم رہے۔ بس کامران ڈیوٹی پر جاتا۔ باقی کا سارا وقت وہ نادرہ کی معیت میں گزارتا۔ اس دوران میں کامران نے اسے اتنی محبت دی کہ وہ کامران کی بے دام کنیز بن کر رہ گئی۔ اسے کامران

کے سوا اس دنیا میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گویا کامران بڑی ہوشیاری اور کامیابی کے ساتھ اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی راہ پر گامزن تھا۔ ایک رات کامران نے نادرہ سے کہا۔

''ہنی! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے......''

نادرہ چونک اٹھی۔ ایک واجبی سی شکل وصورت کی مالک چالیس سالہ عورت کو جب اس کا خوبرو تیس سالہ شوہر ''ہنی'' کہہ کر مخاطب کرے تو آپ مذکورہ عورت کی خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

''کیسی خوش خبری کامران؟'' نادرہ نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

''چند روز بعد میری کمپنی انویسٹ منٹ کی ایک نئی اسکیم لانچ کر رہی ہے۔'' کامران نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''لیکن اس اسکیم میں ہر کوئی اپنی رقم نہیں لگا سکے گا۔''

''کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں۔'' نادرہ کے لہجے میں الجھن در آئی۔

''مطلب یہ کہ اس اسکیم میں اپلائی تو کوئی بھی کرسکتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بس ایک سادہ سا فارم بھر کر جمع کرانا ہوگا لیکن صرف دس افراد کو اس اسکیم میں رقم لگانے کی اجازت دی جائے گی اور......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر ڈرامائی انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور ان دس خوش قسمت افراد کا فیصلہ قرعہ اندازی کی بنیاد پر ہوگا۔''

''ایسی کیا اسکیم ہے جو اتنی لمبی چوڑی احتیاط برتی جارہی ہے؟'' نادرہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''سنو گی تو پھڑک اٹھو گی۔'' کامران اس کے تجسس کو ہوا دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ بہت ہی خاص قسم کی اسکیم ہے۔ صحیح معنوں میں راتوں رات امیر بنا دینے والی۔''

''میں ضرور سننا چاہوں گی۔'' نادرہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ ''مجھے تفصیل سناؤ۔''

''اگر کوئی شخص صرف سو دن کے لیے ہماری کمپنی میں اپنا سرمایہ لگائے گا تو ٹھیک سو دن کے بعد اس کی رقم دوگنا ہوجائے گی۔'' کامران نے بتایا۔

''اوہ......'' نادرہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو واقعی بڑی زبردست اسکیم ہے۔''

''زبردست تو ہے مگر اس کے ساتھ ہی ایک مشکل بھی ہے......''

''کیسی مشکل؟'' کامران کی ادھوری بات کے جواب میں نادرہ نے سوال کیا۔

''اس اسکیم میں کم از کم بیس لاکھ کی انویسٹمنٹ کی شرط ہے۔'' کامران نے بتایا۔ ''جو سو دن کے بعد چالیس لاکھ روپے ہوجائیں گے۔ سو دن کے بعد رقم لگانے والا اگر چاہے تو چالیس لاکھ روپے کمپنی سے وصول کرلے اور اگر چاہے تو مزید سو دن کے لیے انویسٹ کر کے اس رقم کو اسّی لاکھ بنالے۔''

''واقعی، یہ اسکیم تو بہت ہی سنسنی خیز اور منافع بخش ہے۔'' نادرہ نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''مگر اس کے ساتھ قرعہ اندازی کا دم چھلا بھی تو لگا ہوا ہے نا......''

''اس دم چھلے کا توڑ ہے میرے پاس۔'' کامران نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' نادرہ نے استفسار کیا۔

''کمپنی میں میرا اتنا اثر رسوخ تو ہے کہ میں اپنا نام قرعہ اندازی میں بہ آسانی نکلوا سکتا ہوں۔'' کامران نے بتایا۔

''زبردست!'' نادرہ نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم اس اسکیم میں رقم لگانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہو؟''

''ہر عقل مند اور ذی شعور شخص اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں ضرور سوچے گا لیکن......''

''لیکن کیا؟'' کامران نے جملہ ادھورا چھوڑا تو نادرہ نے پوچھا۔

''لیکن یہ کام محض عقل اور شعور کے بل بوتے پر ہونے والا نہیں۔'' کامران بڑی صفائی سے اپنے مقصد کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''اس اسکیم میں حصہ لینے کے لیے بیس لاکھ نیٹ کیش کی بھی ضرورت ہے۔''

''اور تمہارے پاس بیس لاکھ نہیں ہیں۔'' نادرہ نے کہا۔ ''ہیں نا؟''

''میں زیادہ سے زیادہ ادھر ادھر سے پکڑ کر پانچ لاکھ روپے جمع کرسکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اس بزنس کے لیے مزید پندرہ لاکھ کی ضرورت ہوگی۔''

''بتاؤ، میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں کامران؟'' نادرہ نے وارفتگی کے عالم میں کہا۔

''تم بہت کچھ کرسکتی ہو۔'' وہ نادرہ کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہوں کہ کہیں تمہیں برا نہ لگ جائے۔''

''تمہاری کوئی بات مجھے بری نہیں لگ سکتی کامران۔ تم میری زندگی ہو، میرا سب کچھ ہو۔'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔ ''بتاؤ، کیا کرنا ہے؟''

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔'' کامران نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اگر اس آئیڈیا پر عمل کیا جائے تو پندرہ لاکھ روپے حاصل ہو سکتے ہیں۔''

''اور وہ آئیڈیا کیا ہے؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''ہم اس کوٹھی کو فروخت کر دیتے ہیں۔'' کامران نے اپنا ارادہ ظاہر کر ہی دیا۔

کامران کو یقین تھا کہ نادرہ اس کی بات سے انکار نہیں کر سکے گی۔ اس نے نادرہ کے دل و دماغ میں اترنے کے لیے بہت ''محنت'' کی تھی لہٰذا اب اس محنت کا پھل کھانے کا وقت آ گیا تھا۔

''یہ کوٹھی تمہاری کسی خواہش سے زیادہ اہم نہیں ہے کامران۔'' نادرہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ سوچنا ہوگا کہ ہم سو دن تک رہیں گے کہاں؟''

''یہ سوال میرے ذہن میں بھی تھا۔'' کامران چالاکی سے بولا۔ ''لہٰذا میں نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔''

''کیسا بندوبست؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''میرے ایک دوست کی فیملی تین چار ماہ کے لیے سعودی عرب جا رہی ہے۔'' وہ کمال ہوشیاری سے بولا۔ ''ان کی غیر موجودگی میں وہ گھر خالی رہے گا۔ تین کمروں کا صاف ستھرا گھر ہے۔ میں نے اپنے دوست سے اس سلسلے میں بات کر لی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ تین ماہ کے لیے اپنا گھر مجھے استعمال کرنے کے لیے دینے کو راضی ہے۔''

''تمہارے دوست کا گھر کس علاقے میں ہے؟'' نادرہ نے اپنی معلومات کی غرض سے پوچھا۔

''اچھرہ میں۔'' کامران نے بتایا۔ ''ادھر سلطان احمد روڈ پر گلاس فیکٹری کے نزدیک ہے یہ گھر۔''

نادرہ سوچ میں پڑ گئی۔ کامران نے کہا۔

''میں مانتا ہوں کہ اچھرہ والا وہ گھر شادمان کالونی والی اس کوٹھی کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا لیکن جانو...... صرف سو دن کی تو بات ہے۔ اس کے بعد چالیس لاکھ ہمارے ہاتھ میں ہوں گے تو ہم اپنی مرضی سے شہر کے کسی پوش علاقے میں عالیشان گھر خرید لیں گے۔ بس، چند روز تک تمہیں میرے ساتھ قدرے چھوٹے گھر میں رہنا ہوگا۔''

''بات چھوٹے اور بڑے گھر کی نہیں ہے کامران۔'' وہ محبت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں تمہارے ساتھ جنگل بیابان میں بھی رہ سکتی ہوں۔ تمہاری محبت میرے لیے کسی شاہی محل سے کم نہیں ہے۔ بس، میرے ذہن میں ایک خوف سا ہے۔''

''کیسا خوف؟'' کامران نے استفسار کیا۔

''بیس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔'' وہ اپنے خدشات کو نوکِ زبان تک لاتے ہوئے بولی۔ ''اگر خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو......''

''اس کا مطلب ہے، تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔'' کامران نے شاکی نظر سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔

''ایسا نہ کہو کامران!'' وہ تڑپ کر بولی۔ ''میری جان بھی تم پر قربان ہو۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''اصل میں یہ رقم ہم کمپنی میں لگائیں گے نا۔'' نادرہ نے دبی زبان میں کہا۔ ''اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو......؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''یہ انویسٹمنٹ کمپنی بہت مستحکم ہے۔ تمہیں باقاعدگی کے ساتھ کئی ماہ سے منافع مل رہا ہے نا...... اب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک سو دن کے بعد ہم چالیس لاکھ کے مالک بن جائیں گے اور...... دیکھ لینا، یہ تین ماہ پر لگا کر اڑ جائیں گے۔''

کامران کی بات نادرہ کی سمجھ میں آ گئی اور وہ اپنی کوٹھی فروخت کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ کامران نے اپنے رویّے سے نادرہ کے دل و دماغ کو اس طرح اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا کہ وہ اس کی ذات کے حوالے سے منفی انداز میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ رشتے میں کامران اس کا مجازی خدا تھا مگر وہ کامران کی فریبی محبت میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ حقیقی خدا سے زیادہ اس پر بھروسا کرنے لگی تھی اور...... اس نوعیت کے اندھے اعتماد کا جو انجام ہوتا ہے، نادرہ کے ساتھ بھی وہی ہوا۔

شادمان کالونی والی کوٹھی لگ بھگ پندرہ لاکھ میں فروخت ہو گئی اور وہ لوگ اچھرہ والے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ یہ واقعہ آج سے بہت سال پہلے کا ہے۔ مذکورہ کوٹھی کی قیمت آج کی مارکیٹ کے حساب سے کسی بھی طرح دس کروڑ سے کم نہیں ہوگی۔

اچھرہ والے مکان میں رہائش اختیار کیے انہیں لگ بھگ ایک ماہ ہو چکا تھا۔ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی۔ کامران نے نادرہ کے اطمینان کی خاطر دیوار گیر کیلنڈر

پر بولڈ مارکر کی مدد سے سودن کی تاریخوں کے گرد دائرے لگادیے تھے اور ایک سو ایک والے دن پر لکھا تھا...... جشنِ آزادی...... اور اتفاق سے یہ تاریخ تیرہ اگست تھی یعنی اگلے روز چودہ اگست کو پاکستان کا ''یومِ آزادی'' بھی تھا۔ اس سال وہ ڈبل جشنِ آزادی منانے والے تھے۔

نادرہ دن دن گن کر تیرہ اگست کا انتظار کررہی تھی کہ ایک روز اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس شام کامران دفتر سے گھر واپس نہیں آیا تو اسے تشویش ہوئی۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد جب اس کی تشویش پریشانی میں بدلنے لگی تو اس نے کمپنی کے آفس فون کیا مگر اس وقت تک آفس بند ہوچکا تھا۔ اس صورتِ حال نے اسے عجیب سی اذیت میں مبتلا کردیا۔ کئی بار اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ اپنے شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کامران کے کسی دوست کا اس کے پاس نمبر بھی نہیں تھا کہ وہ فون کرکے اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلیتی۔ وہ پوری رات اس نے اپنے گھر میں ٹہلتے ہوئے گزاردی۔

شادی کے بعد یہ پہلی رات تھی جو اس نے کامران کے بغیر بسر کی تھی۔ جب وہ لوگ اچھرہ والے مکان میں شفٹ ہوئے تھے تو کامران نے ایک پسٹل لاکر نادرہ کو دیا تھا۔

''یہ کس لیے ہے؟'' نادرہ پستول کو دیکھ کر بولی تھی۔

''نئی جگہ ہے، نئے لوگ ہیں لہٰذا تمہیں ڈر خوف محسوس ہوسکتا ہے۔'' کامران نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری حفاظت کے لیے ہے۔''

''اوہ...... تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔'' نادرہ ستائشی نظر سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مگر میں نے کبھی گن استعمال نہیں کی۔ اگر کبھی ضرورت پڑ بھی گئی تو میں اس پستول کو چلاؤں گی کیسے؟''

''اللہ نہ کرے کہ کبھی اس کے استعمال کی ضرورت پیش آئے۔'' کامران نے کہا۔ ''یہ حفظِ ماتقدم کے لیے ہے تاہم میں تمہیں پستول چلانا سکھا بھی دوں گا۔ ویسے یہ دکھانے سے بھی کام چل جاتا ہے۔ بعض لوگ تو کھلونا پستول سے چوری اور ڈکیتی کی بڑی بڑی وارداتیں کرڈالتے ہیں، یہ تو پھر بھی اصلی ہے۔ اگر تمہیں کبھی کسی بھی شخص سے کوئی خطرہ محسوس ہو تو تم فوراً پستول نکال لینا۔ وہ تمہارے ہاتھ میں گن دیکھتے ہی پسپا ہوجائے گا اور تم محفوظ رہوگی۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے نادرہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''چور، سانپ اور ہتھیار کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔ یہ اصلی ہوں یا نقلی، سامنے والے کے چھکے چھڑادیتے ہیں۔''

اس رات بھی مذکورہ پستول نادرہ کے پاس تھا لیکن کامران کے واپس نہ آنے کی پریشانی نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی جو اسے پستول کا خیال آتا۔ وہ مضطرب اور فکرمند تھی کہ اس کے شوہر کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے...... کہیں کامران کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا؟

وہ رات جیسے تیسے گزری۔ اگلی صبح وہ اس کے آفس پہنچ گئی اور یہاں آکر گویا اس پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ اسے بتایا گیا کہ کامران نے چند روز پہلے کمپنی کو چھوڑ دیا ہے۔ اسے کوئی اور اچھی جاب مل گئی تھی لہٰذا وہ کمپنی کو اپنا استعفا دے کر رخصت ہوگیا تھا اور اب اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کررہا ہے۔

اس صورتِ حال نے نادرہ کے دماغ کا فیوز اڑادیا۔ وہ کمپنی کے منیجر کے کمرے میں پہنچ گئی اور اسے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ منیجر نے توجہ سے اس کی بات سنی اور آخر میں افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''بی بی! اگر آپ بالکل سچ کہہ رہی ہیں تو پھر اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ آپ کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہمارے ریکارڈ میں تو یہ بھی نہیں ہے کہ کامران نے آپ سے شادی کی تھی۔ بہرحال، وہ ہماری کمپنی چھوڑ کر جاچکا ہے۔ اب اس سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''اور وہ بیس لاکھ کی انویسٹ منٹ......؟'' نادرہ نے مُردہ سے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا نا، کامران نے آپ کے ساتھ سنگین دھوکا کیا ہے۔'' منیجر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ہماری کمپنی نے ایسی کوئی اسکیم لانچ نہیں کی جس میں رقم لگانے سے سودن میں پیسے دوگنا ہوجاتے ہوں۔ اگر آپ کی کہانی سچی ہے تو پھر کامران نے آپ کو الو بنایا ہے البتہ آپ نے ابتدا میں ہماری کمپنی میں جو رقم انویسٹ کی تھی، اس پر آپ کو ہر ماہ باقاعدہ منافع ملتا رہے گا اور آپ جب چاہیں وہ رقم نکلوا بھی سکتی ہیں۔''

''میرے ساتھ فراڈ ہوا ہے اور آپ کی کمپنی کے ایک نمائندے نے مجھے دھوکا دیا ہے۔'' نادرہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ''میں پولیس کے پاس جاؤں گی۔''

''میڈم! پہلی بات تو یہ کہ کامران یہ کمپنی چھوڑ کر جاچکا ہے۔'' منیجر نے دوٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے

کہا۔ ”اب اس کا اس کمپنی کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ آپ کے ساتھ آپ کے شوہر نے فراڈ کیا ہے تو آپ بڑے شوق سے پولیس کے پاس جائیں اور اپنے شوہر کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں۔“

”مگر میں نے اپنی کوٹھی بیچ کر بیس لاکھ آپ کی کمپنی میں لگائے تھے۔“ نادرہ ٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ اتنی آسانی سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔“

”اگر آپ نے ”اوور نائٹ انویسٹرز“ کی کسی اسکیم میں بیس لاکھ کی خطیر رقم لگائی ہے تو آپ کے پاس اس انویسٹمنٹ کے ڈاکومینٹس بھی ہونا چاہئیں جیسا کہ آپ کی ابتدائی انویسٹمنٹ پر ڈاکومینٹس تیار کیے گئے تھے۔ لائیں دکھائیں مجھے وہ بیس لاکھ کی سرمایہ کاری کے کاغذات!“

”میرے پاس اس رقم کی سرمایہ کاری کے ثبوت کے طور پر ایک پرزہ بھی نہیں ہے۔“ نادرہ روہانسی ہوگئی۔ ”میں نے یہ رقم اپنی کوٹھی بیچ کر کامران کے ہاتھ میں دی تھی۔“

”تو پھر جا کر آپ کامران ہی سے بیس لاکھ کا حساب طلب کریں۔“ منیجر نے روکھے پھیکے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے بقول، وہ آپ کا شوہر ہے، تو اس تناظر میں یہ آپ لوگوں کا خانگی معاملہ ہے۔ ہماری کمپنی سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں نکلتا لہٰذا آپ میرا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔ مجھے اور بھی بہت سارے ضروری کام ہیں۔“

نادرہ کا ذہن بار بار چیخ رہا تھا کہ کامران اسے چونا لگا کر رفوچکر ہو چکا ہے مگر دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دل کے نزدیک ”اوور نائٹ انویسٹرز“ کا منیجر بھی جھوٹا تھا۔ کامران نے ابھی جاب بھی نہیں چھوڑی تھی اور اس نے پوری دنیا کو اپنی شادی کے بارے میں بھی بتا رکھا تھا اور...... یہ کہ وہ کسی ایسی مصیبت میں گرفتار تھا کہ نادرہ کے پاس نہیں آسکتا تھا۔

نادرہ کو اس کا دل جو یقین دہانیاں کرا رہا تھا اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہ اس کی محبت کا اعجاز تھا جو وہ کامران سے کرتی تھی۔

شاید اسی لیے محبت کو اندھی کہا جاتا ہے کہ یہ عقل پر تالا ڈال دیتی اور منطق کا منہ بند کر دیتی ہے اور...... نادرہ نے ٹوٹ کر کامران سے محبت کی تھی۔ محبت میں عقل اور منطق کا کوئی عمل دخل نہیں۔

چند روز بعد نادرہ کی محبت پر اس وقت ایک کاری چوٹ پڑی جب ایک شخص نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا۔

”کامران صاحب کہاں غائب ہیں؟“

”آپ کون؟“ نادرہ کے لیے وہ شخص اجنبی تھا لہٰذا وہ اس کے سامنے اپنی پتا نہیں رکھ سکتی تھی۔ ”آپ کو کامران سے کیا کام ہے؟“

”بی بی! آج اس مہینے کی دس تاریخ ہوگئی ہے۔“ اس شخص نے بتایا۔ ”ابھی تک کرایہ نہیں پہنچا جبکہ میں نے کامران صاحب پر یہ بات واضح کردی تھی کہ ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو ہر صورت کرایہ ادا کرنا ہوگا۔“

نادرہ کو یہ سمجھنے میں چنداں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس مکان کے سلسلے میں بھی کامران نے اس کے ساتھ سنگین نوعیت کی غلط بیانی کی تھی۔ یہ مکان اس کے کسی دوست کا نہیں بلکہ کرائے کا تھا اور مالکِ مکان اس وقت اس کے سامنے کھڑا تھا اور کرائے کا تقاضا کر رہا تھا۔

چاہے کچھ بھی تھا لیکن نادرہ کو اپنی محبت کی توہین گوارا نہیں تھی۔ اس نے اپنے اندرونی بھونچال پر جیسے تیسے قابو پایا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں بہت معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو کرائے کے لیے میرے دروازے تک آنا پڑا۔ اصل میں، کامران چند روز سے لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ کرائے کے بارے میں مجھے بتانا بھول گئے ہوں گے۔ بہرحال، میں کل آپ کو کرایہ دے دوں گی۔“

مالکِ مکان شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگیا۔

اس نئے ہولناک انکشاف نے نادرہ کو اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بند کمرے میں رونے لگی تاکہ اس کی محبت کی رسوائی کی داستان اس مکان کے در و دیوار سے باہر نہ جاسکے۔

کرایہ ادا کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پیسے رہتے تھے۔ ”اوور نائٹ“ سے ماہانہ اتنا منافع مل جاتا تھا کہ وہ مذکورہ مکان کا کرایہ ادا کرنے کے ساتھ ہی بڑے اچھے انداز میں گزر بسر کرسکتی تھی۔ مسئلہ معاش کا نہیں تھا۔ مسئلہ تو اعتماد اور بھروسے کا تھا۔ اس نے جس شخص کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنی عزت و آبرو، جان و مال سب کچھ اس پر نچھاور کر دیا تھا، وہی قدر ناشناس اس کی وفا اور محبت کو پاؤں تلے روند کر چلا گیا تھا۔ یہ اتنا بڑا دکھ، اتنا عظیم سانحہ تھا کہ وہ کسی کے سامنے اپنے درد کو بیان بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے اعتماد کا خون کرنے والا اب اس کی دسترس میں نہیں تھا۔

بہت سوچ بچار اور کرب کی منزلوں سے گزر کر نادرہ نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ خود پر گزرنے والی قیامت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی اور اسی گھر میں رہتے

ہوئے کامران کا انتظار کرے گی۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ کامران ضرور واپس آئے گا۔

☆☆☆

نادرہ کا کیس شاکر علی کے توسط سے مجھ تک پہنچا تھا اور یہ شاکر علی کسی صفدر علی کا رشتے دار تھا جو کبھی شادمان کالونی لاہور میں نادرہ کا پڑوسی تھا۔ بعدازاں کامران سے شادی کرکے نادرہ شادمان کالونی سے اچھرہ کے علاقے میں شفٹ ہوگئی تھی۔ شاکر علی نے ایک بار نادرہ اور کامران کو میاں بیوی کی حیثیت سے لاہور میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے عزیز صفدر علی سے ملنے لاہور گیا ہوا تھا۔

شاکر علی ایک ریسٹورنٹ کا مالک تھا۔ اس کا عالی شان ریسٹورنٹ طارق روڈ پر لبرٹی چوک کے قریب واقع تھا۔ اپنے اسی ریسٹورنٹ میں ایک روز شاکر علی نے کامران کو ایک نوخیز دوشیزہ کے ساتھ دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ چالیس سالہ واجبی سی شکل وصورت کی مالک نادرہ کو کامران کی بیوی کی حیثیت سے جانتا تھا اور اب وہی کامران ایک پچیس سالہ خوبرو حسینہ کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا راز و نیاز میں مصروف تھا۔ اس بدلاؤ نے شاکر علی کو الجھا دیا تھا۔

انسانی نفسیات ہے کہ جب کوئی چیز اس کے ذہن کو الجھا دے تو وہ اپنی اس الجھن کی سلجھن کے لیے ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ اسی رات شاکر علی نے اپنے عزیز صفدر علی کو فون کیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد شاکر علی نے پوچھا۔ ''یار صفدر! آپ کے پڑوس میں ایک خاتون رہتی تھیں نا جنہوں نے کسی جوان مرد سے شادی کرلی تھی......!''

''ہاں......تم نادرہ کی بات کررہے ہو نا۔'' صفدر علی نے کہا۔

''جی بالکل۔'' شاکر علی نے مضبوط لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''نادرہ کیسی ہیں؟ کیا وہ اب بھی تمہارے پڑوس میں آباد ہیں؟''

''نہیں......'' صفدر علی نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ شادی کے چند روز بعد ہی اپنی کوٹھی بیچ کر شہر کے کسی اور علاقے میں شفٹ ہوگئی تھیں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''سب خیریت تو ہے نا......تم اچانک نادرہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اللہ کرے خیریت ہی ہو۔'' وہ ذومعنی لہجے میں بولا۔ ''مگر مجھے کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ شاکر علی؟'' صفدر علی پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

جواب میں شاکر علی نے صفدر علی کو کامران اور اس کی ساتھی دوشیزہ کے بارے میں تفصیلاً بتادیا۔ پوری بات سننے کے بعد صفدر علی نے کہا۔

''مجھے تو پہلے ہی یہ شخص کامران کافی مشکوک سا لگا تھا۔ میں نے دبی زبان میں نادرہ کو اس سے شادی سے باز رہنے کے لیے بھی کہا تھا۔ مرحوم ملک وحید کے ساتھ میرا اچھا وقت گزرا تھا۔ وہ گلبرگ میں بیٹھتا تھا اور میں نے ٹیمپل روڈ پر جیولری کی دکان کھول رکھی ہے۔ جب مجھے نادرہ کی کامران سے شادی کی اطلاع ملی تو اسی وقت مجھے دال میں کچھ کالا محسوس ہوا تھا لیکن ظاہر ہے، میں کھل کر اس شادی کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا لہٰذا چپ ہو رہا پھر چند روز بعد نادرہ نے اپنی کوٹھی بیچ دی اور کسی اور علاقے میں چلی گئی۔''

''صفدر علی! میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ نادرہ کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوگئی ہے۔'' شاکر علی نے تشویش میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا کسی طرح تم نادرہ سے رابطہ کرسکتے ہو؟''

''اگر میں کوشش کروں تو اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔'' صفدر علی نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

''پلیز......یہ کوشش فوری ہی کرڈالیں۔'' شاکر علی نے کہا۔ ''اس دوران میں، میں کامران کا حدود اربعہ اور تازہ ترین سرگرمیوں کا سراغ لگاتا ہوں۔''

چند روز بعد وہ دونوں ایک مرتبہ پھر نادرہ اور کامران کے موضوع پر خاصی سنجیدہ گفتگو کررہے تھے۔ دونوں کے پاس ایک دوسرے کو بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس بار بھی ان کی بات ٹیلی فون پر ہی ہو رہی تھی۔

صفدر علی نے نادرہ کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ نادرہ سے ملاقات پر کامران کے فراڈ کی کہانی بھی صفدر علی تک پہنچ گئی تھی۔ صفدر علی نادرہ کو اپنے ساتھ اپنی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ دوسری جانب شاکر علی نے کامران کی کنڈلی نکال لی تھی۔ کامران، نادرہ کو لوٹنے کے بعد لاہور سے کراچی آگیا تھا۔ یہاں اس نے بہادرآباد کے علاقے میں ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کی اور چاول کے بیوپاری کی حیثیت سے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ لوگوں کو اس نے یہی بتا رکھا تھا کہ وہ اندرونِ سندھ اور اندرونِ پنجاب سے چاول خرید کر کراچی کی غلہ مارکیٹ میں فروخت کرتا ہے۔ شاکر علی نے اس طرح دار حسینہ کا کھوج بھی لگا لیا تھا جسے اس نے پہلی

مرتبہ کامران کے ساتھ ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ اس لڑکی کا نام فوزیہ تھا اور...... وہ کامران کی بیوی تھی۔ ان کی شادی کچھ عرصہ پہلے ہی ہوئی تھی اور اس سے بھی سنسنی خیز انکشاف یہ کہ چند روز میں کامران اور فوزیہ امریکا شفٹ ہونے والے تھے۔

''وہ کمینہ کب امریکا جارہا ہے؟'' صفدر علی نے استفسار کیا۔ ''میں اسے ایسے نہیں جانے دوں گا۔ اس نے نادرہ کو نہ صرف دھوکا دیا ہے بلکہ اس کی کوٹھی بیچ کر لاکھوں روپے ہڑپ کر گیا ہے۔''

''وہ دو دن بعد یہاں سے پرواز کر جائے گا۔'' شاکر علی نے بتایا۔ ''میں نے اپنے ایک خاص آدمی کو سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا یا ہوا ہے۔ وہ سنڈے کی رات جہاز پر سوار ہوگا لیکن جہاں تک لاکھوں روپے کی رقم کا تعلق ہے تو وہ سارا اماؤنٹ کامران اور فوزیہ کے روانہ ہونے سے پہلے ہی امریکا بھیجا جا چکا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' صفدر علی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''میری معلومات کے مطابق کامران نے چند روز پہلے اپنا سارا سرمایہ ہنڈی کے ذریعے نیویارک کے ایک اسٹاک بروکر کے نام یہاں سے امریکا بھیج دیا ہے۔''

''اوہ......'' صفدر علی نے ایک گہری سانس لی۔ ''گویا اب ہمارے ہاتھ میں صرف یہ کامران ہی ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اسے فوزیہ کے ساتھ امریکا جانے سے روک سکتے ہیں۔''

''بالکل، یہ ممکن ہے۔'' شاکر علی نے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے نادرہ کا یہاں کراچی میں ہونا ضروری ہے۔ کیا آپ اسے ایک آدھ دن میں یہاں میرے پاس پہنچا سکتے ہیں؟''

''میں یہ کر سکتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔'' صفدر علی نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''چوبیس گھنٹے کے بعد نادرہ تمہارے پاس ہوگی۔ پیسے تو گئے۔ ہم اس خبیث ہی کو پکڑ لیں تو کافی حد تک یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کیا تم کراچی میں اس معاملے کو آسانی سے ہینڈل کر لو گے؟''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔'' شاکر علی نے کہا۔ ''میں سب دیکھ لوں گا۔ بس آپ نادرہ کو کسی بھی طرح سنڈے کی دوپہر تک میرے پاس پہنچا دیں۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔''

ہنڈی یا حوالہ کے ذریعے بھاری رقوم کو ایک ملک سے دوسرے ملک ٹرانسفر کرنا بہت پرانا طریقہ ہے۔ اگرچہ یہ دھندا غیر قانونی کے زمرے میں آتا ہے لیکن یہ کام نہایت ایمان داری سے کیا جاتا ہے تاہم نائن الیون کے واقعے کے بعد سے ہنڈی کے حوالے سے خاصے سخت بین الاقوامی قوانین بنائے گئے ہیں لہٰذا یہ کام خاصا کم ہو گیا ہے اور جتنا بھی ہو رہا ہے، نہایت ہی احتیاط اور رازداری کے ساتھ جاری ہے۔ آج کل اسے ''منی لانڈرنگ'' کا ٹائٹل دے دیا گیا ہے۔

شاکر علی نے بہت اچھا ہوم ورک کر رکھا تھا لہٰذا جب نادرہ کراچی پہنچی تو وہ فوراً حرکت میں آ گیا۔ شاکر کی معلومات کے مطابق کامران اور فوزیہ کو سنڈے کی رات دس بجے اپنے فلیٹ سے نکلنا تھا۔ یہاں سے وہ سیدھا ائرپورٹ کا رخ کرتے پھر وہ دونوں نصف شب کے آس پاس امریکا کے لیے پرواز کر جاتے۔ امریکا میں عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کے لیے ایک تگڑی رقم نیویارک ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ نادرہ کے اعتماد کو دھوکا دینے کے علاوہ کامران نے اس سے لگ بھگ پندرہ لاکھ روپے بتھیا لیے تھے۔ یہ تو ایک کیس تھا۔ وہ ہتھے چڑھتا تو پتا چلتا کہ اس کمبخت نے اور کہاں کہاں اور کیا کیا گل کھلا رکھے تھے۔

شاکر علی چونکہ ریسٹورنٹ لائن کا بندہ تھا لہٰذا ہر قسم کے لوگوں سے اس کا ملنا جلنا رہتا تھا۔ اس نے اس مشن کے لیے اپنے ایک دو مستعد جاننے والوں کو پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا چنانچہ قبل اس کے کہ کامران فوزیہ کے ہمراہ بہادر آباد والے فلیٹ سے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوتا، شاکر علی، نادرہ اور اپنے بندوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔

یہ بہادر آباد کا بارونق کمرشل علاقہ تھا۔ شاکر علی کی معلومات کے مطابق وہ فلیٹ کامران نے کرائے پر لے رکھا تھا اور اب وہ یہاں سے اپنے پرسمیٹ کر ہزاروں میل دور ایک نئے آشانے کی جانب کوچ کرنے والا تھا۔ جب یہ لوگ کامران کی گلی میں داخل ہوئے تو اپارٹمنٹس بلڈنگ کے نیچے ایک ٹیکسی کھڑی دکھائی دی جو یقیناً کامران اور فوزیہ کو لے کر ائرپورٹ جانے والی تھی۔ اگلے ہی لمحے بلڈنگ کی سیڑھیوں سے کامران باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جبکہ اس کے عقب میں فوزیہ ایک چھوٹا سفری بیگ اٹھائے دکھائی دی۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کی ڈکی کھول دی تاکہ کامران اپنے سامان کو ڈکی میں رکھ سکے۔ اسی لمحے شاکر علی اپنے بندوں کے ہمراہ کامران کی جانب بڑھا۔ نادرہ کو گاڑی کے اندر بیٹھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ نادرہ نے خود کو

چھپانے کے لیے ایک بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

کامران نے تین افراد کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ شاکر علی نے اس کے سامنے پہنچ کر سپاٹ لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ کامران صاحب ہیں نا؟''

''جی!'' کامران نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''آپ کون؟''

شاکر نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے فوزیہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ غالباً آپ کی بیوی ہیں اور لگتا ہے، آپ لوگ کسی طویل سفر پر روانہ ہونے والے ہیں؟''

''جی، آپ کا اندازہ درست ہے۔'' کامران نے بدستور الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''ہم لوگ کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر جارہے ہیں مگر...... آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟''

''ہم خدائی فوجدار ہیں۔'' شاکر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''بچھڑے ہوئے لوگوں کو آپس میں ملانا ہمارا نصب العین ہے اور ہم اسی غرض سے آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''مم...... مگر...... میرا تو کوئی بچھڑا ہوا نہیں ہے......'' کامران نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''مجھے کسی سے نہیں ملنا...... پلیز، آپ میرا وقت برباد نہ کریں۔ ہمیں ائرپورٹ جانے میں دیر ہوگئی تو ہماری فلائٹ نکل جائے گی۔''

''فلائٹ تو یقیناً نکل جائے گی مسٹر کامران!'' شاکر علی نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''امریکا جانے کا خیال ذہن سے نکال دیں اور اس شخصیت سے ملیں جو آپ سے ملنے کے لیے طویل سفر کرکے یہاں پہنچی ہے......''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' کامران جھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

شاکر نے نادرہ کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی سے باہر نکل آئے پھر وہ کامران کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

''یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو تم پر بجلی بن کر گرے گی اور تمہارے حواس کی ایسی کم تیسی کرکے رکھ دے گی۔''

اس دوران میں نادرہ گاڑی میں سے نکل کر کامران کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ اس کا جسم چادر میں لپٹا ہوا تھا تاہم چہرہ پوری طرح کھلا تھا اور...... نادرہ پر نگاہ پڑتے ہی کامران کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی تھی۔

''یہ تمہاری بچھڑی ہوئی بیوی ہے یا تم اس کے بچھڑے ہوئے شوہر ہو، یہ فیصلہ تو بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔'' شاکر علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''فی الحال مسئلہ یہ درپیش ہے کہ ہم تمہیں نادرہ کے لاکھوں روپے لوٹ کر اور اس کے اعتماد کا خون کرکے امریکا نہیں جانے دیں گے۔ تم یہاں سے ائرپورٹ نہیں بلکہ سیدھے حوالات میں پہنچو گے۔''

''یہ کیا بے ہودگی ہے۔'' کامران ٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے ایسا مذاق ہرگز پسند نہیں ہے۔''

صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوزیہ آگے بڑھی پھر نادرہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے تیز لہجے میں کامران سے استفسار کیا۔ ''کیا یہ عورت تمہاری بیوی ہے؟''

''بالکل نہیں......'' وہ کمال ڈھٹائی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں...... میں تو آج اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔''

پہلے اعتماد کا خون پھر پندرہ بیس لاکھ کی ڈز اور اب پہچاننے سے انکار...... اس صورت حال نے نادرہ کے ذہن کے پرخچے اڑا دیے۔ اس کے وجود پر ایک لرزہ سا طاری ہوگیا۔ اس کے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جس نے اسے محبت کا فریب دے کر نہ صرف مال وجائداد سے محروم کردیا تھا بلکہ اسے دربدر کرکے اسی سے لوٹی ہوئی دولت کے بل بوتے پر وہ اپنی نوعمر بیوی کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی گزارنے امریکا جارہا تھا۔

نادرہ کا دماغ الٹ گیا۔ اچانک اس نے چادر اتار پھینکی اور بجلی ایسی سرعت کے ساتھ اس نے اپنے پرس میں سے ایک خطرناک پستول برآمد کیا اور آن واحد میں اس نے کامران پر یکے بعد دیگرے تین فائر کردیے۔

شاکر علی اینڈ کمپنی اس قسم کی سچویشن کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ سب کچھ چشم زدن میں رونما ہوگیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ لوگ نادرہ کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے، وہ اپنا کام کرچکی تھی۔

کامران اپنے دفاع میں کچھ نہ کرسکا اور گولیاں کھانے کے بعد کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند گرا اور زمیں بوس ہوگیا۔ وہ اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا۔ نادرہ نے پستول کو اس کی لاش پر پھینکا اور خواب ناک لہجے میں بولی۔

''کامران! تم مجھے نہیں جانتے نا...... آج کے بعد میں بھی تمہیں نہیں جانتی۔ یہ پستول تم ہی نے مجھے لاکر دیا تھا تاکہ

میں اپنی حفاظت کرسکوں...... دیکھو لو، آج کس طرح میں نے اپنی حفاظت کی ہے...... ایک لٹیرا میرا اعتماد، میری دولت، میری جائداد اور...... سب سے بڑھ کر میری محبت لوٹ کر امریکا فرار ہو رہا تھا...... میں نے اسے ختم کر ڈالا......''

پھر وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اسے اپنے کیے کا افسوس تھا یا وہ اپنی مرحوم محبت کا ماتم کر رہی تھی، یہ آنسو بڑے بے زبان ہوتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا، خونِ جگر کس کے لیے آنکھوں سے بہہ گیا۔

کراچی کے باسی بخوبی آگاہ ہیں کہ بہادر آباد کمرشل ایریا کس قدر مصروف اور بارونق ہے اور رات کے دس بجے وہاں کیسی گہما گہمی ہوتی ہے۔ فائرنگ کی آواز نے کئی افراد کو اس جانب متوجہ کر دیا تھا اور بعض نے تو نادرہ کو گولیاں چلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ فائرنگ کی آواز، قریب سے گزرنے والی ایک پولیس موبائل تک بھی پہنچی چنانچہ نادرہ کی گرفتاری فوراً عمل میں آ گئی اور اس واردات کے عینی شاہد بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کی گواہی سراسر نادرہ کے خلاف تھی۔

شاکر علی نے تمام کہانی بیان کرنے کے بعد خاموشی اختیار کی تو میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''خاصا مشکل کیس ہے......!''

''اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کافی مشکل پسند ہیں۔'' اس نے میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کس سے پتا چلا ہے؟''

''مظہر صدیقی صاحب سے۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''صدیقی صاحب سے میری دیرینہ دوستی ہے۔ اگر یہ کوئی سیدھا سادہ کیس ہوتا تو کسی بھی رنگروٹ وکیل کی خدمات حاصل کی جاسکتی تھیں۔ صدیقی صاحب نے آپ کی جتنی تعریف کی ہے، اس کے پیشِ نظر ہی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''ہوں......'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''نادرہ کا کیا حال ہے؟''

''وہ اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہے۔'' شاکر علی نے بتایا۔ ''پولیس نے سات دن کا ریمانڈ لے رکھا ہے جس میں سے دو دن گزر چکے ہیں۔''

''نادرہ نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اس واقعے نے نادرہ کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ عجیب سی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتی ہے یا پھر زیادہ تر خاموش ہی رہتی ہے۔ نظر یہی آ رہا ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ میں وثوق سے نہیں بتا سکتا کہ اس نے پولیس کو کیا بیان دیا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں یہ کیس لینے کو تیار ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اگر نادرہ کا ذہنی توازن ٹھکانے نہیں تو یہ بات اس کے حق میں جاتی ہے۔ اگر عدالت میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ وقوعہ کے روز شدید غیظ کے باعث اپنے حواس کھو بیٹھی تھی تو اس کا فعل قتلِ عمد کے زمرے میں نہیں آتا چنانچہ اس کی سزا میں حتی الامکان کمی کے لیے کوشش کی جاسکتی ہے۔''

''شکریہ بیگ صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے میرے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔''

''جی فرمائیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں چاہتا ہوں، اگلی پیشی سے پہلے آپ حوالات جاکر نادرہ سے ایک ملاقات کرلیں۔'' اس نے کہا۔

''ضرور، یہ تو مجھے کرنا ہی ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آج میری کچھ مصروفیات ہیں۔ آپ کل آجائیں پھر نادرہ سے ملنے چلتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک۔'' وہ تشکرانہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''شاکر صاحب! آپ بھی اپنے عزیز صفدر علی کی مدد سے وہ تمام دستاویزی ثبوت یہاں منگوالیں جو نادرہ کے کیس کے سلسلے میں کوئی اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مثلاً نادرہ اور کامران کا نکاح نامہ، اور ونائٹ انویسٹرز کے ساتھ نادرہ کے معاملات کی دستاویزات اور رسیدیں وغیرہ۔''

''جی، میں سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں یہ سب کرلوں گا بلکہ میں کامران اور نادرہ کی شادی کے گواہوں میں سے کسی کو بھی اسٹینڈ بائی رکھوں گا اور اس مالک مکان سے بھی رابطہ کروں گا جس سے کامران نے اچھرہ والا مکان کرائے پر لیا تھا۔''

''گڈ......!'' میں نے سراہنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

اس نے میری فیس ادا کی اور اگلے دن حاضر ہونے کا

وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں شاکر علی کے ساتھ متعلقہ تھانے جا کر حوالات میں نادرہ سے ملا۔ ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں کسی ملزم سے ملاقات کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا پڑتا ہے، اس کا ذکر پہلے بھی کئی مرتبہ کیا جا چکا ہے۔

نادرہ کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ ابھی تک میں نے اس کا ذکر ہی سنا تھا۔ یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ واجبی سی شکل و صورت کی مالک ایک فربہ اندام عورت تھی۔ ایک ہینڈسم اور اسمارٹ تیس سالہ مرد کسی لالچ کے بغیر ایسی عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ کامران نے یہ شادی سوچ سمجھے منصوبے کے تحت کی تھی۔

نادرہ کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے جیسے دو تین راتوں سے مسلسل جاگ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر بھی ویرانی اور ناامیدی کا راج تھا۔ جب ہم اس کے سامنے پہنچے تو وہ سپاٹ نظر سے ہمیں دیکھنے لگی۔

''نادرہ!'' شاکر علی نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ میں نے آپ کا کیس ان کے حوالے کر دیا ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بہت قابل اور تجربہ کار وکیل ہیں۔ یہ تمہیں باعزت بری کروا لیں گے۔''

نادرہ نے خالی خالی نظر سے مجھے دیکھا اور خواب ناک لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''وکیل صاحب! آپ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں کیا؟ مگر...... اب مجھ سے شادی کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس کوٹھی رہی ہے، نہ مال و دولت اور نہ ہی میرے دل میں کسی کے لیے محبت باقی ہے۔ یہ ساری چیزیں تو کامران لے گیا......''

''ہوش میں آؤ نادرہ!'' شاکر علی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ وکیل صاحب آپ کا مقدمہ لڑیں گے اور آپ کو باعزت چھڑوا کر لے جائیں گے۔''

''کیا پولیس والے مجھے جانے دیں گے؟'' وہ بے یقینی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مگر یہ تو کہہ رہے تھے، زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ بس ذرا سا جھٹکا لگتا ہے اور پانچ دس منٹ میں جان نکل جاتی ہے۔''

اس کا مطلب ہے، پولیس والوں نے اسے پھانسی سے ڈرانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے پیچھے یقیناً ان کا کوئی مقصد ہوگا۔ وہ سخت دہشت زدہ تھی اور شاید پھانسی کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھی تھی اور اسی دہشت نے اس کے حواس کا بیڑا غرق کر ڈالا تھا۔

''نادرہ صاحبہ!'' میں نے نہایت ہی نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''پولیس والے بکواس کرتے ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ لوگ اپنی کمائی کے چکر میں اسی طرح ملزموں کو ڈراتے دھمکاتے رہتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''پولیس والوں نے آپ سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ تو نہیں کیا؟''

''یہ کہتے ہیں کہ اگر میں انہیں دو لاکھ دے دوں تو میری گردن بچ جائے گی۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''مگر میں کہاں سے دوں دو لاکھ۔ اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ کامران لوٹ کر لے گیا......''

اس کی سوئی بار بار کامران پر آ کر رک جاتی تھی اور اس کا بڑا مضبوط، بڑا سنگین سبب تھا۔ اس ظالم انسان نے نادرہ کی زندگی تباہ و برباد کر کے رکھ دی تھی۔

''میری بات غور سے سنیں نادرہ صاحبہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تو آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اگر ہوں بھی تو پولیس والوں کو ایک روپیہ نہیں دینا۔ یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں آپ کے کیس کو سمجھ گیا ہوں۔''

''اچھا جی......'' وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''آپ کیا سمجھے ہیں؟''

اس کا سوال کرنا میرے لیے باعث اطمینان تھا۔ گویا میں اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ اس کیس میں میری ابتدائی کامیابی تھی۔ میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ کامران کی موت آپ کے ہاتھوں ہوئی ہے لیکن آپ نے جن حالات میں اس شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا، وہ فطرت کے عین مطابق تھا۔ آپ کے اس فعل پر آپ کو پھانسی کی سزا نہیں ہو سکتی۔''

پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں مجھے زندگی کی رمق نظر آئی۔ گویا وہ دہشت کی کیفیت سے رفتہ رفتہ باہر نکل رہی تھی۔ اس کی امید بھری سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں......؟''

یہ بھی ایک مثبت علامت تھی کہ وہ اپنی زندگی کے معاملے میں دلچسپی لے رہی تھی۔ میں نے بہ دستور نرم لہجے

میں کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں۔ کامران نے قدم قدم پر آپ سے جھوٹ بولا اور آپ کو دھوکا دیا، یہاں تک کہ آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا...... ہیں نا؟''

''جب اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کیا تو میرا دماغ گھوم گیا تھا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اور شدید قسم کے طیش نے آپ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا تھا۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے جو کچھ بھی کیا، اس میں آپ کے ارادے کو دخل نہیں۔ بس وہ سب کچھ بے اختیار، خودکار انداز میں ہو گیا تھا۔''

''جی...... جی ہاں......'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''بس تو اب آپ میری بات کو دھیان سے سنیں۔'' اس کی ہمت بندھانے کی غرض سے میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میری ساری عمر قانون کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے اور پیچیدہ کیس لڑتے گزری ہے۔ یاد رکھیں کہ ہر قتل کی سزا موت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی حرکتوں سے اس قدر مشتعل کر دے کہ دوسرے شخص کی برداشت جواب دے جائے اور اسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہے اور اسی بے قابوپن میں دوسرا شخص پہلے شخص پر حملہ آور ہو جائے اور اسے کوئی ضرر پہنچانے کی کوشش کرے جس کے نتیجے میں پہلے شخص کی موت واقع ہو جائے تو قانون کی زبان میں اسے قتلِ عمد نہیں کہتے۔ اس صورت میں قانون پہلے شخص کی ہلاکت پر دوسرے شخص کو موت کی سزا نہیں دیتا۔''

اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ متوقع نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''اچھا...... ایسا بھی ہو سکتا ہے؟''

''بالکل...... جو قانون کی کتابوں میں لکھا ہے، میں نے آپ کو وہی بتایا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کہیں آپ مجھے جھوٹی تسلی تو نہیں دے رہے؟'' وہ تصدیق طلب نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''نہیں......'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے کلائنٹس کے ساتھ غلط بیانی نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں جھوٹی تسلیاں دیتا ہوں۔ جو حقیقت تھی، وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔''

وہ تشکرانہ انداز میں باری باری مجھے اور شاکر علی کو دیکھنے لگی۔

شاکر علی نے کہا۔ ''نادرہ! آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ صفدر علی وکیل صاحب سے ہر ممکنہ تعاون کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ اگلی پیشی پر آپ کی ضمانت ہو جائے گی۔''

''میں کس منہ سے آپ کا اور صفدر بھائی کا شکریہ ادا کروں۔'' اس کی آواز بھیگ گئی۔ ''آپ لوگ اپنوں سے بڑھ کر میری مدد کر رہے ہیں۔''

''شکریہ ادا کرنے کے لیے ابھی بڑی عمر پڑی ہے۔'' شاکر علی نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال آپ وکیل صاحب سے تعاون کریں اور بیگ صاحب جو بھی پوچھیں، انہیں بتا دیں۔''

نادرہ نے آنسو پونچھے اور میری جانب متوجہ ہو گئی۔ اب وہ بالکل نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس سے چند ضروری سوالات کیے پھر وکالت نامے اور دیگر اہم کاغذات پر اس کے دستخط لینے کے بعد اسے ''پتے کی باتیں'' ذہن نشین کرائیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔

دو روز بعد سانولے رنگ کا ایک شخص میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ اس نے آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا اور چہرے کے تاثرات سے خاصا ٹیڑھا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور پوچھا۔

''جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''خدمت تو میں آپ کی کرنے آیا ہوں۔'' وہ بھونڈے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس کے لیے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''کیسا تعاون...... میں کچھ سمجھا نہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''پانچ لاکھ کی ایک ڈیل ہے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ایک لاکھ آپ کے ہوئے۔''

''بھائی صاحب! شاید آپ کسی غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک وکیل ہوں اور لوگوں کے کیس عدالت میں لڑتا ہوں۔ یہی میرا پیشہ ہے۔ اس کے سوا میرا اور کوئی کاروبار نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں جناب...... بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جس ڈیل کا ذکر کیا ہے وہ بھی ایک کیس کے سلسلے ہی میں ہے۔''

''کس کیس کے سلسلے میں؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''جناب! میں اس کیس کی بات کررہا ہوں جس میں ایک بیوی نے بیچ بازار اپنے شوہر کے جسم میں تین گولیاں اتار کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ نادرہ کے کیس کا حوالہ دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے اس کیس کو؟''

''وکیل صاحب! میری معلومات کے ذرائع بڑے باوثوق ہیں اور پولیس کے حلقے میں بھی میرا اچھا خاصا اثر رسوخ ہے۔'' مجھے مرعوب کرنے کے لیے وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ اس بیوہ کا کیس آپ نے پکڑ لیا ہے۔''

''آپ کو بالکل درست پتا چلا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کی تعریف اور اس کیس میں اتنی گہری دلچسپی کا سبب؟''

''میرا نام عدنان ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور میں مقتول کامران کا بڑا بھائی ہوں۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ میرے پاس کوئی ڈیل کرنے آئے ہیں؟''

''جی بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس عورت نے جو کچھ کیا ہے، اس کی سزا میں وہ پھانسی چڑھ جائے گی اور میں چاہتا ہوں، آپ اسے سمجھائیں۔''

''مثلاً...... کیا سمجھاؤں؟'' میں بلی کو تھیلے سے باہر لانے کے لیے اس کی باتوں میں دلچسپی ظاہر کرنے لگا۔

''دیکھیں وکیل صاحب! میرا بھائی تو اب واپس آنہیں سکتا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر وہ عورت مک مکا کے لیے تیار ہو جائے تو میں اپنے بھائی کا خون معاف کرنے کو تیار ہوں۔''

''ہوں......'' میں نے اپنے چہرے سے تاثر دیا جیسے اس کی بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔ ''مثلاً آپ کس قسم کا مک مکا چاہتے ہیں؟''

''شریعت کی اصطلاح میں اسے دیت کہتے ہیں۔''

وہ گویا میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر وہ عورت خوں بہا کے ڈیل میں مجھے پانچ لاکھ ادا کر دے تو میں اس رقم میں سے ایک لاکھ روپے آپ کو دے دوں گا۔ اس طرح ہم سب مل کر اس کیس کو عدالت کے باہر ہی رفع دفع کر دیں گے۔''

''چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ!'' میں نے دل میں یہ محاورہ دہرایا۔ وہ گھٹیا شخص اپنے مردہ بھائی کے پیسے کھرے کرنے آیا تھا۔ اس کی پیشکش سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''مسٹر عدنان! آپ کے بھائی نے اس بے چاری عورت کے ساتھ کیا کم زیادتیاں کی ہیں جو اب آپ اس کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا کے قہر سے ڈریں۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''آپ کو وکیل کے بجائے کوئی مولوی ہونا چاہیے تھا۔ میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو اب آپ خود ہی بھگتیں۔''

وہ در پردہ مجھے دھمکانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔ ''مجھے کیا بھگتنا ہے؟''

''میں نے آپ کے فائدے کی بات کی تھی۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''بیٹھے بٹھائے ایک لاکھ روپے آپ کی جیب میں آجاتے مگر آپ نے میری پیشکش کی قدر نہیں کی۔ میں شہر کے سب سے بڑے وکیل کی خدمات حاصل کروں گا۔ اس خونی بیوہ کو پھانسی نہ کروائی تو میرا نام بھی عدنان نہیں ہے۔''

میں اس کی حماقت اور کمینگی پر مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ استغاثہ کی جانب سے ایک معروف وکیل پیش ہوا تھا۔ میں اس وکیل کو اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ مذکورہ وکیل صاحب کی فیس یقیناً مقتول کے بھائی عدنان نے ادا کی ہوگی۔ عدنان چند روز پہلے مجھے کسی چوٹی کے وکیل کے حوالے سے دھمکی بھی دے کر گیا تھا۔ گویا اس کی دھمکی کھوکھلی نہیں تھی۔

چالان میں پولیس نے دفعہ تین سو دو لگائی تھی، یعنی اسے قتلِ عمد کا کیس بنا کر پیش کیا تھا۔ میں نے ملزمہ کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! یہ قتلِ عمد نہیں بلکہ قتلِ خطا کا کیس ہے لہٰذا چالان میں دفعہ تین سو دو کے بجائے دفعہ تین سو اٹھارہ اور تین سو انیس لگائی جانا چاہیے۔''

''یور آنر! یہ قتل عمد کا کیس ہے۔'' وکیل استغاثہ نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''ملزمہ نے ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت لاہور سے کراچی کا سفر کیا اور پھر موقع ملتے ہی اس نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ کیس ناقابلِ ضمانت ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزمہ کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جیل بھیج دیا جائے۔''

''جناب عالی! یہ درست ہے کہ میری مؤکلہ نے

لاہور سے کراچی تک کا سفر کیا۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس مقصد کے پیچھے اس کی کوئی خفیہ پلاننگ نہیں تھی۔ وہ اپنے دھوکے باز شوہر کو ملک سے فرار ہونے سے روکنا چاہتی تھی۔''

''دھوکے باز شوہر...... ملک سے فرار......؟'' جج نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''یس یور آنر!'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''میں نے وکالت نامے اور ملزمہ کی درخواستِ ضمانت کے ساتھ اس کیس کے پس منظر کی سمری منسلک کر دی ہے تاہم مختصراً عرض ہے کہ......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مقتول کچھ عرصہ پہلے تک لاہور کی ایک انویسٹمنٹ کمپنی میں ملازم تھا۔ اگر عدالت ضرورت محسوس کرے گی تو مذکورہ کمپنی کے منیجر جواد حسین کو عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ ملزمہ نے اپنی کچھ رقم اس کمپنی میں انویسٹ کر رکھی تھی اور یہیں پر مقتول اور ملزمہ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ چند ہی روز میں مقتول نے ملزمہ کو اپنی نقلی محبت کے شیشے میں اتارا اور اسے شادی کے لیے راضی کر لیا۔ اگر عدالت حکم دے گی تو اس شادی کے نکاح خواں حاجی نواز علی کو بھی پیش کر دیا جائے گا۔'' میں نے ذرا سی دیر کے لیے توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''شادی کے چند روز بعد ہی مقتول نے ملزمہ کو راتوں رات امیر بننے کا خواب دکھا کر اس کی کوٹھی پندرہ لاکھ میں بکوادی مگر یہ خطیر رقم اس نے کہیں بھی انویسٹ نہیں کی۔ اس امر کی گواہی کے لیے منیجر جواد حسین کو عدالت میں پیش کیا جاسکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک روز مقتول ملزمہ کو کرائے کے ایک مکان میں بے یارومددگار چھوڑ کر لاہور سے کراچی چلا آیا۔ ملزمہ کا سابق پڑوسی صفدر علی اور کرائے کے مکان کا مالک نفیس احمد اس حقیقت کی گواہی دے سکتے ہیں۔ کراچی آنے کے بعد مقتول نے خود کو چاول کا ایک بیوپاری ظاہر کیا اور چند ہی روز بعد ایک خوبرو حسینہ سے شادی کر لی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ کراچی سے امریکا روانہ ہوتا، ملزمہ کے ایک خیر خواہ شاکر علی نے اس کے منصوبے کی بو سونگھ لی اور فی الفور لاہور میں ملزمہ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ ملزمہ اپنے شوہر کو فرار ہونے سے روکنے اور اپنی رقم کا حساب لینے جب کراچی پہنچی تو مقتول نے اسے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا......'' میں نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! آپ خود سوچیں...... ایک عورت جس کا شوہر اس کا گھر بار، مال و دولت، اعتماد، وفا، محبت سب کچھ لوٹ کر اسے دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ آیا ہو اور اسی ستم رسیدہ عورت کے پیسوں سے وہ کسی اور حسینہ کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی گزارنے امریکا جانے کے لیے تیار بیٹھا ہو...... جب وہ مظلوم عورت اپنے مجرم شوہر کے سامنے پہنچے اور شوہر نئی بیوی کی موجودگی میں اسے پہچاننے سے انکار کر دے تو اس عورت کے ذہن و دل کی کیا حالت ہوگی۔ میری مؤکلہ اور اس کیس کی ملزمہ اس ذہنی کیفیت سے گزر رہی ہے جنابِ عالی......''

عدالت کے کمرے میں سناٹے کا راج تھا۔ میں نے جذباتی لہجے میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مقتول نے جب ملزمہ کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیا تو فرطِ غیظ نے ملزمہ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود کر دی۔ اس کی عزت، وفا اور دولت کا لٹیرا اس کے سامنے کسی اور عورت کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔ اپنے شوہر کو باز پرس کے لیے روکنا تو اس کا حق بنتا تھا نا؟''

''وکیل صاحب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

''جنابِ عالی! میری مؤکلہ ہرگز ہرگز اپنے شوہر کی زندگی سے کھیلنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔'' میں نے ایک جذباتی مگر تکنیکی پینترا مارتے ہوئے کہا۔ ''بس، وہ اسے روکنا چاہتی تھی اور اس لیے ملزمہ کے ذہن نے سمجھایا کہ اس دھوکے باز کمینے کو زخمی کر کے ہی روکا جاسکتا ہے۔ اگر وہ مقتول کو شدید زخمی کر دے تو وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ امریکا نہیں جاسکے گا۔ بس اس نے یہی کیا۔ اس نے زخمی کرنے کی نیت سے اپنے شوہر پر تین گولیاں چلائیں لیکن ظاہر ہے، ملزمہ کوئی ماہر شوٹر نہیں ہے لہٰذا اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ ایک گولی مقتول کی ٹانگ میں پیوست ہوئی، دوسری گولی اس کے پیٹ میں جا گھسی اور تیسری گولی نے اس کے سینے کو چھید ڈالا...... یہ قتلِ خطا ہے یور آنر...... قتلِ خطا۔''

وکیل استغاثہ نے ضمانت رکوانے کے لیے بڑھ چڑھ کر بولنا شروع کر دیا۔ جج توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا اور آخر میں اس نے کہا۔

''وکیلِ صفائی نے دفعات کے حوالے سے جو اعتراضات اٹھائے ہیں، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''جنابِ عالی! شاید معزز عدالت کو یہ معلوم نہیں کہ

میرے فاضل دوست ایک بہت اچھے فکشن رائٹر بھی ہیں۔ ایک مقامی ڈائجسٹ میں ان کی معرکہ آرا تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ عدالت کا کمرا ہے، کوئی ڈائجسٹ نہیں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے طنزیہ نظر سے مجھے دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہاں پر ہر معاملے کو حقائق اور ٹھوس ثبوت کی بنا پر رکھا جاتا ہے۔ ملزمہ کی مظلومیت کے حوالے سے وکیل صفائی نے جو افسانوی داستان سنائی ہے اس میں رتی بھر بھی سچائی نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ملزمہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لاہور سے کراچی پہنچی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ رکھتی تھی اور اس نے اپنے مقصد کو پورا کر لیا۔ یہ سراسر قتلِ عمد یعنی دفعہ تین سو دو کا کیس ہے ورنہ اپنے شوہر کی تلاش میں نکلی ہوئی کوئی بیوی اپنے پرس میں بھرا ہوا پستول نہیں رکھتی۔''

آخری جملہ اس نے ایک نشتر کے طور پر میری سمت پھینکا تھا۔ میں نے اس کے وار کو الفاظ کی ڈھال پر روکتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! وکیل استغاثہ نے جس پستول کا ذکر کیا ہے، وہ مقتول ہی نے لا کر ملزمہ کو دیا تھا تاکہ وہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں اپنی جان اور عزت کی حفاظت کر سکے۔''

''اپنی جان اور عزت کی حفاظت کر سکے یا کسی دوسرے کی جان و عزت سے کھیل سکے؟'' وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''جناب عالی! انسان اپنی نفسیات کے سامنے مجبور ہے۔'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''اور ہر سچویشن میں انسان کی ذہنی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ ماحول اور حالات انسان کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی چوٹ پر اگر ذرا سی ٹھوکر بھی لگ جائے تو انسان درد کی شدت سے بلبلا اٹھتا ہے......'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''مقتول نے غلط بیانی اور دھوکا دہی کے نشتروں سے ملزمہ کی روح کو بری طرح گھائل کر رکھا تھا۔ پھر جب اس نے ملزمہ کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیا تو یہ سچویشن ملزمہ کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ وہ مقتول کی جان لینے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ وہ محض اسے امریکا جانے سے روکنا چاہتی تھی۔ اس نے مقتول کو زخمی کرنے کی نیت سے مقتول کی ٹانگوں پر فائرنگ کی۔ یہ مقتول کی بدقسمتی کہ ملزمہ کا نشانہ چوک گیا اور ایک گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی جو بالآخر مقتول کی موت کا سبب بنی۔ موقع پر موجود ہر شخص بشمول مقتول کی دوسری بیوی فوزیہ، یہ گواہی دے سکتے ہیں کہ اس روز جب شاکر علی نے مقتول کو بتایا کہ اس کی بیوی اس سے ملنے آئی ہے اور ملزمہ کی جانب انگلی اٹھا کر جب فوزیہ نے اپنے شوہر مقتول کامران سے یہ سوال کہ کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟ تو مقتول نے سرے سے ملزمہ کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ اس صورتِ حال نے ملزمہ کے حواس مختل کر دیے اور اس نے اپنے شوہر کو امریکا جانے سے روکنے کے لیے اس کو زخمی کرنے کی غرض سے فائرنگ کر دی......'' میں ایک لمحے کے لیے رکا پھر کراری آواز میں بولنا شروع کیا۔

''یور آنر! پاکستان پینل کوڈ کے مطابق دفعہ تین سو اٹھارہ بتاتی ہے کہ...... اگر کوئی شخص، کسی دوسرے شخص کی موت وقوع میں لانے یا اسے شدید ضرر پہنچانے کی نیت کے بغیر کسی غلطی یا غلطی واقعہ سے دوسرے شخص کی موت کا باعث بن جائے تو پہلا شخص قتلِ خطا کا مرتکب کہلائے گا اور قتلِ خطا کی تشریح دفعہ تین سو انیس میں کی گئی ہے۔ یعنی قتلِ خطا کا مرتکب شخص قابل ضمانت ہے اور قابل راضی نامہ ہے۔ اگر عدالتی کارروائی کے نتیجے میں ایسا ملزم قصوروار ٹھہر جائے تو دیت اور پانچ سال کی سزا کا مستحق ٹھہر سکتا ہے۔ دیٹس آل یور آنر!''

وکیل استغاثہ نے ایک بار پھر ضمانت رکوانے کے لیے زور لگانا شروع کیا لیکن جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! اس کیس کی دفعات کا فیصلہ آئندہ پیشی پر کیا جائے گا۔ اس سے پہلے آپ مقتول اور ملزمہ کے میاں بیوی ہونے کے ثبوت کا بندوبست کریں۔ کیا آپ ان کے نکاح خواں کو بطور گواہ عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''

''ضرور جناب!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ انتظام ہو جائے گا۔''

جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ گویا ملزمہ کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی۔ نادرہ کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

میں عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے عدنان کو وکیل استغاثہ سے بات کرتے دیکھا۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں میری جانب

دیکھا جیسے بہ زبانِ خاموشی یہ کہہ رہا ہو کہ دیکھا، میں نے ملزمہ کی ضمانت نہیں ہونے دی۔ میں انہیں نظرانداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ میں جج کی توجہ ایک نہایت ہی اہم نکتے کی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ نکتہ تھا دفعات کا استعمال۔ اگر ملزمہ پر دفعہ تین سو دو کے بجائے دفعہ تین سو اٹھارہ لگا دی جاتی تو یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہو جاتا۔

اگلی پیشی پر میں نے جج کی فرمائش پر نہ صرف نکاح خواں حاجی نواز علی کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر دیا بلکہ ''اوورنائٹ انویسٹرز'' کے منیجر جواد حسین اور کوٹھی کے خریدار مطلوب بٹ کے حلفیہ بیانات بھی عدالت میں دائر کر دیے۔ جواد حسین نے اپنے بیان میں اس بات کی گواہی دی تھی کہ مقتول کامران ان کی کمپنی میں کام کر چکا تھا اور جب وہ کمپنی چھوڑ کر چلا گیا تو ملزمہ اس کی تلاش میں کمپنی آئی تھی جبھی یہ راز کھلا کہ انویسٹمنٹ کے نام پر مقتول، ملزمہ کے پندرہ لاکھ کھا کر کہیں چلا گیا تھا جبکہ مطلوب بٹ نے اپنے بیان میں اس امر کی تصدیق کی تھی کہ جب اس نے ملزمہ سے وہ کوٹھی پندرہ لاکھ میں خریدی تو مقتول شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھا اور یہ پندرہ لاکھ ملزمہ نے مقتول کے ہاتھ ہی میں دیے تھے۔

ان حالات کی روشنی میں جج نے پولیس کو ہدایت کی کہ وہ عرصہ سات یوم میں اس کیس کا نیا چالان پیش کرے۔ گویا اب پولیس کو زیرِ دفعہ تین سو اٹھارہ کا نیا چالان پیش کرنا تھا جو میری مؤکلہ کے لیے حد درجہ سودمند ثابت ہوتا۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کے طفیل نادرہ کی دہشت اور وحشت تقریباً ختم ہو گئی تھی اور اس کے اندر پیش آمدہ حالات سے نمٹنے کی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لگ بھگ دو ماہ کے بعد اس کیس کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ جج کی ہدایت کے مطابق نئے چالان میں میری مؤکلہ پر دفعہ تین سو اٹھارہ لگائی گئی تھی یعنی اب یہ کیس قتلِ عمد کا نہیں بلکہ قتلِ خطا کا تھا۔

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہ پیش کیے گئے لیکن میں یہاں پر انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کی گواہی کی کوئی خاص اہمیت ہوگی۔ یہ واقعہ چونکہ ایک پررونق مقام پر پیش آیا تھا لہٰذا استغاثہ کے پاس گواہوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

سب سے پہلے ملزمہ نادرہ کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ وہ اب بڑی حد تک سنبھل چکی تھی اور اس نے میری ہدایت کی روشنی میں بڑا ناپا تلا بیان دیا تھا۔

استغاثہ کی جانب سے پہلا گواہ عدنان پیش ہوا یعنی مقتول کا بڑا بھائی۔ اس نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان دیا۔ وکیل استغاثہ نے سرسری سی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا تو میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔

''عدنان صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔ ''مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔''

''میں آپ کے محسوسات کا ٹھیکے دار تو نہیں ہوں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو یاد نہیں آ رہا کہ کبھی ہماری ملاقات ہوئی ہو۔''

''ٹھیک ہے، آپ خفا نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے، مجھے مغالطہ ہوا ہو۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''بہرحال، مجھے آپ کے بھائی کی موت کا بہت دکھ ہے۔''

''آپ کو میرے بھائی کی موت کا دکھ بھی ہے اور آپ اس کی قاتل کا مقدمہ بھی لڑ رہے ہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ اچھی ہمدردی ہے وکیل صاحب!''

''میں ملزمہ کا مقدمہ لڑ رہا ہوں تو یہ میرا پیشہ ورانہ فرض ہے اور اگر میں آپ کے بھائی کی موت پر افسوس کا اظہار کر رہا ہوں تو یہ بحیثیت انسان میرا اخلاقی فریضہ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ بھی اپنے فرائض کو بہ احسن طریق ادا کر رہے ہیں؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا مقتول واقعی آپ کا بھائی تھا؟''

''جی بالکل، کامران میرا سگا چھوٹا بھائی تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ کو کوئی شک ہے کیا؟''

''ہاں، کسی حد تک شک سا محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیسا شک؟'' وہ ناگواری سے مجھے گھورنے لگا۔

میں اپنے دھیمے اور ٹھنڈے انداز سے اس کے غصے کو ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ وہ غلطی کرے اور میری پکڑ میں آ جائے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ آپ کراچی میں اور وہ لاہور میں رہ رہا تھا اور آپ دونوں کے بیچ کوئی رابطہ بھی نہیں تھا......''

''آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہمارے بیچ رابطہ نہیں تھا۔'' وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لاہور اور کراچی ایک ہی ملک کے دو شہر ہیں اور اس ملک کا ہر شہری کسی بھی شہر میں رہائش اختیار کر سکتا ہے۔''

''میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے بہت شکریہ عدنان صاحب۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تو گویا آپ دونوں رابطے میں رہا کرتے تھے؟''

''جی بالکل۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''پھر تو آپ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں شریک ہوئے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ شادی جو مقتول نے لاہور میں ملزمہ سے کی تھی؟''

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر گڑبڑاہٹ کے آثار نمودار ہوئے لیکن جلد ہی وہ سنبھل گیا اور بولا۔ ''جی نہیں...... میں اس شادی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔''

''اس عدم شرکت کا کوئی سبب؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''مقتول نے آپ کو انوائٹ نہیں کیا تھا یا کوئی اور مجبوری تھی؟''

''کامران نے مجھے اپنی شادی میں بلایا تھا لیکن میں اپنی مصروفیت کے باعث جا نہیں سکا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کا شغل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''میں پراپرٹی کا کام کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''محمود آباد میں میری اسٹیٹ ایجنسی ہے۔''

''آپ کا کوئی اور رشتے دار......؟'' میں نے پوچھا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔ ''اس وقت عدالت میں کامران مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست غیر متعلقہ سوالات سے عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''میں نے ابھی تک ایک بھی غیر ضروری سوال نہیں کیا جناب عالی۔'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور میں اپنے اس موقف کو ابھی عدالت میں ثابت بھی کر کے دکھا دوں گا۔''

''وکیل صاحب۔'' جج نے مجھ سے کہا۔ ''پلیز پروسیڈ۔''

میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''عدنان صاحب! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ہمارا اور کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ بس ہم دونوں بھائی تھے اور اب......'' اس نے اپنی آواز میں جذبات بھرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ اس ظالم عورت نے میرے چھوٹے بھائی کی زندگی چھین لی ہے۔'' بات کے اختتام پر عدنان نے اکیوزڈ باکس میں کھڑی نادرہ کی جانب انگلی سے اشارہ بھی کر دیا۔

''عدنان صاحب! چھوٹے بھائی کے لیے آپ کی جذباتی وابستگی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ اپنے اکلوتے عزیز از جان چھوٹے بھائی کی شادی میں شریک کیوں نہیں ہوئے تھے؟ پراپرٹی کا کام ایسا تو نہیں کہ انسان ایک دن کی فرصت بھی نہ نکال سکے؟''

ایک لمحہ اس نے سوچا پھر جواب دیا۔ ''وہ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے کامران کے فیصلے سے دکھ پہنچا تھا اور میں نے اسے اس شادی سے منع کیا تھا۔ میرا بھائی ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔ اسے ایک سے بڑھ کر ایک جوان اور حسین لڑکی کا رشتہ مل سکتا تھا۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا جو اپنی اماں کی عمر کی ایک بدشکل عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ بس، میں اسی بات پر اس سے ناراض تھا اس لیے اس کی شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کے شادی میں شرکت نہ کرنے کے فارمولے کو تسلیم کر لیتا ہوں۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب آپ مجھے یہ بھی بتا دیں کہ آپ نے اپنے بھائی کی دوسری شادی میں شرکت کیوں نہیں کی تھی حالانکہ یہ شادی تو آپ ہی کے شہر میں ہوئی تھی اور اس مرتبہ آپ کا بھائی ایک نوعمر طرح دار حسینہ سے شادی کر رہا تھا؟''

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے پھیلائے ہوئے جال میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے بہ دستور اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

''عدنان صاحب! حقیقت یہ ہے کہ آپ کا اپنے بھائی سے کبھی رابطہ رہا ہی نہیں تھا۔ وہ جب کراچی سے لاہور گیا تو آپ سے بالکل کٹ گیا لہٰذا آپ کو اس کی پہلی شادی کی خبر ہے اور نہ دوسری شادی کا علم۔ یہ تو آپ نے جب اخبار میں کامران کے قتل کی خبر پڑھی تو آپ اس کی لاش پانچ لاکھ میں فروخت کرنے منظرِ عام پر آ گئے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''میں آپ کے پاس جو تجویز لے کر آیا تھا، وہ شریعت کے عین مطابق تھی۔'' وہ میرے چکر میں آگیا۔

''دیت کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مگر میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔''

''تو آپ کی یادداشت نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ مبارک ہو عدنان صاحب۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ معزز عدالت کے سامنے یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ آج سے پہلے میری آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔''

''یہ پانچ لاکھ کا کیا معاملہ ہے وکیل صاحب؟'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

''جناب عالی!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولنا شروع کیا۔ ''استغاثہ کا معزز گواہ اس کیس کے آغاز میں میرے آفس میں ایک آفر لے کر آیا تھا کہ اگر میں ملزمہ کو پانچ لاکھ دیت (خوں بہا) دینے کے لیے راضی کرلوں تو اس رقم میں سے ایک لاکھ بطور کمیشن مجھے دے گا لیکن میں نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''چھوٹا بھائی ملزمہ کو پندرہ بیس لاکھ کی ڈز دے کر لاہور سے کراچی چلا آیا تھا اور بڑا بھائی خوں بہا کے نام پر اس ستم رسیدہ عورت سے مزید پانچ لاکھ بٹورنے کے چکر میں تھا۔ یہ اپنے مردہ بھائی کے پیسے کھرے کرنا چاہتا تھا۔''

''میں نے جو کچھ بھی کیا، شریعت میں اس کا حکم موجود ہے۔'' وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ قرآن کو نہیں مانتے؟''

''قرآن کریم اللہ کے احکامات کی کتاب مقدسہ ہے اور میں اللہ کے ہر حکم کو مانتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن دیت کا معاملہ ایسا نہیں جیسا آپ نے میرے سامنے پیش کیا تھا۔ اگر کوئی کیس عدالت میں ہے تو دیت کا فیصلہ بھی عدالت ہی کرتی ہے اور دیت کی رقم کی ادائیگی کے لیے بھی قانون موجود ہے۔ از روئے دفعہ تین سو اکتیس...... دیت کی ادائیگی دو طرح سے کی جائے گی۔ اول، اگر ملزم کی حیثیت ہو تو یکمشت۔ دوم، اگر ادائیگی کی حیثیت نہ ہو تو دیت کی رقم قسط وار واجب الادا بنائی جاسکتی ہے جو کیس کے آخری فیصلے کی تاریخ سے تین سال کی مدت تک پھیلی ہو سکتی ہے۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر عدنان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مگر آپ بھی کیا کریں...... آپ تو ایک پراپرٹی ایجنٹ ہیں۔ نازک قرآنی معاملات کو بھی کمیشن کے اصولوں پر ہی طے کریں گے نا!''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے بھائی کی موت کا ذرا سا بھی دکھ یا صدمہ نہیں ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''آپ کی نظر دیت کی رقم پر لگی ہوئی ہے لیکن یاد رکھیں، یتیموں اور بیواؤں کا مال کھانے والوں کا بڑا عبرت ناک انجام ہوا کرتا ہے۔ اپنے بھائی کی المناک موت ہی سے کچھ سبق سیکھ لیں۔''

''آپ وکیل ہیں یا مولوی صاحب؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''میں کیا ہوں، اگر ابھی تک آپ کو پتا نہیں چلا تو انشاء اللہ، اس کیس کے اختتام تک آپ سب جان جائیں گے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ نے ملزمہ کو پھانسی دلوانے کے لیے اپنی جیب سے ایک مہنگے وکیل کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ آپ کا کیس بھی یقیناً یہی وکیل صاحب لڑیں گے لیکن اس کیس میں ان کی حیثیت وکیل صفائی کی ہوگی۔'' پھر میں نے مڑ کر مرچی لگانے والے انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

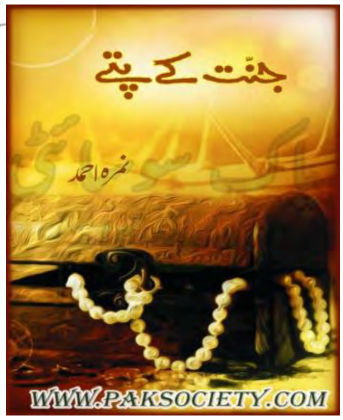
☆☆☆

آئندہ پیشی پر تین گواہوں کو استغاثہ کی جانب سے پیش کیا گیا لیکن وہ میری مؤکلہ کے خلاف کوئی خاص محاذ کھڑا نہ کر سکے۔ میں نے ان کے بیانات کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ ان میں سے ایک گواہ پر ہونے والی جرح خاصی دلچسپ ہے لہٰذا میں صرف اسی کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔

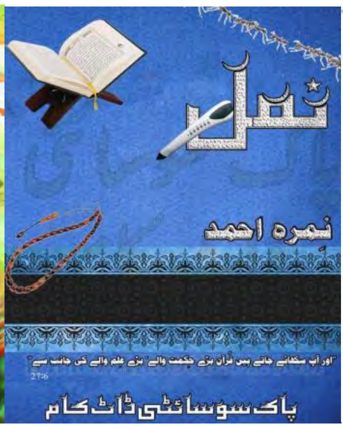
یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو اس روز مقتول اور اس کی بیوی کو ائرپورٹ پہنچانے والا تھا۔ اس کا نام قاسم معلوم ہوا۔ قاسم کا شمار بھی اس واقعے کے چشم دید گواہوں میں ہوتا تھا۔ وکیل استغاثہ نے اسے نادرہ کے خلاف بیان دینے کے لیے خصوصی طور پر تیاری کرائی تھی۔

اس نے بیان ریکارڈ کروا دیا تو وکیل استغاثہ جرح

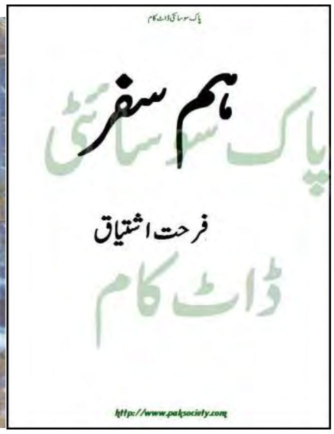
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

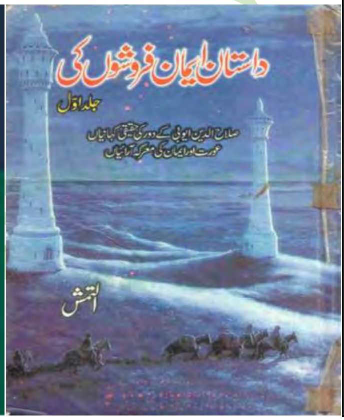




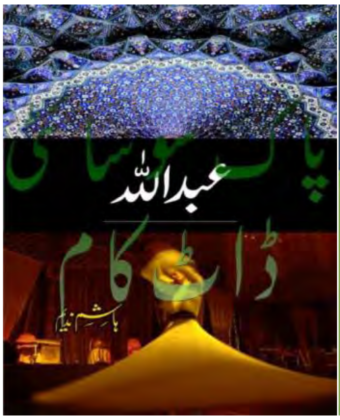


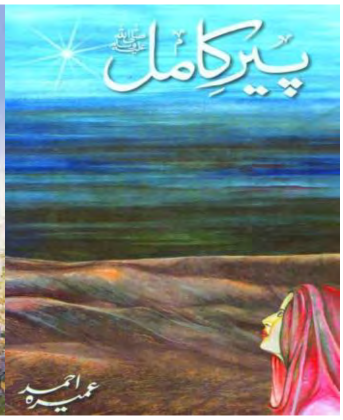


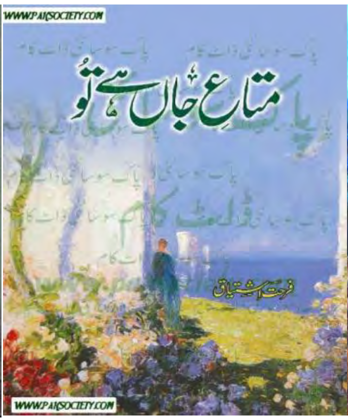


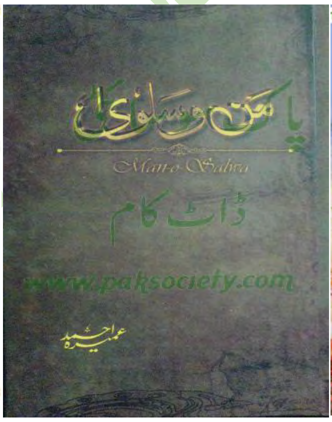




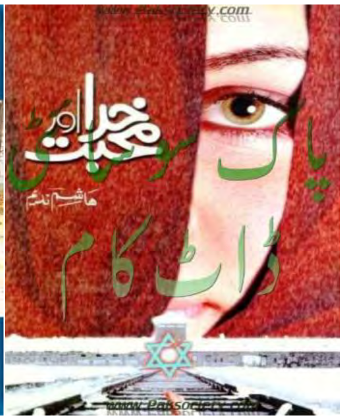


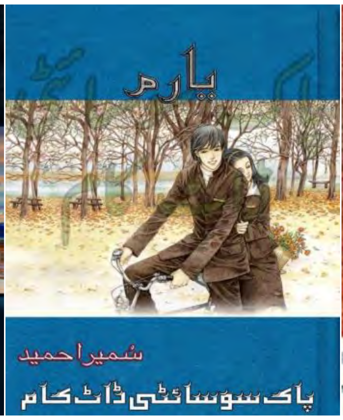




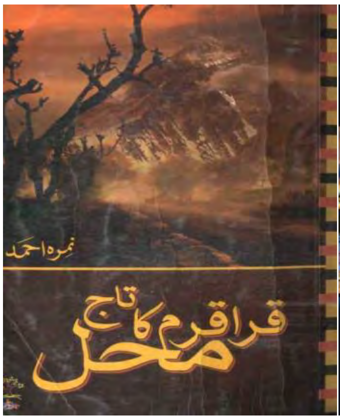












کے لیے اس کے پاس چلا گیا اور کہا۔ ''قاسم! کیا تم مقتول کو پہلے سے جانتے تھے؟''

''بالکل نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو مزدور آدمی ہوں وکیل صاحب! ٹیکسی چلاتا ہوں اور اپنی روزی کماتا ہوں۔ مقتول نے مجھے ائرپورٹ جانے کے لیے بلایا اور میں آ گیا۔''

''مطلب یہ کہ اس سے پہلے تم نے مقتول کو کہیں نہیں دیکھا تھا؟''

''جی نہیں۔'' گواہ نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

''اور کیا تم ملزمہ سے پہلے بھی کہیں مل چکے ہو؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''نہیں جناب! یہ عورت بھی میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔''

''کیا تم عدالت کو بتاؤ گے کہ وقوعہ کے روز کیا ہوا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، مقتول کی موت کس طرح واقع ہوئی؟''

''میں ٹیکسی میں سامان رکھوانے میں مقتول اور اس کی بیوی کی مدد کر رہا تھا۔'' ڈرائیور نے بتانا شروع کیا۔ ''کہ ملزمہ اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گئی اور اس پاگل عورت نے آتے ہی مقتول پر فائرنگ بھی شروع کر دی جس کے نتیجے میں مقتول زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔''

''فائرنگ کے دوران ملزمہ نے کوئی بات بھی کی تھی یا بالکل خاموش رہی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ سے سوال کیا۔

''خاموش کہاں رہی تھی جناب۔'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ عورت فائرنگ کرتے وقت... بہ آواز بلند کہہ رہی تھی ...... کامران! میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا اور آخر تم مجھے مل ہی گئے۔ آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم کہیں نہیں جا سکو گے۔ ادھر ہی میرے ہاتھوں سے مرو گے...... اور اس عورت نے واقعی مقتول کو مار ڈالا۔''

وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''دیٹس آل یور آنر۔''

اپنی باری پر میں استغاثہ کے گواہ کے پاس پہنچ گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ ''قاسم! تم کتنے نمبر کی بس چلاتے ہو؟''

میرا سوال اس کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ بس کی ڈرائیوری سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

حاضر جوابی

احمد بن ابی طاہر ایک بدشکل انسان تھا اور اس کے پاس ایک بہت ہی خوب صورت خادمہ تھی۔ ایک دن وہ گھر میں داخل ہوا تو سامنے خادمہ کو دیکھ کر مسکرا دیا مگر خادمہ اسے دیکھ کر ناراض ہوگئی۔ خادمہ کے ماتھے پہ شکن دیکھ کر احمد بن طاہر نے پوچھا۔ ''میں تیری صورت دیکھ کر ہنس رہا ہوں اور تو ہے کہ ناراض ہو رہی ہے۔''

خادمہ نے کہا۔ ''تم من بھاتی چیز کو دیکھ کر مسکرائے ہو اور مجھے ایک ناگوار چیز سے واسطہ پڑا ہے اس لیے ماتھے پر شکن آ گئی۔''

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ، لاہور

''تم نے بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم ٹیکسی میں مقتول کا سامان رکھوا رہے تھے تو ملزمہ نے اچانک وہاں پہنچ کر مقتول پر فائرنگ شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔'' میں نے بہ دستور گواہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت ملزمہ نے کس قسم کی سینڈل پہن رکھی تھی؟''

''جی نہیں۔ میں نے اس کی سینڈل پر دھیان نہیں دیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں یہ تو یاد ہوگا کہ ملزمہ نے وقوعہ کے روز کس رنگ کا لباس پہن رکھا تھا؟''

میرے سوالات نے قاسم کو کافی حد تک الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! مجھے اس کے کپڑوں کا رنگ بھی یاد نہیں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ بادام کھانے سے انسان کی یادداشت کافی تیز ہو جاتی ہے؟''

''جی، میں نے سنا ہے مگر کبھی ٹرائی نہیں کیا۔'' وہ ہونقوں کے انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

''ٹرائی کرنا بھی نہیں کیونکہ آج کل ایک نئی ریسرچ بھی مارکیٹ میں آ چکی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کون سی ریسرچ؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''بتاؤں گا مگر میری ایک شرط ہے!'' میں نے کہا۔

اس کی الجھن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ''کیسی شرط جناب۔''

''تمہیں میرے ایک سادہ سے سوال کا جواب دینا ہوگا۔''

''جی پوچھیں......'' وہ سادگی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''قاسم! کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے تم سے پہلا سوال کیا کیا تھا؟ میں تمہاری زبان سے اپنے الفاظ سننا چاہتا ہوں۔''

میرے انداز نے اس پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی اسے یاد نہ آسکا کہ میں نے اس سے پہلا سوال کون سا کیا تھا۔ وہ بے بسی سے بولا۔

''مجھے بالکل یاد نہیں آرہا......''

''ٹھیک ہے قاسم!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے تو میرے سوال کا جواب نہیں دیا مگر میں تمہیں نئی ریسرچ سے ضرور آگاہ کروں گا اور وہ نئی ریسرچ ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے تیکھی نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر ڈرامائی لہجے میں کہا۔

''......کہ عقل بادام کھانے سے نہیں آتی ٹھوکر کھانے سے آتی ہے۔''

''مم......مگر آپ نے تو یادداشت کی بات کی تھی۔'' وہ روہانسا ہو گیا۔ ''اور اب عقل کا ذکر کر رہے ہیں۔''

''عقل اور یادداشت آپس میں کزن ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے استغاثہ کے گواہ کے ساتھ تفریح کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک کے ساتھ دوسری بونس میں چلی آتی ہے۔ تم اسے ''بائی ون، گیٹ ون فری'' کی کوئی ڈیل سمجھ لو۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے احتجاج کا علم بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صفائی نے عدالت کے کمرے میں مداری کا تماشا لگا رکھا ہے۔ انہیں اس قسم کی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''بیگ صاحب! آپ کے ان سوالات کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

''بہت گہرا تعلق ہے جناب عالی!'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میں عدالت کے علم میں اس حقیقت کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں کہ استغاثہ کا گواہ قاسم دروغ گو درجۂ اول ہے۔''

''وہ کیسے؟'' جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''وہ ایسے جناب کہ......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''اسے یہ یاد نہیں کہ وقوعہ کے روز ملزمہ نے کس قسم کی سینڈل پہن رکھی تھی۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس روز ملزمہ نے کس رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا حتیٰ کہ اسے تو چند لمحات پہلے کی بات بھی یاد نہیں آرہی کہ میں نے اس سے پہلا سوال کیا کیا تھا۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ مان لیا جائے کہ اس کی یادداشت بہت کمزور ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ......'' میں نے سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ کیسے یاد رہ گیا کہ وقوعہ کے روز ملزمہ نے مقتول پر فائرنگ کرتے ہوئے یہ کہا تھا...... کامران! میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا اور آخر تم مل ہی گئے۔ آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم کہیں نہیں جا سکو گے۔ ادھر ہی میرے ہاتھوں سے مرو گے......''

عدالت میں یکدم سناٹا چھا گیا۔ جج نے ناگواری سے استغاثہ کے گواہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''جب تمہاری یادداشت اتنی ہی کمزور ہے تو پھر اتنا عرصہ پہلے کے ملزمہ کے الفاظ تمہارے ذہن میں کس طرح محفوظ ہیں؟''

وہ جواب دینے سے پہلے وکیل استغاثہ کی جانب امداد طلب نظر سے تکنے لگا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''قاسم! میں نے تم سے پہلا سوال یہ کیا تھا کہ تم کتنے نمبر کی بس چلاتے ہو؟ مگر تمہیں تو کچھ یاد ہی نہیں ہے سوائے ان الفاظ کے جو بقول تمہارے وقوعہ کے روز ملزمہ کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ میرا اللہ بھی تمہیں معاف کرے لیکن جج صاحب کے سوال کا اگر تم نے جواب نہیں دیا تو یہاں سے گھر نہیں بلکہ سیدھے جیل جاؤ گے......''

وہ میری دھمکی سے بری طرح بدحواس ہو گیا۔ روئے سخن جج کی جانب کرتے ہوئے بولا۔ ''سر! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ یہ بیان مجھے وکیل صاحب نے رٹایا تھا......''

''یہ بکواس کرتا ہے۔'' وکیل استغاثہ بوکھلا گیا اور غصے سے بولا۔ ''یہ جھوٹا ہے...... احمق کہیں کا۔''

''جناب عالی!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وکیل استغاثہ کے ان الفاظ کو ریکارڈ میں لایا جائے۔ فاضل وکیل نے

اپنے ہی گواہ کو بکواس، جھوٹا اور احمق کہا ہے۔ ایسی صورت میں ٹیکسی ڈرائیور قاسم کی گواہی قابلِ سماعت نہیں رہتی۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ قاسم کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے تاکہ آئندہ کبھی یہ جھوٹی گواہی کی جرأت نہ کر سکے۔''

اس صورتِ حال نے قاسم پر خاطر خواہ اثر کیا۔ وہ وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے جارحانہ انداز میں بولا۔ ''جھوٹا میں نہیں، آپ ہیں۔ مجھے آنکھیں نہ دکھائیں۔ آپ نے خود مجھے یہ بیان رٹایا تھا۔ میری بس اتنی سی خطا ہے کہ میں پیسوں کے لالچ میں آکر آپ کی بات ماننے کے لیے تیار ہوگیا۔'' پھر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر جج سے ملتمس ہوا۔

''سر! آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں پھر کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

''جنابِ عالی! استغاثہ کے گواہ ٹیکسی ڈرائیور قاسم کے اعترافِ جرم نے استغاثہ کی دروغ گوئی کی قلعی کھول دی ہے۔ اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ میری مؤکلہ کو سخت ترین سزا دلوانے کے لیے استغاثہ کس طرح جھوٹے گواہوں کا سہارا لے رہا ہے۔''

جج نے گواہ قاسم کو منحرف قرار دے دیا اور آئندہ پیشی تک کے لیے سماعت کو ملتوی کر دیا۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر میری جانب سے شاکر علی اور فوزیہ پیش ہوئے۔ فوزیہ مقتول کی دوسری بیوی تھی جو اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اس کے چنگل میں پھنس گئی تھی اور بالآخر اس سے شادی کر بیٹھی تھی لیکن وقوعہ کے روز جب اسے پتا چلا کہ مقتول کیسے گھناؤنے کردار کا مالک تھا تو اس کا ذہن بدل گیا۔ اس بدلاؤ کی تین بنیادی وجوہات تھیں۔

اول، فوزیہ نے جس دولت کی خاطر مقتول سے شادی کی تھی وہ تمام کی تمام دولت اس کے ہاتھ سے نکل کر غیر قانونی طریقے سے نیویارک پہنچ چکی تھی۔ دوم، مقتول کی موت واقع ہوچکی تھی اور وہ فوزیہ کے لیے ایک پھوٹی کوڑی بھی چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ سوم، نادرہ کے حالات نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس کے اندر کی عورت نے حق کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور وقوعہ کے روز اس کی آنکھوں کے سامنے جو کچھ پیش آیا تھا، وہ اس نے من وعن عدالت کے سامنے بیان کر دیا۔ فوزیہ کے بیان نے نادرہ کے کیس میں مزید جان ڈال دی اور عدالت کی ہمدردیاں بھی میری مؤکلہ کے ساتھ ہوگئیں۔

اسی پیشی پر دونوں جانب کے تمام گواہوں کو نمٹا دیا گیا لہٰذا میں نے اپنی مؤکلہ اور اس کیس کی ملزمہ نادرہ کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! جب کوئی شخص کسی کو دھوکا دینے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ اپنے تمام طبعی جذبات کو ایک طرف رکھ کر اپنی نئی نفسیات کے مطابق پیش قدمی کرتا ہے لہٰذا وہ اپنے شکار کی کسی بھی بات پر خفا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی کسی ناپسندیدہ حرکت پر غصے کا اظہار کرتا ہے، خواہ غصے کی وجہ کتنی بھی برمحل اور جائز کیوں نہ ہو ورنہ انسان کی عمومی نفسیات کے مطابق غلط اور ناجائز بات پر غصہ آنا لازمی ہے......''

میں نے لمحاتی توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! مقتول نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ملزمہ سے شادی کی تھی ورنہ ان کا کوئی میل یا میچ کہیں سے بنتا ہی نہیں تھا۔ ان کی عمروں میں بہت زیادہ فرق تھا اور ملزمہ کوئی حور یا پری بھی نہیں تھی البتہ مقتول کے لیے ملزمہ کے پاس ایک کشش تھی اور اس کشش کا نام تھا دولت...... مقتول نے بڑی ہوشیاری سے شادی کے بعد ملزمہ کو اپنے فریب کے شیشے میں اتارا اور راتوں رات رقم دوگنا کرنے کا خواب دکھا کر اس کی کوٹھی بکوا دی۔ پھر اسے بے یار ومددگار چھوڑ کر وہ لاہور سے کراچی چلا آیا۔ اپنے تئیں وہ کامیاب رہا بھی۔ اس نے جو منصوبہ بندی کی اس کا ثمر اسے حاصل ہوگیا تھا لہٰذا وہ ملزمہ کو اپنے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ وہ اس کی پروا کیے بغیر جوس کے خالی ڈبے کے مانند حالات کے کوڑے دان میں پھینک کر آگے بڑھ گیا تھا۔''

میں نے ایک بار پھر رک کر حاضرین عدالت کا جائزہ لیا۔ ہر شخص یک ٹک مجھے ہی دیکھے چلا جا رہا تھا۔ میں دوبارہ جج سے مخاطب ہوا۔

''یور آنر! یہ ٹھیک ہے کہ مقتول کے بیمار ذہن سے جنم لینے والے فلسفے کے تحت وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا لیکن اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ وہ فریب اور دھوکا دہی کا مرتکب ہوا تھا اور اس نوعیت کا جذباتی انجام خودکشی یا قتل ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے لیے کسی مثال یا ثبوت کی ضرورت نہیں۔ میری مؤکلہ اپنی محبت میں سچی تھی لہٰذا اس نے مقتول پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ اگر وہ کمزور ذہن کی مالک ہوتی تو اپنے محبوب کی بے وفائی پر خودکشی کر لیتی لیکن اس نے ایسا

نہیں گیا بلکہ ہر لمحہ اس کی محبت اسے یقین دلاتی رہی کہ مقتول ضرور ایک دن لوٹ کر واپس آئے گا تاہم وہ دن کبھی طلوع نہیں ہوا، البتہ ایک روز ملزمہ کو پتا چلا کہ اس کا گمشدہ شوہر کراچی میں ہے اور اس نے ایک اور شادی بھی کرلی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مقتول اس سے ہتھیائی ہوئی دولت کے بل بوتے پر اپنی نئی بیوی کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی گزارنے امریکا جارہا ہے تو وہ فی الفور لاہور سے کراچی پہنچ گئی تاکہ مقتول کو امریکا جانے سے روک سکے لیکن یہاں آکر جب اسے پتا چلا کہ اس کا شوہر صرف خود غرض، فریبی اور دھوکے باز ہی نہیں تھا بلکہ اپنی نئی بیوی کے سامنے تو وہ اسے پہچاننے ہی سے انکاری ہے تو پھر اس کا غصہ اور اشتعال اس انتہا کو پہنچ گیا کہ دماغ اس کے قابو میں نہ رہا اور اس کے حواسِ خمسہ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر سلسلۂ دلائل کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! بعض ناگہانی اشتعال ایسے ہوتے ہیں جن کا ردِعمل فوری ظاہر ہوتا ہے مگر یہ ردِعمل دیرپا نہیں ہوتا جبکہ بعض اشتعال بہت خطرناک اور مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے اشتعال رفتہ رفتہ انسان کے ذہن اور دل کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور انسان ان کے بارے میں جتنا سوچتا ہے، ان کی شدت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کامران نے میری مؤکلہ کو محبت کا فریب دے کر جو اشتعال دلایا تھا، وہ اسی نوعیت کا خطرناک اشتعال تھا۔ اس اشتعال کے اثرات نے ملزمہ کی ساری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ گھریلو زندگی سے محروم ایک تنہا عورت تھی۔ اس کی نہ کوئی اولاد تھی اور نہ ہی کوئی قریبی رشتے دار۔ وہ اپنا دکھ کسی کے سامنے بیان نہیں کرسکتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ مقتول نے اسے دولت وجائداد سے بھی محروم کردیا تھا۔ جب ملزمہ کو مقتول کی اصلیت کا علم ہوا تو اس وقت اس کی جو دلی کیفیت رہی ہوگی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ میرے علم کے مطابق ابھی تک ایسے الفاظ ایجاد بھی نہیں ہوئے جو کسی کے دلی جذبات کی ترجمانی کرسکیں۔ مقتول نے ملزمہ کو محبت سے محروم کیا، ازدواجی زندگی سے محروم کیا، ایک عالیشان کوٹھی سے محروم کیا اور اس سے لوٹے ہوئے مال اور اسباب پر عیاشی کا منصوبہ بھی بنا ڈالا۔ اگر مقتول اپنی نئی بیوی کے ساتھ امریکا فرار ہوجاتا تو میری مؤکلہ اس وقت کٹہرے میں کھڑی انصاف کی بھیک مانگتی دکھائی نہ دیتی۔ اتنا بڑا صدمہ اٹھانے کے بعد اس کا زندہ بچ جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کا ہارٹ فیل ہوجاتا یا وہ اپنے سامنے پھیلی ہوئی ویران اور طویل زندگی پر موت کو ترجیح دیتی۔ جب تک مقتول کا فراڈ کھلا نہیں تھا، ملزمہ بڑی امید کے ساتھ اس کی واپسی کی منتظر تھی لیکن حقیقت سامنے آنے کے بعد اس کے پاس جینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا تھا......“

میں نے ایک بار پھر لمحاتی توقف کیا۔ جج پوری توجہ سے میرے دلائل سن رہا تھا۔ میں نے اپنی محنت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! ملزمہ اپنے بیان میں بتا چکی ہے کہ اس نے ارادۂ قتل کی نیت سے مقتول پر گولی نہیں چلائی تھی اور یہ بات اصولی طور پر درست بھی نظر آتی ہے کیونکہ کامران کا زندہ رہنا نادرہ کے لیے زیادہ ضروری تھا کیونکہ مقتول کی زندگی سے زیادہ اہم وہ رقم تھی جو وہ ملزمہ سے ہتھیا کرلے گیا تھا۔ مقتول کی زندگی کی صورت میں ملزمہ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرسکتی تھی۔ ملزمہ اسی لیے مقتول کو زخمی کرنا چاہتی تھی کہ وہ امریکا نہ جاسکے لیکن مقتول کی بدقسمتی کہ ملزمہ کا نشانہ خطا ہوگیا...... اور......“ میں نے رک کر اس کیس کے انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا پھر جج سے درخواست کی۔

”جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں آئی او صاحب سے چند نہایت ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں جو اس کیس کو اس کے منطقی انجام تک پہنچادیں گے۔“

کسی بھی کیس کے انکوائری آفیسر (تفتیشی افسر) کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

جج نے مجھے آئی او سے سوالات کی اجازت دے دی تو میں اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ جج کا اشارہ پاکر وٹنس باکس میں آگیا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر دوستانہ انداز میں کہا۔

”ماشاء اللہ! آپ پولیس کی وردی میں بہت اسمارٹ لگتے ہیں۔“

”جی شکریہ۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے آئی او کی جھوٹی تعریف نہیں کی تھی۔ وہ واقعی ایک اسمارٹ اور ہینڈسم شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آئی او صاحب! میرے پاس پوسٹ مارٹم کی جو رپورٹ ہے، اس کے مطابق مقتول کامران کی موت سینے میں پیوست ہونے والی گولی سے واقع ہوئی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ

تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’مقتول کو کُل تین گولیاں لگی تھیں جن میں سینے میں پیوست ہونے والی گولی جان لیوا ثابت ہوئی۔ ویسے پیٹ میں گھسنے والی گولی سے بھی بہت زیادہ خون کا اخراج ہوا تھا۔‘‘

’’اوہ یس......‘‘ میں نے اس انداز میں کہا جیسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ ’’خون کے اخراج سے یاد آیا کہ مقتول کی موت کا ایک سبب تیزی سے جسم سے خارج ہونے والا خون بھی تھا۔‘‘ لمحاتی توقف کر کے میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

’’میری معلومات اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق کم وبیش دس بجے رات مقتول پر فائرنگ کی گئی تھی اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت ساڑھے دس کے بعد واقع ہوئی تھی اور جب اسے اسپتال پہنچایا گیا تو وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق مقتول کو لگ بھگ پونے گیارہ بجے اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ کیا آپ اتنے بجے ہی اسپتال پہنچے تھے؟‘‘

’’جی...... جی ہاں۔‘‘ اس نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا پھر سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔

’’ہیئر از پوائنٹ یور آنر!‘‘ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہا۔

’’اپنے پوائنٹ کی وضاحت کریں بیگ صاحب۔‘‘ جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

’’جناب عالی! اہم واقعاتی شہادتیں، میڈیکولیگل آفیسر کی رپورٹ یہ ظاہر کرتی ہے کہ مقتول کامران کی موت جسم سے بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باعث واقع ہوئی ہے۔ ٹھیک دس بجے رات مقتول کے بدن میں تین گولیاں پیوست ہوئیں اور لگ بھگ پونے گیارہ بجے جب اسے اسپتال پہنچایا گیا تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ پولیس نے زخمی مقتول کو فوری طبی امداد دینے کے سلسلے میں مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ پولیس کے محکمے میں اس نوعیت کی بے قاعدگی اور غفلتیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ضابطے میں کارروائی کے نام پر پولیس متاثرہ شخص کی تکلیف کو پس پشت ڈال کر اپنے کام میں لگ جاتی ہے۔ میں نے اسپتال کی رپورٹ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں شہر کے چار نامور ڈاکٹروں سے مقتول کی موت کے حوالے سے سرٹیفکیٹ حاصل کیے ہیں۔ یہ چاروں بہت مستند اور معروف ڈاکٹر ہیں۔ ان کی رپورٹس اور سرٹیفکیٹس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

میں نے متذکرہ بالا سرٹیفکیٹس کی مصدقہ نقول اپنی فائل میں سے نکال کر جج کی طرف بڑھادیں اور کہا۔

’’جناب عالی! ان چاروں ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ اگر مقتول کو فوری طبی امداد فراہم کر دی جاتی تو اس کی جان بچائی جاسکتی تھی لہٰذا......‘‘ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

’’لہٰذا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ مقتول کی موت کی اصل ذمے دار پولیس ہے۔ دیٹس آل یور آنر۔‘‘

عدالت میں سرگوشیوں کی آوازیں ابھریں پھر... چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں شور کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

’’آرڈر، آرڈر......‘‘ جج نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ’’سائلنٹ پلیز...... عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔‘‘ پھر اس نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

’’آپ بیگ صاحب کے اس پوائنٹ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟‘‘

’’جناب عالی! یہ سب کچھ بعد از وقت ہے۔‘‘ وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔ ’’اگر ایسی کوئی بات تھی تو میرے فاضل دوست نے یہ سرٹیفکیٹس وغیرہ پہلے کیوں نہیں پیش کیے؟‘‘

’’دیر آید، درست آید۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’جناب عالی! میں سمجھتا ہوں اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب بھی اور جہاں سے بھی جو حقائق ہاتھ لگیں، انہیں شاملِ مقدمہ کیا جاسکتا ہے حتیٰ کہ اگر لوئر کورٹ سے کسی کیس کا فیصلہ ہو جانے کے بعد بھی کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے تو اس ثبوت کی بنا پر اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی جاسکتی ہے۔‘‘

میرا استدلال اتنا جاندار تھا کہ وکیل استغاثہ اس کی مخالفت میں کچھ بھی نہ کہہ سکا اور بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ جج تھوڑی دیر تک، اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو شاکر علی میرے ساتھ ہی تھا۔ وہ خدا کا بندہ ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اس کے گھر کا کوئی کیس ہو۔ ویسے ریسٹورنٹ لائن میں صبح کا وقت زیادہ بزی نہیں ہوتا لہٰذا اسے عدالت آنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔

''بیگ صاحب! آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔'' شاکر علی میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، اگلی پیشی پر جج فیصلہ سنا دے گا۔''

''مجھے بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ ہمارے حق میں ہی ہوگا۔''

''انشاء اللہ!'' وہ کراری آواز میں بولا۔

ہم پارکنگ لاٹ تک ساتھ آئے اور پھر اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر عدالت سے روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے اس کیس کا فیصلہ سنا دیا۔

شاکر علی کا بے لوث تعاون اور میری انتھک محنت رنگ لے آئی تھی۔ اگرچہ عدالت نے اس پیشی پر نادرہ کو بری تو نہیں کیا تھا تاہم جج کا فیصلہ اس کے حق ہی میں تھا۔ عدالت نے نادرہ کو دو سال کی سزائے محض سنائی تھی اور اس کے ساتھ دیت کے طور پر مقتول کے لواحقین کو ایک لاکھ روپے بھی ادا کرنا تھے۔ یہ خوں بہا ظاہر ہے، مقتول کے بڑے بھائی عدنان کی جیب میں جاتا۔ کامران کے لواحقین میں صرف وہی ایک شخص زندہ تھا۔

وہ بدذات شخص اپنے مرے ہوئے بھائی کی لاش کو بیچ کر پانچ لاکھ روپے کھرے کرنا چاہتا تھا اور اس ڈیل کے بدلے میں وہ مجھے ایک لاکھ روپے دینے کو تیار تھا لیکن میں نے اس کی بے غیرتی کا ایسا آپریشن کیا تھا کہ وہ ایک لاکھ روپے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور...... یہ ایک لاکھ روپے بھی اسے قسطوں کی صورت میں عرصہ دو سال کے عرصے میں ملنا تھے یعنی اس رقم کی چوبیس قسطیں ہوگئی تھیں یعنی پانچ ہزار سے بھی کم قسط بنتی تھی۔ وہ کمیشن ایجنٹ اس میں بھی خوش تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ کامران کی ہڈیاں بھی بیچ کر کھا جاتا۔

اچھائی کی ایک حد ہوتی ہے لیکن برائی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اگر انسان بے غیرتی کی راہ پر چل نکلے تو اسے مہا... بے غیرت بننے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ عدنان کا شمار ایسے ہی افراد میں کیا جا سکتا تھا۔

جب عدالت نے فیصلہ سنایا تو شاکر علی نے مجھ سے کہا تھا۔ ''بیگ صاحب! میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے پھر دیت کی رقم کو ہم یکمشت کیوں نہ ادا کر دیں۔ اس ذلیل انسان سے جتنی جلدی جان چھوٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔''

ذلیل آدمی سے اس کی مراد ''عدنان'' تھا۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاکر صاحب! ہماری نہیں، اس کمینے کی جان ہمارے پاس پھنسی ہوئی ہے۔ اگر ہم نے اسے یکمشت ایک لاکھ کی رقم ادا کر دی تو اس کی جان آسانی سے چھوٹ جائے گی اور میں یہ نہیں چاہتا۔''

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ عدالتی فیصلے کے عین مطابق وہ دو سال تک عدالت کے چکر لگاتا رہے اور ہر ماہ اپنی قسط وصول کر کے جاتا رہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا بندوبست کر دوں گا کہ عدنان کا آپ سے کوئی واسطہ نہ رہے۔ آپ عدالت میں ہر ماہ رقم جمع کرا دیا کریں اور وہ وہاں سے وصول کر لیا کرے۔ عدنان جیسے انسان دشمن کتوں کے سامنے ایک ساتھ بہت سارا گوشت نہیں پھینک دینا چاہیے۔ انہیں ہڈی ہڈی، بوٹی بوٹی کو ترسا کر مارنا چاہیے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں بیگ صاحب! وہ اسی سلوک کا مستحق ہے۔'' شاکر علی تائیدی انداز میں بولا۔ ''میں نے یکمشت ادائیگی کی بات اس لیے کی تھی کہ ہر ماہ اس کم ظرف کے منہ نہ لگنا پڑے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی خواہش کے مطابق بڑا شافی بندوبست کر دوں گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''عدالت کے ذریعے کی جانے والی ادائیگی سب سے زیادہ محفوظ تصور کی جاتی ہے۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوگیا۔

نادرہ کو عدالت نے دو سال قید محض کی سزا سنائی تھی۔ دو سال کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ قلیل مدت پر لگا کر اڑ جاتی ہے لیکن اس کیس کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ یہ قلیل مدت پوری ہونے سے پہلے ہی نادرہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ اسے جیل گئے صرف چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ موسم سرما میں اسے نمونیا ہوگیا۔ چیسٹ انفیکشن اتنا شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکی اور جیل کی چاردیواری سے نکل کر سیدھی قبرستان چلی گئی۔

میرے حساب سے یہ اس کی جسمانی موت تھی۔ اس کی روح تو بہت پہلے اس وقت ختم ہوگئی تھی جب کامران نے اس کے جذبات، احساسات اور ارمانوں کا خون کیا تھا۔ وہ ایک زندہ لاش کی طرح اپنے بدن کا بوجھ اٹھائے زندگی گزار رہی تھی۔ جیل میں اسے اس بوجھ سے نجات مل گئی تھی۔

(تحریر: حُسام بٹ)



اپ ڈیٹ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

اپ ڈیٹ رہنا عہدِ جدید کی ضرورت تو ہے مگر... انسان زندگی کے کن کن معاملات میں الرٹ رہ سکتا ہے... رشتوں اور تعلق کے حوالے سے کبھی علم اور کبھی لاعلمی انسان میں بے چینی پیدا کردیتی ہے۔ وہ بھی عجیب شخص تھا جو اپنی یادوں کو اپ ڈیٹ کرنے نکلا تھا... اور لمبے عرصے تک بے خبری میں زندگی سکون سے گزارتا رہا مگر ایک مقام پر حقائق کے ادراک نے اس کی روح تک کو گھائل کردیا۔ ایسے میں بھلا چین کیسے ممکن تھا۔

دل میں پھانس بن کر اتر جانے والی یادوں کا دلفریب احاطہ

آج تک تو یہی سنا ہے کہ تقدیر انسان پر ہمیشہ ہنستی آئی ہے...... مگر یہاں سوال یہ ہے کہ کیا کبھی وہ انسان پر روئی بھی ہے؟ شاید نہیں، یا پھر ہاں!

ہاں! کسی اور پر تو نہیں، مجھ پر تو ضرور ایک بار روئی ہو گی...... وہ جتنی بھی بے رحم اور بے حس سہی مگر مجھ بدنصیب پر تو وہ بھی دکھی ہوئی ہوگی۔

لیکن ہم نے کبھی غور نہیں کیا ہوگا کہ جو ہمارے ساتھ ہونے والا ہوتا ہے...... اس بارے میں تقدیر ہمیں پہلے سے کچھ اشارے بھی دیتی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو بات تقدیر ہمیں سمجھانا چاہتی ہے، وہ اس وقت تو نہیں، البتہ بعد میں سمجھ آتی ہے مگر وہ بھی ایسے کہ ذہن کی گیرائی سے اس پر غور کریں...... گزرے ہوئے واقعات کو ایک ترتیب کے ساتھ

یاد کر کے دیکھیں تو آپ ایک دم چونک پڑیں گے...... تقدیر کی شکل آپ کو جیتی جاگتی دکھائی دینے لگے گی۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔ نکتہ بہت باریک ہے، امید ہے میری یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ کو یقین آجائے۔

تقدیر کو ہم اکثر کوستے ہیں کہ یہ نامہربان ہوتی ہے مگر یہ عجیب ہے کہ تقدیر نے میرے ساتھ ایک بے رحمی کی میں اس سے بہت خوش ہوا...... ہاں! اس کی بے رحمی پر خوش ہونے والا شاید میں ہی ایک واحد انسان ہوں۔

اس واقعے کو آج پورے پچیس برس بیت چکے ہیں میں نے کسی سے محبت کی تھی۔ بڑی عجیب محبت تھی میری یہ...... جو بچپن سے شروع ہوئی تھی، کھیل کھیل میں، ہنستے ہوئے...... ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے...... پانی کے چھینٹے اڑاتے ہوئے، بچگانہ انداز میں ایک دوسرے کے کپڑے کھینچتے ہوئے اور دھکیلتے ہوئے۔ آہ...... یہ یادیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔

پچاس برس نے بڑی تیزی سے زقند بھری ہے۔ آج بھی مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ کل ہی کی تو بات ہے۔

آج پچیس برس بعد میں ایک خوش حال اور کامیاب زندگی بسر کررہا ہوں۔ اگر کامیابی اسے کہتے ہیں تو سنیے...... میں ایک بڑے سرکاری محکمے میں اچھی پوسٹ پر فائز ہوں۔ گزیٹڈ آفیسر ہوں جسے عرفِ عام میں ''کلاس ون آفیسر'' کہا جاتا ہے۔ اب میری عمر پچاس برس ہے۔ صوبہ سندھ کے ایک دور افتادہ اور ایشیا کے گرم ترین مشہور تاریخی شہر جیکب آباد کا رہنے والا ہوں۔ یہی میری جنم بھومی ہے۔ جاب وغیرہ کے سلسلے میں، آج کل مستقل طور پر کراچی کے ایک پوش علاقے میں مقیم ہوں۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے آخری سال میں ہے، بیٹی...... این ای ڈی یونیورسٹی میں سافٹ ویئر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کررہی ہے۔ سب سے چھوٹا بیٹا ایک بڑی پرائیویٹ یونیورسٹی سے ایم بی اے کررہا ہے۔ میری بیوی ہے، نسرین......

غرضیکہ میرے بچے، میری بیوی...... اب یہی میری کُل کائنات ہیں۔

بہ ظاہر دنیا کی نظروں میں ایک کامیاب اور خوش باش انسان ہوں لیکن میرے اندر دکھ کی آنچ رہتی ہے۔

میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ ہے، میں ہر شے میں ''اپ ڈیٹ'' کا قائل ہوں۔ پرانی شے فوراً ترک کردیتا ہوں، نئی شے اپنا لیتا ہوں، چاہے وہ نئے ماڈل کی گاڑی ہو یا دوسرا کوئی سامان۔ گھر کا پینٹ ہو، خواہ صحیح حالت میں ہی کیوں نہ ہو، فوراً نیا کروالیتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے نئے پن میں ایک خوشی اور راحت ملتی ہے۔

مگر ہاں! ایک چیز کو میں ''اپ ٹو ڈیٹ'' نہیں کرسکا ہوں اور وہ ہیں میری یادیں...... گزری ہوئی یادیں بھلا... یادیں بھی اپ ڈیٹ ہوتی ہیں؟ لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ ایک سودا سا سر میں سما گیا تھا کہ ہاں! اگر میری وہ یادیں جو میرے لیے ایک طرح سے سرمایۂ حیات رکھتی ہیں، وہ بھی تو اپ ڈیٹ ہوسکتی ہیں...... اس کا خیال مجھے ایک امید پر آیا تھا...... ایک ایسی امید جس کے ''بر آنے'' کا مجھے بالکل بھی یقین نہ تھا، یہ ناممکن تھا۔ اس واقعے کو اب پچیس سال بیت چکے تھے مگر یہ بات بھی تو تھی کہ میں پچیس سالوں میں کب شکارپور گیا تھا۔

پھر ایک وعدہ بھی تو تھا، اس وعدے کو یاد کرکے مجھے خود پر ندامت بھی ہوئی کہ وہ اب تک میں پورا نہیں کرسکا تھا یا پھر شاید مایوسی اور زندگی کی مصروفیات نے مجھے اس طرف سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ہاں! ایک اور بات بھی تھی، وہ ایک عجیب ہی وعدہ تھا، بچوں جیسا یا پھر خبطیوں والا۔

بس! یہی وہ لمحہ تھا میرے سوچنے کا جس نے مجھے مہمیز کیا تھا کہ میں کشاں کشاں شکارپور نکل جاؤں، ایک چکر ہی لگا آؤں...... کیا خبر وہ یادیں جو اس شہر سے وابستہ تھیں، وہ ''اپ ٹو ڈیٹ'' ہوچکی ہوں مگر اسے اپ ٹو ڈیٹ کرنے والا اب کہاں تھا۔ وہ تو عرصہ دراز سے اپنے شوہر کے ساتھ پہلے ساؤتھ افریقا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے امریکا جا سیٹل ہوا تھا، اب تو اس کے بھی تین بچے ہوچکے تھے۔

اب کہاں دنیا کا ایک کونا اور کہاں دوسرا اور دور افتادہ کونا...... امریکا سے شکارپور...... ہنسنے والی ہی بات ہے لیکن پتا نہیں کیوں میرے دماغ میں کیا سمائی تھی کہ میں اس دن سے کچھ زیادہ بے چین سا رہنے لگا تھا۔

میں اب تقریباً فارغ البال ہوں، بڑے بیٹے کے لیے رشتے ڈھونڈے جارہے ہیں، اس کے علاوہ میری اور کوئی خاص مصروفیات نہیں ہیں۔

ایک دن میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ جانا چاہیے۔ وہ وعدہ بچوں والا سہی، کیا خبر وہی سچا ثابت ہو۔ اس روز میں نے نسرین سے کہا۔

''مجھے ایک ضروری کام سے اندرونِ سندھ جانا پڑرہا ہے...... اپنے آبائی شہر جیکب آباد......''

''ارے...... خیریت؟ یہ آپ کو اتنے عرصے بعد

وہاں کیا کام پڑ گیا؟‘‘ نسرین کا حیرت کرنا عام سی بات تھی۔ وہ پانچ چھ برس ہی چھوٹی تھی مجھ سے، چالیس کے پیٹے میں بھی وہ ایک خوبرو عورت تھی۔ گورا رنگ، درمیانہ قد اور جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا۔

’’مگر...... وہاں تو اس وقت قیامت خیز گرمی پڑ رہی ہوگی۔ یہ جون کے مہینے میں تمہیں کیا سوجھی وہاں جانے کی؟ ...... وہ آگے بولی۔

میں نے جواب میں ایک گہری ہمکاری بھری تھی۔ میں نے اس سے بہت جھوٹ بولے تھے، مگر وہ ایسے نہیں تھے جس سے مجھے فائدہ اور اسے نقصان ہوا ہو...... یہ روزمرہ اور عمومی نوعیت کے تھے۔ یہ بھی ایسا ہی جھوٹ تھا جو میں نے اس سے بولا۔

’’ہاں! وہ پنشن کا ایک پرانا مسئلہ تھا جو لٹکتا آرہا تھا اب تک لیکن اب معاملہ گلے پڑ گیا ہے۔ ایل پی سی میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ غلطی تو اے جی آفس والوں کی ہے مگر بھگتنی مجھے پڑ رہی ہے۔ جیکب آباد ٹریژری آفس خود جا کر ہی حل کرانا پڑے گا...... ورنہ پنشن اس ماہ نہیں ملے گی، دوبارہ بحال کرانے کے لیے لمبے چوڑے پروسس میں پڑنے سے زیادہ بہتر ہے کہ جیکب آباد کا ایک چکر لگا ہی آؤں۔‘‘

’’کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ...... جیکب آباد میں بچپن کے دن یاد آرہے ہوں؟‘‘

نسرین نے آخر میں شرارت بھرے لہجے میں کہا اور میں اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

’’ارے بھئی تم بھی کیا بات لے کر بیٹھ گئی ہو...... مجھے جیکب آباد جانے سے ہول آرہا ہے مگر جانا تو پڑے گا ہی۔‘‘ میں نے بات ٹال دی، ہمیشہ کی طرح۔

☆☆☆

ایک سوٹ کیس لیے میں رات آٹھ بجے والی لگژری ائرکنڈیشن کوچ میں سوار ہو گیا جس نے اگلے دن مجھے جیکب آباد کے بجائے شکارپور پہنچا دیا۔ ہاں! میں اسی شہر میں ہی اترنا چاہتا تھا۔ یہاں سے صرف تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہی تو جیکب آباد تھا، جو میرا آبائی شہر اور جنم بھومی تھا۔

جیکب آباد کے علاوہ شکارپور کے ساتھ بھی میرا تعلق رہا ہے اور یہی اہم رہا ہے...... کراچی جیسے ایک بڑے اور بھرے پُرے ماڈرن شہر سے اندرونِ سندھ کے اس دور افتادہ شہر میں آنا مجھے بالکل بھی عجیب نہیں لگا تھا مگر افسوس ہوا کہ یہ آج بھی ویسا ہی پسماندہ اور غریب سا ہی شہر رہا۔ یہاں مجھے کوئی ترقی دیکھنے میں نہیں آرہی تھی وہی دھول اڑاتے راستے، تنگ گلیاں، بکھرے بکھرے سے بازار اور بے ہنگم شور مچاتی مارکیٹیں...... سب کچھ ویسا ہی تو تھا جیسا کہ پچیس برس پہلے تھا۔ فقط اتنا ضرور ہوا تھا کہ کچھ پکی عمارتوں کا اضافہ ہو چلا تھا کچھ کچے راستے، پختہ سڑکوں کا منظر پیش کرنے لگے تھے۔ باقی سب ویسا ہی تھا، بھینسوں کی قطاریں اور ان کے پیچھے ڈنڈا گھماتے بھاگتے بچے۔

میں نے شکارپور کے ایک معروف چوک بازار ’’لکھی در‘‘ میں ایک ہوٹل میں کمرا لیا۔ تھوڑا فریش ہوا، ناشتا کیا، اس کے بعد سفر کی تکان اتارنے کے لیے سو گیا۔

جاگا تو سہ پہر کی خبر لایا۔ بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ جون کا مہینا تھا، اندرون سندھ میں تو یوں بھی بہت گرمی پڑتی تھی مگر اس گرمی میں مجھے گم گشتہ یادوں کی آنچ آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں جب ہوٹل سے باہر نکلا تو شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ فضا حبس زدہ سی تھی۔ میں لکھی در سے نکلا اور پھر میرے قدم اس راستے پہ ہو لیے جو پرانے قبرستان کی طرف جاتا تھا لیکن میری منزل یہ نہ تھی۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ ایسے میں میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیات ہونے لگیں۔ میرے اندر کچھ دھڑک رہا تھا۔ سانسوں کا زیروبم بھی بے ترتیب سا ہونے لگا تھا۔ قبرستان کی کچی گارے مٹی والی باؤنڈری وال سے آگے مجھے دائیں جانب ایک بڑا سا دیوہیکل چوبی گیٹ نظر آگیا۔ میں اس کے سامنے جا ٹھہرا...... اور بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری تھرتھرائی ہوئی ہمکاری خارج ہو گئی۔ میں یک ٹک اس بند چوبی گیٹ کو دیکھتا رہا۔ اس کے برابر میں، جو اس سے ملحقہ ہی تھی، بڑی سی دو دروازوں والی دکان بھی ہوا کرتی تھی۔ اس کے دروازے بھی بند تھے۔ وہاں ایک عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔ ایسی خاموشی جس کے پیچھے خوشیوں اور محبت بھرا طوفان سا چھپا ہوا ہو۔ گیٹ اور دکان کے اطراف کی دیواریں سال خوردہ سی نظر آرہی تھیں۔ اندر کے باغات اور رہائشی عمارت کی کیا حالت ہوگی، اس کا بھی میں نے اسی طرح کا اندازہ لگایا۔ میں جانتا تھا کہ اندر اب کچھ بھی نہیں تھا، نہ وہ محبت، نہ وہ رفاقت، نہ وہ لوگ...... اور نہ وہ خود...... صرف ماضی کی وہ گم گشتہ یادیں ہوں گی، جو اب یہاں کی مکین ہو کر رہ گئی تھیں...... لیکن پھر بھی میں یہاں آیا تھا، اپنی یادوں کو اپ ڈیٹ کرنے تاکہ میری یادوں کی پٹاری میں کچھ نیا ہو۔

معاً میں چونکا۔ گیٹ کا بغلی دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ

کے ساتھ کھلا۔ اس کی آواز کراہتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی مجھے...... اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص برآمد ہوا۔ یہ کوئی ملازم یا چوکیدار ٹائپ کا ہی آدمی نظر آیا۔ اس نے عام سی شلوار قمیص اور کاندھوں پر اجرک رکھی ہوئی تھی۔ سر پہ پرانی سی شیشوں کے کام والی سندھی ٹوپی تھی۔ رنگت خاکستری تھی اور چہرہ قدرے لمبوترا۔

وہ میری وضع قطع سے کچھ مرعوب سا ہوا اور بولا۔

''سائیں! خیریت؟ کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' اس کا لب و لہجہ سندھی تھا۔ ''ویسے یہاں اب کوئی نہیں رہتا ہے۔'' اس نے جیسے مجھے سوچتا پا کر اپنا جملہ مکمل کیا تو میں نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ یہاں اب وہ لوگ نہیں رہتے جو پہلے یہاں رہا کرتے تھے۔ اس بات کو پچیس برس بیت چکے ہیں۔ کیا ان کے بعد کوئی یہاں رہنے کو اب تک نہیں آیا ہے؟''

وہ میری بات پر ذرا چونکا اور اپنی آنکھیں قدرے سیچ سیچ مجھے بہ غور تکنے لگا۔ اس کے بعد بولا۔

''ہاؤ سائیں! پچھلوں کا تو مجھے پتا نہیں، پر مجھے یہاں کی چوکیداری سنبھالے ہوئے، پندرہ برس ہو چکے ہیں۔''

''یہ جگہ کن لوگوں نے خریدی تھی ان سے؟''

میں نے اس فیملی کا نام بتایا...... وہ جواب میں بولا۔

''مراد شاہ نے خریدی تھی۔ وہ یہاں کماد (گنا) اور کٹی (پھونس) کا کارخانہ لگانا چاہتا تھا مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا یہ منصوبہ ایسے ہی پڑا رہ گیا۔ بڑے لوگ ہیں جی، بھی سیاست تو بھی جاگیردارانہ معاملات...... بس! اسی میں لگے رہتے ہیں۔''

''تم مستقل ادھر ہی رہتے ہو؟''

''ہاؤ سائیں! اندر ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے وہیں میری زال (بیوی) اور تین بچے رہتے ہیں۔ باقی سائیں! اندر سارا پلاٹ خالی پڑا ہے۔ بے آباد اور ویران...... جیسے برسوں سے ادھر کوئی نہیں رہتا ہو۔'' اس نے کہا۔

میں نے اپنی جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا...... وہ حیرت اور کچھ خوشی کے ملے جلے تاثرات سے نوٹ کو اور مجھے دیکھنے لگا، پھر اسی لہجے میں بولا۔

''یہ...... یہ کیا سائیں؟''

''یہ رکھ لو...... اور اگر برا نہیں مناؤ تو میں ذرا ایک نظر یونہی اس عمارت کو اندر سے گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ میری بات پر ہنس پڑا اور بولا۔ ''سائیں! آپ بھی عجیب ہو...... یہ کوئی عجائب خانہ تو نہیں ہے کہ آپ اس کے گھومنے کے اتنے سارے پیسے دے رہے ہو۔ آپ ویسے ہی گھوم لو۔''

''نہیں...... نہیں، یہ رکھ لو...... ویسے تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر آخر میں پوچھا۔

وہ ابھی تک حیرت اور الجھن میں تھا، جھٹ بولا۔

''میرا نام مختیار علی ہے سائیں! اور آپ......؟''

''میرا نام زمان خان ہے۔ میں جیکب آباد سے تعلق رکھتا ہوں اور اب کافی عرصے سے کراچی میں مقیم ہوں۔ میرا یہاں بھی بہت سا بچپن گزرا ہے...... شکارپور ایک سرکاری کام سے آیا تھا، سوچا ایک نگاہ اس جگہ کو بھی دیکھتا جاؤں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے تو میں چلا جاتا ہوں، یہ پیسے بھی تم بے شک رکھ لو بس ایک خواہش تھی۔''

میں نے دیکھا وہ ایک دم کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا لیکن پھر فوراً بولا۔

''ارے سائیں! مجھے کیا اعتراض ہوگا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں سمجھ گیا آپ کی بات...... بعض انسانوں کو اپنی بچپن کی جگہوں سے بہت عشق ہوتا ہے۔ اللہ سائیں بخشے میرے بابا کو...... وہ کہتا تھا کہ انسان کتنا بھی دور چلا جائے، اسے اپنی پرانی جگہوں کی یاد آتی ضرور ہے۔ آجاؤ سائیں...... آجاؤ...... ! بھلی کری آیو۔'' (خوش آمدید) اس نے مجھے راستہ دیا اور میں نے بغلی گیٹ سے اندر قدم رکھ دیا۔

☆☆☆

برات آچکی تھی جیکب آباد سے۔ پرانا زمانہ تھا، مسافر لاری بک کرائی گئی تھی۔ دونوں گھرانے پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے تھے۔ بڑی فیملیز تھیں۔ براتیوں سے بھری لاری دیوہیکل چوبی گیٹ سے اندر داخل ہو کر ایک وسیع و عریض احاطے کے ایک کونے میں کھڑی ہو چکی تھی۔ براتی اترنے لگے۔ دلہا کو بھی اتارا گیا۔ دلہا اپنے نو بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اُن کے گھر کی یہ پہلی شادی تھی، اس لیے خوب دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ سب آئے تھے۔ ان میں دلہے کا سب سے چھوٹا بھائی زمان بھی تھا۔ اس کی عمر چھ، سات سال کی تھی۔ اسے بھی رنگ برنگا لباس پہنایا گیا تھا، وہ شاہ بالا بنا ہوا تھا۔ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اچھل کود رہا تھا۔

احاطے کے بعد ایک ہزار گز پر باغ پھیلا ہوا تھا۔ بہت وسیع اراضی تھی اس گھر کی جو کسی حویلی کا ہی

منظر پیش کرتی تھی۔ ایک جگہ ٹیوب ویل تھا، ڈھلائی کا کارخانہ اور اس سے ذرا پرے شیشے کا بھی کارخانہ لگا ہوا تھا۔ باؤنڈری وال کے اندر بیرونی طرف آٹھ نو کوارٹر بنے ہوئے تھے جن میں سے کچھ اپنے استعمال میں تھے، باقی کرائے پر اٹھا رکھے تھے۔

شکار پور...... یوں بھی باغات کا شہر کہلاتا تھا۔ چھوٹا اور خوب صورت تھا۔ باغات کے درمیان میں سخت خشک مٹی کی روش تھی جو حویلی نما مکان کے مرکزی گھر تک جاتی تھی۔ باغات میں ہر قسم کے پھل اور سبزی نظر آرہی تھی۔

ننھے ''شاہ بالا'' کو یہ جگہ بہت اچھی لگی تھی مگر اس سے بھی زیادہ اچھی اسے... ایک شے لگی تھی۔ وہ تھی...... شازی...... شازی دلہن کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ پورا نام اس کا شازیہ تھا، جس طرح زمان کا ہوبی......

شازی نے بھی چمک دمک والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چھوٹے بڑے، جوان اور خواتین، بزرگ مرد الگ محفلیں سجا کر بیٹھ گئے۔ براتیوں کی تواضع کی جانے لگی۔ دعوت میں اپنے ہی عزیز رشتے دار اور چند دیگر لوگ شامل تھے۔

زمان اور شازی کی ہنستے کھیلتے دوستی ہوگئی، دونوں ہم عمر جو تھے۔ زمان کو شازی بہت اچھی لگی تھی۔ معصوم صورت صاف اور اجلی رنگت۔ شازی کے گھنے ریشمی بال پیشانی تک اس طرح کٹنگ کیے ہوئے تھے جو اس کے کتابی چہرے پر خوب جچ رہے تھے۔

دونوں امرود کے باغ کے پاس ہی روش پر تین پہیوں کی سائیکل کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ شازی بیٹھی تھی اور زمان اسے دھکا لگا رہا تھا۔ اگر چہ یہ عمل باری باری ہو رہا تھا مگر زمان کی یہی کوشش تھی کہ وہ خود کم اور شازی کو سائیکل میں زیادہ چکر دے۔ وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب دونوں تھک گئے تو وہیں تختے دار ایک چوبی بینچ پر ذرا ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔

باہر کے مہمان جا چکے تھے۔ باقی قریبی اور براتی مہمان اندر موجود تھے۔ جوانوں نے کیرم بورڈ کی محفل سجائی ہوئی تھی۔ بڑے گفتگو میں مصروف تھے اور یہ دونوں باغ میں سخت گرمی میں اپنی الگ چھوٹی سی محفل سجائے بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے، گرمی کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔

''تم لوگ ہماری باجی کو آج لے جاؤ گے نا؟''

زمان جب خالی سائیکل گھسیٹ کر بینچ تک لایا تو شازی امرود کے درخت کی جھکی جھکی شاخوں سے چند امرود توڑ کر اپنی جھولی میں بھر لائی اور اس کے قریب آکر ایک امرود بڑھاتے ہوئے معصوم سے لہجے میں بولی۔

زمان نے اس کی آنکھوں میں اداسی دیکھی تو ایک دم گھبرا سا گیا۔ فوراً اس کا دل رکھنے کے لیے بولا۔

''نن...... نہیں تو۔ پپ...... پتا نہیں مجھے...... امی اور گھر والے تو یہی کہہ رہے تھے کہ ہم آج دلہن کو لینے جارہے ہیں......'' زمان کو اور کوئی جواب نہ سوجھا تو یہی بتا دیا۔

''ہاں نا......... ہماری باجی تمہارے بھائی جان کی دلہن جو ہیں۔'' شازی نے کہا۔

''اچھا......'' زمان کچھ سوچنے لگا پھر اس کا دل رکھنے کے لیے جو سر میں سمایا بول پڑا۔

''تم اگر کہو تو میں امی جان سے ضد کر کے تمہاری باجی کو ساتھ لے جانے سے منع کر دیتا ہوں۔'' اس کی بات پر شازی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں سے جھانکتے موتیوں جیسے سفید دانت زمان کو بھلے محسوس ہوئے۔ وہ اسے ہنستی ہوئی بہت اچھی لگی۔ ابھی اس ''اچھا'' لگنے میں محبت کی جواں سالی قائم نہیں ہوئی تھی اور اس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

بس ایک بیگانہ سی، نامعلوم سی معصومیت تھی، انسیت تھی اور بے نام سی اپنائیت...... بھری دوستی تھی...... جیسے کسی بچے کو کوئی کھلونا اچھا لگتا ہے۔ وہ بھی اسے کھلونے کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ایک پیاری سی اور بولنے والی گڑیا کے روپ میں......

''بدھو! بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے...... ویسے باجی کہہ رہی تھیں کہ ان کے جانے کے بعد ہم سب لوگ بھی تمہاری طرف جیکب آباد آئیں گے۔''

''اچھا......!'' زمان ایک دم خوش ہو گیا۔

تھوڑا ستانے کے بعد دونوں ایک بار پھر کھیل میں مگن ہو گئے۔ دو گھرانوں میں رشتے داری استوار ہو چکی تھی، اسی لیے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ تو یہ دونوں بھی خوب جم کر دوستی لگاتے۔

باغ کے ایک گوشے میں ٹیوب ویل بھی لگا ہوا تھا۔ وہاں سے ٹھنڈا پانی نکلتا تھا۔ دونوں گرمی کی دوپہروں میں آم توڑ کر ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانیوں میں گھس جاتے اور کھیلتے رہتے۔ انہیں بھیگنے کی پروا بھی نہیں ہوتی مگر یہ دھیان ہوتا تھا کہ کپڑے بھیگ جانے سے کہیں بڑوں کی ڈانٹ نہ پڑ جائے، اسی لیے دونوں کپڑے خشک کرنے

کے بعد ہی گھر کی طرف جاتے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن زمان کے بھائی شہریار کا ولیمہ تھا۔ ان دنوں شادی ہال نہیں ہوا کرتے تھے۔ بس گھر کے باہر ٹینٹ لگا کر کھانے پینے کا بندوبست کر دیا جاتا تھا۔

شکار پور سے دلہن کے گھر والے آئے تھے۔ ان میں شازی بھی تھی۔ زمان، شازی کو اور شازی اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ دونوں سارا دن خوب کھیلتے رہے۔ جب جانے لگے تو دونوں اداس ہو گئے۔ شازی کے دماغ میں کیا سمائی کہ اس نے جانے سے انکار کر دیا اور ضد کر کے رونے لگی کہ وہ یہیں رہے گی۔ مجھے زمان سے اور بھی کھیلنا ہے...... میری بھی اس سے شادی کر دو، جس طرح باجی کی کی ہے...... میں ادھر ہی رہوں گی، مجھے کہیں نہیں جانا ہے......

بڑے اس کی بچگانہ بات پر بے اختیار ہنس دیے تھے۔

ہم بچے تھے، ہمیں کیا پتا تھا کہ شادی کیا ہوتی ہے مگر اتنا ضرور جان گئے تھے کہ شادی کے بعد ساتھ رہا جاتا ہے اور اسی ''ساتھ'' کے لیے ہی تو شازی نے یہ بچگانہ ضد کی تھی جو مجھے بھی اچھی لگی تھی۔

بات آئی گئی ہو گئی...... دونوں گھرانوں میں یہ رشتہ بنیادی طور پر ''وٹہ سٹہ'' تھا مگر کسی وجہ سے دلہن کے بھائی کی دلہا کی بہن سے شادی ٹال دی گئی تھی اور ایسا دلہن والوں کی طرف سے ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد دلہا والوں کے، یعنی زمان کے ماں باپ شکار پور پہنچے اور دلہن کے امی ابو کو ان کا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی تو وہ پہلے تو ادھر ادھر کھسکنے لگے۔ یعنی مطلب کی بات سے آنا کانی کرتے رہے اس کے بعد...... اپنی یہ مجبوری بتا کر جان چھڑا لی کہ ہمارا بیٹا ہمارے کہنے میں نہیں ہے، اس نے اس رشتے سے انکار کر دیا ہے۔

زمان کے ماں باپ اس وعدہ خلافی پر چراغ پا ہو گئے پھر روایتی جھگڑوں کا آغاز ہوا...... دلہا پر ماں باپ کی طرف سے یہ دباؤ ڈالا جانے لگا کہ چونکہ ان لوگوں نے اپنے وعدے کے مطابق تمہاری بہن کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا ہے، لہٰذا اب تم ان کی نوبیاہتا بیٹی کو بھی اس کے گھر بھیج دو۔ دلہے میاں ذرا اور طبیعت کے تھے، پتا نہیں یہ اصول پرستی تھی یا خدا خوفی...... انہوں نے یہ کہہ کر حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ اس میں میری بیوی کا کوئی قصور نہیں۔ بات صحیح بھی تھی لیکن ماں باپ اور دیگر بہن بھائیوں نے سمجھایا کہ ہم خدانخواستہ ایسا کچھ نہیں چاہ رہے ہیں۔ یہ محض ان پر ایک دباؤ ڈالنے کے مترادف ہوگا وغیرہ مگر دلہے میاں نہیں مانے۔

وقت گزرتا گیا، جھگڑے چلتے رہے۔ دلہے میاں اپنی بیوی کو لے کر سسرال شکار پور جا بسے۔ وہیں ان کے سسر نے انہیں ایک گھر دے دیا تھا، جو ان کے حویلی نما مکان سے ملحقہ ہی تھا۔ بس درمیان میں ایک چھوٹا سا احاطہ تھا اُس طرف دلہا کا سسرال یعنی دلہن کا میکا اور اس طرف ان کا گھر......

بعد میں ان کے بھی بچے ہوئے۔ دلہے میاں جیکب آباد آتے جاتے رہتے تھے، بیوی بچوں کے ساتھ.... بہ ظاہر سب ٹھیک چل رہا تھا، نہیں چل رہی تھی تو رشتے داری۔ دلوں میں کدورتیں موجود تھیں مگر جوان پود کا رسمی میل جول جاری رہتا تھا۔ ظاہر ہے رشتے داری تو تھی ہی چاہے برائے نام سہی۔

جھگڑوں کے بعد دلہا کے سسرال یعنی ان کے گھر جانے کی سب سے پہلے روایت زمان نے ہی ڈالی تھی۔ وہ لڑکپن میں قدم رکھ چکا تھا، عنفوانِ شباب تھا۔ شازی کے ساتھ بتایا ہوا بچپن اور دوستانہ اب بچگانہ پن سے آگے سرک چکا تھا اور یوں ایک تعلقِ خاطر کا جذبہ بھی پودے سے بڑھ کر تناور درخت بن چکا تھا۔

زمان اب میٹرک میں تھا۔ شازی بھی میٹرک میں تھی۔ زمان خاصا خوبرو تھا۔ رنگت سانولی تھی، سینہ چوڑا اور دراز قامت تھا۔

وہ دھڑکتے دل سے بھائی بھابی کے گھر پہنچا۔ بھائی جان اور بھابی اس سے مل کر خوش ہوئے۔ وہ شام کو جیکب آباد سے شکار پور پہنچا تھا۔ اکیلا تھا۔ بھائی جان کے تین بچے تھے جو زمان کے ساتھ کافی مانوس تھے۔

چائے وغیرہ پینے اور دیگر گھریلو حال احوال کے بعد اس کے بھائی نے اس سے کہا کہ وہ انکل والوں (دلہا کا سسرال) کے ہاں جا کر ان سے سلام دعا کر آئے۔ زمان ابھی کا تو منتظر تھا۔ اسے شازی کے دیدار کا انتظار تھا۔ عرصہ بھی تو بہت ہو گیا تھا اسے دیکھے ہوئے۔ بچپن کے بعد یہ لڑکپن سے عنفوان شباب تک کے ماہ و سال جھگڑوں اور بڑوں کی آپس کی ناراضگی میں ہی بیت گئے تھے۔

اس کی آمد سے بھابی بہت خوش ہوئی تھیں۔ بھائی جان بھی خوش تھے کہ ان کے گھر سے کوئی ان کے سسرال آیا تھا ملنے۔

بھائی جان اسے خود اپنے ساتھ حویلی لے کر گئے تو وہاں سب نے زمان کا پرتپاک استقبال کیا۔ زمان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ کسی نے بھی اسے دیکھ کر منہ نہیں بنایا

تھا۔سب ہی خوش تھے۔اس کی خاطر داری بھی اچھی ہوئی غرضیکہ وہی گھریلو ماحول بن گیا جو آج سے چند سال پہلے تھا۔

بھائی جان اسے وہاں چھوڑ کر پلٹ گئے تھے کہ ان کا چھوٹا بھائی یہاں مگن ہو گیا۔زمان نے شازی کو بھی دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔سروقد،صورت خوب تو تھی ہی اس کی......اب تو دراز قامت اور شباب کی آمد نے اس کے حسن دلفریب کو الگ ہی چاشنی بخش دی تھی۔خوب کس کے باندھی ہوئی گھنے بالوں کی چوٹی اس کی پشت تک لہراتی نظر آ رہی تھی۔آنکھوں میں ویسی ہی شوخی تھی جو وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔اب تو اور ہی بات تھی،اس شوخی میں ایک اور جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ سی بھی آتی محسوس ہوتی تھی۔آنکھوں میں اس کی اب ایک معنی خیزیت تیرتی نظر آتی تھی۔

وہ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔زمان کو یہ سارا ماحول خوشگوار اور راحت آمیز محسوس ہوا،کیونکہ اس ماحول کی ''رنگینی'' ہی اور تھی۔

''کتنی بڑی ہو گئی ہے اور کس قدر خوب صورت بھی۔''

وہ بہ ظاہر اس کے بڑے،بہن بھائیوں سے باتیں کر رہا تھا اور اندر ہی اندر اپنے،شازی کے حسن دل آرا پر تبصرے بھی کیے جا رہا تھا۔اگرچہ خود اس کے لیے بھی وہاں یہی تبصرہ ہوا تھا۔

''ماشاء اللہ زمان بڑا ہو گیا ہے۔''

اس کا وہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔سب موجود تھے،اسی لیے وہ شازی سے کوئی چھوٹی سی عمومی نوعیت کی بات کرتے ہوئے بھی کترا رہا تھا،کچھ اس کی اپنی شرمیلی طبیعت بھی تھی۔اس کے بعد کھانا وغیرہ لگائے جانے کی بات ہونے لگی تو زمان وہاں سے جانے لگا۔اسے کھانا کھانے کا کہا گیا مگر اس نے شکریہ کہا اور نیچی نظریں کیے وہاں سے بھائی کے ہاں آ گیا۔بھائی کے گھر کا دروازہ ان کے گھر کے دروازے سے ہی نظر آ جاتا تھا،درمیان میں فقط ایک چھوٹا سا بیرونی احاطہ تھا۔

بھابی نے اس کے لیے کچھ خاص پکا رکھا تھا،جو اس نے بڑے شوق سے کھایا۔کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے تین چھوٹے بھتیجوں سے کھیلنے اور باتوں میں لگ گیا مگر چور چور سی اور بے چین نظروں سے دروازے کے اس جالی دار شٹر کے پار بھی دیکھتا جاتا،جہاں سے بیرونی احاطے کے پار......بھائی جان کے سسرال کے گھر کا دروازہ نظر آتا تھا۔احاطے میں بتی جل رہی تھی۔وہ بھتیجوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور بھائی جان سے باتوں میں مگن ہو گیا۔

اچانک اسے شٹر کی چرچراہٹ سنائی دی۔اس کا دل بے طرح دھڑکا۔اندر ہی دونوں گھروں کا الحاق ہونے کے باعث بھابی کے بہن بھائیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا،مگر زیادہ تر شازی ہی آتی جاتی تھی۔وہ اپنی ''باجی'' سے بہت مانوس جو تھی۔

شٹر کھلنے کی مخصوص چرچراہٹ اور ٹھک سے بند ہونے کی آواز سن کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ کمرے میں تھا اور وہاں سے لاؤنج قریب تھا۔اس کی نظریں اسی طرف کسی کے شوقِ دیدار کے لیے ٹھہر گئیں۔

''باجی!ننھی آپی لہسن اور ادرک کا پیسٹ مانگ رہی ہیں،کل شامی کباب بنانے ہیں۔تھوڑا کم پڑ گیا تھا۔''

اس کی مترنم آواز گونجی۔زمان بھتیجوں کے ساتھ کمرے میں بیڈ پر لوڈو کھیل رہا تھا،کمرے کے دروازے سے لاؤنج صاف نظر آتا تھا۔زمان گردن موڑے منتظر نظروں سے اسی طرف دیکھتا رہا۔پھر اسے ہوا کا خوشگوار جھونکا سا محسوس ہوا،اس کی جھلک ایسی ہی تھی۔وہ سامنے سے گزری اور اس طرف دیکھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔دونوں کی نظریں فقط ایک لمحے کو چار ہوئی تھیں اور بس......وہ گزرتی چلی گئی۔

''فریج میں رکھا تو تھا،دیکھتی ہوں......'' اسے اپنی بھابی کی آواز سنائی دی۔

''چچا جان!آپ کی باری ہے،جلدی سے چھکا نکالیں اور گوٹ بھگائیں،ورنہ پٹ جائے گی۔'' اچانک اس کے بڑے بھتیجے نے اس سے کہا۔وہ چونکا۔

''یہ مارا......واہ چچا جان!آپ نے صحیح وقت پر چھکا مارا۔'' زمان کے واقعی چھکا نکل جانے پر بڑا بھتیجا خوشی سے چلایا۔

''کیا شور مچایا ہوا ہے؟کون جیت رہا ہے؟''

اسی وقت شازی ہاتھ میں ایک چھوٹا سا باؤل تھامے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اپنے بھانجوں سے بولی۔اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر زمان کا بے طرح دھڑکتا دل جیسے رک گیا......وہ سر اٹھا کر اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگا۔شازی نے بھی اس کی طرف دیکھا۔دونوں کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ مچلی۔

''شازی آنٹی!میں اور زمان چچا جیت رہے ہیں۔'' بڑے بھتیجے نے خوش ہو کر اسے بتایا۔زمان کو جانے کیوں ایک چپ سی لگ گئی تھی۔اس کا گلا خشک ہونے لگا تھا،بس وہ اب لوڈو بورڈ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔اس کی

طبیعت میں بڑی جھجک تھی۔۔بہت احتیاط تھی۔
اچھا بھئی، مبارک ہو...... تمہیں اور تمہارے چچا کو......'' وہ شوخی سے بولی۔زمان کو اس کی آواز نغمے بکھیرتی محسوس ہونے لگی تب ہی اس کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔
''خیر مبارک......''
''شازی آنٹی! آپ بھی آئیے نا، آپ ہماری ساتھی بن جائیں۔'' مخالف گروپ کے ایک چھوٹے بھتیجے نے اس سے فرمائش کر ڈالی۔
''ابھی تو مجھے کام ہے، پھر آتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔زمان کو پل کے پل یوں لگا جیسے...... اس کے وہاں سے جاتے ہی سب کچھ ایک دم بجھ گیا ہو مگر اس کی سوئی...... ''ابھی تو مجھے کام ہے، پھر آتی ہوں۔'' پر اٹک کر رہ گئی۔اس کا مطلب تھا وہ دوبارہ آئے گی۔اس نے خوش امیدی اور بے پایاں مسرت سے سوچا اور اسی خوشی کے لذت بھرے انتظار میں وہ بھی کھیلتا رہا۔اس دوران میں بھابی اندر داخل ہوئیں۔
''زمان! چائے پیو گے، تمہارے بھائی جان کے لیے بنا رہی ہوں۔'' بھابی نے اس سے پوچھا تو وہ بولا۔
''جی بھابی! آدھا کپ پی لوں گا۔'' بھابی چلی گئیں۔
چائے آئی۔زمان چائے کا مگ تھامے اٹھ کر کمرے سے باہر لاؤنج میں آ گیا۔وہاں ایک صوفہ بچھا ہوا تھا، بھائی جان ٹہل رہے تھے۔وہ بیٹھ گیا۔دونوں بھائیوں کے درمیان چائے پینے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔زمان کو شازی کا انتظار تھا۔چائے ختم ہوئی اور باتیں بھی۔
بھائی جان کو ٹہلنے کی عادت تھی' وہ لاؤنج میں ٹہلتے رہے اور بھابی سے باتیں کرتے رہے۔بھتیجوں نے زمان کو اپنے کمرے میں کھینچ لیا اور یہی وہ چاہتا بھی تھا۔وہ ایک بار پھر لوڈو میں مصروف ہو گئے مگر زمان کا دھیان کھیل میں کہاں تھا۔وہ اپنے پیارے بھتیجوں کا دل رکھنے کے لیے ہی کھیل رہا تھا۔اس کی بے چین ساعتیں...... جالی دار شٹر کے دروازے کی آواز پر لگی ہوئی تھیں۔
تھوڑی دیر اور گزری۔اس دوران زمان، شازی کے آنے کی دعائیں مانگتا رہا۔
''شازی آنٹی نے آنا تھا، وہ نہیں آئیں ابھی تک؟'' چھوٹے بھتیجے نے انہیں یاد دلایا۔
''میں انہیں بلا کر لے آتا ہوں۔'' منجھلے نے کہا اور اٹھنے لگا۔زمان کی محتاط پسندی آڑے آ گئی کہ نہ جانے بھائی جان کے سسرال والے کیا سمجھیں، اس نے منجھلے بھتیجے کو منع کر دیا۔
کھیل شروع ہو گیا مگر زمان کو اپنی جانِ جاناں کا انتظار تھا۔تھوڑی دیر اور گزر گئی۔وہ اب غیر دلچسپی سے کھیلنے لگا پھر کچھ سوچ کر پانی پینے کے لیے اٹھا۔فریج لاؤنج میں ہی ایسی جگہ رکھا تھا کہ وہاں سے جالی دار شٹر کے پار دوسرے گھر کے دروازے کو دیکھا جا سکتا تھا جو کھلا ہی رہتا تھا۔ یہاں سے اس کا بڑا صحن صاف نظر آتا تھا۔زمان نے فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور پانی پینے لگا، ساتھ ہی اس کی نظریں ادھر جمی ہوئی تھیں۔جب وہ بوتل واپس رکھنے لگا تو اسے سامنے والے گھر کے صحن کی روشنی بجھتی ہوئی نظر آئی۔
وہ مایوس ہو گیا اور بے دلی سے پلٹا۔
اس کا اب کھیل میں بالکل بھی جی نہیں لگ رہا تھا۔ابھی وہ گیم ختم کرنے ہی والا تھا کہ اچانک شٹر کھلنے اور بند ہونے کی آواز ابھری۔
عاشق بھی کیسے سرپھرے ہوتے ہیں، وہ کتنا کچھ اپنے محبوب پر وار دیتے ہیں۔اپنے پل پل کا سکون، اپنی ساری توجہ، اپنا سارا دھیان، سب ہی کچھ اس ''منتظر آہٹ'' پر فدا کر دیتے ہیں۔محبوب کی ایک ذرا سی آہٹ پر دل کیسے خوشی و مسرت سے دھڑک اٹھتا ہے۔زمان کی بھی کچھ یہی کیفیات تھیں اس وقت...... یہ اس کے لیے آہٹ نہیں تھی، یہ اس کے لیے دنیا جہان کی ایک دولت تھی جو اسے ملنے والی تھی۔
وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ایک خیال یہ بھی آیا کہ ضروری تو نہیں کہ وہی ہو۔اس کی بڑی بہن بھی آتی تھی، کبھی اس کی بھابی کی بھی آمد ہو جاتی تھی۔
''شازی آنٹی آ گئیں......''
بڑے بھتیجے نے جیسے زمان کو مژدۂ جاں فزا سنایا...... وہ واقعی آ گئی تھی۔دروازے پر کھڑی تھی۔زمان کے ہونٹوں پہ شرمیلی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔اس کے من میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔رگ رگ میں سرور و محبت کا ایک نشہ سا طاری ہونے لگا تھا۔ایک بھتیجے نے اسے بیٹھنے کو جگہ دی اور وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔
لوڈو کا بورڈ ان کے درمیان میں رکھا تھا۔چونکہ وہ مخالف گروپ میں تھی اسی لیے اسے زمان کے دائیں ہاتھ کی جانب بیٹھنا پڑا تھا۔اس سے زمان کے دل و دماغ کی کیفیات ناقابلِ بیان ہو رہی تھیں۔وہ وہاں اس کے گھر میں اسے جی بھر کے نہیں دیکھ سکتا تھا، کیونکہ وہاں اس کے بھائی

بہن بھی موجود تھے اور یہ معیوب ہی لگتا مگر یہاں وہ اسے بڑی تسلی اور خوب جی بھر کے دیکھ رہا تھا۔ بھتیجے ابھی چھوٹے اور معصوم تھے۔ انہیں کیا پتا تھا کہ ان کے چچا جان ان کی شازی آنٹی پر کس قدر فریفتہ تھے۔ تاہم اس نے اپنی فطرت کے مطابق یہاں بھی خیال رکھا تھا کہ...... بھتیجے لاکھ بچے سہی مگر اس طرح کے ''غیر معمولی پن'' کو محسوس نہ کریں۔

وہ بڑے سلیقے سے اپنے گھٹنے سکیڑے بیٹھی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کا عام سا گھریلو لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا کھلی کھلی رنگت والا چہرہ زمان کی پُرشوق نظروں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے سیم تن وجود کے ایک ایک حصے کو بہت احتیاط اور لذت قرب کے ملے جلے احساس تلے دیکھ رہا تھا۔ گھٹنے سکیڑ کر بیٹھنے سے شازی کا شاخ گل جیسا بدن بڑا قیامت خیز خم کھائے ہوئے تھا اور وہ اسی خم کی بھول بھلیوں میں جیسے آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس کی موجودگی اس کمرے میں زمان کے لیے ایسی ہی تھی جیسے یہ کمرا نہیں کوئی بت کدہ ہو اور وہ ایک مقدس مورتی تھی، وہ اس کا پجاری تھا۔

شازی اس کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی مگر اس کی بورڈ پر جھکی جھکی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے پھول سی پنکھڑیوں سے نرم وگداز ہونٹوں پر جمی رہنے والی مسکراہٹ سے صاف لگتا تھا کہ وہ زمان کی دلی کیفیات سے واقف تھی اور شرارتاً اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، اسے بے چین کر رہی تھی اور جیسے کہہ رہی تھی۔

''اچھی طرح دیکھ لو...... تمہارے قریب بیٹھی ہوں میں جانتی ہوں کہ تم اپنے بڑوں کو ناراض کر کے صرف میری وجہ سے یہاں آئے ہو۔''

''چچا جان! آپ کی باری ہے۔''

اچانک بھتیجے کی آواز نے اسے چونکا دیا، یہی وہ وقت تھا، جب شازی نے اس کی طرف اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر دیکھا تھا اور اسے اپنی طرف متوجہ پا کر اپنی مسکان گہری کر لی تھی۔

زمان نے باری چلائی اور یوں کھیل آگے بڑھتا گیا کئی مواقعوں پر زمان کو شازی کی گوٹ پیٹنے کا موقع ملا مگر وہ چھوڑ دیتا، کبھی بھول جانے کا بہانہ کرتا اور شازی مسکرا دیتی۔

عورت کو خدا نے اس صلاحیت سے نوازا ہے کہ وہ نگاہ مرد کا مقصد بغیر اس کے کہے یا پوچھے سمجھ لیتی ہے۔ شازی کو بھی اس کا اندازہ تھا۔ زمان اظہارِ محبت کے لیے بے چین تھا۔ بچپن میں دوستی اور کھیل کود کر جوان ہونے کی اور بات تھی مگر اب اس رشتے کو وہ ہمیشہ کا ایک معتبر نام دینا چاہتا تھا۔ جس کی ابھی تک اس میں ہمت نہیں پڑی تھی۔ کیونکہ حالات بھی ایسے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بھابی آ گئیں۔

''چلو بھئی اب آرام کر لو، بہت رات ہو گئی ہے۔'' وہ یہ کہہ کر چلی گئیں۔ گیم ختم کر دیا گیا اور وہ بھی چلی گئی۔

زمان وہ ساری رات نہیں سو سکا۔ اگلے دن صبح وہ دیر سے جاگا تو شازی وہاں بھابی کے پاس کچن میں موجود تھی۔ زمان کا غسل کرنے کا ارادہ تھا مگر شازی کو وہاں پا کر اس نے منہ ہاتھ دھونے پر ہی اکتفا کیا کہ کہیں وہ اس کی دید سے محروم نہ رہے۔

بھابی نے ناشتا بنایا اور سرو شازی نے کیا۔ وہ اسے نظریں بھر بھر دیکھتا رہا، مگر اس بات کا بھی خیال رکھا کہ بھابی وغیرہ کو شبہ نہ ہو۔

وہ دو دنوں کے لیے آیا تھا، جو پورے ہو چکے تھے، مگر اس کا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ سو وہ دل پر جبر کر کے جیکب آباد لوٹ آیا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ اس کا شکارپور جانے کے لیے ہر وقت جی للچاتا رہتا تھا مگر اتنی جلدی جلدی جانا اس کے اپنے گھر والوں کو برا لگتا۔ دو ایک ماہ بعد پھر اس نے موقع بنایا اور بھائی جان اور بھتیجوں سے ملنے کے لیے شکارپور جا پہنچا۔

پھر وہی بے چینی اور اظہارِ منش دیدارِ منش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس بار اس نے پکا تہیہ کر لیا تھا کہ وہ شازی سے اپنی محبت کا اظہار ضرور کر کے رہے گا۔

مگر جب وہاں جاتا تو نہ جانے کیوں اس کی زبان گنگ ہو جاتی پھر اسے ایسا کوئی موقع بھی نہ ملتا کہ وہ دونوں تنہا ہوتے، بھتیجے ساتھ ہوتے، بھائی جان نہیں تو بھابی تو ہوتی ہی تھیں۔ دو دن پھر سے گزر جاتے اور اسے مجبوراً دل پہ بھاری پتھر رکھ کر لوٹنا پڑتا۔

اس نے ایف ایس سی کر لیا۔ شازی بھی ایف ایس سی کر چکی تھی۔ آگے جا کے اُس کا ارادہ سی ایس ایس کرنے کا تھا جبکہ شازی بی اے اور ایم اے کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھی۔

کچھ سال اور سرک گئے۔ ایک دن وہ شکارپور پہنچا۔ وہ شام کو ہی جاتا تھا۔ جیکب آباد سے شکارپور ان دنوں مسافر لاریاں چلا کرتی تھیں جو ایک گھنٹے میں شکارپور

پہنچادیتی تھیں۔
حسب معمول شام کو وہ وہاں پہنچا۔ شکار پور جا کر وہ جیسے جی اٹھتا تھا۔ ابھی بھابی کے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی بے چین اور منتظر نگاہیں، شتر والے دروازے کی طرف اٹھنا شروع ہوگئیں۔ شازی کو زیادہ دیکھنے کا موقع اسے اپنی بھابی کے گھر میں ملا کرتا تھا۔
اگرچہ وہ سلام دعا کے لیے بھائی کے سسرالی ''گوشے'' میں بھی چلا جاتا تھا، وہ ادھر ادھر مصروف تو ہوتی تھی مگر وہ اس کی فقط ایک ہی جھلک دیکھ سکتا تھا۔
بھابی کے گھر آ کر وہ اس کا ہی منتظر رہتا۔ وہ اس روز رات میں آئی۔ اس بار وہ اپنے ساتھ اسکریبل کا بورڈ لائی تھی۔ زمان جیسے خوشی سے جھوم اٹھا۔
''آؤ...... آج اسکریبل کھیلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔
اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ دونوں بیٹھ گئے۔
زمان آج خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا کیونکہ آج صرف وہ دونوں تھے...... آج تقدیر اسے خود پر غیر معمولی طور پر مہربان ہی محسوس ہو رہی تھی۔
بھتیجے کوئی اپنا کھیل کھیل رہے تھے۔ سب سے چھوٹا سو چکا تھا۔ بھائی جان اپنے دستی ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے اور بھابی...... اپنے میکے والے گوشے میں گئی ہوئی تھیں۔ ٹی وی وغیرہ وہیں دیکھا جاتا تھا۔
اسکریبل میں لیٹر جوڑ کر انگریزی میں جملے بنائے جا رہے تھے۔ زمان نے ایک موقعے پر Love کا جملہ بنایا تو شازی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔
''کیسا لگا یہ لفظ؟'' زمان کو موقع ہاتھ آیا۔
''ٹھیک ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔
''صرف ٹھیک ہے؟''
''تو اور کیا کہوں؟''
''مجھے تو یہ لفظ بہت دلنشیں اور پیارا لگتا ہے کیا تمہیں نہیں لگتا؟'' زمان نے مخموری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
''لگتا ہے۔''
''شازی! تمہیں بچپن یاد ہے اپنا؟'' زمان نے اچانک پوچھا۔
''ہاں! بھلا بچپن کسے بھولتا ہے؟''
''وہ والا بچپن جو ہماری دوستی اور جان پہچان کی ابتدا بھی بنا تھا۔''
''ہاں! وہ بھی یاد ہے۔''
''میرے لیے وہی بچپن اہم ہے شازی! جو تمہاری سنگت میں بیتا، گرمی کی دوپہروں میں باغ میں کھیلتے ہوئے، تین پہیوں کی سائیکل چلاتے ہوئے اور ٹیوب ویل کے پانیوں میں نہاتے ہوئے۔'' زمان نے ایک جذب کی سی کیفیت میں کہا تو شازیہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔
''کل ہم اکٹھے باغ کی سیر کریں گے اور ٹیوب ویل کی طرف بھی چلیں گے۔ چلو گی نا؟'' زمان نے اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو شازی نے ایک دم اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سا رنگ امڈ آیا تھا۔
اسی دوران بھابی آگئیں اور گفتگو کا سلسلہ وہیں موقوف ہوگیا۔
اگلے دن...... دوپہر کو زمان کھانا کھا کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ اس کی بے چین اور منتظر نظریں شتر کی طرف بار بار اٹھ رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ شازی آئے گی اور وہ واقعی آگئی۔ باہر ہی کھڑے کھڑے اس نے اسے آنے کا اشارہ کر دیا۔
تھوڑی دیر بعد ہی دونوں باغ میں تھے۔ ماحول اور فضا ایسی تھی کہ گرمی بھی لگتی تھی مگر خنک ہوا بھی محسوس ہوتی تھی۔
دونوں گھوم پھر کر بچپن کی باتیں اور یادیں تازہ کرنے لگے۔ اس کے بعد ٹیوب ویل کی طرف آگئے جس کے موٹے فولادی پائپ سے ٹھنڈا پانی موٹی دھار کی صورت میں گر رہا تھا اور سیمنٹ کے بنے ایک چوڑے کھالے میں جمع ہو رہا تھا۔
''یاد ہے نا...... شازی! ہم دونوں یہاں آیا کرتے تھے اور ہماری جھولیاں آموں سے بھری ہوتی تھیں۔ ہم یہاں نہاتے بھی تھے اور آم بھی کھایا کرتے تھے، بھیگا بھی کرتے تھے۔''
''ہاں! بہت اچھی طرح یاد ہے مجھے......'' اس نے بھی گویا ایک خاص کیفیت کے زیرِ اثر کہا تو جیسے زمان کے دل میں نشہ سا چھانے لگا۔ اس نے اسی وقت شازیہ کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور بہت ڈوبے لہجے میں بولا۔
''شازی! میں مرجاؤں گا تمہارے بغیر...... مم...... مجھے مل جاؤ...... تم مجھے مل جاؤ...... میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''
یہ کہہ کر اس نے شازی کی نرم ملائم جلد والی مخروطی گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ شازی نے جیسے خود کو اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ زمان کے ہونٹ اس کی گردن سے

ہوتے ہوئے شازی کے کان کی لوتک پہنچے تو وہ اسے، اس کے ہونٹوں کی حرارت کی طرح ہی تپتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اسی وقت کہیں قریب ہی کسی کی آواز ابھری......اور دونوں ایک جھٹکے سے الگ ہوگئے۔ کسی مزدور نے اپنے ساتھی کو آواز لگائی تھی۔ کیونکہ وہاں اندر ہی کچھ فاصلے پر ڈھلائی کا کارخانہ چل رہا تھا۔

دونوں سنبھل گئے۔ شازی نے اقرارِ محبت سے پہلے کچھ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''زمان! جانتے ہو نا، ہمارے بڑوں کے آپس میں کس قدر اختلافات ہیں بس میں اسی بات سے ڈرتی ہوں۔''

''اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے شازی!'' زمان نے اپنے لہجے کو پاوثوق بنا کر کہا۔

''ہم تم تو ایک ہیں نا....! بڑوں کے اختلاف بڑے جانیں۔''

''نہیں زمان! میں ایک بیٹی اور ایک بہن بھی ہوں۔'' وہ جیسے زمان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے آزردہ سے لہجے میں بولی زمان دہل گیا۔

''نہیں شازی! ایسا مت کہو......''

''تم رشتہ تو بھیجو، کیا پتا مان لیا جائے۔'' اسے بے حوصلہ پا کر شازی نے مشورہ دیا۔

دونوں اور آگے بڑھے تو ایک برگد کے درخت کے پاس آ کر زمان کو جانے کیا سوجھی کہ وہاں رک گیا۔

وہاں دھاتی کارخانہ ہونے کی وجہ سے...... جا بجا لوہے کے اوزار بھی بکھرے رہتے تھے۔ زمان نے ایک میخ اٹھائی اور برگد کے اس درخت کی چھال اتارنے لگا تھوڑی چھال اتارنے کے بعد اس نے اس کی تہ میں اپنا اور شازی کا نام لکھ دیا۔

''یہ کیا؟'' شازی اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر بولی۔

''شازی!'' زمان نے عجیب سے لہجے میں اس سے کہا۔''شازی! وعدہ کرو......ہم ایک ہوگئے تو اس نام کو روزانہ دیکھا کریں گے۔ یہ ہماری اس دن کی باقاعدہ اعتراف محبت کی نشانی کہلائے گا اور اگر ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تو بھی خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہوں، یہاں ایک بار ضرور آئیں گے اور ہم میں سے جو بھی یہاں آیا، وہ ایک دوسرے کے نام پر ایک کیل ضرور ٹھونکے گا۔''

شازی نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ تاہم بولی۔''اور اگر یہ درخت یہاں تب تک قائم نہ رہا تو......؟''

''نہیں، میں جانتا ہوں، خواہ کچھ بھی ہو جائے، یہاں کے لوگ برگد کے درخت کو کبھی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹاتے......عمارت کا زاویہ بدل لیں گے مگر اس درخت کو نہیں اکھاڑیں گے......یوں بھی برگد کے درخت کی عمر لمبی ہوتی ہے۔''

تقدیر کتنی مہربان ہوتی ہے۔ کہاں تو اتنی بار زمان آتا رہا مگر شازی سے کبھی اس قدر تفصیل اور فرصت سے ملنے کا موقع نہیں ملا اور آج اس بار آیا تو جیسے اس کا محبوب پورا اس کی دسترس میں رہا تھا مگر وہ اس کی رضا چاہتا تھا اور وہ اس کی......

اب ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ زمان کو اپنے گھر جیکب آباد لوٹنے کی جلدی پڑ گئی۔ وہ ماں کو شازی کا رشتہ مانگنے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔

گھر کا لاڈلا تھا۔ اس کی بات پر بھونچال تو آیا مگر پڑھا لکھا خاندان تھا۔ اس کی ضد کے آگے خاموش ہو گیا۔ ماں بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر اپنی جھولی پھیلائے ''دشمن'' گھرانے جا پہنچی مگر وہاں سے صاف انکار ہو گیا۔

پھر تو گھر والے خوب زمان کے لتے لینے لگے کہ اس نے اپنی غرض کی خاطر خاندان بھر کی ناک کٹوادی۔ باپ

تھرمامیٹر

سرکس میں شیشے کے ٹکڑے کھانے کا مظاہرہ کرنے والا فنکار بیمار پڑا تو اسے ایک قریبی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ نرس نے ٹمپریچر کی نیت سے اس کے منہ میں تھرمامیٹر رکھا، سرہانے لگا ہوا چارٹ اتارا تا کہ اس میں مریض کا ٹمپریچر درج کیا جا سکے پھر وہ مریض کی جانب متوجہ ہوئی تو یہ دیکھ کر حیرت و خوف کے باعث سر سے پاؤں تک لرز گئی کہ مریض تھرمامیٹر کو چبا رہا تھا۔

مریض نے نرس کو اپنی جانب متوجہ دیکھا تو مسکرا کر بولا۔''تم نے بہت مزیدار چیز کھلائی ہے سسٹر! دو چار ایسی ہی چیزیں اور دے دو۔''

قلمی تعاون امتیاز احمد۔ منڈی بہاؤالدین

بھی سخت ناراض ہوا۔

"ہم سے پہلے تو وعدہ خلافی کی گئی تھی۔ ہمارا ان پر قرض بھی بنتا تھا، لڑکا نہ دیا، دوسری بیٹی ہی دے کر یہ قرض چکا دیتے۔"

زمان اپنا دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ اس نے بھائی جان اور بھابی کی بھی خوب منتیں کیں، مگر وہ بھی کچھ نہیں کر سکے۔

نہ ہی وہ خود کچھ کر سکا تھا۔ وہ شاید بزدل بھی تھا، یا پھر اسے شازی نے پہلے ہی یہ اشارہ دے دیا تھا کہ وہ ایک بیٹی اور بہن بھی ہے، اسی لیے مجبور ہے۔

وقت گزرا...... ظاہر ہے اب اس کا بھی شکار پور آنا جانا بند ہو گیا تھا کیونکہ دوبارہ سے لڑائی تازہ ہو گئی تھی۔ بھائی جان کو بھی کوسنے اور زن مریدی کے خطابات سے نوازا جانے لگا تھا۔

کچھ دن اور گزرے تو پتا چلا کہ شازی کی شادی کر دی گئی ہے۔ وہ پہلے کوئٹہ اور پھر اپنے شوہر کے ساتھ ہمیشہ کے لیے امریکا چلی گئی تھی۔ زمان کی تو دنیا ہی ویران ہو گئی...... اسے یاد آیا کہ شازی سے آخری ملاقات کس قدر تفصیل سے ہوئی تھی۔ شاید تقدیر خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جدا ہونے سے پہلے یہ دو دیوانے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیں...... اور وہی ہوا تھا۔ تقدیر نے انہیں خوب موقع دیا تھا ملنے کا۔

وہ اپنی تقدیر کے اس "چلن" کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا کہ آیا وہ اس کے لیے "اچھی" ثابت ہوئی تھی یا "بری"۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ خاندان کے بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لڑکوں بالوں کی شادیاں ہو گئیں، حالات بدلنے لگے تھے۔ ہر پڑھا لکھا شخص اندرونِ سندھ سے کوچ کر کے بڑے شہروں میں جا بسا تھا۔

زمان کا بھی دل خراب ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا بوریا بستر سمیٹا اور جیکب آباد کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر کراچی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔

ٹرین شکار پور کے راستے ہی سے گزرتی تھی۔ رات کا وقت تھا جب ٹرین شکار پور کے باغوں اور جنگلوں سے گزرنے لگی تو کھڑکی کی طرف بیٹھے بیٹھے، زمان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

وہ کراچی آ گیا اور پھر ادھر ہی کا ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

اندر قدم رکھتے ہی ایک عجیب سے احساس تلے میرا اندر بھرا سا گیا۔ آج پچیس سال بعد میں نے یہاں قدم رکھا تھا...... ایک فلم سی تھی ماضی کی جو یادوں کی اسکرین پر اچانک ہی ری وائنڈ ہو کے چل پڑی تھی۔

"آہ......" اک کراہ نما غیر مرئی صوتی آواز کو میں نے یہاں بکھرے ہوئے محسوس کیا تھا۔

ـــ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

اک ویرانی سی ویرانی تھی کہ ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا...... کی تفسیر بنا یہ مقام اب جیسے ایک شہر خموشاں کا سا منظر پیش کرتا تھا۔ شام کی بکھری بکھری سرخ لالی میں اجڑا منظر بڑا ہوک زدہ دکھائی دیتا تھا۔

باغ تو اجڑ چکا تھا۔ خشک مٹی والی روشیں جو باغ کے مختلف گوشوں تک جاتی تھیں، وہ اب دھول زدہ بھربھری مٹی میں بدل چکی تھیں۔ ان کی ترتیب بھی میدان کا ہی منظر پیش کرتی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں بچپن میں شازی اور میں تین پہیوں والی سائیکل چلایا کرتے تھے۔

میں اس جگہ کھڑا رہا۔ ٹنڈ منڈ درخت، لکڑی کی وہ بینچیں جہاں میں اور شازی بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے، ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ دیواریں خستہ حال ہو چکی تھیں، بلکہ ان روزنوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔

"سائیں! اس طرف میری کوٹھری نما رہائش گاہ ہے، اگر ضرورت محسوس کرو تو وہیں آ جانا۔ چائے پانی مل جائے گا......"

مختیار علی کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔

"آں...... ہاں! ٹھیک ہے، میں تھوڑا آگے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں سائیں! بے شک سارا گھوم لو۔" اس نے کہا اور اپنے کاندھے پر دھری اجرک کو جھٹکا، پھر ایک طرف چلا گیا۔

میں بوجھل بوجھل قدموں اور بھرے بھرے دل کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

مجھے یاد تھا کہ میں نے کہاں جانا تھا مگر ابھی میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔ جہاں بھابی بھائی جان کا گھر تھا، جہاں وہ جالی دار شٹر والا دروازہ تھا جس کی آہٹ پر ہر وقت میرے کان لگے رہتے تھے۔ وہاں پہنچا تو جیسے وہ بھی ایک کھنڈر اور اجڑے دیار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کتنا کچھ بدل گیا تھا ان پچیس برسوں میں......

میں اس درمیانی احاطے میں آ گیا جہاں میرے

سیدھے ہاتھ پر شازی کا گھر ہوتا تھا اور الٹے ہاتھ پر بھائی اور بھابی جان رہتے تھے۔ اس طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ کوارٹر نما گھر اب بھی قائم تھا۔ بے شک خستہ حال ہو چکا تھا مگر اپنی جگہ قائم تھا۔ اگرچہ وہاں بھی مجھے چھدری چھدری خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

میں سب سے پہلے دائیں ہاتھ والے مکان کی طرف بڑھا تو اس کی سال خوردہ چوکھٹ کے قریب جا کر ہی رکا، اندر سخت تعفن سا اٹھ رہا تھا، شاید آوارہ کتوں، چوہوں اور بلیوں نے اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی۔

باہر سے ہی اندر جابجا جالے اور نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ اور الابلا پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ہول سا اٹھتا تھا دل و دماغ میں کہ کبھی یہاں بھی ایک بھرا پرا خاندان آباد تھا۔

میں پلٹا اور اس طرف آگیا جہاں بھابی بھائی جان کا گھر تھا، وہ کچھ بہتر حالت میں لگتا تھا۔

میں قریب آیا تو وہ شٹر والا دروازہ ٹوٹا پڑا تھا اور چوکھٹ سے الگ ہو کر ایک طرف کو جھول رہا تھا۔ اندر کا ماحول نظر آرہا تھا۔ میں نے اندر قدم رکھ دیا۔

برآمدے کی چھت گر چکی تھی اور بڑا سا سوراخ ہو گیا تھا جہاں سے ڈھلتے شفق کی سرخی اندر پڑ رہی تھی، بائیں ہاتھ پر جو دو کمرے تھے، وہاں گرد و غبار کا ملبا سا پڑا نظر آیا۔ میں آگے ہی بڑھتا رہا اور اس کمرے کے ٹوٹے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا اور اس کمرے کو نظر بھر بھر کر تکتا رہا...... جہاں کبھی میں اور شازی بیٹھ کر لوڈو کھیلا کرتے تھے۔

میری یادیں خوب ”اپ ڈیٹ“ ہو رہی تھیں...... میں آج پچیس برس بعد یہاں ایسے ہی نہیں آیا تھا۔ اپنی سرمایہ حیات یادوں کو ”رنگین“ بنانے آیا تھا۔

اسی وقت شٹر والا دروازہ ”ٹھک“ سے بجا، بالکل اسی طرح جیسے شازی کی آمد پر پچیس سال پہلے بجتا تھا اور میرا دل بری طرح دھڑک اٹھتا تھا، اب بھی ایسا ہی ہوا......

مگر...... اس بار شٹر بجنے سے میرا دل ہی نہیں پورا وجود دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں خاموشی اور ویرانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور ایک گہری ہمکاری بھری اور وہاں سے پلٹ آیا۔

اب میرا رخ ٹیوب ویل کی طرف تھا مگر وہاں کچھ نہیں تھا، سوائے ملبے کے ڈھیر کے۔ ایک درد آمیز یادوں کی ٹیس سی ابھری دل میں کہ وہ بھی کیا دن تھے، جب میں اور شازی یہاں آم توڑ کر لاتے تھے اور نہاتے تھے، شرارتیں کرتے تھے۔ وہاں سے میں اس طرف کو مڑا جہاں برگد کا وہ درخت میری اور شازیہ کی محبت اور اس وعدے کا امین بھی تھا کہ بچھڑنے کے بعد ہم میں سے کسی کو ایک دوسرے کی یاد ستائے گی تو وہ یہاں آکر ایک دوسرے کے نام پر کیل ضرور ٹھونکے گا۔

وہی درد انگیز ٹیس اٹھی میرے سینے میں، جس نے مجھے رنجور سا کر دیا۔

آج میں سوچ رہا تھا، کیسی بچگانہ خواہش کی تھی میں نے بھی...... بھلا ایسا کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ اب شازیہ کو عرصہ ہوا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکا میں مقیم تھی، بھائی اور بھابی والے بھی کئی سال پہلے کینیڈا شفٹ ہو چکے تھے۔ اب کہاں امریکا اور کہاں یہ شکارپور......

میں بے اختیار ہنس دیا مگر ایک خیال کے تحت دل بھی بے طرح دھڑک رہا تھا، سوچنے لگا۔

”کیا شازیہ یہاں آئی ہوگی؟ کیا اس نے وعدے کے مطابق میرے نام پر کیل گاڑی ہوگی؟ اگر ایسا ہوتا تو مجھے چوکیدار مختیار علی تو ضرور بتاتا...... سائیں! آپ کی طرح ایک خاتون بھی یہاں اسی طرح آئی تھیں۔ اس جگہ کو دیکھنے کے لیے...... جس طرح آپ آئے ہیں......“

اس دلیل نے مجھے اداس کر دیا۔ میری یادوں کو ”اپ ڈیٹ“ کرنے کی خواہش ماند پڑنے لگی...... لیکن اب میں ایک نگاہ برگد کا وہ حصہ دیکھے بغیر پلٹ کر کیسے جا سکتا تھا۔ اس کے لیے تو میں نے کراچی سے یہاں تک کا سفر کیا تھا۔ میں دھڑکتے دل سے آگے بڑھا۔ سامنے مجھے وہ درخت نظر آگیا۔ وہ بھی بوڑھا ہو چکا تھا مگر اسی طرح اب تک تنا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے رخ کا اندازہ کیا اور وہاں جا کھڑا ہوا، جدھر میں نے ایک فولادی اوزار کی مدد سے اس کی چھال اتاری تھی، وہاں اب ایک اور چھال نکل آئی تھی۔ چونکہ اس طرف ڈھلائی کا کارخانہ ہوا کرتا تھا، جس کی در و دیوار اب بھی قائم تھیں، اگرچہ بیشتر ڈھے چکی تھیں مگر میں وہاں سے ایک لوہے کا سریا تلاش کر کے اسی جگہ شگاف ڈال کر چھال اتارنے لگا تو اچانک میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ سریا کسی ٹھوس فولادی شے سے ٹکرایا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہاں ایک کیل گڑی ہوئی تھی۔

”مائی گاڈ! مائی گاڈ!“

میرا دل ہولنے لگا۔ میں نے کیل نکال لی اور اس کا جائزہ لیا، کیل زیادہ پرانی نہیں لگتی تھی۔ ورنہ اسے خوب

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

زنگ لگ چکا ہوتا۔

"او، میرے خدا!...... کیا وہ بھی اتنے سال بعد یہاں آئی تھی؟ اپنی یادوں کو "اپ ڈیٹ" کرنے...... شاید چند ماہ پہلے یا پھر چند سال پہلے......" میں اس کیل کو بڑی محبت سے دیکھنے لگا پھر وہ وہیں ٹھونک دی۔ اس کے بعد میں نے اپنے ہینڈ بیگ سے ہتھوڑی اور کیل نکالی جو میں اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔

اس کیل کے ساتھ میں نے وہ کیل بھی ٹھونک دی اور تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور مجھے اس میں کسی کی شوخ سی سرگوشیاں سنائی دیتی محسوس ہونے لگیں۔

شام خاصی جھکنے لگی تھی اور اطراف میں اندھیرا سا پھیلنے لگا تھا۔ میں ایک عجیب سی سرخوشی محسوس کررہا تھا، اس مسرت کی تہ میں اداسی بھی گھلی ہوئی تھی۔ ایک دکھ تھا اور گم گشتہ یادِ ماضی کا درد بھی کروٹیں لے رہا تھا۔

میرے اندر بس ایک ہی گردان ہوئے جارہی تھی۔

"آہ...... وہ آئی تھی، وہ آئی تھی۔ اس نے اس وعدے کو تو پورا کرنے کے لیے امریکا سے یہاں تک کا سفر کیا تھا مگر کیسی عجیب بات تھی کہ اس نے میرا ساتھ دینے سے انکار کردیا تھا...... اس لیے کہ وہ ایک بیٹی بھی تھی اور بہن بھی...... وہ دو پاٹوں کے درمیان میں پس گئی تھی اور جانے کب تک پستی رہی تھی۔ خوش تو اب تک میں بھی نہیں رہا تھا اس کے بغیر......"

میری آنکھیں آبدیدہ سی ہوگئی تھیں۔ میں پلٹ گیا۔ مجھ میں اب وہاں کھڑے رہنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ میں بوجھل بوجھل سے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اسی... دیوہیکل چوبی دروازے کی طرف بڑھنے لگا، جہاں سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ میرا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ میں نے اپنی یادوں کو اپ ڈیٹ کرلیا تھا۔

مگر نہیں...... ابھی تو اپ ڈیٹ ہونے کے لیے اور بھی کچھ رہتا تھا۔ کاش! یہ والی شے اپ ڈیٹ نہ ہوتی......

ہوا یوں کہ جب میں پلٹنے لگا تو وہی مختیار علی وہاں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچ کے تاثرات تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونا چاہا تو وہ بولا۔

"سائیں! معاف کرنا، ایک بات آپ سے پوچھنا تھی۔"

"ہاں...... ہاں کہو، کیا بات ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر خوش اخلاقی سے کہا تو وہ بولا۔

"سائیں! میں نے آپ کو اس بیری درخت کی طرف جاتے دیکھا تھا......"

"تم کہیں اس برگد کے پرانے درخت کی بات تو نہیں کررہے ہو جو ٹیوب ویل کی طرف بنا ہوا ہے؟"

"ہاؤ سائیں! وہی درخت، ہم لوگ اسے بیری درخت کہتے ہیں۔ آپ وہاں کیوں گئے تھے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ اسے ہی دیکھنے آئے تھے۔"

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں صرف وہی دیکھنے نہیں آیا تھا خیر! یہ بتاؤ تم نے یہ کیوں پوچھا؟"

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بجائے میرے سوال کا جواب دینے کے مجھ سے مستفسر ہوا۔ "سائیں! آپ نے وہاں بیری درخت کے پاس اور کچھ دیکھا......"

اس کا لہجہ پل کے پل اسرار بھرا ہو گیا۔

"کیا مطلب؟ ن...... نہیں تو...... مجھے تو اور کچھ نظر نہیں آیا؟"

"آئیں میرے ساتھ......" اس نے کہا اور اسی طرف چل پڑا جدھر وہی برگد کا پرانا درخت تھا۔ میں حیران و پریشان سا اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ چلتے چلتے بولا۔

"یہ بات میرے ذہن میں تھی، میں اسی لیے چونکا تھا مگر اب آپ کا یہ اشتیاق اور بیری درخت کی طرف آپ کو جاتے دیکھا تو سوچا آپ کو اس بات سے آگاہ کردوں۔ شاید وہ عورت آپ کی کوئی رشتے دار ہی لگتی تھی۔"

اس کی "عورت" والی بات پر میں چونکا اور اس کے عقب میں چلتے چلتے پوچھا۔

"عورت؟ کون سی عورت؟"

"آپ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو سب بتائے دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

شام کا اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ ہم خود رو جھاڑیوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور وہاں پہنچ کر رک گئے۔ مختیار علی نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ایک ٹارچ نظر آرہی تھی جو اس نے جلادی۔

"ذرا اس طرف آئیں سائیں!" اس نے کہا اور برگد کے موٹے تنے والے درخت کے عقب میں آگیا۔ میں بھی اسی طرف بڑھا۔ یہاں جابجا خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں...... اس نے روشنی ڈالی تو میں دہل گیا۔

سامنے ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ

مجھے چکر سا آگیا۔

میں نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور خشک پڑتے حلق سے پوچھا۔

''یہ...... یہ...... یہ کس کی قبر ہے؟''

''سائیں! یہ اسی عورت کی قبر ہے جو ایک سال پہلے ہی یہاں آئی تھی۔'' وہ بتانے لگا اور میں اپنی جگہ سن کھڑا رہا۔ وہ آگے بتا رہا تھا۔

''سائیں! یہ عورت بھی آپ کی طرح یہاں آج سے ایک سال پہلے ہی آئی تھی۔ آپ ہی کی عمر کی تھی، مگر خاصی بیمار اور بہت زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ شاید کچھ غموں کی ماری لگتی تھی غریب...... خیر! میری بیوی سے ملی تھی، وہ بھی یہاں آپ کی طرح سیر کرنے آئی تھی۔ میری بیوی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے برگد کے اس درخت کو بھی دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہاں اس نے ایک کیل ٹھونکی اور پتا نہیں پھر کیا ہوا کہ اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ وہ اکیلی تھی۔ ایک چھوٹا سوٹ کیس تھا اس کے ہاتھ میں۔ میری بیوی خیراں نے ہی اسے سنبھالا اور خدا ترسی کی خاطر اسے گھر لے آئی۔ سائیں! پھر وہ یہاں سے گئی نہیں، بہت بیمار تھی، اس کے پاس پیسے بھی تھے، وہ اس نے ہمیں دے دیے تھے۔ وہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ادھر ہی رہنے لگی، یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار تھا...... پھر وہ ایک دن مرگئی۔ اس نے مرنے سے پہلے خیراں سے کہا تھا کہ اسے اسی برگد کے درخت کے پاس ہی دفنا دیا جائے۔ بات مشکل تھی، میں یہ نہیں چاہتا تھا مگر کیا بات تھی کہ خیراں اس سے بہت لگا کھانے لگی تھی۔ اس نے ضد کر کے اسے ادھر ہی دفنا دیا۔ خیراں تو کہتی ہے کہ اسی قبر کی وجہ سے شاید اس اتنی بڑی جگہ کا کچھ نہیں ہو پا رہا ہے۔ جب بھی اسے ڈھانے یا مسمار کرنے کی باتیں ہوتی ہیں، وہ کسی وجہ سے التوا کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

''اس عورت نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' میں نے گم صم سے لہجے میں پوچھا۔ میرے اندر چیختے ہوئے سناٹے اترنے لگے تھے۔

''شازی...... شاید شازیہ۔''

''اور اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ اس حال کو کیسے پہنچی تھی؟'' میں نے بھرے بھرے دل سے پوچھا۔

''بتایا تو تھا خیراں کو کہ وہ امریکا میں رہتی تھی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تو بچوں نے اسے وہاں کسی ادارے میں ڈال دیا۔ پتا نہیں کوئی مشکل سا نام لے رہی تھی۔ پھر یہ وہاں سے یہاں چلی آئی، سب چھوڑ چھاڑ کر...... بچے بھی اسے نہیں پوچھتے تھے۔ بس سائیں! اتنی سی کہانی تھی اس بے چاری کی۔''

وہ اتنا بتا کر چپ ہو گیا۔

''یہ اتنی سی کہانی نہیں ہے مختیار علی!'' بے اختیار میرے لبوں سے گومگو انداز میں نکلا تھا۔

''جی سائیں؟'' وہ بولا۔

''نن...... نہیں، کچھ نہیں۔'' میں نے اپنے حلق میں اترنے والی رقت پر بہ مشکل قابو پایا اور اس سے آخر میں کہا۔

''مختیار علی! اگر تم اعتراض نہ کرو تو میں یہاں کبھی کبھار اس بدنصیب عورت کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آجایا کروں؟''

''ہاؤ سائیں! برابر آؤ، جب بھی آؤ...... آپ کو کوئی نہیں روکے گا۔'' اس نے کہا۔ اس کے بعد میں نے اپنی جیب سے ایک اور نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ رکھ لو، اس کی قبر کی دیکھ بھال کرتے رہا کرو۔''

''ٹھیک ہے سائیں! آپ فکر نہ کرو۔''

''اب تم ایک کام کرو، جلدی سے جا کر پھول لے آؤ۔ وہ میں اس قبر پر چڑھا کر اپنا راستہ لوں تب تک میں وہیں جا کر فاتحہ پڑھتا ہوں۔''

وہ چلا گیا۔ اب مجھے خیال آیا کہ وہ میرا وہم نہیں تھا اور نہ ہی وہ شٹر والا دروازہ ایسے ہی بجا تھا، جبکہ ہوا بھی بند تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کس قدر خوش ہوئی ہوگی اور اس نے اپنی آمد کے لیے ہی شٹر بجایا ہو، جس طرح پچیس سال پہلے وہ بجا کر آتی تھی۔

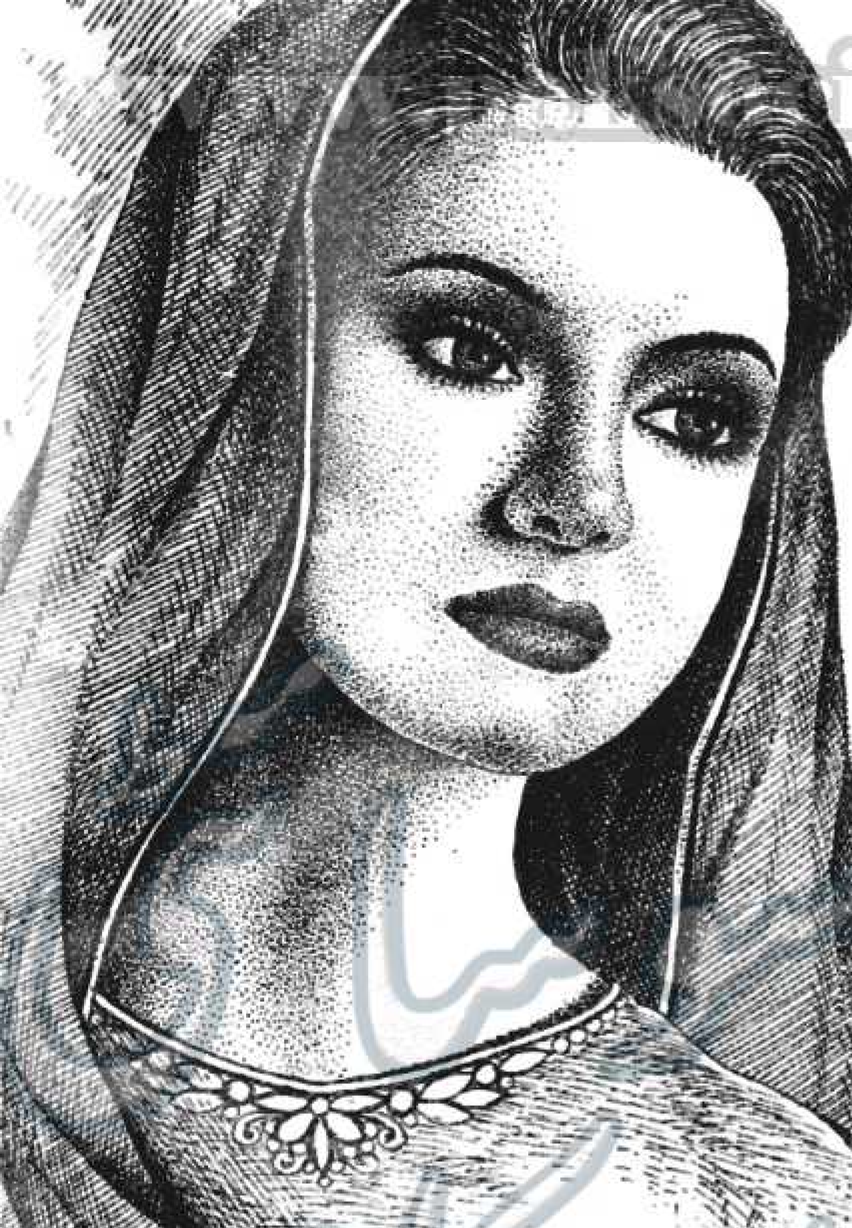
☆☆☆

وہاں سے لوٹنے کے بعد ہوٹل میں آکر میں نے اپنا مختصر سا سامان سنبھالا اور نکل گیا۔

کراچی جانے والی کوچ تیار کھڑی تھی۔ مجھے کھڑکی والی سیٹ ملی تھی۔ میری یادیں ''اپ ڈیٹ'' ہو چکی تھیں مگر ایک گہرے دکھ کے ساتھ کہ شازی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔

اپنی جس خواہش کو میں عجیب اور سرپھری سمجھے ہوئے تھا...... وہ اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ پوری ہو چکی تھی۔

کوچ جب روانہ ہوئی اور شکار پور کے باغات کے درمیان بنی سڑک سے گزرنے لگی تو بے اختیار شازی سے ملنے والا وہ پہلا دن بے اختیار میرے تصور میں اتر آیا۔



محفلِ شعر و سخن

* زوہیب احمد ملک ...... گلستان جوہر، کراچی

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اِک روز کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

* عبدالجبار رومی انصاری ...... چوہنگ، لاہور

مزاجِ شمع میں کچھ ذوق پروانہ بھی ہوتا تھا
کسی کا نام اس محفل میں دیوانہ بھی ہوتا تھا
جہاں الفت نبھانے کے حسین اقرار ہوتے تھے
قریب شہر یارو! ایک ویرانہ بھی ہوتا تھا

* مہتاب احمد ...... حیدرآباد

تمام پیڑ جلا کے خود اپنے ہاتھوں سے
عجیب شخص ہے سایہ تلاش کرتا ہے

* محمد اسحاق انجم ...... کنگن پور، قصور

سندر ہاتھ سنہری زلفیں
کوئی تو ان کو چھوتا ہوگا
پھول سے لب کچھ کہتے ہوں گے
قسمت والا سنتا ہوگا

* ظہیر احمد ...... لاڑکانہ

دیکھیں گے اسے پردۂ افلاک سے آگے
اک نقشِ قدم سرحدِ ادراک سے آگے

* رعنا رضوی ...... یو کے

یہ قفس ہی مجھ کو عزیز ہے یہاں جی تو لوں گا قرار سے
مجھے اب چمن میں نہ لے چلو میں ڈرا ہوا ہوں بہار سے

* وزیر محمد خان ...... بٹل ہزارہ

تمہیں خبر ہی نہیں تم تو لوٹ جاؤ گے
تمہارے ہجر میں لمحہ بھی سال ہوتا ہے

* نگہت علی ...... بہاولپور

ہل جائیں گے ایک بار تو عرشوں کے در و بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کسی دن
آپس کی کسی بات کا ملتا ہی نہیں وقت
ہر بار یہ کہتے ہیں کہ ''بیٹھیں گے کسی دن!''

* محمد کمال انور ...... اورنگی ٹاؤن، کراچی

تنگ آ کے جو ہم بیچنے نکلے وفا فراز
لوگوں نے پھر خلوص کے بھاؤ گرا دیے

* ملائکہ حریم ...... حجرہ شاہ مقیم

ہر کوئی سنگ بکف ہے تو تعجب کیسا
دوست بھی تو نے مرے یار، بنائے تھے بہت

* طلحہ کمال ...... نارتھ کراچی، کراچی

خواہش کی کسی موج کے ریلے میں رہیں گے
شبنم کی طرح، صبح کے میلے میں رہیں گے!
دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ، جھمیلے میں رہیں گے

* مدحت ...... کراچی

سب کے ہونٹوں پہ تبسم تھا میرے قتل کے بعد
جانے کیا سوچ کے روتا رہا قاتل میرا

❄ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
میں بجھ تو گیا ہوں پھر بھی مجھ میں
روشن تیرے نام کا دیا ہے

❄ ناہید اعوان......میانوالی
شمار گردشِ لیل و نہار کرتے ہوئے
گزر چلی ہے ترا انتظار کرتے ہوئے
تمام اہلِ سفر ایک سے نہیں ہوتے
کھلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

❄ محمد اسلم......نواب شاہ
ہر دم دنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں، فرصت رہتی ہے
کرنی ہے تو کھل کے کرو، انکار وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

❄ حکیم سید محمد رضا شاہ بخاری......میانوالی
شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا ہے

❄ ثنا عظیم......کراچی
اس دشتِ بے وفائی میں جائیں کہاں کہ ہم
ہیں اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیے ہوئے
دیکھو تو کتنے چین سے! کس درجہ مطمئن
بیٹھے ہیں ارضِ پاک کو آدھا کیے ہوئے

❄ مشتاق انصاری......راولپنڈی
ہم تو اسیر خواب تھے تعبیر جو بھی تھی
دیوار پر لکھی ہوئی تحریر جو بھی تھی
ہر فرد لاجواب تھا، ہر نقش بے مثال
مل جل کے اپنی قوم کی تصویر جو بھی تھی!

❄ وسیم اکرم......میر شاہ، خانیوال
پھر نیا سال، نئی صبح، نئی امیدیں
اے خدا خیر کی خبروں کے اجالے رکھنا

❄ محمد شہباز اکرم نوئی......ڈھپئی، پاک پتن
پچھلے برس تھا خوف کہ تجھ کو کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دعا ہے تیرا سامنا نہ ہو

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال
تصویر شاہکار وہ لاکھوں میں بک گئی
جس میں بغیر روٹی کے بچہ اداس ہے

❄ نورین منصور......میر پور خاص
آنکھوں کا رنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا!
کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے پہ نقش
پھر یوں ہوا کہ خود مرا چہرہ بدل گیا

❄ محمد الیاس......فیصل آباد
سارے دھنک کے رنگ تھے اس کے لباس میں
خوشبو کے سارے انگ اسے سوچنے میں تھے
ہر بات جانتے ہوئے دل مانتا نہ تھا
ہم جانے اعتبار کے کس مرحلے میں تھے

❄ اعجاز احمد......سرگودھا
ظاہر شمال میں کوئی تارا ہوا تو ہے
اذنِ سفر کا ایک اشارہ ہوا تو ہے
وہ جانے، اس کو خیر خبر ہے بھی یا نہیں!
دل ہم نے اس کے نام پہ وارا ہوا تو ہے

❄ ملک محمد یونس......ضلع خانیوال
دب جاتی ہیں بھوکے بچوں کی سسکیاں
اس شہر میں ایوانوں کا شور بہت ہے

❄ رانا بشیر احمد ایاز......احسان پور، ضلع رحیم یار خان
اداس دل کی ویرانیوں میں بکھر گئے ہیں خواب سارے
یہ میری بستی سے کون گزرا ہے نکھر گئے گلاب سارے

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
وہ بھی عجیب شخص تھا الزام لے گیا
قندیل لے کے آیا تھا اندھوں کے شہر میں

❄ انعم کمال......کراچی
لفظوں کی شرارت ہے
سنبھل کر کچھ بھی لکھنا تم!
محبت ایک لفظ ہے لیکن
یہ اکثر ہو بھی جاتی ہے

❄ احمد حسن عرضی خان......قبولہ شریف بائی پاس
کچھ اس ادا سے میرے ساتھ بے وفائی کر
کہ تیرے بعد مجھے کوئی بے وفا نہ لگے

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
شیشے کا جسم اوڑھ کے نکلے تھے شہر میں
اب کیا کریں گلہ کہ ہوئے پاش پاش ہم

❄ ڈاکٹر ناہید شیخ...... سرگودھا
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پہ اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

❄ محمد اقبال...... کورنگی، کراچی
کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

❄ امتیاز علی...... سرگودھا
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

❄ ماہین فاطمہ...... حجرہ شاہ مقیم
ہر کوئی دیتا ہے زخم گن گن کے بے وجہ
میں کس کس زخم کو اپنا نصیب سمجھوں

❄ داؤد اشفاق...... حجرہ شاہ مقیم
بیتے دنوں کے زخم کریدتا ہوں رات بھر
آئے نہ جن کو نیند، وہ کیا خواب دیکھیں

❄ اشفاق شاہین...... لاہور
یوں خود فریبیوں میں سفر ہو رہا ہے طے
بیٹھے ہیں پل پہ اور نظر ہے بہاؤ پر

❄ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ شرقی
خزاں رکھے گی شہنیوں کو بے ثمر کب تک
یہ دن بھی گزر جائیں گے حوصلہ رکھنا

❄ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

❄ شاکر علی...... اسلام آباد
حسن خود تیرا تعارف ہے زمانے کے لیے
خس و خاشاک سے کچھ دور نہیں ہے شعلہ

❄ محمود اختر...... سیالکوٹ
بدن کو خاک کیا اور لہو کو آب کیا
پھر اس کے بعد مرتب نیا نصاب کیا

❄ ثمینہ ایاز...... پشاور
چاہے جس رستے سے آئے شہزادی
ہم نے شہرِ دل سے دھوپ اٹھا لی ہے

❄ وردا، آریز ملک...... کراچی
تیری خواہش پہ خود میں سمٹا تھا
دیکھ لے اب کہاں کہاں ہوں میں

❄ صغیر آفاق...... لاہور
اشک آنکھوں سے یہ کہہ کر نکلا
تیرے ضبط کی یہ حد ہے؟ حد ہے

❄ محمد قدرت اللہ نیازی...... حکیم ٹاؤن، خانیوال
اپنا بنا کے رکھ لو مجھے تم کہ
سب نے چھوڑ دیا ہے تیرا سمجھ کر

❄ دانش عمیر...... کراچی
یوں بھی نہیں کہ میرے بلانے سے آگیا
جب رہ سکا نہیں تو بہانے سے آگیا

❄ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر...... نئی منڈی سکھیکی
کیا کہیں اس سے کہ جو بات سمجھتا ہی نہیں
وہ تو ملنے کو ملاقات سمجھتا ہی نہیں

❄ محمد امجد ریاض...... چیچہ وطنی
میں بھاگ آیا بڑا بے گانہ پن تھا اس کے لہجے میں
میں کچھ دیر اور اس سے بات کرلیتا تو مر جاتا

❄ جاوید اختر رانا...... پاک پتن شریف
سفر میں بوجھ اٹھانا محال تھا سو ہم
تمام خواب تمہارے ہی در پہ چھوڑ آئے

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان...... ڈاہرانوالہ
صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھریاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

❄ جبران احمد ملک...... کراچی
خاک پر سوتے ہوئے یاد مجھے آتا ہے
جاگتے ہوں گے کہیں اپنے مکانوں میں کہیں

کوپن برائے شمارہ فروری 2017

محفلِ شعر و سخن

نام: ------------------------------

پتا: ------------------------------



میں کیا کروں؟

ش م جمیل

شادی سے پہلے بیوی کی ہر ادا دل کو بھاتی ہے اور حسن تو جیسے گویا شوکیس میں سجا کوئی شوپیس لگتا ہے مگر... دعویٰ یہ ہوتا ہے "تمہارا دل کتنا خوب صورت ہے" اور شادی کے بعد دل تو وہی رہتا ہے پر شوکیس میں رکھا حسن خواہ شوپیس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے عشق کی داستان میں بھی کچھ ایسی ہی سنسنی خیزی کارفرما رہی جس نے اس کے تمام جذبوں کو جرم کی دلدل میں دھکیل دیا۔

ایک ہی طریقۂ واردات پر بیک وقت دو مختلف جرائم کا ارتکاب

وہ جمعے کا دن تھا۔ ابھی صرف دوپہر ہوئی تھی لیکن جارج ابھی سے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آج رات اپنی بیوی کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے اس نے غور سے نئی ویٹرس کو دیکھا۔ اس کے جسم کے پیچ وخم دیکھ کر اس کے منہ سے ایک سرد آہ سی نکلی۔ اگر اس کی بیوی میگی، اس ویٹرس کی نسبت آدھی بھی خوبصورت اور پُرکشش ہوتی تو اسے کبھی قتل جیسے جرم کے بارے میں غور نہ کرنا پڑتا۔ پانچ سال پہلے اس

کی ملاقات میگی سے کیلیفورنیا کی ایک بستی میں ہوئی تھی جہاں وہ تعطیلات گزار رہا تھا اور خود کو وہاں بے حد تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت میگی نے اپنی عمر چونتیس سال بتائی تھی لیکن وہ اسے پچیس سال سے زیادہ نظر نہیں آتی تھی۔ خود اس کی عمر تیس سال تھی۔ میگی کے چہرے پر اس قدر رونق اور شگفتگی تھی کہ وہ اسے پچیس سال سے زائد تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ ایک ہفتے بعد ان کی شادی ہوگئی۔ شادی میں اس قدر عجلت کی وجہ جہاں اس کا احساس تنہائی اور میگی کی خود سپردگی اور شباب تھا، وہیں میگی کی دولت اس کے لیے باعث کشش تھی۔ میگی کو ترکے میں پچاس ہزار ڈالرز کی مالیت کے بانڈ حصص اور نقد رقم ملی تھی۔ جارج نے پانچ سال کے عرصے میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے کام لے کر پچاس ہزار ڈالرز کی رقم کو تقریباً ڈھائی لاکھ ڈالرز بنالیا تھا۔ معاشی طور پر اس کی زندگی بے حد خوشحال اور پُرسکون تھی لیکن......

پانچ سال کے دوران اس کی بیوی آہستہ آہستہ اپنی ذات کی طرف سے بے پروا ہوتی چلی گئی۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے شادی سے پہلے میگی نے اپنی ذات پر شگر کا خول چڑھا رکھا تھا۔ جیسا کہ بادام والی مٹھائی پر شکر کی تہ چڑھی ہوتی ہے اور اب اس کا خول اتر گیا تھا اور اس کی صحیح عمر اس کے سامنے آگئی تھی جو اسے پچاس سال نظر آتی تھی۔ وہ اپنے بالوں کی جانب سے بے پروا رہنے لگی تھی اور اب سرخ بالوں میں بھورے رنگ کے بالوں کی جڑیں چمکنے لگی تھیں۔ اس نے بیوٹی کلینک بھی جانا چھوڑ دیا تھا اور اب تو وہ اکثر چہرے پر کریم لگانا بھی بھول جاتی تھی جس کی وجہ سے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے گرد جھریاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ اکثر ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر تلخ کلامی بھی ہوجاتی تھی جس کا رخ عموماً اس طرح ہوتا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے جارج کہ تم نے میری دولت کے لیے مجھ سے شادی کی تھی۔" میگی تلخ لہجے میں کہتی۔

جارج کہتا۔ "پیسا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ایک مڑے تڑے عمر رسیدہ پچاس ڈالر کے نوٹ کی قیمت اور اہمیت وہی ہوتی ہے جو ایک نئے پچاس ڈالر کے نوٹ کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر میں نے تم سے شادی تمہاری دولت کی وجہ سے کی تھی تو یہ مت بھولو کہ میں نے اس رقم کو پانچ گنا کر دیا ہے۔ اس مکان ہی کو دیکھ لو۔ اس مکان اور اس کے قیمتی فرنیچر اور ان نوادرات کی قیمت جن سے اسے سجایا گیا ہے، پچاس ہزار ڈالرز سے زیادہ ہے اور شادی سے پہلے تمہارے پاس کل پچاس ہزار ڈالرز تھے۔ آیا کچھ سمجھ میں؟"

"میں جانتی ہوں۔" میگی نے چلّا کر کہا۔ "تم مجھے بیوقوف مت سمجھنا۔ ذرا مجھے طلاق دینے کی کوشش کرو۔ قانون مجھے سب سے پہلے میرے پچاس ہزار ڈالرز واپس دلوائے گا اور اس کے بعد جو دولت اور جائداد بچے گی، مجھے اس میں سے آدھا حصہ ملے گا۔ تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔" میگی نے شراب کے نشے میں دانت نکوستے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" جارج نے جواب دیا۔ "میرا انتظار مت کرنا۔ تمہیں اپنا حسن برقرار رکھنے کے لیے نیند کی اشد ضرورت ہے۔ جب نیند آئے تو سوجانا۔"

وہ زور سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اسے احساس تھا کہ وہ کبھی میگی کو طلاق نہیں دے سکے گا۔ ایسا کرنے کی صورت میں اسے میگی کے پچاس ہزار ڈالرز واپس کرنے ہوں گے۔ اس کے بعد اسے اپنی جائداد اور دولت میں سے آدھا حصہ دینا ہوگا۔ یعنی ایک لاکھ ڈالرز۔ اس کے بعد اسے عدالت میں مقدمہ لڑنے پر میگی کے وکیل اور خود اپنے وکیل کی فیس ادا کرنا ہوگی۔ ظاہر ہے اس کے بعد اس کے پاس کیا بچے گا؟ میگی کو طلاق دینے سے خودکشی کرنا زیادہ مناسب تھا۔ اس مسئلے نے اسے پریشان کیا ہوا تھا اور اس مسئلے کا حل اچانک ہی اس کے ذہن میں چھ ماہ قبل آیا تھا۔

وہ تعطیلات گزارنے چند دوستوں کے ہمراہ مچھلی کے شکار کے لیے جھیل پر گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور وہ سب کیبن میں تین روز کے لیے قید ہو کر رہ گئے۔ وقت گزاری کے لیے اس نے رسالے پڑھنے شروع کردیے۔ اسے ایک کہانی بہت پسند آئی۔ ایک شخص اپنی بیوی کو قتل کرنے کا بے حد عمدہ منصوبہ بناتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے ایک مخصوص دن ایک مخصوص کلب میں پوکر کھیلنے لگتا ہے۔ وہ کلب میں اپنے مخصوص وقت پر داخل ہوتا ہے اور ہمیشہ مقررہ وقت پر اٹھتا ہے۔ اس طرح وہ کئی ماہ تک اپنے اس ٹائم ٹیبل پر عمل کرتا ہے۔ کھیل کے دوران جوا کھیلنے والے کمرے سے ملحق آرام کرنے والے کمرے میں دس پندرہ منٹ کے لیے ضرور جاتا ہے۔ آرام کرنے والے کمرے کا ایک بغلی دروازہ ہوتا ہے جس کی مدد سے باہر نکلا جاسکتا تھا۔ وہ کئی ماہ تک اپنے ٹائم ٹیبل پر سختی سے عمل کرتا ہے اور سب لوگ اس سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں۔ ایک روز جب وہ حسبِ معمول آرام کرنے والے

کمرے میں سستانے کے لیے داخل ہوتا ہے تو بغلی دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے اور دس منٹ کے اندر اپنی بیوی کو قتل کر کے واپس اسی بغلی دروازے سے اندر داخل ہوجاتا ہے۔ حسب معمول کھیل میں دوبارہ... شریک ہوجاتا ہے۔ بعد میں پوچھ گچھ کرنے پر جوئے کی میز پر بیٹھنے والے تمام لوگ شہادت دیتے ہیں کہ وہ... ایک لمحے کے لیے بھی کلب سے باہر نہیں گیا پھر بھی قاتل پکڑا جاتا ہے کیونکہ جب وہ اپنی بیوی کو قتل کر کے واپس آرہا ہوتا ہے تو وہ عجلت میں ٹریفک سگنل کی سرخ بتی کو نظر انداز کرتا ہوا ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے اور ایک کانسٹیبل اس خلاف ورزی پر اس کا چالان کر دیتا ہے۔ وہ چالان یہ ثابت کر دیتا ہے کہ قاتل اس مخصوص وقت پر کلب کے اندر موجود نہیں تھا۔

جارج کو یہ کہانی بہت پسند آتی ہے اور اسے اس کہانی میں اپنے مسئلے کا حل بھی مل جاتا ہے۔ وہ ہوبہو اسی منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا اپنا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہانی والے قاتل کی طرح عجلت میں ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے جیسی حماقت نہیں کرے گا۔ یہ چھ ماہ پہلے کی بات تھی۔

اسے احساس تھا کہ کسی شادی شدہ عورت کے قتل پر پولیس سب سے پہلے اس کے شوہر پر قاتل ہونے کا شبہ کرتی ہے لیکن اگر جائے واردات سے غیر حاضری کی شہادت دینے والے چھ سات گواہ موجود ہوں تو پھر پولیس شوہر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جیسا کہ کہانی سے ثابت ہوتا تھا۔ بشرطیکہ شوہر کوئی احمقانہ غلطی نہ کرے۔ اس نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ خود ایسی کوئی غلطی نہیں کرے گا جو اس کے لیے پھانسی کا پھندا ثابت ہو۔

جارج کو بھی جوا کھیلنے سے رغبت نہیں رہی تھی۔ اس نے ایسے کئی جوئے کے اڈوں کے بارے میں سنا ہوا تھا جہاں شرفا بند کمروں میں جوا کھیلتے تھے۔ مثلاً ایک ایسا ہی اڈا یانگی اسٹریٹ پر واقع تھا جو ایک حجام کی دکان کے اندر تھا۔ ایک اور خفیہ اڈا سوانگی کولڈ اسپاٹ کے پیچھے تھا۔ جارج نے ان دونوں اڈوں پر جا کر پوکر کھیلا۔ وہ ایک ماہ تک ہر جمعے کو دونوں جگہ جاتا رہا۔ پھر اس نے محلِ وقوع اور اپنے منصوبے کو مدنظر رکھتے ہوئے سوانگی کے اڈے کو منتخب کرلیا۔ کیونکہ سوانگی کے خفیہ جوئے خانے میں آرام کرنے کا ایک کمرا بھی تھا جس کا ایک بغلی دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کو بھی کوئی استعمال نہیں کرتا تھا۔ پوکر کھیلنے کے دوران عام طور پر ہر شخص کچھ دیر کے لیے کمرے میں آرام کرنے جاتا تھا لیکن جارج نے کبھی کسی کو بغلی دروازہ استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سوانگی کے جوئے خانے میں آنے والے سب شرفا ہوتے تھے اور وہاں ... بازی بھی ہزاروں کی لگتی تھی۔ عام طور پر وہاں جوا کھیلنے کے لیے کم از کم دو ہزار ڈالرز جیب میں ڈالنے ضروری ہوتے تھے۔ پچھلے پانچ ماہ کے دوران کھیل میں وہ کبھی ہار جاتا اور کبھی اس کی جیت ہوتی تھی۔ اب تک وہ مجموعی طور پر سات ہزار ڈالرز نفع میں تھا۔

جہاں وہ باقاعدگی سے ایک مقررہ وقت پر جمعے کی رات کو جوئے خانے میں داخل ہوتا تھا اور رات گئے وہاں سے اٹھتا تھا، وہیں وہ دوسرے کھلاڑیوں کی طرح آرام کرنے والے کمرے میں جا کر آرام بھی ضرور کرتا تھا۔ آرام کا تو صرف بہانہ ہوتا تھا۔ وہ دراصل آنے والے وقت کی ریہرسل کرتا تھا۔ آرام کرنے والے کمرے میں داخل ہو کر وہ احتیاط سے ادھر ادھر دیکھ کر بغلی دروازے سے باہر نکل جاتا اور اپنے پیچھے بغلی دروازے کو بھیڑ دیا کرتا تھا پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر تک سفر کرتا۔ تمام راستے وہ ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیتا۔ کتنے ٹریفک سگنل آتے ہیں۔ کانسٹیبل کہاں کھڑا ہوتا ہے؟ سگنل کی بتی کب سرخ ہوتی ہے اور کتنی دیر سرخ رہتی ہے؟ سفر کے دوران کون سی ممکنہ رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں؟ وہ دس منٹ سے پہلے ہی واپس آجاتا اور بغلی دروازے سے اندر داخل ہو کر دروازے کو دوبارہ بند کر دیتا اور دوبارہ کھیل میں شریک ہوجاتا۔ اس نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ اگر کبھی اسے اپنے منصوبے میں کوئی رکاوٹ آنے کا احساس ہوا تو وہ فوراً اپنے منصوبے کو خیرباد کہہ دے گا اور غیر ضروری خطرہ مول نہیں لے گا۔

پانچ ماہ کے دوران کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اسے اپنا منصوبہ ہر طرح ممکن نظر آیا اور آج کی رات اس نے اپنے منصوبے پر آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی تو اس کی بیوی اپنے معمول کے مطابق مشروب کا آخری گلاس پینے کے بعد نو بجے شب سو جائے گی۔ اگر اس کی قسمت نے ساتھ دیا تو جوئے خانے میں وہی مخصوص ساتھی موجود ہوں گے جو عام طور پر ہر جمعے کو ہوتے ہیں۔ یعنی وہ خود، جوئے خانے کا مالک سوانگی، بشنی، منٹگمری، گورڈن بلیک، پال کورس اور ایک گنجا دھنیا آدمی۔ ساتھ کھیلتے ہوئے ان لوگوں کے درمیان ایک قسم کا دوستانہ تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ پچھلے جمعے

کو ایک نیا آدمی آیا تھا اور اس رات وہ پوکر کھیلنے میں پندرہ سو ڈالرز ہار گیا تھا۔ جارج کو امید تھی کہ اب وہ کبھی اس جوئے خانے کا رخ نہیں کرے گا۔ وہ خود اس نئے آدمی سے آٹھ سو ڈالرز جیتا تھا۔

شام کو دفتر سے گھر آنے کے بعد جارج نے کھانا کھایا اور پھر اخبار پڑھتا رہا۔ میگی کو اس کے معمول کا علم تھا چنانچہ جب وہ آٹھ بجے جوئے خانے جانے کے لیے اٹھا تو میگی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جارج نے اپنی گاڑی حسبِ معمول گلی کی طرف کھڑی کی تا کہ جب وہ بغلی دروازے سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو گلی سنسان ہونے کی وجہ سے کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔ وہاں چند ایک گاڑیاں اور بھی کھڑی ہوا کرتی تھیں۔ گاڑی لاک کر کے وہ گھوم کر سڑک پر آیا اور پھر داخلی دروازے سے سوانکی کولڈ اسپاٹ میں داخل ہو کر ایک دروازے سے جس کے اوپر بڑے بڑے حروف میں ''آفس'' تحریر تھا، جوئے خانے کے اندر داخل ہو گیا۔

''ہیلو جارج!'' اس کے اندر داخل ہوتے ہی بشنی نے چلّا کر کہا۔

''ہیلو!'' جارج نے سر ہلا کر جواب دیا اور کمرے میں موجود دوسروں کو دیکھا۔ ابھی کھیل شروع نہیں ہوا تھا اور صرف چار آدمی ہی آئے تھے۔

''اب ہم پانچ ہو گئے ہیں۔'' بشنی نے کہا۔ ''اب کھیل شروع کیا جا سکتا ہے۔''

سب نے کھیل شروع کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا اور فوراً ہی کھیل شروع کر دیا گیا۔ جارج نے بلف شروع کر دیا اور بازی پچاس پچاس ڈالرز بڑھانے لگا۔ اس کا ارادہ آج چند ہزار ڈالرز ہارنے کا تھا لیکن قسمت اس پر حد درجہ مہربان تھی اور وہ برابر جیتے جا رہا تھا۔ جارج نے نوٹ کیا کہ رات کے بارہ بجے تک تمام کھیلنے والے کم از کم دو دو مرتبہ آرام کرنے والے کمرے میں ستانے کے لیے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی تقویت حاصل ہوئی کیونکہ ایسی صورتِ حال میں بعد میں پولیس کے دریافت کرنے پر کوئی بھی یہ نہیں بتلا سکے گا کہ کون کس وقت اور کتنی دیر کے لیے کھیل کی میز سے غیر حاضر رہا۔

نئی بازی شروع ہونے پر جارج نے اپنے پتے دیکھے۔ اس کے پاس تین اِکے آئے تھے۔ ظاہر ہے وہ بازی اس کی تھی۔ اس نے اپنے پتے میز پر الٹ کر رکھ دیے کیونکہ وہ یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کی طرف سے یہ گمان کرے کہ آج جارج کھیل ختم کر کے جلد ہی گھر واپس چلا گیا۔ جب تک کہ اس کے پتے میز پر موجود تھے کھیلنے والے یہی سمجھتے کہ وہ ضروریات سے فارغ ہونے یا ستانے کے لیے برابر والے کمرے میں گیا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ جلد از جلد گھر جا کر اپنی بیوی کو قتل کر کے اس سے پہلے ہی واپس آ جائے جب اس کی باری آنے والی ہو تا کہ کسی کو بھی اس کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہو سکے اور منٹگمری جو اس کے سیدھے ہاتھ پر بیٹھا ہوا تھا، بعد میں پولیس کو حلفیہ بیان دے سکے کہ جارج نے کھیل کے دوران ایک ہاتھ بھی نہیں چھوڑا۔

پتے میز پر الٹ کر وہ مختصر سی راہداری عبور کرتا ہوا آرام کرنے والے کمرے میں پہنچا اور فوراً ہی بغلی دروازہ کھول کر گلی میں نکل آیا۔ بغلی دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے تا کہ دروازے کے ہینڈل پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہ بننے پائیں۔ اس نے اپنے پیچھے آرام کرنے والے کمرے کا داخلی دروازہ بند کر دیا تھا تا کہ اس کی غیر موجودگی میں اگر کوئی دوسرا شخص اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو دروازہ بند پا کر یہی سمجھ جائے کہ اندر کوئی موجود ہے۔ اس نے دروازے کے لاک میں ایک تنکا پھنسا دیا تا کہ اس کے پیچھے خودکار قفل بند نہ ہو جائے اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جب وہ گلی سے باہر نکل کر سڑک پر آیا تو اس نے نوٹ کیا کہ گلی بالکل سنسان ہے۔ وہاں کوئی دوسری کار یا راہگیر موجود نہیں تھا۔

کار چلاتے ہوئے اس نے رفتار پچیس میل فی گھنٹا سے آگے بڑھنے نہیں دی۔ وہ اس اہم موقع پر تیز رفتاری کے جرم میں چالان کروانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی چلاتے ہوئے سیٹ کے نیچے سے پلاسٹک کور میں لپٹا ہوا ریوالور نکالا اور اسے کھولا۔ اس کے ہاتھوں پر بدستور دستانے موجود تھے۔ اس نے گاڑی اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر روک دی اور باقی فاصلہ اس نے تیز تیز قدموں سے پیدل چلتے ہوئے طے کیا۔ رات بہت ہو چکی تھی۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ جب وہ اپنے مکان کے قریب پہنچا تو اسے پورا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔ کسی بھی مکان میں روشنی نہیں تھی۔ دستانے پہنے پہنے اس نے چابی سے مکان کا داخلی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

خواب گاہ میں داخل ہونے کے بعد اس نے پہلے یہ یقین کر لیا کہ تمام کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے خواب گاہ کی روشنی جلائی۔ اس کی بیوی بے ڈھنگے انداز میں بے حد خوبصورت گاؤن پہنے بستر پر خوابیدہ تھی۔ جارج نے

جیب سے ریوالور نکال کر میگی کے دل کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔ اس کی بیوی آواز نکالے بغیر آنجہانی ہوگئی۔

ریوالور جیب میں واپس رکھنے کے بعد اس نے میگی کے جسم پر پڑی ہوئی چادر کو الٹ دیا تاکہ دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہو جیسے مقتولہ نے مرنے سے پہلے کسی قسم کی آواز سن کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی پھر اس نے اپنی بیوی کی انگلی سے ہیرے کی انگوٹھی نکالی اور پھرتی سے زیورات رکھنے والا ڈبا ڈریسنگ ٹیبل پر الٹ دیا۔ ڈبے سے تمام زیورات باہر نکل پڑے۔ اس نے ان میں سے صرف وہی زیورات اٹھائے جو واقعی قیمتی تھے اور انہیں اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ جب وہ مکان سے باہر نکلا تو اس نے اس بات کا خیال رکھا کہ وہ اپنی کار تک پہنچنے سے پہلے اسٹریٹ لائٹ کی زد میں نہ آئے۔ پڑوس کے کچھ مکانوں میں روشنی نظر آنے لگی تھی۔ غالباً انہوں نے گولی چلنے کی آواز سن لی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ہیڈ لائٹ جلائے بغیر کار ڈرائیو کرنے لگا۔ وہاں سے کافی دور نکلنے کے بعد اس نے اپنی کار کی بتیاں روشن کیں۔

کار چلاتے ہوئے وہ ایک جگہ رک گیا۔ وہ مقام اس نے پہلے ہی سے منتخب کیا ہوا تھا۔ وہاں رک کر اس نے گٹر کی مین لائن میں اپنا ریوالور، دستانے اور زیورات ڈال دیے اور پھر کار میں بیٹھ کر جوئے خانے کی طرف چل دیا۔ اس تمام عمل کے دوران وہ بے حد نروس ہوگیا تھا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ یہ واقعی خطرناک بات تھی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ اس کا کوئی پڑوسی اندھیرے ہی میں جاگ رہا ہو اور وہ گولی چلنے کی آواز سن کر فوراً اپنے مکان سے باہر نکل آیا ہو اور اندھیرے میں اس کے باہر آنے کا انتظار کررہا ہو اور جب وہ اپنے مکان سے باہر نکلا ہو تو اس نے اسے مکان سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہو؟ اگر ایسا ہوا بھی تو وہ کیا کرسکتا تھا؟ ظاہر ہے قتل جیسی حرکت حساب کی غلطی تو تھی نہیں جسے دوبارہ صحیح کیا جاسکتا ہو۔ اب جب وہ اپنے بے حد ممکن منصوبے پر عمل کرچکا تھا تو اسے اس میں بے شمار خامیاں نظر آنے لگی تھیں۔

جب اس نے جوئے خانے کے پاس گلی میں اپنی کار کھڑی کی اور گھڑی میں وقت دیکھا تو اسے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اس سارے کام میں اسے صرف آٹھ منٹ ہی لگے تھے۔ حالانکہ یہ وقفہ عین اس کے منصوبے کے مطابق تھا لیکن وہ آٹھ منٹ اس پر آٹھ صدیوں کی طرح ہی گزرے تھے۔ گاڑی لاک کرکے وہ بغلی دروازے سے آرام کرنے والے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرا بدستور خالی تھا۔ اس نے تالے میں پھنسا ہوا تنکا نکال دیا اور خودکار قفل بند ہوگیا پھر اس نے آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر وہ ٹھیک ٹھاک نظر آرہا تھا، کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو قتل کرکے آرہا ہے۔ اس لیے اسے کسی چیز سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ آرام کرنے والے کمرے سے باہر نکلا اور جوئے کی میز پر جاکر بیٹھ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ کھیل اسی طرح جاری تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کسی نے بھی اسے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی نے بھی اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ کسی نے بھی اسے مشتبہ نظروں سے نہیں گھورا۔

دس منٹ بعد جب اسے یقین ہوگیا کہ کسی کو بھی یہ یاد نہیں رہے گا کہ کھیل کے دوران میز پر سے اٹھ کر گیا تھا تو اندرونی طور پر اس نے بے حد سکون محسوس کیا اور پھر وہ تندہی سے کھیل میں مشغول ہوگیا۔ اس نے دو ہاتھ بڑی بے پروائی سے کھیلے لیکن وہ دونوں ہاتھ جیت گیا۔ قسمت اس پر بے حد مہربان تھی۔

سیکنڈ منٹوں میں، اور منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ جارج نے تصوراتی نظروں سے میگی کو خون میں لت پت بستر پر پڑے دیکھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد پولیس سرجن قتل کے وقت کا تعین کرے گا اور وقت وہی ہوگا جس کے بارے میں سات گواہ حلفیہ بیان دیں گے کہ وہ اس شام کھیل کے دوران ایک منٹ کے لیے بھی اٹھ کر باہر نہیں گیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ آزادی کے احساس سے خود کو کسی پرندے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اس احساس میں شاید اس کی مستقل جیت کا بھی اثر تھا۔ وہ آزادی کے نشے میں مخمور ہوتا جارہا تھا لیکن ابھی سب سے مشکل کام باقی تھا۔ یعنی اپنی بیوی کی لاش کو دریافت کرنا ...... اور پھر پولیس کو اطلاع دینا۔ ان کی مشتبہ نظروں اور ان کے بے شمار سوالوں کا سامنا کرنا۔

ساڑھے چار بجے تک جوئے کی میز پر جیتنے والا وہ واحد کھلاڑی تھا اور ٹو اور منٹگمری کے بھی چند سو ڈالرز اس کی جیب میں تھے۔ بشی تقریباً ایک ہزار ڈالرز خسارے میں تھا۔ سوانگی بھی پانچ سو ڈالرز ہار چکا تھا۔ ساڑھے چار بجے اس نے آخری بازی پر لگے ہوئے چھ سو ڈالرز بھی سمیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیے۔

''آج کی رات میری تھی۔'' جارج نے ایک گہری

سانس لے کر کہا۔
''کیا خیال ہے...... اب کھیل بند کیا جائے؟''
جوئے خانے کے مالک سوانکی نے کہا۔
''کیوں؟'' جارج نے کہا۔ اچانک ہی گھر جانے کے خیال سے اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ آخر وہ کس طرح میگی کی لاش کا اور پھر پولیس والوں کا سامنا کر سکے گا۔ وہ زیادہ وقت اس بلا کو ٹالنا چاہتا تھا۔ ''ابھی بجا ہی کیا ہے؟ رات ابھی جوان ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''چلو یہی سہی۔'' بشتی نے کہا۔ ''تم کب تک جیتتے رہو گے؟'' چنانچہ کھیل پھر شروع ہوا۔ منٹگمری البتہ اٹھ کر گھر چلا گیا۔
ساڑھے پانچ بجے سوانکی نے پھر کہا۔
''تمہارا خیال غلط تھا بشتی۔ آج کی رات واقعی جارج کی ہے۔ آج اسے کوئی بھی نہیں ہرا سکتا۔ مزید کھیلنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری جیبیں ہلکی ہوتی رہیں اور اس کی جیب بھاری ہوتی رہے۔ ممکن ہے آئندہ جمعے کو قسمت اس پر مہربان نہ رہے اور ہم آج کا حساب بے باق کرلیں۔''
جارج بھی مرے ہوئے دل سے کھیل ختم کرنے پر تیار ہو گیا۔ 'اب مجھے میگی کی لاش کو دریافت کرنا ہی پڑے گا۔' جارج نے سوچا اور بے دلی سے نوٹ جیب میں ٹھونستے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صبح چھ بجے پولیس کو فون کر کے بلانے کا خیال کچھ ایسا خوش کن نہیں تھا اور پھر ان نظروں کا مقابلہ کرنا اور ان کے سوالوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا لیکن یہ سب کچھ تو اسے کرنا ہی تھا۔
''تم میرے ساتھ گھر کیوں نہیں چلتے؟'' جارج نے سوانکی کو دعوت دی۔ ''ہم وہاں آج رات کی خوشی میں ایک ایک جام پئیں گے۔''
''نہیں، میں نہیں جا سکتا۔'' سوانکی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے صبح دکان بھی کھولنی ہے۔ اس لیے چند گھنٹے نیند لینا ضروری ہے۔''
''اچھا۔'' جارج نے مُردہ دلی سے کہا اور داخلی دروازے سے باہر نکل آیا پھر وہ آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا ہوا سڑک پر سے گھوم کر گلی میں پہنچا اور گاڑی میں بیٹھ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ صبح صادق ہونے لگی تھی اور رات کی تاریکی آہستہ آہستہ چھٹتی جا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس شہر سے اپنے کاروبار اور اپنی دولت کو سمیٹ کر کسی دوسرے شہر بھاگ جائے اور نئے سرے سے نئی زندگی شروع کرے لیکن اب ایسے کسی فیصلے کا وقت نکل چکا تھا۔
فرار مجرم کے خلاف سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے۔
جوئے خانے سے اس کے مکان کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ جارج آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا ہوا گھر کے قریب پہنچا۔ جب اپنے گھر کے سامنے اسے پولیس کی جیپ کھڑی ہوئی نظر آگئی تو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ کیا میگی کی لاش دریافت کی جا چکی ہے؟ کیا کسی پڑوسی نے گولی چلنے کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع دے دی تھی؟
چلو اچھا ہی ہوا۔ اس نے سوچا۔ جن کٹھن لمحات سے وہ اس قدر خوفزدہ تھا، وہ بیت چکے تھے۔ اب اسے میگی کی لاش دریافت کرنے کا کام نہیں کرنا پڑے گا۔ اس نے پولیس کی گاڑی کی طرف دیکھے بغیر ہی گاڑی اپنے مکان کے احاطے میں داخل کردی اور بٹن دبا کر گیراج کا دروازہ کھولا پھر وہ گاڑی گیراج کے اندر لے گیا۔ اس کے پیچھے گیراج کا دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا۔
گاڑی سے نکل کر جارج نے چابی کی مدد سے وہ دروازہ کھولا جو کچن...... میں کھلتا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ اندر چپے چپے پر پولیس والے موجود ہوں گے لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اندر تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنے معمولات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک کیتلی میں کافی کا پانی بھر کر گیس کے چولہے پر رکھ دی۔ فوراً اسے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ باہر پولیس والے کال بیل بجا رہے تھے۔ وہ کمروں میں روشنی کرتا ہوا دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھولا۔ باہر دو پولیس والے کھڑے تھے۔
''صبح بخیر۔'' جارج نے خوش دلی سے کہا۔
''اندر آجائیں...... کچن میں، میں نے ابھی ابھی کافی کا پانی گرم ہونے کے لیے رکھا ہے۔ میری بیوی ابھی بیدار نہیں ہوئی۔'' پھر اس نے ایک معذرتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں ابھی ابھی گھر واپس آیا ہوں۔''
''ہم جانتے ہیں۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔ ''ہم باہر تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ باہر کافی سردی تھی۔ کافی کا ایک ایک کپ پینے میں کوئی حرج نہیں۔''
وہ دونوں جارج کے پیچھے پیچھے کچن...... میں داخل ہوئے۔ کیتلی میں پانی ابل رہا تھا۔ اس نے سگھڑ شوہروں کی طرح تین پیالیاں اٹھائیں۔ پھر کریم اور چینی نکالی اور پھر چمچے...... پھر کچھ سوچ کر اس نے ڈبل روٹی نکالی اور ریفریجریٹر کی طرف بڑھا تا کہ اندر سے مکھن نکال سکے۔ اس دوران میں پولیس والے خاموش رہے۔ جارج

کو ان کی خاموشی سے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔

آخر یہ لوگ کیوں خاموش ہیں؟ یہ سوالات کیوں نہیں کرتے؟ کیا میگی کی لاش مردہ خانے لے جائی جا چکی ہے؟ اور کیا یہ دو پولیس والے اس لیے چھوڑ دیے گئے ہیں تاکہ وہ اسے یہ اندوہناک خبر سنا سکیں؟

''آج قسمت مجھ پر مہربان تھی۔'' جارج نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ ''تمام رات میں چند دوستوں کے ساتھ پوکر کھیلتا رہا اور اتنی رقم جیت کر اٹھا کہ اپنی بیوی کے لیے ایک منک کا کوٹ خرید سکوں۔ میرا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ فوراً میگی کو جگا کر یہ خوشخبری سنا دوں لیکن نہیں، وہ اس طرح جگانے پر مجھے کچا کھا جائے گی۔ اگر میں اس سے یہ کہوں کہ آج میں بری طرح ہار کر آیا ہوں تو کیسا رہے گا؟''

پولیس والے جواب میں خاموش رہے۔ اس نے کافی بنائی اور پھر ڈبل روٹی پر مکھن لگا کر ان کے سامنے سلائس رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ تشریف رکھیں اور اب بتائیں آخر آپ کا آنا کیسے ہوا؟ سلائس لیں۔ تکلف کی بات نہیں۔''

''شکریہ۔'' ایک پولیس والے نے کہا اور دونوں نے ہاتھ بڑھا کر مکھن لگے ہوئے سلائس اٹھا لیے۔

''تو تم آج ساری رات پوکر کھیلتے رہے؟'' ایک پولیس والے نے کہا۔

''ہاں!'' جارج نے جواب دیا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے پوکر کھیلنا قانون کے خلاف ہو لیکن آج کل ہر شخص پوکر کھیلتا ہے۔''

''ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔'' پولیس والے نے جواب دیا۔ ''یہ بتایئے کہ آج کھیل کس وقت شروع ہوا تھا اور کب ختم ہوا؟''

''کھیل پچھلی رات تقریباً نو بجے شروع ہوا تھا۔'' جارج نے جواب دیا۔ ''اور ابھی کوئی دس منٹ پہلے ختم ہوا ہے۔''

''کیا تم تمام وقت وہاں موجود رہے؟'' دوسرا سوال ہوا۔

''ہاں!'' جارج نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

''کیوں؟''

اس نے بھولپن سے ایک پولیس والے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہ بھی کہہ دے کہ وہ یہ سب کچھ ثابت کر سکتا ہے۔ جوئے خانے میں تمام وقت موجود رہنے کی گواہی سات آدمی دے سکتے ہیں لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔

''خوب!'' پولیس والے نے کہا۔ ''تمہارے علاوہ دوسرے کھیلنے والے کون کون تھے؟'' تیسرا سوال ہوا۔

''اوہ چھوڑیئے جناب۔'' جارج نے اس طرح کہا جیسے وہ اس سوال کا مطلب غلط سمجھ رہا ہو۔ ''ہم لوگ کوئی جوا نہیں کھیل رہے تھے۔ بس وقت گزاری کے لیے پوکر کھیل رہے تھے۔ ہم ہر جمعے کی رات پوکر کھیلتے ہیں۔ اگر آپ میرے ذریعے دوسروں کو پھنسانا چاہتے ہیں تو میں ہرگز اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' پولیس والے نے اسے یقین دلایا۔ ''ہمیں ان تمام لوگوں کے نام پہلے ہی معلوم ہیں جو آج رات کھیل رہے تھے۔ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا مسٹر منٹگمری اس وقت وہاں موجود تھے جب کھیل شروع ہوا تھا...... یعنی نو بجے؟''

''منٹگمری!'' جارج نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''جی ہاں! بلکہ وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے اور میرے آنے ہی پر کھیل شروع ہوا تھا۔''

''اچھا تو وہ کس وقت وہاں سے گئے؟''

''کون منٹگمری؟'' جارج نے دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے دریافت کیا۔ سوالات کا رخ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

''جی ہاں۔ ہم مسٹر منٹگمری ہی کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔''

''منٹگمری......'' جارج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''وہ کھیل ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی گھر چلا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ساڑھے چار بجے تھے لیکن آپ یہ سوالات کس لیے پوچھ رہے ہیں؟''

''کیا کھیل کے دوران کسی وقت وہ اٹھ کر باہر گئے تھے؟'' پولیس والے نے اس کے سوال کو نظرانداز کر دیا۔

''نہیں۔'' جارج نے جواب دیا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی اٹھ کر باہر نہیں گیا۔''

''کیا تم عدالت کے سامنے حلف اٹھا سکو گے؟''

''کیوں نہیں۔'' جارج نے کچھ جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ہر وقت وہاں موجود رہا اور ہم میں سے کوئی بھی کھیل کے دوران اٹھ کر باہر نہیں گیا۔ میں حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں لیکن ان تمام سوالوں کا مقصد؟''

''تو ٹھیک ہے۔'' پولیس والے نے مکھن لگے ہوئے سلائس کا آخری لقمہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اتنے ہی پُریقین ہو تو یقیناً دوسرے بھی یہی بیان دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا

کہ منٹگمری کا بیان درست ہے۔ ہمیں اس کے بیان پر یقین تھا لیکن پھر بھی یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی تصدیق کرتے۔''

دونوں پولیس والے کافی کا آخری گھونٹ لے کر کھڑے ہوگئے۔

''لیکن...... لیکن یہ سب کیا ہے؟ آپ لوگ کس بات کی تصدیق کرنا چاہتے تھے؟'' جارج نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں...... منٹگمری کی بیوی کو آج رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔'' پولیس والے نے جواب دیا۔

''نہیں!'' جارج کو یقین نہیں آیا۔

''اب تمہارے بیان کے بعد یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اس کی بیوی کو ہلاک کرنے والا کوئی چور تھا۔'' پولیس والے نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ''لیکن گھر میں سے صرف زیورات ہی غائب ہیں، چور نے اور کوئی چیز چرانے کی زحمت نہیں کی۔ اس کے علاوہ ہمیں ایسی کوئی نشانی نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ چور زبردستی کسی کھڑکی کے ذریعے مکان کے اندر داخل ہوا تھا۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارا یہ سوچنا قدرتی امر تھا کہ قاتل دراصل منٹگمری ہے۔ لیکن جائے واردات سے عدم موجودگی ثابت کرنے والے سات گواہوں کی موجودگی میں ہمیں اپنے اس خیال سے دستبردار ہونا پڑے گا۔''

جارج نقاہت سے کرسی پر گر گیا۔

''تمہیں یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔'' دوسرے پولیس والے نے کہا۔ ''کیا منٹگمری تمہارا بہت گہرا دوست ہے؟''

''ہاں!'' جارج نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''چھ ماہ قبل ہم دونوں ساتھ ہی مچھلیوں کا شکار کھیلنے جھیل پر گئے تھے اور بارش کی وجہ سے تین روز تک کیبن میں قید ہوکر رہ گئے تھے۔ پھر ہم نے ایک ساتھ پوکر کھیلنا شروع کیا تھا۔ اس وقت سے آج تک ہم دونوں ہر جمعے کو باقاعدگی سے پوکر کھیل رہے ہیں۔''

'اور چھ ماہ قبل کیبن میں قید ہونے کے بعد ہم دونوں نے ایک ہی رسالے میں ایک ہی کہانی پڑھ کر ایک ساتھ اپنی بیویوں کو قتل کرنے کے لیے ایک ہی جیسا منصوبہ بنایا تھا۔' جارج نے تلخی کے ساتھ سوچا۔ وہ یہ سب کچھ پولیس والوں کو کیسے بتاتا؟

''اوہ...... بڑا افسوس ہوا۔'' پولیس والا کہہ رہا تھا۔ ''آپ تشریف رکھیں، ہم خود ہی باہر نکل جائیں گے۔''

چند لمحوں بعد جارج کو دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ بہ مشکل تمام وہ کرسی پر سے اٹھا اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ پولیس والے مکان سے باہر جا چکے ہیں، وہ اندھوں کی طرح فرنیچر سے ٹکراتا ہوا دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے خواب گاہ میں پہنچا۔

خواب گاہ کی روشنی جلی ہوئی تھی۔ میگی اسی طرح لیٹی ہوئی تھی جس طرح وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب خواب گاہ کے دروازے میں گھستے ہی دیکھنے والے کو یہ احساس ہو جاتا کہ میگی مر چکی ہے اور خون سے لت پت چادر خشک ہو چکی تھی۔

''خدا تمہارا بیڑا غرق کرے منٹگمری۔'' جارج نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں بھی آج ہی کی رات ملی تھی اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لیے۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا بستر کی طرف بڑھا۔ اس کی نظریں اپنی بیوی کی لاش پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا ذہن اس لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے بے شمار منصوبوں پر غور کر رہا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنے اصلی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے پولیس کو فون کر کے بلا لے لیکن...... وہ یہ کس طرح ثابت کرتا کہ منٹگمری کی بیوی اور اس کی بیوی کا قاتل ایک ہی چور تھا جس نے پہلے منٹگمری کی بیوی کو قتل کیا اور پھر اس کی بیوی کو۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ دونوں عورتوں کا قتل ایک ہی ریوالور سے ہوا ہو اور دونوں کے جسموں میں ایک ہی ریوالور سے چلائی ہوئی گولیاں برآمد ہوں۔ شاید پہلے ایسا ممکن ہوتا لیکن اب ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

سب سے ٹیڑھا مسئلہ جو اس کے سامنے تھا، وہ یہ تھا کہ دو شوہروں کی دو بیویاں ایک ہی رات میں قتل ہوتی ہیں۔ دونوں کا قتل ہو بہو ایک جیسا ہے۔ دونوں شوہروں کی جائے واردات سے غیر موجودگی ایک ہی قسم کی شہادت مہیا کرتی ہے۔ بلکہ اس کی اپنی شہادت نے منٹگمری کو ہر قسم کے شک وشبہے سے بالاتر کر دیا تھا اور پھر دونوں قتل ایک ہی رات ہوتے ہیں۔ دونوں شوہر ایک ہی رات ایک ہی جوئے خانے میں ایک ساتھ جوا کھیل رہے تھے۔ البتہ منٹگمری کو اس پر ایک فوقیت حاصل تھی۔ اس نے اپنی بیوی کی لاش کو اس سے پہلے ہی دریافت کر کے اپنی جان بچالی تھی لیکن کیا پولیس اس قدر مشابہت محسوس کرنے کے بعد بھی منٹگمری کو چھوڑ دے گی؟

''مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں؟'' جارج نے سرگوشی میں اپنی بیوی کی لاش کو گھورتے ہوئے کہا۔

ماروی

محی الدین نواب

اڑتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چھپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت واحترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے پرموڑ پر کہیں حسن وعشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین وسنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ وآہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رقابتوں اور رفاقتوں کا ایک دل ربا سلسلہ





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی فتی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبرا سمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبرا سمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برباد کر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مر مٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ، جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر مینی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ مراد نے مرینہ کو قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ مرینہ اور مراد میں پھر ان بن ہوگئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرالیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوادیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کرلیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوالیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِ اقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہوجاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک

حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارضِ اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی منگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہوگیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ عابی دو اغوا کاروں کے ساتھ دنیا دیکھنے خود چلا گیا۔ عابی رومانیہ آگیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ماروی اچانک انتقال کر گئی۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی جس کا نام ماروی رکھا گیا۔ وہ بچی حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی۔ مراد نے ماسٹر کو بوبو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کرلیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرالیے۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمے داری عابی کے سپرد کردی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھالیا۔ عابی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ مگر وہ انجان دشمن عابی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان نون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابی کی غیر معمولی طاقت کے زیرِ اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ تاریک دنیا کی ایک لڑکی نیلماں دینِ اسلام کی طرف مائل ہو کر عابی کی مددگار بن گئی۔ وہ جب چاہتی تھی ٹرانسپیرنٹ ہو کے غائب ہو جاتی تھی۔ نیلماں نے عابی کی مدد کر کے ان نون کو پکڑوا دیا تاہم نیلماں کا باپ باروا اسے عابی کے شکنجے سے نکال کرلے گیا۔ شیطان کو ماننے والی اور اس کی پرستش کرنے والی لارا نامی عورت نے پھانس کر مراد سے نکاح کرلیا تاہم نیلماں کی بدولت مراد پر اس کی اصلیت کھل گئی۔ لارا مراد کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مراد اپنے ہونے والے بچے کو شیطان کے سائے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ نیلماں کو لارا کے متعلق آگہی ملی۔ اس نے مراد کو لارا کے پاس پہنچا دیا۔ لارا نے اپنے بچاؤ کے لیے مراد پر گولی چلائی مگر نیلماں سامنے آگئی۔ وہ جان سے گئی۔ مراد کی گولی سے لارا زخمی ہوئی مگر اس کے ہاتھ نہ آسکی۔ لارا نے ایک لڑکے کو جنم دیا اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مراد کو کوئی دوسرا بچہ حوالے کردیا۔ مراد دھوکا کھا گیا۔ وہ لاوارث بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر اس کی پرورش کرنے لگا۔ ماروی کو حقیقت کا علم تھا مگر اس نے رضائے الٰہی سے یہ بات عیاں نہیں کی۔ عابی نے ریسلر کا روپ دھار کر ٹیلی پیتھی جاننے والوں باروا اور امیی مالا کو ہلاک کیا۔ دشمن عابی کو ٹریپ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ادھر بن زیان نے دو جادوگروں کے ذریعے اپنے اور لارا کے گرد حفاظتی حصار قائم کروالیا۔ عابی کو ایک لڑکی پسند آگئی اور اس نے اس سے شادی کرلی ان پر حملہ ہوا مگر وہ دونوں محفوظ رہے۔ دراصل وہ لڑکی علوم فلکیات کے ماہر کی بیٹی تھی۔ ادھر لارا کی خدمات پر مامور جادوگر نے لارا کو شکنجے میں لے لیا۔ اس نے عابی اور ماروی سے مدد مانگی۔ عابی نے جادوگر کو ہلاک کردیا۔ لارا اور بن زیان آپس میں بات کر رہے تھے کہ ماروی اچانک وہاں پہنچ گئی۔ وہ ماروی کی آواز پر چونک گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماروی وہاں موجود تھی۔ اس کا وجود نظر نہیں آرہا تھا مگر وہ پراسرار انداز سے حواس پر چھا رہی تھی۔ وہ بڑی توجہ سے متحرک کرسی کو دیکھ رہے تھے۔

پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”اللہ نے چاہا تو ہم شیطان کے پرستاروں کو اور ان کی مدد کرنے والوں کو پنپنے نہیں دیں گے۔ اگر ایمان اور شیطان کی جنگ کو قیامت تک جاری رہنا ہے تو ہماری نسلیں ایمانی اور روحانی قوتوں سے جنگ جاری رکھیں گی۔“

بن زیان نے کہا۔ ”پلیز نظر آؤ۔ ہم تمہاری طاقت کے آگے جھکنے کی بات کریں گے۔“

”میرا نظر آنا ضروری نہیں ہے۔ صرف خدا کے آگے جھکنے کی بات کرو۔“

بن زیان نے کہا۔ ”جب یہ طے ہے کہ ایمان اور شیطان کے درمیان تاقیامت مخالفت رہے گی تو کیوں نہ ہم اپنے اپنے علاقے میں امن و سکون سے رہیں؟“

ماروی نے کہا۔ ”ہمارا یا شیطان کا اپنا اپنا علاقہ کہاں ہے؟ ساری دنیا ساری کائنات اللہ کی ہے۔ ہم اللہ کی زمین پر جہاں چاہتے ہیں، آتے جاتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں، وہاں شیطان ضرور آتا ہے اگر تم زمین کو دو حصوں میں بانٹ کر ایک اللہ والوں کو اور دوسری شیطان والوں کو دینا چاہتے ہو تو یہ کبھی نہیں ہوگا۔ یہ دنیا صرف انسانوں کے لیے ہے۔ شیطان تو جبراً اپنی من مانی کرتا آرہا ہے۔ تم لارا جیسی ٹیلی پیتھی جاننے والی کا ہاتھ پکڑ کر کتنے دن جیو گے؟ کب تک اس جزیرے میں چھپے رہو گے؟ بھائی جان تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک اس جزیرے سے باہر نہیں جاؤ گے، میں یہاں آتی رہوں گی اور تمہارا سکون برباد کرتی

رہوں گی۔"

"میں نے اپنے اطراف حصار بندی کرائی ہے، تم مجھے چھو بھی نہیں سکو گی۔"

"عارضی حصار بندی سے خوش ہوتے رہو۔ کلام پاک کی آیتیں پہاڑوں کا سینہ چاک کرسکتی ہیں لیکن میں تلاوت نہیں کررہی ہوں۔ اس کے بغیر ہی تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی اچانک اس کمرے کے ایک گوشے میں آگ کا شعلہ بھڑکا پھر وہ تیزی سے کمرے میں پھیلنے لگا۔ لارا اور بن زیان اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ وہاں سے بھاگتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئے۔ شعلے اس کمرے سے نکل کر پوری رہائش گاہ میں پھیلنے والے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے ہانپتے ہوئے اس محل نما بنگلے سے باہر دور چلے آئے۔ مسلح فوجی اپنی ڈیوٹی کے مطابق مستعدی دکھا رہے تھے۔ آگ بجھانے کی کوششیں کررہے تھے۔ پوچھ رہے تھے کہ آگ کیسے لگی؟

اس گھر کو اپنے ہی اعمال سے آگ لگی تھی۔ انہیں ماروی کی آواز سنائی دی۔ "دیکھو تم حصار بندی میں ہو آگ تم تک نہیں پہنچے گی لیکن تمہیں دوڑاتی ایک دن جزیرے کے باہر بھائی جان کے پاس پہنچادے گی۔ اس دن کا انتظار کرو۔"

وہ ہاں سے دانش کے پاس آگئی۔ وہ یونیورسٹی کے جم خانے کے اس حصے میں تھا جہاں جوڈو کراٹے سکھائے جاتے تھے۔ وہاں بڑی عمر کے بچے خطرناک فائٹنگ سیکھتے تھے۔ دانش اگرچہ آٹھ برس کا تھا تاہم اپنے بھائی عابد کی طرح قد نکال رہا تھا۔ اس ادارے کے ماہر استادوں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا۔ "اسے ہم کیا سکھائیں گے۔ یہ تو سیکھا سکھایا آیا ہے۔ پرنسس (ماروی!) آپ خود ہی دیکھیں۔"

ماروی کے سامنے دانش کے مقابلے میں چار فائٹر آگئے۔ دو استاد بھی آکر پینترا بدلنے لگے پھر ایک نے اچانک حملہ کیا تو دانش طرح دے گیا۔ دوسرے نے پھر تیسرے نے مختلف سمتوں سے اپنے داؤ پیچ آزمائے۔ وہ کبھی اچھل کر کبھی فضا میں قلابازی کھا کر بچ رہا تھا۔ پھر جب ایک فائٹر کے منہ پر ہاتھ مارا تو وہ چکرا کر گر پڑا۔ وہ زخمی ہوگیا تھا۔ مقابلہ روک دیا گیا۔

دانش نے کہا۔ "آپی! آپ کے حکم سے یہاں آگیا تھا۔ یہ میرا پہلا اور آخری دن ہے۔ آج کے بعد یہاں نہیں آؤں گا۔"

وہ بھائی بہن باتیں کرتے ہوئے جم خانے سے باہر آگئے۔ دانش نے کہا۔ "یہ مار پیٹ، یہ دنگا فساد میرے مزاج کے خلاف ہے۔ میں کبھی کسی سے ہاتھاپائی کرنا نہیں چاہتا۔"

ماروی نے کہا۔ "نہ چاہنے کے باوجود دشمن اس طرح چھیڑتے ہیں کہ ہم لڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔"

"آپ نے تو خطرناک جادوگروں کو خاک میں ملادیا ہے لیکن ان سے ہاتھاپائی نہیں کی۔ مجھے عابی بھائی جان کے مقابلے میں ٹیلی پیتھی کی ایک اضافی صلاحیت حاصل ہے۔ میں اس کے ذریعے امن و امان سے اور بڑی خاموشی سے دشمنوں سے نمٹ لیا کروں گا۔"

"بے شک تم ایسا کرسکو گے۔ یہ اچھا ہے کہ خون خرابے سے دور رہو گے۔"

ماروی اسے یہ حقیقت بتاچکی تھی کہ وہ مراد علی منگی کا بیٹا ہے۔ یہ فراڈ بھی بتایا تھا کہ اس کی ماں لارا نے کس طرح دھوکے سے بچے تبدیل کیے تھے۔

ماروی نے کہا۔ "میں بابا جانی کو پہلے ہی دن حقیقت بتادیتی لیکن جب بھی بتانے کی کوشش کی تو نامعلوم سی رکاوٹیں پیش آنے لگیں۔ اللہ کو منظور نہیں ہے کہ جو لاوارث بچہ بابا جانی کے پاس آیا ہے، وہ لاوارث رہے۔ جب تک اللہ کو منظور نہیں ہوگا، وہ بچہ بابا جانی کا وارث بن کر رہے گا اسی لیے میں نے اس کا نام وارث علی منگی رکھا ہے۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا آپی! یہ وارث بھی اسی ریاست کا شہزادہ اور بابا جانی کا بیٹا کہلاتا رہے گا۔"

یہ خبر مراد تک پہنچی تھی کہ ریاست کی اسلامی یونیورسٹی میں ایک ایسا طالب علم آیا ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ کلام پاک کو حفظ کیا ہے بلکہ اس کلام کے الفاظ، فقروں اور ہدایات کی کماحقہ تشریح بھی بیان کرتا ہے۔ وہ پرنس عابی کی طرح جنگجو بھی ہے۔ اپنی عمر کے ساتھ ساتھ اس دنیا کا دوسرا ناقابلِ شکست انسان کہلائے گا۔

یہ معلوم ہوا کہ اسے ماروی یونیورسٹی میں لائی ہے۔

اس نے بیٹی سے پوچھا۔ "یہ گوہرِ نایاب کہاں سے لائی ہو؟"

"بابا جانی! اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتاسکوں گی۔ لارا اپنی تاریک دنیا میں اس بچے کو شیطان کا پرستار بنارہی تھی۔"

مراد نے کہا۔ "یہ وہی بچہ ہوگا جسے اس نے دوسری شادی کے بعد جنم دیا ہے؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکوں گی۔"

"جبکہ تم دوسروں کے اندر کے راز معلوم کرلیتی ہو۔"

"بے شک اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس نے مجھے بہتیری روحانی قوتیں عطا کی ہیں۔ میں اس معبود کے حکم سے بس اتنا ہی بولتی ہوں جتنی مجھے اجازت ملتی ہے۔ میں اللہ کے حکم سے لارا کے بیٹے دانش کو دین اسلام میں لے آئی ہوں لیکن بیٹے کو ماں سے جدا کرنے کا ظلم نہیں کیا ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ لارا نے بھی مجبور ہوکر ہی سہی، وارث کو میرے حوالے کردیا تھا۔ اس نے بیٹے کو باپ سے جدا نہیں کیا۔ تم نے بھی نہیں کیا...... شاباش! لیکن لارا تمہاری دشمن ہوگئی ہوگی۔ تم نے اسے ماں کے پاس تو رہنے دیا مگر شیطان سے چھین لیا ہے۔"

ماروی اپنے بابا جانی کو پوری روداد سنانے لگی کہ جب دانش پیدا ہوا تھا تب اس کے کانوں میں اس نے اذان سنائی تھی۔ تب سے اب تک کی محنت رنگ لائی ہے۔ اسے ماں کی ٹیلی پیتھی ملی ہے اور اللہ تعالیٰ کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ اسے بھائی جان (عابی) کی جنگجو صلاحیتیں حاصل ہوئی ہیں۔

مراد نے پہلی بار یونیورسٹی میں آکر اسے دیکھا۔ اسے دیکھ کر دل کھنچا جارہا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے اسے سینے سے لگایا پھر اس کی پیشانی کو چوم کر بولا۔ "تم ماروی کو آپی کہتے ہو۔ اس کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کررہے ہو تو مجھے بھی بابا جانی کہہ سکتے ہو۔"

دانش خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ باپ کے قدموں میں گرکر لپٹ کر بولا۔ "آپ میرے دل کی مراد پوری کررہے ہیں۔ مجھے بہت اونچا مقام دے رہے ہیں۔"

مراد اسے قدموں سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "تم قدموں میں نہیں، ہمارے دلوں میں رہو گے اور ہمارے دین اسلام کا بول بالا کرتے رہو گے۔"

آگے وہ نہ جانے کیا کرنے والا تھا۔ فی الحال باپ کی دھڑکنوں سے لگ کر اپنے جائز حقوق حاصل کررہا تھا۔

☆☆☆

نہ بھاگنے والے پاؤں رہے تھے، نہ تحفظ دینے والی کوئی جگہ رہی تھی۔ بن زیان کن پیروں سے بھاگ کر کہاں جاتا؟ جہاں جاتا، وہاں ماروی آجاتی اور اس کے پیچھے عابی کھڑا رہتا۔ اگر کہیں بھاگ کر نہ جاتا تو اس جزیرے کی زمین بھی غیر محفوظ ہوگئی تھی۔ ماروی اس کے ایک بنگلے کو آگ لگا کر یہ جتا کر گئی تھی کہ وہ جہاں جائے گا، وہاں آگ لگتی رہے گی۔ وہ ہزاروں مسلح فوجیوں کی پناہ میں بھی نہیں رہ سکے گا۔

اس کا بنگلا جل کر کھنڈر ہوچکا تھا۔ وہ شکست خوردہ ہوکر گھاس پر گر پڑا تھا۔ لارا اس کے سامنے دو زانو ہوکر بیٹھ گئی، ماروی ایسا تماشا کرگئی تھی کہ مسلح سپاہی بھی کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ سب دور کھڑے منتظر تھے کہ بن زیان انہیں کیا حکم دینے والا ہے۔

وہ بڑی دیر کے بعد بولا۔ "تم یہاں سے جاؤ۔"

لارا نے پوچھا۔ "مجھے جانے کو کیوں کہہ رہے ہو؟"

"یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے کہ تم تمام ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے دوستی اور اتحاد ختم کروں گا، تب ہی وہ عابی مجھے جینے دے گا۔"

"کیا تم ٹیلی پیتھی جیسے زبردست ہتھیار سے محروم ہوجاؤ گے؟"

"تمہارا یہ ہتھیار مجھے سلامتی نہیں موت دے رہا ہے اور ابھی مجھے اپنی پوری زندگی گزارنی ہے۔ تم مجھ جیسے کسی اور شاطر سے دوستی کرلو۔ وہ تمہاری راہنمائی کیا کرے گا۔"

"میں نہیں جانتی، تمہارے بعد مجھے کس پر بھروسا کرنا چاہیے کیا تمہاری نظروں میں کوئی ہے؟"

"مجھ سے نہ پوچھو، عقل سے سوچو، ماروی یہاں ہوگی۔ ہماری باتیں سن رہی ہوگی۔"

وہ پریشان ہوکر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس نے بری طرح دہشت طاری کردی ہے۔"

"یہ دہشت عابی کی بات مان کر ہی ختم ہوگی۔ ہمیں ہمیشہ کے لیے جدا ہوجانا ہے۔ تم چھپ کر بھی میرے دماغ میں نہیں آسکو گی۔"

"ہاں... ہم ماروی سے چھپ کر عابی کو دھوکا نہیں

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

دے سکیں گے۔"

اس نے فون کے ذریعے عابی سے رابطہ کیا پھر کہا۔

"میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے حکم کے مطابق شیطانی ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے دوستی اور اتحاد ختم کر رہا ہوں۔ میں اور میری تنظیم کے تمام شاطر کبھی ان سے فون پر بھی گفتگو نہیں کریں گے۔ اگر ٹیلی پیتھی کے ذریعے خفیہ رابطہ رکھنا چاہیں گے تو ماروی سے ان کا فراڈ چھپا نہیں رہے گا۔ مختصر یہ کہ میں کسی پہلو سے تمہیں دھوکا نہیں دے سکوں گا۔ پلیز مجھ پر بھروسا کرو۔ میں جزیرے سے باہر آنا چاہتا ہوں۔"

عابی نے کہا۔ "جب یہ اچھی طرح سمجھ گئے ہو کہ کسی پہلو سے بھی مجھے دھوکا نہیں دے سکو گے تو میں تمہاری دشمنی کو نظرانداز کرتا ہوں۔ جب تک ان ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی دوستی کو بھولتے رہو گے، تب تک میں تم سے دشمنی کو بھولتا رہوں گا۔"

عابی نے فون بند کر دیا۔ لارا نے پوچھا۔ "کیا وہ تم پر بھروسا کرے گا؟ دشمنی بھول جائے گا؟"

"ہاں۔ مجھے سلامتی مل گئی ہے۔ پلیز ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر یہاں سے جاؤ۔ ایک لفظ نہ بولو۔ فوراً جاؤ۔"

اس نے پلکیں جھپکائیں پھر دوسری سانس میں اپنی رہائش گاہ کے بیڈروم میں پہنچ گئی۔ ان لمحات میں وہ بالکل تنہا اور بے یارومددگار ہو گئی تھی۔

بن زیان جیسا شاطر ساتھی جس نے اسے مراد سے نجات دلائی تھی اور بڑی مکاری سے بیٹے کو ماں کی ہی آغوش میں رہنے دیا تھا، جادوگروں کے مقابلے میں بھی اس کا ساتھ دیتا رہا تھا، آج وہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا۔

اور تو اور جس بیٹے کو مکاری سے حاصل کیا تھا، اسے ماروی نے چھین لیا تھا۔ وہ صرف بیٹے کے رشتے سے ماں کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر بیٹے کا بھی کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ اپنے مسلمان باپ، بھائی اور بہن کے خلاف کبھی ماں کے شیطانی ارادوں کو پورا نہ کرتا۔

اس نے بیٹے کے دماغ میں آ کر کہا۔ "کہاں ہو؟ میں آدھی مر چکی ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں تنہا اور بے یارومددگار رہ گئی ہوں۔ عابی نے بن زیان کو بھی مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا ہے۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ تم بھی رسمی طور پر بیٹے کا رشتہ نبھانے چلے آتے ہو پھر چلے جاتے ہو۔ تم خون کے رشتوں سے ان کے سگے ہو، جو میرے مذہب کے اور میری جان کے دشمن ہیں۔"

دانش نے ماں کے سامنے حاضر ہو کر کہا۔ "ایک دن یہ ہونا تھا۔ اس لیے ہو رہا ہے۔ مام! آپ ایک اکیلی جان ہیں۔ زندگی گزارنے کا محفوظ راستہ اختیار کریں۔ پھر سمجھاتا ہوں۔ دینِ اسلام قبول کریں اور آخری سانسوں تک سلامتی سے رہیں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں مرتے دم تک شیطان کے قدموں میں رہوں گی۔ غم و خوشی، ناکامیاں اور کامیابیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ شیطان بڑی قوتوں والا ہے۔ وہ مجھے جھکنے، ٹوٹنے اور گرنے نہیں دے گا۔"

"تو پھر تنہا اور بے یارومددگار ہونے کا ماتم نہ کریں۔ جائیں شیطان مردود سے مدد مانگیں۔"

"یو شٹ اپ! شیطان کو مردود نہ کہو۔"

"اگر میں یہاں بیٹھا رہ گیا تو اور بہت کچھ کہوں گا۔ آپ برداشت نہیں کر سکیں گی اس لیے جا رہا ہوں۔"

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انسان اپنے خیال اپنے نظریے اور اپنے عقیدے کے مطابق جس بات سے چپک جاتا ہے، اس سے آخری دم تک الگ نہیں ہوتا۔ لارا کا عقیدہ تھا کہ شیطان سب سے زیادہ قوی ہے اور اس پر مہربان ہے۔ اس نے اسے غائب ہونے اور خیال خوانی کی صلاحیتیں دی ہیں۔ مراد جیسے ناقابلِ شکست انسان سے نجات دلائی ہے۔ اس شیطان نے اس کے بیٹے کو اب تک اس کے باپ سے دور رکھا ہے۔

لارا اپنے حالات کے مطابق موجودہ نقصانات اٹھا رہی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ شیطان جلد ہی پھر کوئی بن زیان اس کے لیے بھیج دے گا۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق تاریک دنیا کے معبد میں شیطان کے مجسمے کے سامنے آ گئی۔ اس کے سامنے سجدہ کرتے کرتے اوندھے منہ لیٹ گئی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہاں کاہن اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے علاوہ بے شمار شیطان کے پجاری موجود تھے۔ وہ روتی اور گڑگڑاتی ہوئی اپنی روداد بیان کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ آئندہ پرنس عابی کے خوف سے بن زیان ان کا ساتھ نہیں دے گا۔ مسلمانوں کے مخالفین جو اب تک مراد اور عابی کے خلاف ان کا ساتھ دیتے آ رہے تھے، وہ سب سہم گئے ہیں۔

موسم سرما کے سنہرے، روپہلے شب و روز کو پُر لطف بناتا پاکیزہ دسمبر 2016ء کا شمارہ



ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

انجم انصار اور **رفعت سراج** کے دلکش ناولوں کی پُر لطف اقساط

سحر ساجد کی اچھوتی تحریر **من جانبازم** کی اگلی قسط

سیما رضا ردا نے کھولی پٹاریں اپنے خوب صورت مکمل ناول **ہم کو عبث بدنام کیا** میں

اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل و یقین کی پُر حیرت داستان **میمونہ صدف** کے قلم سے

نگہت سیما سے دلچسپ ملاقات کا مزید احوال جانیں **وہ آئے بزم میں**

کسبِ حلال پر **اختر شجاعت** کا ایمان افروز مضمون

نفیسہ سعید اور **رفاقت جاوید** کی خصوصی تحریریں

شائستہ زریں نے کی بھرپور

میزبانی وہ بھی معروف ٹی وی اینکر **صبا نقوی** کی

پاکیزہ کے مہمان میں

اس کے علاوہ

فرحین اظفر، سلمیٰ غزل، بشریٰ ماہا، نور عین، سنبل،

تنزیلہ زاہرہ افضل و دیگر معروف قلمکاروں کی حسین تحریریں...

دیگر معلوماتی، تفریحی، مستقل مضامین و حسین شاعری صرف آپ کی عالی ذوق کی نذر

پھر یہ کہ اس کے بیٹے دانش کو اس سے چھین لیا گیا ہے۔ انہوں نے زومبی گانگا سے اس کی عزت و آبرو بچا کر اس پر مہربانی کی ہے لیکن بیٹے کو شیطان سے دور کر دیا ہے۔ پرنس عابی کی دہشت ایسی طاری ہو گئی ہے کہ بڑے بڑے ممالک کے حکمران بھی ان ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا ساتھ نہیں دیں گے۔

وہ بولتی رہی، دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔ پھر کاہن نے کہا۔ ''چپ ہو جاؤ۔ اٹھو اور آنسو پونچھ لو ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ مجھے آگہی ملی ہے' شیطان معظم نے مراد، عابی اور ماروی کے زوال کا وقت مقرر کر دیا ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ بازی پلٹنے والی ہے۔ اس دنیا میں کبھی کسی کو دائم اور قائم رہنے والی قوت نہیں ملی۔ عابی کی قوت بھی قائم نہیں رہے گی۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھنے والا ہے۔''

وہ انسانی زندگی کی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ ازل سے دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ مسلمان ہو یا کافر، اسے زوال کے بعد عروج حاصل ہوتا ہے پھر عروج کے بعد زوال سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

کاہن کو آگہی ملی تھی، نہ ملتی تب بھی عابی ایک انسان تھا۔ اسے بھی کامیابیوں کے بعد ناکامیوں سے گزرنا ہی تھا۔ ایسا وقت سب پر آتا ہے۔ اس پر بھی آنے والا تھا۔

☆☆☆

وہ لیلیٰ کے ساتھ بہت ہی پُرمسرت ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ دشمنوں کی طرف سے مطمئن تھا۔ مختلف ہتھکنڈوں سے نقصان پہنچانے والے فی الحال ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ ایسی خوشحالی کے باوجود اس کا سسر درویش نجومی پریشان ہو رہا تھا۔ اس کے علم کے مطابق بیٹی کو جلد ہی ماں بننے کی خوشخبری سنانا تھی اور وہ نہیں سنا رہی تھی۔

چھ ماہ گزر گئے۔ درویش نے گھر کی بوڑھی خادمہ سے کہا۔ ''لیلیٰ سے پوچھو۔ اتنے دن ہو گئے، وہ ماں کیوں نہیں بن پا رہی ہے۔''

بوڑھی خادمہ نے کہا۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کبھی مہینوں اور کبھی برسوں گزر جاتے ہیں اور عورت کے پاؤں بھاری نہیں ہوتے۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''مجھ سے بحث نہ کرو۔ جاؤ اس سے پوچھو۔ وہ ماں کیوں نہیں بن رہی ہے؟''

خادمہ لیلیٰ کے پاس گئی پھر واپس آ کر بولی۔ ''آپ چھتری کھول کر بیٹھے ہیں اور آسمان نے برسنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ میاں بیوی تو خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کر رہے ہیں۔''

وہ غصے سے اچھل پڑا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟ شادی سے پہلے لیلیٰ کو پیش آنے والی باتیں بتا دی تھیں۔ وہ میرے لیے عابی جیسا عجیب و غریب نواسہ پیدا کرے گی۔ صرف وہی نہیں، اس کے بعد مزید چھ بیٹیاں بھی چھ عجیب و غریب نواسوں کو جنم دیں گی۔ ان کے ذریعے پوری دنیا میں میری حکمرانی قائم رہے گی۔ کہاں ہے لیلیٰ؟''

وہ براہ راست بیٹی سے خاندانی منصوبہ بندی والی باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے کہا۔ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا تم میرے لیے ایک نواسے کو جنم نہیں دو گی؟''

اس نے کہا۔ ''آپ کے علم نجوم کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ جب یہ مقدر میں لکھا ہے اور آپ دعویٰ کرتے ہیں تو پھر اولاد ہو گی۔ لیکن آپ عابی کی شادی اور ازدواجی زندگی کی پوری ہسٹری پر نظر ڈالیں۔ اس کی پہلی بیوی سہاگ کی سیج پر یکلخت مر گئی تھی۔ میڈیکل رپورٹ نے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا کہ آئندہ جو بیوی بن کر آئے گی وہ ماری جائے گی۔ لیکن دوسری بیوی زندہ رہی۔ اس نے ازدواجی مسرتیں حاصل کیں کیونکہ اس نے خاندانی منصوبہ بندی کے مطابق عمل کیا تھا۔ میں بھی اس کے مطابق عمل نہیں کروں گی تو اس کی پہلی بیوی کی طرح ماری جاؤں گی۔''

''میرا علم کہتا ہے تم نہیں مرو گی۔ باپ کو دھوکا نہ دو۔ جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کرو۔''

''آپ کی پیش گوئی اگرچہ صحیح ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی کوئی پیش گوئی کسی پہلو سے کمزور ہو جاتی ہے۔ آپ خود نہیں جانتے کہ آپ کے علم کی کون سی کمزوری میری جان لے لے گی۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کی غلطی نہیں کروں گی۔''

دونوں باپ بیٹی میں ٹھن گئی۔ درویش پوری دنیا پر حکمرانی کرنے اور عیش و عشرت سے بھرپور زندگی گزارنے کے بڑے جذباتی اور دلچسپ خواب دیکھتا آیا تھا۔ وہ اپنے ارادوں کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔

اس نے لیلیٰ سے کہا۔ ''جو کہتا ہوں، وہ کرو۔ اگر جلد

ہی ماں بننے کی خوش خبری نہیں سناؤ گی تو تمہاری زندگی کے دن پورے ہو جائیں گے۔ تم کسی دن بھی اچانک ہی ابدی نیند سو جاؤ گی۔''

یہ دھمکی نہیں تھی۔ ارادہ خطرناک تھا۔ جو بیٹی کام آنے والی نہیں تھی، اس بچی کو ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ کیا عابی اس کی دوسری بیٹی سے شادی کر کے اس کی پیش گوئی کو درست ثابت کرتا؟

وہ تو کبھی اس کی دوسری بیٹی سے شادی نہ کرتا۔ اس نے فون کے ذریعے عابی سے کہا۔ ''تم میرے علمِ نجوم کے خلاف عمل کر رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''تمہاری بیٹی کی سلامتی اسی میں ہے۔''

''میری بات کا یقین کرو۔ لیلیٰ جان سے نہیں جائے گی۔ وہ ایک بیٹے کی ماں ضرور بنے گی۔''

''میں اپنی پہلی بیوی سے اب تک ذاتی تجربات سے گزر رہا ہوں۔ لیلیٰ کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کے مطابق زندگی گزارتی رہے۔ بس اور زیادہ بے حیائی کی باتیں مجھ سے نہ کرو۔''

عابی نے فون بند کر دیا۔ وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ غصے سے چیخنے لگا۔ وہ کوئی عام سا داماد ہوتا تو اسے اپنے قدموں میں لا کر اپنی بات منوا لیتا لیکن مجبوری تھی۔ اس کے خلاف کسی طرح کی سازش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن ماروی سے نہ کوئی دشمن چھپ سکتا ہے، نہ اس کی کوئی سازش چھپ سکتی ہے۔

اس نے عابی کا زائچہ درست بنایا تھا۔ اسے عابی کے سات عجیب و غریب نواسے حاصل ہو سکتے تھے لیکن زائچے اور پیش گوئی میں ایک خامی رہ گئی تھی۔ درویش کو یہ تو معلوم تھا کہ پرنس غیر معمولی جسمانی توتوں کا حامل ہے لیکن یہ پہلو نظر انداز ہو گیا تھا کہ ازدواجی مسرتیں حاصل کرنے کے دوران یہی قوت کسی بھی بیوی کے لیے قاتل بن جایا کرے گی۔

بہرحال درویش سے غلطی ہو گئی تھی۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، اسے ناکام و نامراد رہنا تھا۔

وقت خاموشی سے گزرنے لگا۔ کہتے ہیں سمندر کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ کبھی اچانک ہی توقع کے خلاف کوئی طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک برس گزر گیا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ لیلیٰ کمزور ہو گئی۔ بیمار رہنے لگی۔ دوسرے برس کے اختتام پر اس کی زندگی کا اختتام ہو گیا۔

یہ خیال آرائیاں ہونے لگیں کہ کوئی لڑکی پرنس کی بیوی بن کر زیادہ دنوں تک جی نہیں پاتی۔ اکثر خیال آرائی کرنے والے کے دلوں کو یہ بات لگ رہی تھی۔ وہ دعوے سے کہہ رہے تھے کہ آئندہ بھی دیکھ لینا، جو لڑکی عابی کی زندگی میں دلہن بن کر آئے گی وہ موت کی سیج پر سونے کے لیے ہی آئے گی۔

عابی کا حال بھی عجیب سا ہو رہا تھا۔ اب وہ ایک شریکِ حیات کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے لیلیٰ کی وفات کے چالیس دن بعد پھر ایک لڑکی سے نکاح پڑھا لیا لیکن مزاج میں اور جذبات میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ پہلے جیسا عابی نہیں رہا تھا۔ اس کی طلب میں شدت آ گئی تھی۔ ایک شریکِ حیات ناکافی ہو گئی تھی۔

اس نے دوسری شادی کی پھر تیسری کی پھر چوتھی بھی لے آیا۔ یوں ذہنی طور پر وہ پُرسکون اور آسودہ رہنے لگا۔

وقت گزر رہا تھا اور دنیا دیکھ رہی تھی۔ یہ خیال درست ہو رہا تھا کہ اس کی کوئی بیوی برس ڈیڑھ برس سے زیادہ سہاگن کی مسرتیں حاصل نہیں کرتی تھی۔ بیمار اور کمزور ہو کر وفات پا جاتی تھی۔

تب اس کے ضمیر نے پوچھا۔ ''وہ کب تک شادیاں کرتا رہے گا اور اپنی شریکِ حیات بننے والیوں کو قتل کرتا رہے گا؟''

لیلیٰ کے بعد پچھلے پانچ برسوں میں سات عدد شریکِ حیات اسے گلے لگا کر موت کو گلے لگا چکی تھیں۔ یہ سب نے مان لیا تھا۔ وہ خود مان رہا تھا کہ اس سے ازدواجی مسرتیں حاصل کرنے والیاں رفتہ رفتہ بیمار اور کمزور ہو کر اپنی جان سے جاتی ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد وہ جان بوجھ کر عورتوں کو اپنے حرم میں لا کر انہیں موت کی طرف پہنچا دیتا ہے۔

لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ کنواری لڑکیوں کا قاتل ہے، انہیں سہاگن بنا کر مار ڈالتا ہے۔ اسے شادی نہیں کرنا چاہیے۔ کبھی نہیں کرنا چاہیے اور لڑکیاں بھی دیوانی ہیں۔ اس قاتل کی سیج پر جانے کے لیے موت سے ڈرنا بھول جاتی تھیں۔

شیطان نے عابی کو سمجھایا۔ کسی کے ساتھ مسلسل راتیں گزارو گے تو تمہاری قوت اسے اندر سے کھوکھلا کردے گی۔ اس کے ساتھ ایک رات گزارو پھر اسے چھوڑ دو، کسی دوسری کو پکڑو۔ اس طرح وہ آنے والیاں سلامت رہیں گی اور تم بھی قاتل نہیں کہلاؤ گے۔ لڑکیوں کی سلامتی اور تمہاری نیک نامی کا یہی ایک راستہ ہے اور یہ راستہ دینی احکامات کے خلاف تھا۔

شیطان کے راستے پر چلتے رہنے سے لڑکیوں کی سلامتی تھی پھر عابی کسی کا قاتل نہ کہلاتا۔ ہاں مگر گناہ گار کہلاتا۔ دین ایمان سے جاتا۔ اس نے کہا۔ ”فی الحال میں شادیاں نہیں کروں گا، یہ آزماؤں گا کہ کتنی مدت تک ایک شریک حیات کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ اللہ نے ہر جاندار کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ انسان ہوں، حیوان ہوں یا حشرات الارض ہوں...... مجھے یقین ہے کہ میرے معبود نے میری جسمانی قوتوں کو برداشت کرنے والی عورتیں ضرور پیدا کی ہوں گی۔ وہ بھی میری طرح غیر معمولی قوتوں کی حامل ہوں گی۔“

مراد اپنے بیٹے کے موجودہ حالات سے پریشان تھا۔ اس نے تمام پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کہا۔ ”ہماری دنیا میں بے شمار جنگجو اور کشتیاں لڑنے والی خواتین ہیں۔ ان میں کئی غیر معمولی قوتوں کی حامل ہوتی ہیں۔ میں اپنے بیٹے کے لیے ایسی خواتین کا رشتہ طلب کررہا ہوں۔ وہ مجھ سے یا عابد علی منگی سے براہِ راست گفتگو کرسکتی ہیں۔ ان خواتین کو ترجیح دی جائے گی جو حیرت انگیز جسمانی قوتوں کی حامل ہوں گی۔“

بے شک صرف اللہ تعالیٰ ہی ایک ہے اور تنہا رہنے والا ہے اور لاشریک ہے، باقی کوئی تنہا نہیں رہ سکتا۔ لاشریک نہیں کہلاسکتا اس لیے شریک حیات بننے کے لیے عورت لازمی ہے۔

ایسی لازمی خواتین درجنوں نکل آئیں جو جسمانی طور پر حیرت انگیز قوتوں کی حامل تھیں۔ انہوں نے عابی سے رابطہ کیا۔ پہلے فون کے ذریعے ان سے باری باری گفتگو ہوئی۔ ان میں سے کئی نااہل تھیں۔

صرف سات خواتین نے خود کو اہل ثابت کیا۔ عابی نے شرائط پیش کیں کہ جو بھی منکوحہ بنے گی، وہ پہلے دین اسلام قبول کرے گی۔ دوسری شرط یہ پیش کی کہ وہ حسب ضرورت ایک کے بعد دوسری شادی کرے گا۔ اس پر کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔

ایک خاتون سوکن کو برداشت نہیں کرسکتی تھی اس لیے شریک حیات کی فہرست سے نکل گئی۔ دو خواتین اپنا مذہب چھوڑنے اور اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ اس لیے وہ بھی فہرست سے خارج ہوگئیں۔ صرف چار رہ گئیں۔

ایک خاتون مسلمان تھی۔ پہلے اسی سے نکاح پڑھایا گیا۔ پچھلی تمام بیویاں وفات پاچکی تھیں۔ اب ایک شہ زور آئی تھی۔ لاکھوں، کروڑوں افراد تجسس میں مبتلا تھے۔ عابی نے کہا تھا کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کے کسی اصول پر عمل نہیں کریں گے۔ جلد ہی صاحبِ اولاد کہلائیں گے۔

دوسرے دن سب حیران ہوئے۔ عابی کے محل سے کوئی ماتمی خبر نشر نہیں ہوئی۔ اس شریک حیات نصیبہ خاتون نے ثابت کردیا کہ اللہ کسی کو تنہا اور لاشریک نہیں رہنے دیتا۔ نصیبہ خاتون اس کی کامیاب شریک حیات ثابت ہورہی تھی۔

دوست اور دشمن منتظر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آئندہ چند دنوں میں کس طرح کا منفی ردعمل سامنے آئے گا۔ نصیبہ بیمار ہوگی یا رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جائے گی۔

لیکن ان میاں بیوی نے احتیاطی تدابیر یہ اختیار کی کہ عابی نے ایک ماہ بعد ہی دوسری شادی کی پھر دو ماہ بعد تیسری بھی کرلی۔ فہرست کے مطابق ایک رہ گئی تھی۔ وہ بھی کیوں رہتی۔ وہ چھ ماہ بعد چار بیویوں کا خاوند بن گیا۔ یوں اس کی قوتیں تقسیم ہوگئیں۔ وہ ایک بار پھر مکمل اطمینان اور آسودگی سے دن گزارنے لگا۔

یہ بات حیران کن تھی کہ دشمن بھی بڑے اطمینان اور آسودگی سے اپنے اپنے معاملات میں یوں مصروف تھے جیسے دشمنی بھول گئے ہوں۔ وہ عابی کے کسی معاملے سے دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔

کیا دشمن ایسے نیک اور صالح ہوتے ہیں؟

☆☆☆

تاریک دنیا کے تین ہی ٹیلی پیتھی جاننے والے تھے۔ ان کے حالات اچانک بدل گئے تھے۔ وہ خیال خوانی کرنا بھول گئے تھے۔ اپنے دشمن مراد، عابی اور ماروی کو بھول گئے تھے۔ جبکہ وہ کبھی انہیں بھول نہیں سکتے تھے لیکن ان کے ساتھ ایسا ہورہا تھا۔

شیطان کی عبادت گاہ میں، اس کے مجسمے کے سامنے لارا، آبنوس اور طاغوتا پر زبردست تنویمی عمل کیا گیا تھا۔ اس عمل کے نتیجے میں وہ تینوں ایک نامعلوم عامل کے زیرِاثر آگئے تھے۔

جب تک وہ عامل اجازت نہ دیتا' وہ خود کو نہ پہچانتے۔ جب تک وہ حکم نہ دیتا' وہ خیال خوانی نہ کرتے۔

وہ پراسرار عامل شیطان ہی ہوگا یا اس کا بہت ہی... خطرناک چیلا ہوگا۔ اب تک مسلسل شکست کھاتے رہنے کے باعث شیطان شاید خود میدانِ جنگ میں آنے پر مجبور ہوگیا ہوگا۔

بہرحال اس پراسرار عامل نے اپنے ہی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو کسی زبردست منصوبے کے تحت عارضی طور پر ناکارہ بنادیا تھا اور انہیں شیطان کی ہی عبادت گاہ میں ایسا بنایا گیا تھا۔

دانش اپنی ماں سے ملنے آیا تو وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''آپ تاریک دنیا میں کیوں آئی ہیں؟ میں نے کہا تھا کہ یہاں نہیں آیا کروں گا۔''

اس نے چونک کر سر گھما کر بیٹے کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ میری اجازت کے بغیر کمرے میں کیوں آئے ہو؟''

اس نے حیرانی سے ماں کو دیکھا۔ وہ ناگواری سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ سختی سے بولی۔ ''کون ہو تم......؟''

وہ تعجب سے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''مام! آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ بیٹے کو نہیں پہچان رہی ہیں؟''

''بکواس مت کرو۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔''

دانش فوراً ہی خیال خوانی کے ذریعے اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس کے خیالات کہنے لگے کہ وہ لارا ہے۔ شیطان کی پجارن ہے۔ اس کا کوئی شوہر کوئی بچہ نہیں ہے۔ وہ اپنی تاریک دنیا میں بہت عیش و آرام سے ہے۔ جلد ہی اس کی شادی ہونے والی ہے۔

دانش نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ کسی نے آپ پر تنویمی عمل کیا ہے۔ آپ کا برین واش کیا ہے۔ آپ کے دماغ سے پچھلی تمام زندگی کی یادیں مٹادی ہیں۔''

اس نے ماروی کو آواز دی۔ ''آپی! فوراً آئیں......''

وہ آگئی۔ لارا کے خیالات پڑھنے لگی پھر بولی۔ ''یہ کوئی شیطانی چال ہے۔ اسے سمجھنا ہوگا۔''

وہ کاہن کے دماغ میں پہنچ کر بولی۔ ''یہ کیا ہورہا ہے؟ لارا کا دماغ کیوں پھر گیا ہے؟ وہ بیٹھے بٹھائے خود کو کیسے بھول گئی ہے؟''

کاہن نے کہا۔ ''شیطان نے صرف لارا کے ہی نہیں' آبنوس اور طاغوتا کے دماغوں کو بھی واش کردیا ہے۔''

''کیا ان تینوں پر شیطان نے تنویمی عمل کیا ہے؟''

''ہاں، یہی سمجھو۔''

دانش نے کہا۔ ''بکواس نہ کرو۔ شیطان کبھی کسی کے سامنے نہیں آتا۔''

''وہ ایک عامل کے بھیس میں آیا تھا۔ اس نے اپنے ہی پرستاروں کی صلاحیتیں اور قوتیں چھین لی ہیں۔ کوئی اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں مارتا۔ شیطان نے ماری ہے۔ وہ بڑا شاطر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسا کیوں کررہا ہے؟''

دانش نے کہا۔ ''تمہارے شیطان کی ایسی کی تیسی...... ہم ابھی تنویمی عمل کا توڑ کریں گے۔ میں اپنی مام کی یادداشت واپس لاؤں گا۔''

اس نے ماروی کے ساتھ خیال خوانی کی پرواز کی۔ لارا کے دماغ میں پہنچنا چاہا تو وہ لاکڈ ہوچکا تھا۔ ان کی سوچ کی لہریں واپس آگئیں۔ وہ بہن بھائی ریاست کی یونیورسٹی کی رہائش گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ماروی زیرلب کچھ پڑھتی رہی پھر اس نے خیال خوانی کی پرواز کی۔ اپنی روحانی صلاحیتوں کو طرح طرح سے آزمایا۔ آخر واپس آکر سر جھکا کر بولی۔ ''اللہ کو منظور نہیں ہے۔ ہم شیطانی عمل کو توڑ نہیں سکیں گے۔''

''آپی......! ٹیلی پیتھی ان کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔ شیطان نے اسے ہی ان کے دماغوں سے واش کردیا ہے۔ وہ ہمارے خلاف ایسی چال چل رہا ہے' جو ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔''

ماروی نے کہا۔ ''ہم بھائی جان (عابی) کے آس پاس رہنے والوں کے دماغوں میں جاتے آتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی ٹیلی پیتھی جاننے والا کسی کو آلۂ کار بنا کر بھائی جان کے قریب نہیں جاسکے گا۔ ہم ہمیشہ محتاط رہتے ہیں۔ آؤ

وہاں چلیں۔"

وہ بہن بھائی عابی کے محل میں آگئے۔ وہاں زبردست حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے۔ وہ دونوں پھر ایک بار ان کا اچھی طرح جائزہ لینے لگے۔ بے شک تمام جاں نثار عابی کے اطراف لوہے کی دیوار بن کر رہتے تھے۔

وہ دونوں خیال خوانی کے ذریعے وہاں کے ایک ایک فرد کے چور خیالات پڑھتے رہے۔ یہ ثابت ہو رہا تھا کہ شیطان نے واقعی ان تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ عابی کے آس پاس اور محل کے اندر اور باہر کوئی خیال خوانی کرنے والا نہیں آتا تھا۔

عابی ٹیلی پیتھی کے پہلو سے پوری طرح محفوظ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب پہلی شہ زور خاتون نصیبہ اس کی شریک حیات بن کر آئی تھی۔ ماروی اور دانش نے نصیبہ اور اس کے تمام رشتے داروں کے خیالات پڑھے تھے۔ ان میں سے کوئی عابی کے دشمنوں سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ نصیبہ بے شک وفادار اور خدمت گزار بیوی تھی۔

پھر وقت گزرنے لگا۔ عابی نے ایک کے بعد دوسری، تیسری پھر چوتھی شادی کی۔ ماروی اور دانش ان چاروں کے دماغوں میں جاتے آتے رہتے تھے۔ وہ سب ہی شک و شبے سے بالاتر تھیں اور بہت ہی معتمد شریک حیات تھیں۔

یوں سات برس گزر گئے۔ دانش پندرہ برس کا ہو گیا۔ لڑکپن سے جوانی کی طرف آنے لگا۔ وہ ماں کے لیے پریشان تھا۔ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی وہ ٹیلی پیتھی سے محروم تھی۔ اپنے آپ کو بھولی ہوئی تھی۔ بیٹے کو نہیں پہچانتی تھی۔

وہ تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والے برسوں سے ناکارہ تھے۔ تاریک دنیا سے باہر نہیں جاتے تھے۔ اس کے باوجود عابی کی شامت آچکی تھی۔

اب بھید کھلنے والا تھا۔ پچھلے سات برسوں میں وہ بہت ہی غیر محسوس طریقوں سے کمزور ہوتا جارہا تھا۔ ابتدائی چند برسوں میں اسے محسوس نہیں ہوا تھا پھر معلوم ہونے لگا کہ وہ دوڑنے کے بعد ہانپنے لگا ہے جبکہ وہ تھکنا اور ہانپنا جانتا ہی نہ تھا۔

ایک بار اس نے دیوار پر گھونسا مارا تو تکلیف ہوئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو فولاد تھا۔ اسے پتھر کی دیواروں سے چوٹ نہیں لگتی تھی۔

ایسی شکست نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے پہلے کبھی اسپتال کا راستہ اور کسی ڈاکٹر کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے پہلی بار دنیا کے چار مشہور و معروف ڈاکٹروں کو طلب کیا۔ انہیں اپنے حالات بتائے۔ ان تجربہ کار ڈاکٹروں نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ لیبارٹری سے تمام ضروری ٹیسٹ کرائے پھر رپورٹ سامنے آئی۔ اس کے خون میں ایسی مضر رساں دوا کے اثرات پائے گئے جو آہستہ آہستہ گوشت کو گلاتی رہتی ہیں۔

مراد اپنے بیٹے کی یہ رپورٹ سنتے ہی لرز گیا۔ تمام دنیا پر چھا جانے والا بیٹا جسے تیر، تلوار اور بندوق کی گولیاں بھی نہیں مار سکتی تھیں، اس ناقابلِ شکست شہ زور کا گوشت اندر ہی اندر گل رہا تھا۔

مرنے کے بعد قبر میں کیڑے کھاتے ہیں۔ یہاں زندگی میں شیطان اس کا گوشت نوچ رہا تھا۔ کسی خطرناک سلو پوائزن کے ذریعے پہاڑ جیسے جسم کی دیوار سے گوشت کو کھرچ رہا تھا۔

کون ایسا شاطر تھا؟ شیطان براہِ راست کچھ نہیں کرتا، کراتا ہے۔ اس نے کسے آلۂ کار بنایا ہے؟ وہ آلۂ کار کس طرح ایک پہاڑ کے اندر سرنگ بنا کر دوائیں پہنچا رہا ہے؟

اور وہ ایسی سست رفتار دوائیں تھیں کہ سات برسوں میں اس کے مجموعی نتائج ظاہر ہو رہے تھے۔ دشمن سات سالہ منصوبوں پر بڑے صبر و استقلال سے چپ مار یار تے آرہے تھے۔ ان کی طویل خاموشی اب سمجھ میں آرہی تھی۔

ماروی اور دانش بڑی برق رفتاری سے محل کے کچن والوں کے دماغوں میں جانے لگے۔ ان جاں نثاروں کے بھی چور خیالات پڑھے جو کچن میں سیکیورٹی کے ذمے دار تھے۔ وہ جانے انجانے میں کسی بھی دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والے کے زیر اثر نہیں آئے تھے۔ کوئی دشمن کھانے پینے کی چیزوں تک ان کے ذریعے نہیں پہنچا تھا۔

انہوں نے عابی کی چاروں شریک حیات کے خیالات پڑھے وہ اس معاملے میں معصوم تھیں۔ کسی شک وشبے کے بغیر عابی کی وفادار تھیں۔ اگر کبھی انجانے میں کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے کے زیر اثر آجاتیں تو ماروی اور دانش کو بعد میں بھی ان کے چور خیالات سے حقیقت معلوم ہو جاتی۔

یہ درست ہے کہ شیطان انسان کے اندر ہوتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا مگر اسے جو کرنا ہوتا ہے، اندر بیٹھ کر کرتا رہتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا ایک دستِ راست عذرباد مصروفِ عمل تھا۔

عذرباد نے سب سے پہلے لارا، آبنوس اور طاغوتا کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ ماروی اور دانش پچھلے سات برسوں سے دن رات ان تینوں کے دماغوں میں جاتے آتے رہے تھے اور انہیں ناکارہ ہی پایا تھا۔

عذرباد نے ان بہن بھائی کو پوری طرح یقین دلا دیا تھا کہ وہ ناکارہ ہو چکے ہیں اور انہوں نے عابی سے دشمنی نہیں کی ہے جبکہ وہی خیال خوانی کے ذریعے اس پہاڑ کو کھود رہے تھے۔

عذرباد عین ضرورت کے وقت ان کے سامنے آ کر چٹکی بجا کر کہتا۔ ''ویک اپ (جاگو)!''

اور وہ چونک جاتے تھے۔ اگر نیند میں ہوتے تو فوراً آنکھیں کھول دیتے۔ اگر جاگتے رہتے تو اپنے عامل کا حکم سنتے ہی خود فراموشی کے طلسم سے نکل آتے تھے۔

پھر عامل عذرباد کہتا کہ محل کے کچن میں باورچی گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کے دماغ کو گرفت میں لے کر اس دودھ میں دوا ملاؤ جسے عابی صبح ناشتا کے وقت پینے والا ہے۔

لارا حکم سن کر فوراً اس باورچی کے دماغ میں پہنچ جاتی۔ اسے نیند کی حالت میں ٹریپ کرتی۔ حکم دیتی۔ ''تم بدستور نیند میں رہو گے۔ آنکھیں کھول کر نیند کی حالت میں اس دوا کے پاس پہنچو گے جو تمہارے ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب میں رکھی ہوئی ہے۔''

وہ باورچی اس کے احکامات کی تعمیل کرتا اور پھر واپس اپنے بیڈ پر آ کر گہری نیند میں ڈوب جاتا تھا۔ دوسری صبح آنکھ کھلنے کے بعد اسے یاد نہ رہتا کہ وہ پچھلی رات اپنے آقا عابد علی منگی سے دشمنی کر چکا ہے۔

ایسے وقت لارا بھی خیال خوانی سے محروم ہو جاتی تھی۔ یہ بھول جاتی تھی کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے؟ صرف ایک باورچی ہی ان کا آلۂ کار نہیں تھا۔ عذرباد کچن کے اسٹاف میں سے کسی کو بھی حالات اور ضرورت کے مطابق استعمال کرتا تھا۔ وہ خود خیال خوانی کے ذریعے ایسا کر سکتا تھا لیکن فی الحال زبردست پلاننگ میں مصروف رہتا تھا۔ ان تینوں کو آئندہ بھی اپنے زیرِ اثر رکھنے والا تھا۔

وہ تینوں اپنے آپ کو بھول کر لاچار سے ہو گئے تھے۔ عذرباد کے رحم و کرم پر رہنے والے تھے۔ ویسے وہ مراد اور ماروی سے محفوظ تھے۔ وہ انہیں کسی طرح کا الزام نہیں دے سکتے تھے کیونکہ پورے یقین کے ساتھ انہیں سات برسوں سے ناکارہ دیکھ رہے تھے۔

دنیا کے تمام جاسوس بھی عابی کے خلاف ہونے والی واردات کی تحقیقات کر رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس فولادی جسم کے اندر کس نے دوا پہنچائی ہے اور کیسے پہنچائی ہے؟ گھوم پھر کر یہی خیال قائم ہوتا تھا کہ یا تو جادو کے ذریعے ایسا کیا گیا ہے یا پھر بڑا ہی شاطرانہ ٹیلی پیتھی کا حربہ استعمال کیا گیا ہے۔

وہ گوشت گلانے والی دوا اسے رفتہ رفتہ کمزور کرتی جا رہی تھی۔ دنیا کے تمام تجربہ کار ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے تھے۔ بڑے جی جان سے مضر رساں دواؤں کا توڑ کر رہے تھے۔ بس اس حد تک کامیابی ہوئی کہ اس کے خون میں تیزابیت کم ہونے لگی تھی لیکن مضر رسانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ شاید ختم ہونے میں برسوں لگنے والے تھے۔

وہ غیر معمولی قوتِ برداشت کا حامل تھا اس لیے زہریلی دواؤں کے اثرات کو جھیل رہا تھا۔ ایک بیمار کی طرح بستر پر نہیں تھا۔ ایک ہی سوال گردش کرتا تھا کہ کیا اس خطرناک دوا کا توڑ ہو جائے گا؟

دشمنوں کے دماغوں میں بھی تجسس بھرا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس کا کتنا گوشت گل چکا ہے؟ وہ کتنا کھوکھلا ہو چکا ہے؟ سب ہی جلد سے جلد اس کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔

اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم نے مشورہ دیا کہ اسے لندن سے نکل کر سوئٹزرلینڈ کے صحت افزا مقام میں رہنا چاہیے وہاں اس کا علاج ہوتا رہے گا۔

وہ بھی جگہ تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میونخ کے ایک بڑے اسپتال کے ایک بڑے حصے کو ریزرو کرایا گیا۔ تمام حفاظتی انتظامات کے بعد عابی اپنے شاہی طیارے کے ذریعے وہاں پہنچ گیا۔ خفیہ منصوبے کے مطابق دشمن ایک طویل عرصے کے بعد اس سے ٹکرانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

جب وہ طیارے سے اتر کر ائرپورٹ کی عمارت میں آیا تو کسٹم والوں نے اس کے سامان کو چیکنگ کے لیے روک لیا۔ پچھلے کئی برسوں سے وہ پوری دنیا کا شہنشاہ کہلا رہا تھا۔ کوئی اس کے کسی معاملے میں رکاوٹ بننے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ پہلی بار چھ قوی اور قد آور ریسلرز اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔

ایک افسر نے کہا۔ ''مسٹر عابد علی منگی! آپ اپنا

پاسپورٹ اور اہم کاغذات دکھائیں۔ قانونی اجازت نامے کے بغیر آپ کو یہاں کی زمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آپ کا تمام سامان ضبط کرلیا جائے گا۔''

وہ پہلی بار بڑی دلیری سے چیلنج کررہے تھے۔ مراد، ماروی، عابی اور دانش اتنا تو سمجھ گئے کہ دشمن عابی کی شہ زوری کو ناپنے اور تولنے کے لیے بے چین ہیں۔ انہیں اس حد تک اندازہ تھا کہ وہ پہلے کی طرح پوری فوج سے لڑنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اسی لیے وہ بڑی بے باکی سے اس کے مقابلے پر آگئے تھے اور عابی پچھلے دنوں سے کچھ زیادہ ہی کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ تھوڑی دور چل کر تھک جاتا تھا۔ بیٹھ کر ہانپنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ دشمنوں کے درمیان آکر بیٹھ گیا تھا جبکہ اسے تن کر مخالفین کو منہ توڑ جواب دینا چاہیے تھا۔

اس نے چھ قد آور فائٹروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔''میرا راستہ نہ روکو۔ مجھے کمزور نہ سمجھو۔ میں ابھی اس ائرپورٹ کو کھنڈر بنا سکتا ہوں۔ تم سب ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاؤ گے۔''

ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔''پہلے تم بولتے نہیں تھے، کر گزرتے تھے۔ اب کچھ کر نہیں سکتے۔ اس لیے دھمکیاں دے کر دھونس جما رہے ہو۔''

دوسرے نے کہا۔''تم نے قانون کے خلاف ہماری زمین پر قدم رکھا ہے۔ ہم تمہیں گرفتار کرتے ہیں۔''

ایک افسر نے سپاہی کو حکم دیا کہ وہ عابی کو ہتھکڑیاں پہنائے۔ وہ حکم کی تعمیل کے لیے آگے بڑھا تو عابی نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ مار کھا کر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ اسے کچھ زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ اب سے پہلے اس کا ایک ہاتھ پڑتے ہی مقابل کا منہ ٹوٹ جاتا تھا۔

انہیں یقین ہو گیا کہ اب وہ خطرناک مقابل نہیں رہا ہے۔ دو ریسلرز نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں بازوؤں کو جکڑ لیا۔ تیسرا ریسلر اسے ہتھکڑی لے کر اسے پہنانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ چیخیں مارتا ہوا اچھل کر فرش پر گر پڑا۔

ماروی بھائی کے لیے ڈھال اور ہتھیار بننے آگئی تھی۔ کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ جنہوں نے عابی کو اطراف سے جکڑ رکھا تھا۔ ان کے دماغوں میں بھی زلزلے پیدا ہوئے۔ ان کی حالت دیکھ کر سب ہی سہم کر پیچھے چلے گئے۔ وہ بیمار اور کمزور ناقابلِ گرفت بن گیا تھا۔ وہ اسے پکڑنا تو کیا، چھو بھی نہیں سکتے تھے۔

ان کا خیال تھا، عابی پہلے کی طرح تنہا جنگ لڑے گا تو حرام موت مرے گا لیکن ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ ناقابلِ شکست کہلانے والا اپنی جنگ آپ نہیں لڑ رہا تھا۔ اس کی بہن مقابلے پر آگئی تھی۔ وہ بہن کا ہی محتاج ہو گیا تھا۔

دشمنوں کو ابھی ذرا شکست اور ناکامی ہوئی تھی۔ تاہم یہ دیکھ کر حوصلہ بڑھ گیا کہ عابی اب مردِ میدان نہیں رہا ہے۔ ٹیلی پیتھی کا محتاج ہو گیا ہے۔ خیال خوانی کا ہتھیار اگرچہ انتہائی خطرناک ہوتا ہے لیکن وہ اس ہتھیار کا محتاج رہ کر پہلے کی طرح پوری دنیا کا بے تاج شہنشاہ نہیں کہلا سکے گا۔ اب دنیا کے ہر ملک میں اس کی طاقت کا سکہ چلنے والا نہیں تھا۔

ایسے وقت مذرباد نے سپر پاور اور اس کے اتحادیوں سے کہا۔''تم سب یہودی، عیسائی، ہندو، آتش پرست وغیرہ ہو اپنے گاڈ سے زیادہ شیطان کے وفادار اور تابعدار ہو۔ تم سب کو تابعداری کا صلہ مل رہا ہے۔ شیطان نے اس ناقابلِ شکست عابی کو نیم مردہ بنا دیا ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا ہے۔ ابھی وہ ٹیلی پیتھی کے سہارے کھڑا ہوا ہے۔ فکر نہ کرو شیطان کے راستے پر چلتے رہو۔ ان مسلمانوں کو کچلنے کے منصوبوں پر عمل کرتے رہو۔ ہم ماروی کی ٹیلی پیتھی کو تم پر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ ہم ٹیلی پیتھی کا جواب ٹیلی پیتھی سے دیں گے۔''

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔''وہ تین ٹیلی پیتھی جاننے والے پچھلے سات برس سے کہیں گم ہو گئے ہیں۔ شاید مر گئے ہیں۔ کیا شیطان ہمارے لیے خیال خوانی کرے گا؟''

مذرباد نے کہا۔''وہ تو کرتا ہی رہتا ہے۔ عورتوں مردوں، بچوں بوڑھوں کے دلوں اور دماغوں میں گھسا رہتا ہے۔ وہ تمہاری مشکل آسان کرنے کے لیے کچھ بھی کرے گا ابھی کرے گا۔''

اس نے اسی وقت طاغوتا کے سامنے آکر چٹکی بجائی۔ وہ روٹی کھا رہا تھا۔ اچانک ایسے چونک گیا جیسے نیند سے ہڑبڑا کر جاگ گیا ہو۔ اسے یکلخت یاد آگیا کہ وہ طاغوتا ہے اور ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔

اسے اپنے عامل مذرباد کے احکامات کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ فوراً ہی عابی کے کمزور دماغ میں پہنچ گیا۔ اس وقت عابی وہیں ائرپورٹ میں تھا۔ دشمنوں سے کہہ رہا تھا۔ ''مجھ سے دور رہو۔ ورنہ خیال خوانی کے جھٹکے کھا کر مرتے رہو گے۔''

ان سب پر عابی کی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ اسے ہتھکڑی پہنانے کی کوشش کرنے والے دماغی جھٹکے کھا کر

فرش پر تڑپ تڑپ کر نڈھال ہو گئے تھے۔ اب وہاں کوئی ٹیلی پیتھی کی اذیت میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن اچانک ہی ان کی مشکل آسان ہو گئی۔

طاغوتا نے عابی کے اندر پہنچتے ہی زلزلہ پیدا کیا۔ یہ اچانک ایسا حملہ تھا کہ عابی کے ہوش اڑ گئے۔ وہ حلق کے بل چیختا ہوا فرش پر گر کر ماہیِ بے آب کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے جان نکلی جا رہی ہے۔

یہ کیا ہو جاتا ہے؟ بدنصیبی کے ایک ہی جھٹکے سے پہاڑ زمیں بوس ہو جاتا ہے؟

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پوری دنیا میں ایک ہی شہ زور کہلانے والا یوں خاک میں لوٹنے لگے گا۔ ان لمحات میں ایسی دماغی اذیتیں پہنچ رہی تھیں کہ کلام پاک کی آیتیں بھی ذہن سے نکل گئی تھیں۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہوتا جا رہا تھا۔

ماروی تڑپ کر بلند آواز سے پڑھنے لگی۔ سات برس گزر چکے تھے۔ یہ آٹھواں برس تھا۔ دشمن خیال خوانی کرنے والے نابود رہے تھے۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ کبھی وجود میں نہیں آئیں گے۔ لیکن غضب ہو گیا۔ ان میں سے کوئی اچانک زندہ ہو گیا تھا اور ایسا حملہ کر چکا تھا کہ عابی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی حالت کہہ رہی تھی کہ اس پر دوسرا حملہ ہو گا تو وہ ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے سکے گا۔

وہ بھائی کے دماغ پر روحانی ٹیلی پیتھی کے استحکام کے ساتھ چھا گئی۔ اذیت ناک درد کی لہریں یکبارگی دھیمی پڑتی چلی گئیں۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک آیت پڑھنے لگا۔ ایسے وقت طاغوتا نے پھر حملہ کیا۔ اس بار ماروی کی سوچ کی لہروں سے ٹکرا کر واپس چلا گیا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھید کھل جائے۔ اس نے فوراً ہی اس کے سامنے چٹکی بجا کر خود فراموشی کے اندھیرے میں پہنچا دیا۔ طاغوتا پھر غائب دماغ ہو گیا۔ اپنے آپ کو بھول گیا۔

ادھر دانش نے خیال خوانی کی چھلانگ لگائی تھی۔ عابی کے دماغ میں آنے والے کو پکڑنا چاہتا تھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ طاغوتا اس کی پہنچ سے دور چلا گیا تھا۔

اس نے کہا۔ ”آپی! یہ کون ٹیلی پیتھی جاننے والا پیدا ہو گیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”دانش! یہ شیطانی چال ہے۔ اپنی ماں کی خبر لو۔ وہ شاید پھر خیال خوانی کرنے لگی ہیں۔“

وہ فوراً ہی اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا۔ لارا نے اسے اپنے اندر محسوس کرتے ہی کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تو پھر آ گیا

ایک سے بڑھ کر ایک

ایک شخص نے اپنے کنجوس پڑوسی سے پوچھا۔ ”ارے کیا ہو گیا...... اتنے لال پیلے کیوں ہو رہے ہو؟“

کنجوس نے جواب دیا۔ ”میرے چھوٹے بیٹے نے آج نیا جوتا پہنا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ایک کے بجائے دو سیڑھیاں طے کر کے اوپر جانا تاکہ جوتے کا تلا کم گھسے لیکن وہ کمبخت دو کے بجائے تین سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پتلون پھٹ گئی۔“

گوہر نایاب

☆ بخیل شخص کی دولت اس وقت زمین سے نکلتی ہے جب وہ زمین کے اندر چلا جاتا ہے۔

☆ مجھے پتا چلا کہ مخمل کے گدوں اور ننگی زمین پر سونے والوں کے خواب ایک جیسے ہوتے ہیں تو مجھے خدا کے انصاف پر یقین آ گیا۔

☆ اعتماد محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔

☆ مرد کا امتحان عورت سے اور عورت کا رونے سے ہوتا ہے۔

☆ پستی کو حقیر مت جانو، اس نے بلندی کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔

☆ وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ ہرگز نہیں ملتا۔

☆ برے دوستوں کی صحبت سے بچو کیونکہ بُرا دوست اس کوئلے کے مانند ہوتا ہے جو اگر گرم ہو تو ہاتھ جلا دیتا ہے اور اگر ٹھنڈا ہو تو تب بھی ہاتھوں کو کالا کر دیتا ہے۔

☆ لوگ اونچے پہاڑوں سے نہیں اکثر چکنی مٹی سے پھسل جاتے ہیں۔

سبق

ایک پٹواری اپنی زمین کا معائنہ کرنے گیا۔ راستے میں کتوں نے گھیر لیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی اور کچھ دور جا کر نہایت غصے سے بولا۔ ”کاش تمہاری ایک ایکڑ بھی زمین ہوتی تو میں تمہیں سبق سکھا دیتا۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

ہے۔ میرے سر میں بے چینی سی ہونے لگی ہے۔ کتنی بار سمجھاؤں کہ تیری ماں نہیں ہوں۔ آخر کب میرا پیچھا چھوڑے گا؟''

''مام! آپ جھوٹ بولتی آرہی ہیں کہ خیال خوانی نہیں جانتی ہیں۔ ابھی آپ نے دشمنی کی ہے۔ بھائی جان کو دماغی تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ ذرا خاموش رہیں۔''

وہ ماں کو چپ رہنے کے لیے کہہ کر اس کے چور خیالات پڑھنے لگا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ''تمہیں تھوڑی دیر کے لیے دماغ میں برداشت کر رہی ہوں۔ ابھی سانس روک کر بھگادوں گی۔''

اس کے بھگانے سے پہلے ہی وہ ماروی کے پاس آکر بولا۔ ''مام نے خیال خوانی نہیں کی ہے۔ میں نے ان کے چور خیالات پڑھے ہیں۔ وہ واقعی برسوں سے خود کو بھولی ہوئی ہیں۔''

ماروی نے کہا۔ ''تو پھر آبنوس یا طاغوتا نے ابھی دشمنی کی ہوگی۔ ہماری دنیا میں اور کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا نہیں ہے۔ یہی تاریک دنیا میں شیطان کے چیلے ہیں۔ میں ان کے پاس جارہی ہوں، تم بھائی جان کے دماغ میں رہو۔ کسی بھی پرائی سوچ کی لہروں کو بھائی جان کے پاس نہ آنے دو۔ ان کی شیطانی چالبازی کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ آبنوس اور طاغوتا کے اندر گئی۔ ان کے چور خیالات کو اچھی طرح پڑھا۔ پھر مایوس ہو کر بھائی کے پاس آگئی۔ عابی کو اگرچہ آرام آگیا تھا تاہم اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ شدید کمزوری کے باعث اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ جاں باز فوری طبی امداد پہنچانے کے لیے وہاں سے اسپتال لے جانا چاہتے تھے لیکن مسلح فوجی انہیں روک رہے تھے۔ دونوں طرف سے بندوقیں تن گئی تھیں، فائرنگ کے تبادلے سے عابی کا بھلا نہ ہوتا۔ وہ کسی اسپتال یا ڈاکٹر تک پہنچ نہ پاتا۔ اس کی نقاہت کو جلد سے جلد دور کرنا اس کی توانائی کو بحال کرنا ضروری تھا۔

تب ماروی اور دانش فوجیوں کے اندر پہنچے اور دماغی زلزلے پیدا کرنے لگے۔ اعلیٰ افسران ذہنی اذیتیں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیے۔ علاج کے لیے عابی کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ماروی نہ عذرباد کو جانتی تھی نہ اس کی چالبازی کو سمجھ پا رہی تھی۔ عقل یہی کہہ رہی تھی کہ ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمن اور کہیں نہیں ہیں۔ اسی تاریک دنیا میں شاید دوسرے پیدا ہو گئے ہیں۔

وہ کاہن کے پاس آکر بولی۔ ''تم لوگوں کی چالبازی اب ہم سے چھپی نہیں رہے گی۔ تمہارے کسی عامل نے لارا، آبنوس اور طاغوتا کو بظاہر ناکارہ بنا رکھا ہے۔ تم لوگ تقریباً آٹھ برسوں سے ہمیں دھوکا دیتے آرہے ہو۔ شیطان رازداری سے بڑی کامیاب چال چل رہا تھا لیکن آج ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے نے بھائی جان کو دماغی تکلیف پہنچا کر سارا بھید کھول دیا ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہم پچھلے آٹھ برسوں سے دشمنی بھول گئے ہیں۔ امن و امان سے رہتے آرہے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے جب ہمارے پاس ٹیلی پیتھی جاننے والے ہی نہیں رہے ہیں تو ہمیں اپنی دنیا میں امن و امان سے ہی رہنا ہوگا۔''

''باتیں نہ بناؤ۔ یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والے بیک وقت ناکارہ ہو گئے ہیں۔ نہیں، انہیں ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔ تم لوگ وقتِ ضرورت پھر انہیں کام میں لے آتے ہو۔''

عذرباد کاہن کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ماروی سے بولا۔ ''میرا نام عذرباد ہے۔ میں اپنے شیطان معظم کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ تمہارا بہت چرچا سنا ہے۔ آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ تم زبردست روحانی قوتوں کی حامل ہو۔ میں بھی تم سے کم نہیں ہوں۔ ٹیلی پیتھی جانتا ہوں۔ ابھی میں نے ہی عابی کو دماغی جھٹکا پہنچایا تھا۔ وہ تین ٹیلی پیتھی جاننے والے زیرو ہو چکے ہیں۔''

ماروی نے کہا۔ ''جھوٹ بول رہے ہو۔ انہیں ہماری دشمنی اور انتقامی کارروائیوں سے بچائے رکھنے کے لیے برسوں سے یہ ڈراما رچا رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''تمہیں یقین نہیں ہے تو جاؤ۔ ان تینوں کو مار ڈالو۔ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہمارا کھیل جاری رہے گا۔ تم کب تک بھائی کی حفاظت کروگی۔ میں پھر کسی وقت اس پر حملہ کروں گا۔ کیا تم دن رات پہریدار بن کر اس کے اندر رہا کروگی؟ یہ لکھ لو کہ اس کا آخری وقت آگیا ہے۔''

''اللہ بہتر جانتا ہے۔ اگر اس کا آخری وقت نہیں آیا ہے تو تم ان کی پرچھائیں تک بھی نہیں پہنچ سکو گے۔ تمہاری خیال خوانی کی لہریں میری روحانی قوتوں سے مات کھاتی رہیں گی۔''

وہ عابی کے پاس آگئی۔ ڈاکٹر اسے اٹینڈ کر رہے تھے۔ اسے ذرا ہوش آگیا تھا لیکن وہ پوری طرح حواس میں نہیں تھا۔ اس کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ واقعی اس کا آخری

وقت نظر آرہا تھا۔

یہ اللہ ہی ہے جو قوتیں دیتا ہے پھر ان قوتوں پر زوال لے آتا ہے۔ کسی فرعون کو تاحیات فرعون نہیں رہنے دیتا۔ کسی عابد علی منگی کو مسلسل شہ زور نہیں رکھتا، تسلسل توڑ دیتا ہے۔ یہ دستور قدرتی ہے۔ خوشی کے بعد غم، مشکل کے بعد آسانی، جوانی کی شہ زوری کے بعد بڑھاپے کی کمزوری، یہ تمام عوامل ایک چرخے کی طرح گول گھومتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں۔

عابی پر بھی زوال آچکا تھا۔ مراد اسی دن بیٹے کے پاس آیا پھر اسے اپنے ساتھ ارضِ اسلام لے گیا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے زیر علاج رکھنا چاہتا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ عابی اب کسی ملک میں محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اب اسے اپنے ہی ملک، اپنے ہی محل میں باقی ماندہ سانسیں لینی تھیں۔

ماروی نے بھرپور روحانی صلاحیتوں سے اس کے دماغ کو مقفل کر دیا تھا۔ عذر باد اور تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والے بھی اس کے اندر نہیں جا سکتے تھے۔ یوں عابد علی منگی کا باب ان کے لیے بند ہو چکا تھا۔ اب شیطان... یہودیوں، عیسائیوں اور دوسرے دھرم کے لوگوں کو اپنے اعتماد میں لے رہا تھا۔ بڑے دعوے سے کہہ رہا تھا۔ ”تم سب نے دیکھا ہے، عابی پوری دنیا پر چھا گیا تھا۔ تمہارے ملکوں کا حکمران بن کر تم سب کو کٹھ پتلی بنا چکا تھا۔ میں نے اس ناقابلِ شکست فولاد کو پگھلا کر پانی کر دیا ہے۔“

سپرپاور کے حکام اور ان کے اتحادیوں نے کہا۔ ”بے شک تم نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ ہم تمہاری عبادت تو نہیں کرتے لیکن تمہارے تابعدار رہیں گے۔ تم دن کو رات کہتے ہو، ہم بھی رات کہتے ہیں۔ جو چاہتے ہو ہم سے منواتے ہو۔ ہم مانتے ہیں۔“

ایک حاکم نے کہا۔ ”لیکن عابی کے بعد ماروی کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ وہ اپنی روحانی قوتوں کے باعث عابی سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو گی۔“

عذر باد نے کہا۔ ”ہم عبادت گزاروں کی روحانی قوتوں سے نہ ڈرتے ہیں، نہ ان سے کمزور ہیں۔ ماروی دردِ سر ضرور بنے گی لیکن ہم اس سے نمٹ لیں گے۔ نمٹنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے تم سب کو ماروی کے حملوں سے بچائے رکھنا ہوگا۔“

ان سب نے فوراً کہا۔ ”بے شک ہم اس کی دشمنی سے محفوظ رہیں گے تو پوری آزادی سے کھل کر شیطان کے کام آتے رہیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”تم میں سے جتنے اہم حکمران، سیاست دان، فوجی افسران اور دیگر اہم شعبوں کے اہم عہدیداران ہیں، میں ان سب کے دماغوں کو مقفل کر دوں گا۔“

یہ سنتے ہی وہ سب خوشی سے اچھل پڑے، کہنے لگے۔ ”پھر تو ہم محفوظ رہیں گے۔ عابی کی طرح ماروی بھی ہمارے لیے بے ضرر ہو جائے گی، ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔“

وہ بولا۔ ”میں آج ہی سے جادوئی عمل کے ذریعے تم سب کے دماغوں کو پتھر بنا دوں گا۔ ماروی کی خیال خوانی کی لہریں پتھروں سے ٹکرا کر واپس جایا کریں گی۔“

اس سے زیادہ مطمئن کرنے والی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ سپرپاور اور اتحادی ملکوں کے حکمران ایمان اور شیطان کے درمیان سینڈوچ بننے والے نہیں تھے۔ ان کی جان و مال کو کوئی نقصان پہنچنے والا نہیں تھا۔

عذر باد نے کہا۔ ”ہمارا ایک ہی مقصد رہا ہے۔ دین اسلام کو ختم کرنا یا دین داروں کو غلام بنا لینا۔ ہمیں اپنے مقاصد میں کبھی کامیابی ہوتی ہے، کبھی ناکامی لیکن اب ناکامی نہیں ہو گی۔“

آرمی کے ایک اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ ”اب کیا کرو گے؟“

”اب مسلمانوں کو ہی مسلمانوں کا دشمن بناؤں گا۔ ویسے تو ان کے اندر سو طرح کے فرقے ہیں۔ ان کے اندر فتنے اور فسادات پنپتے رہتے ہیں۔ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے اور کمزور بناتے رہتے ہیں۔ موجودہ پلاننگ کے مطابق تمام اسلامی ممالک کو پہلی بار مراد اور ماروی کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ جو مسلمان حکمران ہم سے تعاون کریں گے، ہم ان کے دماغوں کو بھی لاکڈ کر دیں گے' ماروی انہیں بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔“

یہ واقعی زبردست پلاننگ تھی۔ آئندہ صرف یہودی اور عیسائی ہی نہیں، مسلمان حکمران بھی مراد اور ماروی کے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کرنے والے تھے اور یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ باہر والوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا گھر والوں سے گھر والوں کو پہنچتا ہے۔

کچھ عرصے تک خیر و شر کے درمیان خاموشی رہی۔ ان کا ایک دوسرے سے کسی طرح کا رابطہ نہ رہا۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر اپنے حالات کے مطابق منصوبے بنا رہے تھے۔ آدمی سکون سے رہنا نہیں چاہتا۔ ہنگامہ آرائی کے اسباب پیدا کرتا رہتا ہے۔

سپر پاور اور اس کے اتحادیوں نے اشتعال انگیزی شروع کی۔ انہوں نے ریڈیو، ٹی وی چینلز اور اخبارات کے ذریعے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ مراد، اس کی بیٹی اور بیٹے کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ روپوش رہ کر اچانک ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ہم اپنی ریاست ارضِ اسلام میں ہیں۔ اپنے گھر میں رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم چھپ رہے ہیں۔ امن و امان قائم رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ تم لوگوں سے غیر ضروری تعلقات نہ رکھے جائیں۔ دور کی دوستی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔ ہم یہاں اپنی اسلامی یونیورسٹی کی ترقی اور عروج کے لیے دن رات محنت کررہے ہیں۔ آپ حضرات ہماری طرف سے کسی اندیشے میں نہ رہیں۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہم یہ اعلان کررہے ہیں کہ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک تمہاری ریاست ارضِ اسلام سے عارضی طور پر سیاسی تعلقات ختم کرنے والے ہیں۔ تمہاری ریاست کے کسی باشندے کو کسی ملک میں بھی جانے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا نہیں دیا جائے گا۔ تم بھی اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے کسی ملک میں نہیں آسکو گے۔“

”ایسا احمقانہ اعلان نہ کرو۔ ارضِ اسلام کے تقریباً چالیس ہزار باشندے مختلف بیرونِ ممالک میں ہیں۔ وہاں ہمارے سفیروں کو رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی تو ہم ان ملکوں میں اپنے لوگوں کے مسائل اور پریشانیوں کو کیسے حل کریں گے؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہم اپنے ملک کے باشندوں کو تمہاری ریاست سے واپس بلا رہے ہیں۔ تم اپنے لوگوں کو بلاؤ۔“

”صرف انہیں بلانے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ دنیا کے تمام ممالک میں لاکھوں مسلمان رہائش پذیر ہیں۔ وہ وہاں اسلام دشمن عناصر سے نمٹتے رہتے ہیں۔“

”یہ تمہارے مسائل ہیں تم سمجھو۔ ہمیں جو کہنا تھا کہہ چکے ہیں۔“

”تکبر سے باز آجاؤ۔ یہ زمین ایک سرے سے دوسرے سرے تک اللہ کی ہے۔ جہاں جہاں اذانیں گونجتی ہیں اور سجدے کیے جاتے ہیں، وہاں ہم ضرور پہنچتے رہتے ہیں۔ تم لوگ غلط اور عداوتی فیصلے سنا کر ہمیں مشتعل نہ کرو۔ امن و امان سے سفارتی تعلقات بحال رکھو گے تو سب کا بھلا ہوگا۔“

وہ فی الحال دوستانہ تعلقات قائم رکھنے سے انکار کر رہے تھے۔ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مراد اور ماروی مشتعل ہوکر ان کے خلاف کیا کریں گے۔ کیا شیطان واقعی انہیں تحفظ فراہم کرتا رہے گا؟

انہوں نے آزمائش کے طور پر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اپنے کئی ملکوں میں اذان پر پابندی عائد کرنے لگے۔ حکم دیا کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان نہ دی جائے۔ اپنے دین کو اپنے گھر اور مسجد کی چار دیواری سے باہر نہ لایا جائے۔

ایک موذن نے پابندی کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے بدستور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان سنائی تو ایک پولیس افسر نے اسے گولی ماردی۔ وہاں کے مسلمان طیش میں آگئے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خبر پھیل گئی۔ اگرچہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان دینا اس ملک کے قانون کے خلاف تھا۔ تاہم یہ ایسا جرم نہیں تھا کہ موذن کو سزائے موت دی جاتی۔ اس ظلم کے خلاف کئی اسلامی ممالک میں جلوس نکالے جا رہے تھے۔ مراد نے اس ملک کے حکمرانوں سے کہا۔ ”یہ مذہبی جذبات کو چھیڑنے اور مسلمانوں کو طیش دلانے والی شیطانیت ہے۔ موذن کے قاتلوں کو فوراً سزائے موت دی جائے اور وہاں کے تمام مسلمانوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔“

جواباً کہا گیا۔ ”یہ ہمارے ملک کے معاملات ہیں۔ تم تمام مسلمان انتہا پسند، بددماغ اور جذباتی ہو۔“

مراد نے کہا۔ ”میرے بیٹے کی لاعلاج بیماریوں اور کمزوریوں نے تمہارے حوصلے بڑھا دیے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ اس کے بستر علالت پر رہنے سے ہم کمزور ہوگئے ہیں۔ ہم آج بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ کسی ملک میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کراسکتے ہیں۔“

حقارت سے کہا گیا۔ ”ہم دیکھیں گے کہ تم ہمارے ملک میں اپنی من مانی کیسے کرو گے؟ یہاں تمہیں پہلے کی طرح پھولوں کا بستر نہیں ملے گا۔“

”اچھا تو پھر انتظار کرو اور دیکھو کہ یہ اشتعال انگیزی تمہیں کتنی مہنگی پڑنے والی ہے۔“

مراد نے ماروی سے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ یہ دشمن تمہاری ٹیلی پیتھی سے اور روحانی قوتوں سے خوف زدہ کیوں نہیں ہیں؟“

وہ بولی۔ ”بھائی جان انہیں جسمانی قوتوں سے زیر کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں لیکن وہ لوگ میری غیر معمولی قوتوں کا مظاہرہ دیکھ چکے ہیں۔ انہیں کچھ تو محتاط رہنا چاہیے۔ اپنے رویے میں کچھ تو لچک پیدا کرنی چاہیے۔“

”معلوم تو کرو کہ ان میں بلا کی بے باکی کیسے پیدا

ہوگئی ہے؟''

''میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔''

پولیس فورس کے ایک افسر نے موذن کو ہلاک کیا تھا۔ ماروی اس افسر کے پاس پہنچ گئی لیکن اس کے دماغ میں نہ پہنچ سکی۔ اس نے فوراً ہی سانس روک لی تھی۔ یوں معلوم ہوا کہ اسے ٹیلی پیتھی کے حملوں سے بچانے کے لیے اس کے دماغ کو لاکڈ کردیا گیا ہے۔ یعنی وہ مراد اور ماروی کو مشتعل کرنے، چیلنج کرنے سے پہلے وہاں حفاظتی تدابیر پر عمل کرچکے تھے۔

اس افسر نے فاتحانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ یہ جو میرے دماغ میں آنا چاہتی ہے، یہ مراد کی بیٹی ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہم شیطان کے چیلے ہیں۔ اس نے ہم پر ایسا جادو کیا ہے کہ تم اپنی خیال خوانی سے بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکو گی۔''

دوسرے افسر نے خلا میں تکتے ہوئے کہا۔ ''ہائے ماروی! آؤ ہمیں بھی آزمالو۔''

اس نے دوسرے افسروں کے دماغوں میں جانا چاہا۔ ان سب کے دماغ بھی مقفل ہوچکے تھے۔ اس نے کئی چھوٹے بڑے حکام اور فوجی افسران کے اندر بھی جانا چاہا۔ اسے ناکامی اور مایوسی ہوتی رہی۔ جہاں تک شیطان کے تابعدار تھے، وہاں تک رکاوٹیں تھیں۔ وہ کسی کو اپنے زیرِاثر نہیں لاسکتی تھی۔

انہوں نے اسکائپ کے ذریعے مراد کو اسکرین پر دیکھا پھر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہاری بیٹی ہمارے درمیان ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ اسے راستہ نہیں مل رہا ہے۔ آئندہ بھی دیکھو گے، شیطان اسے ٹھوکروں میں اڑاتا رہے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ دماغی دروازے کب تک بند رکھو گے؟ شیطان نے تم لوگوں کے لیے عارضی حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ جادو کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ کچھ ہی دنوں میں تم سب کے دماغی دروازے کھلنے لگیں گے۔ شیطانی امداد جلد ہی ہوا ہوجائے گی۔''

''تمہارے کہہ دینے سے شیطانی امداد کمزور نہیں ہوجائے گی۔ وہ ازل سے دین و ایمان کے خلاف اپنے تابعداروں کو سلامتی دیتا آرہا ہے۔ اب تم لوگوں کا زوال آچکا ہے۔ دیکھ رہے ہو کہ ہم نے دنیا کے تمام ملکوں سے تمہیں بھگا کر اپنی ریاست کے اندر رہنے پر مجبور کردیا ہے۔''

''خوش فہمی میں نہ رہو۔ سیلاب کے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکتا۔ ماروی پلک جھپکتے ہی کسی ملک میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ اب میں بھی آرہا ہوں۔ تم لوگوں نے میرے عابی کے ساتھ جیسی بھیانک اور لرزہ خیز دشمنی کی ہے، اس دشمنی کا انتہائی عبرت ناک انجام تم سب کے سامنے ہوگا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی دشمن کے سامنے مراد آیا ہو اور وہ زندہ رہ گیا ہو۔''

ان سب کو بہت مضبوط سیکیورٹی مل رہی تھی۔ وہ مراد کی دھونس میں آنے والے نہیں تھے۔ ویسے انہیں دھونس میں لاتے، مرعوب کرنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ ماروی ان کے آرمی ہیڈکوارٹر میں آگئی۔ وہ ان کے اسلحے کے گودام کو تباہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ان کی آرمی پہلے کی طرح تباہ ہوجاتی۔ عابی انہیں تباہی کے تماشے دکھا چکا تھا۔ پھر بھی ہوتا تو وہ جھکنے پر مجبور ہوجاتے لیکن وہاں بھی مایوسی ہوئی۔

شیطان نے تمام شعبوں کے کلیدی حکام کو اور آرمی ہیڈکوارٹر کے ایک ایک ڈیپارٹمنٹ کو اپنی سخت حفاظتی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اسلحے کے گودام کے کسی افسر اور سپاہی کے اندر نہ پہنچ سکی۔

یہ ثابت ہورہا تھا کہ وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے کسی بھی دشمن ملک کے حکمرانوں اور فوجی افسروں کے اندر نہیں پہنچ سکے گی۔

ان کی ناکامی پر دشمن جشن منانے لگے۔ بے شک انہوں نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ شاید پہلی بار مراد علی منگی کو ناکام و نامراد بنا کر اسے کونے سے لگادیا تھا۔

یہ خیال تھا کہ عابی جیسے شہزور اور ناقابل شکست بیٹے کے ٹوٹ جانے سے وہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔ آئندہ عذاب بن کر نازل نہیں ہوگا وہ پہلے کی طرح ایکشن سے بھرپور زندگی نہیں گزار سکے گا۔

ان حکمرانوں نے بڑے فخر سے کہا۔ ''لو مراد! ہم نے تمہیں اچھی طرح نچوڑ ڈالا ہے۔ ایک پھٹے ہوئے شکن آلود کپڑے کی طرح الگنی پر پڑے رہو۔''

دوسرے حاکم نے کہا۔ ''تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی بیٹی کو ہمارے ملکوں میں آنے سے روک لو۔ اگر اب وہ ادھر آئے گی تو جانتے ہو کیا ہوگا؟''

''کیا ہوگا؟''

''وہ یہاں آکر خیال خوانی کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانا چاہے گی تو ہم تمہاری ریاست پر فوج کشی کریں گے۔''

''اونہہ۔ کیا ہے وہ تمہاری ریاست؟ ایک ناخن سے بھی چھوٹی ہے۔ دنیا کے نقشے میں کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ ہمارے ایک ہی فضائی حملے سے ہمیشہ کے لیے نابود ہوجائے گی۔''

''وہاں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی

بنانے کا دعویٰ کر رہے ہو۔ ایک حملے میں کھنڈر ہو جانے والی یونیورسٹی میں تم اپنی فیملی کے ساتھ دفن ہو جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر وہ سب ہنسنے لگے۔ بڑی سی اسکرین پر سب ہی برتری کے نشے میں مست دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بہت بڑا چیلنج کیا تھا۔ مراد کے لیے صرف اس کی ریاست ہی نہیں، اسلامی یونیورسٹی بھی بہت زیادہ اہم تھی۔ اس نے، اس کے ہم زاد نے، زیب النساء، بشریٰ اور بلے نے دن رات کی محنت سے چار میل کے رقبے پر اس وسیع وعریض یونیورسٹی کو ایک مضبوط قلعے کی طرح تعمیر کیا تھا۔

وہ یونیورسٹی مراد کے لیے اس لیے بھی جان سے زیادہ اہم تھی کہ اس کی بنیاد ڈالنے سے پہلے اس نے خواب میں بابا صلاح الدین اجمیری کو دیکھا تھا۔ وہ کھودی ہوئی جگہ پر بنیاد کی پہلی اینٹ اپنے ہاتھوں سے رکھ رہے تھے۔ گویا اس یونیورسٹی کی بنیاد بابا اجمیری نے رکھی تھی۔

پچھلے چھ برسوں میں یونیورسٹی کی تعمیر اور ترقی کے دوران میں اس نے کئی بار بابا اجمیری کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ جیسے ایک ایک شعبے میں جاتے تھے اور وہاں کا معائنہ کرتے رہتے تھے۔ پھر معلوم ہوتا تھا کہ ان شعبوں میں جو خامی، کمی یا کوتاہی رہ گئی تھی، وہ دور ہو گئی ہے۔ پیچیدہ مسائل آپ ہی آپ حل ہو جایا کرتے تھے۔

بعض اوقات بندہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ اس کے مسائل کس طرح آسانی سے حل ہو گئے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے مستند علما کرام بڑے ایمانی جذبوں سے کہتے تھے کہ وہاں کے ہر کام میں روحانی عوامل کارفرما ہیں۔ بصارت سے حقیقت نظر نہیں آتی۔ بصیرت سے ان عوامل کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

مراد کو پچھلے چھ برسوں میں اپنا پیر نگا نظر نہیں آیا۔ اسے ایسا ہی لگتا رہا جیسے بابا صاحب سایہ فگن ہیں پھر اس کی دستگیری کے لیے کسی دن اچانک آئیں گے۔

وہ یونیورسٹی جو مراد کے لیے جان سے زیادہ عزیز تھی، اسے تباہ کرنے کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ وہ اسکائپ کے ذریعے ان فرعونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی اٹھ کر اسکرین سے آؤٹ ہو گیا۔ اس نے چیلنج کا جواب نہیں دیا۔ ایک اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ "کہاں ہو تم؟ کیا دم دبا کر بھاگ رہے ہو؟"

انہیں جواب نہیں ملا۔ وہ انتظار کرنے لگے پھر کئی ممالک کے حکمرانوں اور فوج کے افسروں نے اپنے اپنے موبائل فون کی اسکرین کو دیکھا۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ "جواب اسی فون کی اسکرین پر دکھائی دے گا۔ انتظار کرو۔"

ایک اعلیٰ افسر نے اپنے فون کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ پہلی بار دہشت زدہ ہوا ہے۔ جواب دینے سے کترا رہا ہے۔ ابھی روبرو کچھ کہہ نہ سکا۔ منہ چھپا کر کچھ کہنے والا ہے۔"

ایک اور افسر نے کہا۔ "اس کے میسیج پر غور کریں۔ اس نے یہ نہیں لکھا ہے کہ ہم اس کا میسیج پڑھیں گے۔ یہ لکھا ہے کہ میسیج دیکھیں گے۔"

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "یہ دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ کسی طرح کا جواب بھلا دکھائی کیسے دے گا؟ تحریری جواب تو پڑھا جاتا ہے۔"

ایک افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ ہماری حیثیت سے اس کی کھوپڑی گھوم گئی ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "لعنت بھیجو اس پر۔ ہم اس کی ریاست پر حملہ ضرور کریں گے۔ اسے جلد سے جلد نابود کر دینا ہے۔"

مراد نے اپنا جواب سنانے کے لیے انہیں ایک ذرا تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ناگواری سے انتظار کرنے لگے۔ شام سے رات ہو گئی پھر دوسرا دن نکل آیا۔ آرمی کے اعلیٰ افسر نے جھنجلا کر کہا۔ "لعنت ہے اس پر۔ وہ ہم سے منہ چھپاتا رہے گا۔ ہمیں اس ریاست کے باہر کسی بھی ملک میں ماروی کی موجودگی کا اور اس کی خیال خوانی کا ثبوت ملے گا تو ہم ارضِ اسلام پر حملہ کر کے وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

وہ اینٹ سے اینٹ کیا بجاتے؟ اب اس کی دہشت سے ان کے دانت بجنے والے تھے۔ وہ اچانک ہی ان کے سروں پر آپہنچا تھا۔ سب ہی نے رنگ ٹون سن کر اپنے اپنے فون کا بٹن دبا کر دیکھا تو انہیں مراد علی منگی نظر آیا۔ اس نے درست میسیج دیا تھا کہ وہ لوگ اسے پڑھیں گے نہیں، دیکھیں گے۔

اور وہ دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں اسکرین پر تھا، وہاں اس کے پیچھے ایک شاندار رہائش گاہ کے مین گیٹ پر لکھا ہوا تھا۔ "پرائم منسٹر ہاؤس۔"

یہ یقین نہ کرنے والی، چونکا دینے والی بات تھی۔ پرائم منسٹر حیرت سے اچھل کر بولا۔ "یہ...... یہ مراد میرے پیلس کے سامنے ہے۔ کیا یہ ابھی یہاں ہے؟ اسے پکڑو۔ فوراً گرفتار کرو۔"

اس پیلس کے اندر اور باہر یکلخت بھگدڑ مچ گئی۔ وہ

سب چیخ چیخ کر پولیس اور آرمی کے مسلح گارڈز کو احکامات دینے لگے۔ ہر سو خطرے کے الارم گونجنے لگے۔ وہاں سے دور دور تک ہنگامی کرفیو نافذ کردیا گیا۔ ادھر کے تمام راستوں اور علاقوں کو عارضی طور پر بند کردیا گیا۔

میسیج تصویر کے مطابق مراد اب وہاں نہیں تھا۔ کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ اسے دور دور تک تلاش کیا جارہا تھا۔ اس دوران پرائم منسٹر نے اپنے فون سے رنگ ٹون سنی۔ بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا تو مراد کی آواز سنائی دی۔ ”مجھے ڈھونڈو کہ میں دلوں کو دھڑکانے والی دھڑکن ہوں۔ مجھ سے مایوس نہ ہونا۔ میں منہ چھپا کر جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ ارض اسلام کو ایک نقطہ کہہ کر اسے مٹانے کا ناپاک ارادے کرنے والو......! تمہارے ملک کی ایک عبرت ناک تاریخ لکھنے آیا ہوں۔“

اس فون کال نے سبھی کو دہلا دیا۔ یہ یقین ہوگیا کہ وہ اپنی ریاست سے نکل کر وہاں آگیا ہے۔ اسے آنے میں دیر لگی۔ اس نے چالیس گھنٹے پہلے میسیج دیا تھا۔ ہزاروں میل کا سفر کرنے میں خاصا وقت لگا تھا مگر آگیا تھا۔

بے شمار سیاسی اور فوجی عہدیدار اس کے نمبر پر کال کرنے لگے۔ جواباً اسکرین پر تحریر ابھر رہی تھی۔ ”کوئی اور بات نہیں ہوگی۔ آخری موقع دے رہا ہوں۔ خود کو تباہی سے بچاؤ، توبہ کرو اور موذن کے قاتلوں کو قرار واقعی سزا دو۔“

اس سے بات نہیں ہورہی تھی۔ اتنا یقین ہوگیا تھا کہ وہ اسی ملک اسی شہر میں موجود ہے اور اسی طرح کی بڑی تباہی مچانے والا ہے۔ وہ سب جھنجلا رہے تھے۔ اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہوکر اس کی کوئی بات ماننے والے نہیں تھے۔ شیطان انہیں حوصلہ دے رہا تھا۔ ”اس کی دھونس میں نہ آؤ۔ میں نے تمہاری تباہی کے تمام راستوں کو لاکڈ کردیا ہے۔ ماروی کی ٹیلی پیتھی کو بے اثر کردیا ہے اور مراد سے کیا ڈرنا؟ وہ نہ تو ٹیلی پیتھی جانتا ہے اور نہ ہی نادیدہ ہوکر کہیں تباہی لاسکتا ہے۔“

حالات نے باپ بیٹی کو مشکلات میں ڈال دیا تھا۔ ماروی نے شیطانی چالوں کا توڑ کرنے کے لیے مجبوراً گن پکڑی اور مراد کی ہدایت کے مطابق نادیدہ ہوکر آرمی ہیڈ کوارٹر کے اسلحہ خانے میں پہنچ گئی۔

اس نے پھر ان دشمنوں کو میسیج دیا۔ ”تم لوگ نقصان اٹھائے بغیر ہمارا مطالبہ نہیں مانو گے تو پھر لو اور دیکھو۔ دس منٹ کے بعد تم سب کے پاؤں تلے زمین لرزنے والی ہے۔ گھڑی دیکھو۔“

وہ سب پریشان ہوکر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ شیطان بھی نہیں جان سکتا تھا کہ ہزاروں حفاظتی انتظامات ہوں تب بھی مراد علی منگی کیسے سرنگ بنا کر ان کے اندر پہنچ جاتا ہے؟

پھر انہیں میسیج ملا۔ ”میں تمہارے آرمی ہیڈ کوارٹر میں ہوں۔“

یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس کے باوجود بھگدڑ مچ گئی۔ دس منٹ میں تلاش بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ کہاں ہے، کس بھیس میں آیا ہے اور ہیڈ کوارٹر کے کس حصے میں ہے؟

مراد کا یہ طریقہ کار دشمنوں کو پاگل کردینے کے لیے تھا۔ وہ مارنے سے پہلے اسی طرح دوڑاتا تھا۔ وقت بھلا کہاں رکتا ہے۔ دس منٹ گزر گئے۔ واقعی زلزلہ آگیا۔ ایسا فلک شگاف دھماکا ہوا کہ زمین میں گڑھے پڑ گئے۔ بھاگنے والوں کے لیے قبریں بنتی چلی گئیں۔ وہاں کے رہائشی بنگلے اور بیرکس کی دیواریں اور چھتیں ریزہ ریزہ ہوکر فضا میں اڑنے لگیں۔ دور تک آگ ہی آگ، دھواں ہی دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے زیادہ دھواں ان کے دماغوں میں بھر گیا تھا۔ وہ ہیڈ کوارٹر سے دور رہنے کے باعث بچ گئے تھے۔ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ ایک دوسرے سے بھی کچھ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ سب پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

یہ خبر دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچ گئی۔ سوالات گونجنے لگے۔ یہ کیسے ہوگیا؟ پرنس جابی تو بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہا ہے پھر پورے ایک آرمی ہیڈ کوارٹر کو کس نے تباہ کیا ہے؟

ایسا تو صرف جادو سے یا ٹیلی پیتھی کی قوت سے ہوسکتا ہے۔ سوال پیدا ہوا۔ ”پھر ماروی نے اب تک ایسی تباہی کیوں نہیں مچائی تھی؟“

بات یہی سمجھ میں آرہی تھی کہ ماروی ابھی بچی ہے۔ جنگ لڑنے کے ہتھکنڈوں اور چالبازیوں کو نہیں سمجھتی ہے۔ صرف اسلحے سے جنگ نہیں جیتی جاتی۔ اسلحے کو استعمال کرنے کی ذہانت اور حاضر دماغی لازمی ہوتی ہے۔ اسے ابھی باپ سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ وہ اس کا انتظار کررہی تھی۔

دشمن دیکھ لیں، شیطان بھی سمجھ لے کہ بیٹی اسلحہ ہے اور باپ سپاہی ہے۔ بیٹی کا دماغ اسلحہ ہے اور باپ خطرناک اسلحے کا ناقابل شکست کھلاڑی ہے۔ دیکھو کہ میدان جنگ سے پہلی گونج سنائی دی ہے۔ ارضِ اسلام جو ناخن کے برابر ہے، وہ تمہارے گوشت میں گڑ گیا ہے۔ بسم اللہ ہوچکی ہے۔

اب سے پہلے پرنس عابی کی غیر معمولی قوتوں کا مظاہرہ ایسا زبردست ہوتا تھا کہ دشمن اس کے سامنے باپ کو بھول گئے تھے۔ وہ جسمانی قوت میں بیٹے کے برابر نہیں تھا لیکن دشمنوں سے کم بھی نہیں تھا، اپنی ذہانت سے ہمیشہ ان پر بھاری پڑتا آرہا تھا۔

اس ہیڈکوارٹر کی تباہی انہیں سمجھا رہی تھی کہ شیر کو نیند میں مردہ نہ سمجھو۔ وہ سوتا ہے تو جاگتا بھی ہے۔ وہ اپنی ریاست میں رہ کر اسلامی یونیورسٹی کے معاملات میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ وہ دنیا والوں کے لیے سو رہا تھا۔ یہ شیطان کی کمبختی تھی۔ اس نے اپنے طور پر بڑی کامیاب چالیں چلنے کی خوش فہمی میں خوابیدہ شیر کو جگا دیا تھا۔

انہوں نے بڑے غرور سے کہا تھا کہ ایک چٹکی برابر ریاست ارضِ اسلام کو ایک ہی فضائی حملہ کر کے ہمیشہ کے لیے نابود کردیں گے۔ اس سے زیادہ خطرناک حملہ ان کی اپنی زمین پر ہوگیا تھا۔ منہ توڑ جواب ملنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اب اس ملک کو سیاسی، عسکری اور اقتصادی طور پر پھر سے مضبوط ہونے میں برسوں لگنے والے تھے۔

دوسرے تمام ممالک اس ملک کے عبرت ناک انجام سے محتاط ہوگئے تھے۔ مراد اور ماروی کو جواباً چیلنج نہیں کر رہے تھے۔ عذرباد سے پوچھ رہے تھے۔ "تم خاموش کیوں ہو؟ ایک ملک کی معیشت اور فوجی قوت تباہ ہوگئی ہے اور تم جوابی کارروائی نہیں کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "ذرا صبر کرو۔ وکٹ گرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کھیل ختم ہوگیا ہے۔ دوسرے کھلاڑی کے آنے اور دوسرا کھیل شروع ہونے تک ایک ذرا وقفہ رہتا ہے۔ مراد کی اور شیطان کی جنگی حکمت عملی مختلف ہے۔ مراد جب ایکشن میں آتا ہے تو دہشت طاری کرنے کے لیے بڑی تیزی سے حملے کرتا رہتا ہے اور شیطان بہت خاموشی سے اور پراسرار طریقوں سے مقابل کے اندر سرنگ بناتا ہے۔ جیسا کہ عابی کے سلسلے میں دیکھ چکے ہو۔ ہم پچھلے آٹھ برسوں سے اس کی قبر کھودتے آرہے ہیں۔ اسے بستر مرگ پر پہنچادیا ہے۔ وہ آج کل میں دنیا سے جانے والا ہے۔ اب مراد کی شامت آگئی ہے اسی لیے وہ ریاست سے باہر آرہا ہے۔"

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "اگر اسے بھی بستر مرگ پر پہنچانے میں آٹھ برس لگاؤ گے تو کیا وہ تب تک ہمیں زندہ رہنے دے گا؟"

"میں نے تم سب کے دماغوں کو فولادی قلعہ بنادیا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ انہوں نے ہیڈکوارٹر پر حملہ کیا ہے۔ تم میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے اور نہ آئندہ پہنچا سکیں گے۔"

"یہ درست ہے کہ ہم محفوظ ہیں۔ شیطان کی پناہ میں اطمینان ہے لیکن مراد کے موجودہ حملے نے ہمارے ملک کو اپاہج بنادیا ہے۔ ہم بھی اس کی ریاست کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس کی اسلامی یونیورسٹی کو کھنڈر نہیں بنا سکو گے؟"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ "فی الحال ممکن نہیں ہے۔"

ایک حاکم نے حیرانی سے پوچھا۔ "مسٹر عذرباد! کیا ہمارے شیطان کے لیے بھی کوئی بات ناممکن ہوتی ہے؟"

"ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اسے ممکن بنالیتا ہے۔ ابھی رکاوٹیں سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ میں کئی بار اس یونیورسٹی میں داخل ہونے کی کوششیں کرچکا ہوں۔ مجھے راستہ نہیں ملتا ہے۔ جب بھی اس یونیورسٹی کے صدر دروازے کو کھول کر اندر جاتا ہوں تو کسی جنگل میں پہنچ جاتا ہوں۔"

"تعجب ہے۔" آرمی کے ایک افسر نے کہا۔ "ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس یونیورسٹی کی چار دیواری کے اندر کیا ہے؟ کیا تم نادیدہ ہوکر دیوار پھاند کر اندر نہیں جاسکتے؟"

"میں ایک بار دیوار پر چڑھ کر اندر جانا چاہتا تھا۔"

وہ ذرا چپ ہوا۔ ایک نے پوچھا۔ "ہاں تو پھر؟"

"پھر میں دیوار پر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر اور اوپر چڑھتا رہا۔ وہ دیوار آسمان کی بلندیوں پر لے جارہی تھی پھر جب تھک کر رک گیا تو دیکھا، جہاں سے دیوار پر چڑھنا شروع کیا تھا، وہیں پر کھڑا ہوں۔ اندر جانے کے لیے مجھے پھر دیوار پر چڑھنا ہوگا۔"

وہ سب حیرانی سے سن رہے تھے۔ ایک افسر نے کہا۔ "انہوں نے احاطے کی دیوار پر کسی طرح کا جادو کیا ہے۔"

"ضرور کیا ہے۔ مسلمان اسے جادو نہیں، روحانی عمل کہتے ہیں۔ شیطان جلد ہی اس کا توڑ کرنے والا ہے۔"

ایک افسر نے کہا۔ "طیارے کے ذریعے اس یونیورسٹی پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک ہی بم گرایا جائے تو ان کا وہ قلعہ ہمیشہ کے لیے نابود ہوجائے گا۔"

عذرباد نے کہا۔ "انہوں نے ہوائی حملوں سے بھی بچنے کے لیے کوئی جادو کیا ہوگا۔ وہ نادان نہیں ہیں۔ میں دیوار پر چڑھتا ہوا زمین پر سے وہاں نہ جاسکا اگر آسمان کی طرف سے کوئی ہوائی جہاز ادھر نہیں جاسکے گا یا ہوائی حملہ کرنے سے پہلے وہ اسے تباہ کردیں گے تو اس کے بعد وہ اور زیادہ خطرناک دشمن بن جائیں گے، ہمیں سنبھل کر جوابی کارروائی کرنے کا موقع نہیں دیں گے۔ دانش مندی یہ ہوگی کہ ان کی یونیورسٹی کو نہ چھیڑا جائے۔ ان پر کھل کر کسی طرح

کا حملہ نہ کیا جائے۔ ہم نے جس طرح رازداری سے عابی کو کھوکھلا کیا ہے، اسی طرح مراد اور ماروی کو کھوکھلا کریں گے۔"

وہ بولتے بولتے رک گیا پھر مسکرا کر چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "لارا کا بیٹا دانش ماں کو دل وجان سے چاہنے کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی رہائش اسی یونیورسٹی میں ہے۔ ان لحات میں شیطان مجھے ایک راستہ دکھا رہا ہے۔ میں ادھر جا رہا ہوں۔ تم سب مطمئن رہو۔ جلد ہی ہماری طرف سے انتقامی کارروائی ہوگی۔"

وہ ان کے اجلاس سے نکل کر اپنی رہائش گاہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ شیطان اس کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بولنے لگے۔ شیطان نے کہا۔ "ایک نیا گیم۔ سیاہ سفید نہیں ہو سکتا لیکن ہم اجلے کو کالا اور کالے کو اجلا کریں گے۔"

عذرباد نے کہا۔ "میں حاضر ہوں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"لارا پر عمل کرو۔ اس کی شخصیت بدل دو۔ اب وہ لارا نہ رہے۔ نہ خود کو بھول جانے والی، نہ خود کو یاد رکھنے والی۔ اسے ایک نئی تیسری شخصیت میں ڈھال دو۔"

"ایسا ابھی کروں گا۔"

"تیسری شخصیت میں وہ ایک ایسی ماں ہوگی، جس کا جوان بیٹا گم ہو گیا ہے۔ وہ دانش کو اپنا بیٹا بنائے گی۔"

"پھر وہ ہوگا، جس کی توقع ان مسلمانوں کو کبھی نہیں ہوگی۔"

"ایسا کیا ہوگا؟"

"سیاہ سفید ہو جائے گا۔ لارا دین اسلام قبول کرے گی۔"

یہ واقعی چونکا دینے والی، یقین نہ کرنے والی بات تھی۔ وہ شیطان کی بیٹی کبھی ایمان کی چھاؤں میں آنے والی نہیں تھی۔ لیکن شیطان ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ عذرباد نے کہا۔

"اس کا بیٹا تو خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔"

"ماروی سچ معلوم کرنے جب بھی لارا کے اندر جائے گی، میں وہاں موجود رہوں گا۔ میں نمازوں کے دوران میں عبادت کرنے والوں کو بھٹکا دیتا ہوں۔ ماروی کو بھی بھٹکاتا رہوں گا۔ وہ بھی لارا کے اندر مجھے نہیں دیکھ سکے گی، اسے مسلمان ہی سمجھتی رہے گی۔"

"یہ زبردست چال ہوگی۔ وہ مسلمان بن کر ان کا اعتماد حاصل کرتی رہے گی اور ہمارے لیے مخبری کرتی رہے گی۔"

"ان کی اسلامی یونیورسٹی سائنس اور ٹیکنالوجی اور دین و دنیا کے تمام علوم وفنون کی ایک مکمل، مستند اور جامع درس گاہ ہے۔ ہماری دنیا میں سرفہرست رہنے والی درس گاہوں میں اس کا نام آ گیا ہے۔ اس دنیا کے عالم فاضل، دانش ور اور زندگی کے تمام شعبوں کے ماہرین وہاں اکثر دورہ کرنے، معائنہ کرنے جاتے ہیں اور وہاں کے دینی اور روحانی ماحول سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔"

عذرباد نے کہا۔ "دانش اپنی مسلمان ماں کو ضرور اس یونیورسٹی میں لے جائے گا۔ ایسے وقت میں آسانی سے اس کے دماغ میں چھپ کر اس فولادی قلعے کو دیکھ سکوں گا۔"

"ہاں، تم کئی بار وہاں جانے کی کوشش کر چکے ہو اور ناکام رہے ہو۔ لارا تمہیں اپنے دماغ میں چھپا کر لے جایا کرے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "یہ ہوگی ہماری کامیاب چال۔ اس یونیورسٹی کے اندر ان کا کوئی دشمن اور شیطان کا کوئی پرستار جانے میں ناکام رہتا ہے۔ اب ہمارے راستے میں ان کی کوئی جادوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ میں ابھی جا کر لارا کا برین پھر سے واش کروں گا۔"

مراد اور ماروی کو پھر ایک بار برسوں تک فریب میں مبتلا رکھنے کے لیے ایک شیطان کی بیٹی کو دین و ایمان کی چھاؤں میں خطرناک آلۂ کار بنا کر رکھنے کے لیے وہ بہت زبردست چال تھی۔ ازل سے ایسے ہی شیطانی ہتھکنڈے مسلمانوں کو کمزور بناتے آئے ہیں۔

☆☆☆

وہ دین اسلام کے تمام مخالفین خلا میں تک رہے تھے اور شیطان کی ہدایات سن رہے تھے، وہ کہہ رہا تھا۔ "جلدبازی نقصان پہنچاتی ہے۔ مراد نے جو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچایا ہے، اسے برداشت کرو۔ اس سے انتقام لینے کی جلدی نہ کرو۔ انہیں اوندھے منہ گرانے میں تھوڑا وقت لگے گا۔"

ایک اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ "پھر بھی کتنا وقت لگے گا، ہمیں خبر ملی ہے کہ مراد یورپ کے کسی دوسرے ملک میں ہے۔ وہ ہم میں سے کسی کے ملک میں کسی کی شہ رگ کے قریب پہنچا ہوا ہے۔"

دوسرے حاکم نے کہا۔ "تم ہمیں صبر کرنے اور انتظار کرنے کو کہہ رہے ہو۔ کیا وہ دشمن بھی صبر کرے گا اور ہمیں مزید نقصان نہیں پہنچائے گا؟"

"نہیں پہنچائے گا۔ تم اس کے مطالبات پورے کر دو۔ موذن کے قاتل کو سزائے موت دو گے، انصاف

کے تقاضے پورے کرو گے تو وہ آگے اور دشمنی نہیں کرے گا اور یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ مراد نے جرائم کی دنیا سے لے کر سیاسی دنیا میں حکمرانی تک کبھی کسی سے دشمنی میں پہل نہیں کی۔ اسے اینٹ ماری جاتی ہے تب ہی وہ پتھر مارتا ہے۔ اسے کچھ عرصے تک فریب میں مبتلا رکھنا ہوگا پھر اسے دوستانہ اور سیاسی تعلقات کا فریب دینا ہوگا۔“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”اب وہ ہمارے فریب میں نہیں آئے گا۔“

”بڑی آسانی سے آئے گا۔ تم سب اپنے اپنے ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو عزت دو گے۔ انہیں ضروری سہولتیں فراہم کرو گے تو وہ موم ہو جائے گا۔ اسے اپنی طرف جھکانے پھر سے دوستی کے سبز باغ میں لانے کا یہی طریقہ ہے۔“

ان مخالفین نے کچھ روز پہلے بڑی فرعونیت دکھائی تھی۔ ان ارضِ اسلام کے باشندوں کو اپنے اپنے ملک سے نکال دینا چاہا تھا۔ تمام ممالک نے سفارتی تعلقات ختم کرنے کا اعلان کیا تھا اور طاقت کے غرور میں ایک ہی ہوائی حملے سے ریاست ارضِ اسلام کو نابود کر دینے کا فیصلہ سنایا تھا۔

اب وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ اکڑی ہوئی گردنیں جھک گئی تھیں۔ اسی میں دانش مندی دکھائی دے رہی تھی کہ ریاست ارض اسلام سے سیاسی اور عسکری، سفارتی تعلقات کو بحال کریں اور دیکھیں کہ شیطان پھر کس طرح مراد کی کر توڑنے والا ہے۔ ایمان اور کفر کے درمیان ہار جیت کے کھیل کو قیامت تک جاری رہنا ہے۔ وہ دین کے مخالفین عارضی طور پر جھک گئے۔ انہوں نے موذن کے قاتلوں کو سزائے موت دی اور وعدہ کیا کہ وہاں رہنے والے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ شہری حقوق اور سہولتیں دیتے رہیں گے۔

وہ مراد سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ بڑی رازداری سے تلاش کرنے کے باوجود وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنی ریاست سے بھیس بدل کر آیا تھا۔ ان ملکوں میں اپنی صورت اور شخصیت کو بدلتا رہتا تھا۔ وہ کسی بھی ملک کے حکام سے اور فوجی افسران سے ملنا اور انہیں گھاس ڈالنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

وہ ملاقات نہیں کر رہا تھا لیکن ان کے درمیان مذاکرات جاری رہتے تھے کہ انہوں نے مراد سے اور اس کی ریاست سے جو تعلقات ختم کیے تھے، اسے پھر سے بحال کر چکے ہیں۔ اب ان کی یہ شرط مانی جائے کہ مراد اور ماروی کو کسی بھی ملک میں آکر کبھی روپوش نہیں رہنا ہوگا۔

قانون کے محافظوں کے سامنے وقتِ ضرورت حاضر ہونا پڑے گا اگر اپنے دشمنوں سے نمٹنا ہو تو اس ملک کو چھوڑ کر جانا ہوگا۔

مراد نے کہا۔ ”میں جس ملک میں جاتا ہوں، وہاں بے باکی اور آزادی سے رہتا ہوں۔ کسی بھی ملک کی پولیس اور آرمی پر بھروسا نہیں کرتا۔ میری اولاد بھی میری طرح جس ملک میں چاہے گی، جا کر رہا کرے گی۔ ہم کسی بھی ملک کے پاسپورٹ اور ویزا کے محتاج نہیں ہیں۔ ہمیں پابندیوں میں جکڑنے کی باتیں نہ کرو۔“

وہ مختلف پہلوؤں سے مراد کو گھیرنا چاہتے تھے لیکن ناکام رہے۔ یہ ثابت نہیں کر سکتے تھے کہ مراد قانون شکن ہے۔ وہ بعض اوقات مجرموں سے اور اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے قانون کی حد سے باہر نکل آتا تھا۔ اکثر ممالک کے حکمرانوں کے شاہانہ مزاج پر گراں گزرتا تھا۔ اس لیے بھی کہ اپنے دین کی حمایت اور سلامتی کے لیے ان سے جنگ جاری رکھتا تھا۔ یہ جنگ آئندہ بھی جاری رہنے والی تھی۔

مذہبی اختلافات ہوں تو اپنا ہی مذہب افضل اور برتر لگتا ہے۔ دوسرے تمام دین دھرم کے لوگ کمتر اور ہیچ دکھائی دیتے ہیں۔ اختلافات کے بیج اندر سے پھوٹتے ہیں۔

تمام مخالفین کو موجودہ حالات کے پیشِ نظر مراد سے سمجھوتا کرنا ہی تھا۔ لہٰذا وہ راضی ہو گئے کہ اپنے اپنے ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دیں گے اور مراد کے مذہبی جذبات کو بھی ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔

حقیقت یہ بھی تھی کہ عظیم اسلامی یونیورسٹی کا عروج اور شہرت شیطان پر اور اس کے تابعدار حکمرانوں اور فوجی افسروں پر گراں گزر رہی تھی۔ ایسے وقت مراد نے یہ اعلان کیا کہ اس یونیورسٹی سے پانچ تبلیغی جماعتیں مختلف ممالک میں جا کر اپنے دینی فرائض ادا کریں گی۔

بین الاقوامی قوانین کے مطابق کوئی ملک کسی بھی دین دھرم کے پرچار کو نہیں روک سکتا۔ ارضِ اسلام کی تبلیغی جماعتیں جن پانچ ممالک میں جانے والی تھیں، ان ممالک کے حکمرانوں نے کہا۔ ”ہم آپ کے علمائے کرام کو تمام مبلغین کو خوش آمدید کہیں گے لیکن دوسرے درجنوں مذاہب میں کچھ شرپسند اور تخریب کار ہوتے ہیں۔ وہ مسائل پیدا کریں گے تو ہم ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”اتنی معصومیت سے اپنی مجبوریاں ظاہر نہ کرو۔ جب تم بین الاقوامی قوانین کے مطابق ہماری تبلیغی جماعتوں کو تحفظ فراہم نہیں کر سکو گے، اپنے ہی ملک

کے قانون کی بالادستی قائم نہیں رکھ سکو گے تو ہم ان مخالفین سے نمٹ لیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں، آپ کس طرح ان سے نمٹیں گے۔ ہمارے ملکوں کا، ہماری شہری آبادیوں کا امن وامان تباہ ہو جائے گا۔"

"وہ تو ہوگا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ حکمران ہوں، قانون نافذ کرنے والے ہوں یا تمہارے ملکوں کے شرپسند ہوں، وہاں جن کے اندر شیطانیت بھری ہوگی اسے ہم ہی نکالیں گے۔"

دوستانہ سمجھوتے اور مخالفانہ مذاکرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر ناخن برابر بھی اعتماد نہیں کریں گے۔ کسی نہ کسی بہانے فسادات برپا ہونے کی راہیں نکلتی رہیں گی۔ وہ ایک دوسرے کو لاعلمی میں جھوٹ اور فریب سے مات دینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

دیکھا جائے تو میدانِ جنگ میں پوری دنیا ایک طرف تھی اور مراد اور ماروی ایک طرف تھے۔ مراد نے کہا۔ "ماروی! ہم دو نہیں تین ہیں۔ ماشاء اللہ دانش بہت ہی ذہین اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ وہ تمہاری طرح ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔ نادیدہ ہو کر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کہیں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اسے بلاؤ، ہم بات کریں گے۔"

دانش ان دنوں یونیورسٹی میں سائنس و ٹیکنالوجی اور روحانی تعلیمات حاصل کر رہا تھا۔ ماروی نے اسے خیال خوانی کے ذریعے آواز دی تو وہ حاضر ہو گیا۔

مراد نے کہا۔ "ہمیں تمہاری مصروفیات کا علم ہے۔ اس لیے تمہیں میدانِ عمل میں نہیں لا رہے تھے لیکن حالات سنگین ہونے والے ہیں، ہمیں تمہاری غیر معمولی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔"

"بابا جانی! میں حاضر ہوں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں آپ کے سائے میں رہ کر بہت کچھ سیکھتا رہوں گا۔ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"بیرونی ممالک میں اپنی تبلیغی جماعتوں کی نگرانی کرنی ہے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میرا اندازہ ہے کہ ان ملکوں میں ہمارے دین کے خلاف کیسی کیسی شیطانی سازشیں ہوں گی۔"

"تمہارے اندازے سے بھی زیادہ خطرناک سازشیں ہوں گی۔"

"مجھے آپ کے اور آپی کے سائے میں شیطانی چالوں کو سمجھنا اور ان سے نمٹنا آجائے گا۔"

ماروی نے کہا۔ "بڑی خون ریزی ہوگی۔"

مراد نے کہا۔ "جب دشمن مجبور کر دیتے ہیں، تب اپنی حفاظت اور سلامتی کے لیے انسانی زندگی سے کھیلنا پڑتا ہے۔"

وہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔ "بابا جانی! میرا مزاج آپ سب سے ذرا الگ ہے۔ میں کبھی کسی کی جان نہیں لوں گا۔"

باپ نے حیرانی سے بیٹے کو دیکھا، پھر پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم دشمنوں سے جنگ نہیں لڑو گے؟"

"ضرور لڑوں گا۔ اپنے دین کے لیے جان پر کھیل جاؤں گا لیکن کسی کی جان نہیں لوں گا۔"

ماروی اور مراد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

وہ بولا۔ "میں ذرا مختلف انداز میں دشمنوں سے نمٹنے کی کوشش کروں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ دشمن مجھ سے انجان اور غافل رہیں۔ وہ مجھے دیکھیں لیکن دانش کے نام سے نہ پہچانیں۔ میں کسی کی جان سے نہیں کھیلوں گا، چپ چاپ خیال خوانی کے ذریعے انہیں سزائیں دیتا رہوں گا۔"

وہ باپ بیٹی مسکرا کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ "آپ یہی چاہتے ہیں نا کہ مخالفین ہم سے دشمنی نہ کریں؟"

وہ ذرا توقف سے بولا۔ "لیکن دشمن کی تعریف یہ ہے کہ وہ دشمنی کے لیے ہی پیدا ہوتا ہے۔ آپ ایک کو جان سے مارتے ہیں تو دس اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ابتدا سے چلا آ رہا ہے۔ اس لیے میں کسی کو جان سے نہیں ماروں گا۔ سزائیں دیتا رہوں گا۔ کیا کیا جائے کہ تب بھی ہماری دنیا میں محبت اور نفرت، دوستی اور دشمنی آمنے سامنے رہا کریں گی۔ پھر بھی میں اللہ کی دی ہوئی جان کو کسی سے نہیں لوں گا۔ اپنے جیسے انسان کو کبھی مچھر کی طرح مارنا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

مراد نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھی اور کھری باتیں کرتے ہو۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم اپنے لائن آف ایکشن کے مطابق جیسا بہتر سمجھتے ہو، ویسا کرو۔ ہماری تمہاری یہی کوشش ہوگی کہ دشمن عام بے گناہ اور بے ضرر مسلمانوں کو کسی طرح نقصان نہ پہنچائیں۔"

ماروی نے کہا۔ "ہم تینوں تین الگ طرح سے میدانِ عمل میں رہیں گے، آپ اپنی جسمانی قوتوں سے اور خداداد ذہانت سے جنگ لڑتے آئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ بھی اپنے ہی بل پر جنگ جاری رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں روحانی صلاحیتوں کی حامل ہوں۔

دشمن پاتال میں بھی ہوتے ہیں تو وہاں پہنچ جاتی ہوں۔"

وہ دانش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "میرا یہ لاڈلا بھائی دستور کے مطابق جنگ نہیں لڑے گا۔ اپنی حکمتِ عملی سے نئی بازی کھیلے گا۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ کیسے نتائج حاصل کرنے والا ہے۔"

مراد بیٹے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اٹھارہ برس کا قد آور گبرو جوان ہو چکا تھا۔ پہلی بار اپنے طریقۂ کار کے مطابق تنہا میدانِ عمل میں اترنے والا تھا۔

☆☆☆

یہ روز کا معمول تھا۔ دانش دن میں ایک بار اپنی ماں سے ملنے ضرور آتا تھا۔ اس روز بھی وہ تاریک دنیا کی رہائش گاہ میں پہنچا تو وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے خیال خوانی کے ذریعے اسے پکارنا چاہا تھا۔ یہ نئی بات ہوئی کہ اس کی سوچ کی لہروں کو ماں کا دماغ نہیں ملا۔

وہ پریشان ہو گیا۔ خیال خوانی کی لہروں کو اس کا دماغ نہیں ملتا، جو مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ ماں کے لیے تڑپ گیا۔ "مام! کہاں ہو؟ یا خدا! میں کہاں ڈھونڈوں؟"

اس نے ماروی سے کہا۔ "آپی! میری خیال خوانی کی لہروں کو مام کا دماغ نہیں مل رہا ہے۔ وہ نظر بھی نہیں آرہی ہیں۔"

بہن نے تسلی دی۔ "پریشان نہ ہو۔ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔"

اس نے خیال خوانی کی پرواز کی پھر وہ بھی بھٹکنے لگی۔ حیرانی کی بات تھی کہ روحانی ٹیلی پیتھی کی صلاحیتیں بھی ناکام ہو رہی تھیں۔ دانش نے صدمے سے نڈھال ہو کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ جب جسمانی وجود بھی نہ ہو اور دماغ بھی نہ ملے، سوچ کی لہریں خلا میں بھٹکتی رہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مطلوبہ ہستی مر چکی ہے۔

اس نے خشک ویران آنکھوں سے بہن کو دیکھا۔

"اللہ پر بھروسا رکھو۔ میرا دل کہتا ہے، وہ زندہ ہے۔ اس کا برین واش کیا گیا ہوگا اس لیے ہماری خیال خوانی کی لہروں کو اس کا دماغ نہیں مل رہا ہے۔"

"آپی! وہ تو کہیں بھی نظر آسکتی ہیں۔ وہ دنیا کے جس حصے میں بھی ہوتی تھیں، میں پلک جھپکتے میں ان کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔ آپ بھی پہنچ جاتی تھیں۔ ان کا وجود کہاں ہے؟"

"یہ کسی طرح کی زبردست شیطانی چال ہے۔ شیطان نے ہماری خیال خوانی کی لہروں کو لارا تک پہنچنے سے روک دیا ہے۔ یعنی صرف اس کا دماغ ہی نہیں، اس کی شخصیت بھی بدل دی ہے۔ اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ جب

تک ہم تمہاری ماں کے خیالات نہیں پڑھیں گے، ہمیں معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟"

"وہاں تین ٹیلی پیتھی جاننے والے ہیں۔ صرف میری مام کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ میری مام کو مجھ سے دور کیوں کیا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ تم مسلمان ہو۔ میرے اور بابا جانی کے سائے میں رہتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری ماں کو ہم مسلمانوں سے کہیں دور پہنچا کر تمہیں بھی وہاں پہنچائیں گے اور تمہارا بھی برین واش کر دیں گے۔"

وہ دونوں مراد کے پاس آگئے۔ اسے لارا کے متعلق بتانے لگے، اس نے کہا۔ "لارا کے یوں گم ہونے میں اس کی اپنی مرضی ہوگی۔ اس نے شیطان سے کہا ہوگا کہ مراد اس کے بیٹے وارث کو اس سے چھین کر لے گیا ہے۔ اب اس کے اپنے بیٹے دانش کو مسلمان بنا کر یونیورسٹی میں لے گیا ہے، لہٰذا یہ نئی شیطانی چال چل کر وہ دانش کو ہم سے چھین کر لے جانا چاہتے ہیں۔"

ماروی اور دانش نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا جبکہ ایسی بات نہیں تھی۔ لارا جانتی تھی کہ دانش مراد کا خون ہے وہ بھلا بیٹے کو چھین کر دنیا کے کس حصے میں جائے گی، کہاں چھپ کر رہے گی؟

ان لمحات میں ماروی کو جیسے آگہی ملی۔ دل میں بات آئی کہ وہ بابا جانی کو اب دانش کی حقیقت بتا سکتی ہے۔ اب کسی طرح کی نامعلوم قدرتی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔

آئندہ شیطانی چال کو سمجھنے کے لیے مراد کا حقیقت سے آگاہ رہنا لازمی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک لاوارث بچے کو باپ کی بھرپور محبتیں دی تھیں۔ آئندہ بھی ایک باپ کے تمام فرائض ادا کرنے والا تھا، وہ وارث کو موجودہ قدر و قیمت سے اور بلند سطح سے کبھی نیچے نہیں لائے گا۔

ماروی نے کچھ کہنے سے پہلے مراد کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا سوچ رہی ہو؟"

"بابا جانی! ایک بہت بڑی بات ہے۔ آپ ایک بہت بڑی حقیقت سے آج تک بے خبر رہے ہیں۔"

"ایسی کیا حقیقت ہے کہ میں بے خبر رہا اور تم باخبر رہی ہو؟"

"میں آپ کو اٹھارہ برس پہلے ہی بتا دینا چاہتی تھی لیکن......"

مراد نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔ "اٹھارہ برس......؟ تم

اٹھارہ برسوں سے کوئی حقیقت چھپا رہی ہو؟ میں حیران ہوں۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ بیٹی نے اتنے برسوں سے باپ کو اندھیرے میں رکھا ہے۔''

وہ سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے نہیں، اللہ نے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''بابا جانی! اللہ کو منظور نہیں تھا۔ میں نے جب بھی آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا تو کچھ بول نہ سکی۔ میری قوت گویائی عارضی طور پر ختم ہوگئی۔ میں آپ سے دوسری باتیں کرسکتی تھی لیکن ایک یہی حقیقت بیان کرتے وقت چپ لگ جاتی تھی۔ میں بولنا بھول جاتی تھی۔''

وہ بولا۔ ''اللہ جل جلالہ وجل شانہ میرے رب کے آگے سرخم ہے۔ کیا ابھی بول سکتی ہو؟''

''جی ہاں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ میں بول پاؤں گی۔''

اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''بولو! فوراً بولو۔''

''لارا نے آپ کو دھوکا دیا تھا۔ جس بچے کو آپ کے حوالے کیا تھا، وہ آپ کا نہیں تھا۔ وارث آپ کا خون نہیں ہے۔''

وہ شدید حیرانی سے دیدے پھیلائے ماروی کو تک رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''آپ کا خون یہ ہے دانش......''

دانش پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایسا انکشاف تھا کہ مراد نے چونک کر تڑپ کر اسے دیکھا پھر بے اختیار اس کے ایک بازو کو جکڑ لیا۔ جذبات کی شدت سے لرزنے لگا۔ بھید کھلتے ہی دانش بھی جذبات سے مغلوب ہوگیا۔ یکبارگی آگے بڑھ کر باپ سے لپٹ گیا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''اللہ تعالیٰ وارث پر مہربان ہے۔ اس معبود نے جب اسے آپ کی گود میں پہنچایا تو وہ ناقابلِ علاج مریض تھا۔ آپ ہی کے سائے میں اس کا علاج ہوسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اور بہتری فرماتا ہے۔ اس نے آپ کے ذریعے وارث کو صرف زندگی ہی نہیں دی، اسے آپ کا وارث اور ریاست کا شہزادہ بنا دیا۔''

مراد نے دانش کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ ''بے شک۔ وارث میرا وارث ہے۔ اس ریاست کا شہزادہ اور میرا جانشین رہے گا۔''

اس نے دانش کے دونوں بازوؤں کو بڑے جذبے سے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم نہ شہزادے ہو، نہ بادشاہ سلامت بنو گے۔ اپنے باپ کی طرح دین کے لیے اور انصاف کے لیے لڑنے والے سپاہی کہلاتے رہو گے۔''

وہ باپ بیٹے بڑی دیر تک محبتوں سے سرشار ہوتے رہے پھر دانش نے کہا۔ ''بابا جانی! پہلی بار ایسی مسرتیں حاصل ہو رہی ہیں کہ میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔ کلام پاک کی ایک آیت کے مطابق ''یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔'' یعنی غم کے ساتھ خوشی اور درد کے ساتھ دوا بھی ملتی ہے۔ ابھی آپ کی آغوش میں خوشیاں مل رہی ہیں تو صدمہ بھی مل رہا ہے۔ میری مام کہاں ہوں گی بابا جانی؟ وہ زندہ ہوں گی نا؟''

''بیٹے! جن کے اعمال بہتر ہوتے ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ بہتری فرماتا ہے۔ تم ایک سچے دین دار ہو۔ تمہارے دل میں خوفِ خدا رہتا ہے۔ وہ معبود تمہیں صدمات سے بچائے گا۔ ہم تمہاری مام کے لیے دعا بھی کریں گے اور اسے ڈھونڈ نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں گے۔ تم اور ماروی، کاہن اور عذرباد کے پاس جاؤ۔ وہ کوئی چال چل رہے ہوں گے تو بھی ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ پھر بھی ان کی باتوں سے کچھ اندازہ ہوگا۔ کوئی سراغ مل سکے گا۔''

انہوں نے خیال خوانی کی پرواز کی۔ تاریک دنیا کی شیطانی عبادت گاہ میں پہنچے۔ وہاں کاہن، عذرباد، آبنوس اور طاغوتا بیٹھے ہوئے تھے اور لارا کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ آبنوس اور طاغوتا پچھلے آٹھ برسوں سے ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں سے محروم تھے۔ انہوں نے ماروی اور دانش کی خیال خوانی کی لہروں کو اپنے اندر محسوس نہیں کیا۔ یوں کاہن اور عذرباد کو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ بہن بھائی وہاں پہنچے ہوئے ہیں۔

عذرباد کہہ رہا تھا۔ ''پہلے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ مرچکی ہے۔ میری خیال خوانی کی لہروں کو نہیں مل رہی تھی پھر میں نے شیطان معظم سے پوچھا۔ وہ اپنے تمام بھید اپنے بندوں کو بھی نہیں بتاتا۔ جتنا ضروری سمجھتا ہے، اتنا ہی کہتا ہے اور اس نے اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

دانش نے یہ سنتے ہی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ماروی کے پاس آکر بولا۔ ''آپی! میری مام زندہ ہیں۔ شیطان درست کہہ رہا ہوگا نا؟''

وہ بولی۔ ''یہ تو شیطان ہی جانتا ہے۔ اس مردود سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ عذرباد اس کا قابلِ اعتماد دستِ راست ہے۔ اس پر اعتماد کرکے بتانا چاہیے کہ لارا

زندہ ہے تو کہاں ہے؟ کس حال میں، کس حلیے میں اور کس روپ میں ہے؟"

وہ بولا۔ "ہو سکتا ہے، اسے بتایا ہو اور وہ کاہن وغیرہ سے چھپا رہا ہو۔"

انہوں نے مراد کے پاس آ کر کہا۔ "شیطان جانتا ہے کہ لارا زندہ ہے لیکن وہ بہت سے بھید اپنے پرستاروں اور تابعداروں کو بھی نہیں بتاتا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "ہمیں سمجھنا ہوگا کہ اس مردود نے لارا کو کہاں چھپایا ہے؟ کیوں چھپایا ہے؟ کیا وہ لارا کو آئندہ ہمارے لیے مصیبت بنانا چاہتا ہے؟ یہ سمجھنا ہوگا کہ اسے ہمارے لیے کیسے مصیبت بنائے گا؟"

ماروی نے خیال خوانی کے ذریعے عذرباد سے کہا۔ "بابا جانی کے پاس آؤ ہم سے باتیں کرو۔"

وہ مراد کے پاس آ کر بولا۔ "لارا کی گمشدگی میرے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ کاہن اور شیطان کے دوسرے اہم پرستار سمجھ رہے ہیں کہ میں نے اسے غائب کیا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "ہم بھی یہی کہتے ہیں۔"

"میں کیوں اسے غائب کروں گا؟ مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ پچھلے آٹھ برسوں سے چپ چاپ تنہا زندگی گزار رہی ہے۔ نہ کسی کے لینے میں ہے، نہ کسی کے دینے میں ہے۔ تم سب مجھ پر شبہ کر سکتے ہو۔ یہ سوچ سکتے ہو کہ اسے آلۂ کار بنا کر تم مسلمانوں کے لیے مسائل پیدا کروں گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے مسائل پیدا کروں گا؟ اس کی اہمیت ہی کیا ہے؟ اس کے ذریعے تم لوگوں کو کیسے نقصان پہنچا سکوں گا؟ ہاں۔ اس کا بیٹا دانش تم لوگوں کے زیراثر رہتا ہے، اسے کسی تدبیر سے ماں کے زیراثر لا سکتا ہوں لیکن ایسا کرنے کے لیے لارا کو کہیں غائب کیوں کروں گا؟ اسے بیٹے سے دور کیوں کروں گا؟"

اس کی یہ بات ماننے والی تھی کہ وہ اگر لارا کو کسی مقصد کے لیے آلۂ کار بنا رہا ہے تو اسے کہیں چھپائے گا کیوں؟

ماروی نے کہا۔ "تم نے ایسا نہیں کیا ہے۔ تمہارے شیطان نے کیا ہے۔ تب ہی وہ جانتا ہے کہ لارا زندہ ہے۔"

"ہمارا شیطان پاتال میں چھپی ہوئی باتیں بھی جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ ابھی کہاں ہوگی اور کس حال میں ہوگی لیکن شیطان نے اسے وہاں نہیں پہنچایا ہے۔ اسے لارا سے کوئی دلچسپی ہوگی، اس سے کوئی کام لینا ہوگا تو وہ مجھے اس کے پاس پہنچا دے گا۔"

دانش نے کہا۔ "اس سے بولو۔ میری مام کا پتا ٹھکانا بتائے، ایک بیٹے کو ماں کے پاس پہنچائے۔"

"اپنے خدا سے بولو۔ وہ تمہیں وہاں پہنچائے گا۔ وہ تو عالم الغیب کہلاتا ہے۔ اسے بھی معلوم ہوگا کہ تمہاری ماں ابھی کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟"

دانش نے مراد اور ماروی کو دیکھا۔ "انہیں فی الحال قدرت کی طرف سے کوئی سہارا یا اشارہ نہیں مل رہا تھا۔ یوں بھی سنگین مسائل کو حل کرنے کے لیے تو کسی معجزے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔"

عذرباد نے کہا۔ "تمہارا خدا ہو یا ہمارا شیطان، وہ اپنے بندوں اور پرستاروں کی ضرورتیں ہمیشہ پوری نہیں کرتے، جب ضروری سمجھتے ہیں تب ہماری تمہاری مدد کرتے ہیں۔"

دانش نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرما رہا ہے۔ میرے معبود نے میری مام کو زندہ رکھا ہے۔ وہ میری عبادت و ریاضت کا صلہ مجھے دے رہا ہے۔ میں اللہ کو راضی کرتا رہوں گا۔ وہ میری مام تک مجھے پہنچائے گا۔"

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اچانک کہاں گم ہو گئی ہے؟ کیا وہ گم رہے گی؟ پردۂ راز سے باہر نہیں آئے گی؟ اور آئے گی تو کیسے آئے گی؟

موجودہ حالات میں صبر کرنا اور انتظار کرنا تھا۔ کوئی جادو یا معجزہ ہی پس پردہ جانے والی کو پیش کر سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ خبر گرم تھی کہ ارض اسلام کی یونیورسٹی کے علما پانچ ملکوں میں تبلیغ دین کے فرائض ادا کرنے آ رہے ہیں۔ چونکہ اب مراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اس لیے ان ممالک کے حکمران تبلیغی جماعتوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ وعدہ کر رہے تھے کہ جب وہ دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے آئیں گے تو ان کے لیے بھرپور حفاظتی انتظامات کیے جائیں گے اور انہیں ہر طرح سے سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

وہ یہ اندیشہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ ان ملکوں کے غیرمسلم باشندے دینی فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ مراد نے کہہ دیا تھا کہ وہ تمہارے ملکوں کے شرپسند اور تخریب کار ہوں گے۔ تم ان سے نمٹنے میں ناکام رہو گے تو ہم ان سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔

دراصل وہاں کے حکمران اور اہم اکابرین ہی اپنے ملکوں میں اسلام کی تبلیغ اور پھیلاؤ نہیں چاہتے تھے لہٰذا درپردہ ایسی سازشیں ایسی تدابیر کی جا رہی تھیں کہ جن پر عمل

کر کے وہ تبلیغی مشن کو ناکام بنا سکتے تھے۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیابی کے لیے ایک مسلمان جواد سبحانی پر تکیہ کر رہے تھے۔ جواد سبحانی اس ملک کی اسپیشل برانچ کا چیف آفیسر تھا۔ ایسا درندہ صفت تھا کہ شریف آدمی اس کا نام سن کر لرزتے تھے اور بدمعاش اس کے نام کی مالا جپتے تھے۔ اس سے محتاط بھی رہتے تھے۔ جب وہ دوست بنتا تو انہیں سزائے موت سے بچالیتا تھا۔ دشمنی پر آتا تو بیچ چوراہے پر الٹا لٹکا دیتا تھا۔ کسی کو گولی مار دیتا تھا، کسی کو رازداری سے غائب کر دیتا تھا۔

وہ مسلمان فرانسیسی حکمرانوں کا بہت ہی پسندیدہ اور چہیتا افسر تھا۔ وہاں مسلمانوں کو بے جا دباؤ میں رکھتا تھا۔ ان کی دینی آزادی میں رکاوٹیں ڈالتا رہتا تھا۔ اس زمین پر ضمیر فروش مسلمانوں کی کمی نہیں ہے۔ بیرونی ممالک میں ایسے کروڑ پتی اور ارب پتی مسلمان تاجر ہیں جو اپنے مالی منافع کو قائم رکھنے کی خاطر دوغلی زندگی گزارتے ہیں۔

ایسے بااثر امیر کبیر مسلمان تاجران مخالفین کے بے جا رویوں کو نظرانداز کر کے عام مسلمانوں کا سر سہلاتے ہیں۔ ان کی تھوڑی بہت مدد کرنے کے لیے کبھی عارضی روزگار سے انہیں لگاتے ہیں۔ اسلامی ممالک کے کئی سفیر بھی دوسرے ملکوں میں جا کر وہاں کے مسلمانوں کی مشکلات اور مسائل کو اہمیت نہیں دیتے۔ ایسے تاجروں اور سرکاری شاہی ملازمتیں کرنے والے مسلمانوں سے جواد سبحانی کی خوب بنتی تھی۔ جواد ایسے مسلمانوں سے اور اس ملک کے حکمرانوں سے دولت، بدنام شہرت اور رعب و دبدبہ حاصل کرتا رہتا تھا۔

اب موجودہ سازش یہ تھی کہ وہ مخالفین تبلیغی جماعتوں کے لیے مسائل پیدا کرتے تو مسلمان اس پر اعتراض نہ کرتے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا ہے؟

اور وہ سازش یہ تھی کہ وہاں مسلمان کو مسلمان سے لڑا دیا جائے۔ ایک منسٹر نے کہا۔ ”ان مسلمانوں کے درمیان فساد برپا کیا جائے۔ یہ آپس میں لڑیں گے تو اپنا کوئی دینی اور روحانی کام نہیں کر سکیں گے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”یہ لوگ تو ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے آئے ہیں۔ ان کے درمیان ماچس کی ایک تیلی سلگانی ہوتی ہے پھر آگ خود ہی بھڑکتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔“

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”یہاں دو ارب پتی مسلمان ہیں، ان کو آپس میں لڑایا جائے گا تو ان دونوں کی برادری کے لوگ بھی خون خرابے پر اتر آئیں گے۔ ان میں سے ایک تاجر کا بیٹا عمیر احمد اور دوسرے کی بیٹی عرشہ میاں بیوی ہیں۔ اگرچہ پکی رشتے داری ہے لیکن اندر سے کھوکھلی ہے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”کھوکھلی کیوں ہے؟“

”عرشہ اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اربوں کی دولت اور جائداد اس کے نام ہے۔ اگر وہ مرجائے تو اس کی تمام دولت اور جائداد عمیر کی ہو جائے گی۔ عمیر کا باپ بھی یہی چاہتا ہے کہ بہو مرجائے اور خزانہ ان کے نام ہو جائے۔ وہ عرشہ کو اس طرح ٹھکانے لگانا چاہتا ہے کہ ان باپ بیٹے پر کوئی الزام نہ آئے۔“

”کیا عرشہ اور اس کا باپ ان کے مذموم ارادوں سے بے خبر ہیں؟ وہ ایسے نادان تو نہیں ہوں گے۔“

”وہ باپ بیٹی بھی پکے ہیں۔ عمیر اپنے باپ کا اکلوتا وارث ہے وہ باپ بیٹی چاہتے ہیں کہ عمیر لڑھک جائے۔ وہ بڑے دولت مند گھرانے ہیں۔ ان کے پاس دولت ہے، عزت ہے، شہرت اور عیش و عشرت ہے، صرف محبت اور انسانیت نہیں ہے۔“

وہ تمام اکابرین اپنی معلومات کے مطابق بول رہے تھے۔ ان گھرانوں کی ڈھکی چھپی باتیں شاہی طبقے کے چند اونچے لوگ جانتے تھے۔ وہ بہت گہرے تھے۔ ان کی کوئی بات دیوار کے کانوں تک بھی نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن مجرمانہ ذہنیت سے نکلی ہوئی باتیں مجرموں تک کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتی ہیں۔

اس چیف آفیسر نے عمیر کے باپ زبیر کو آفس میں بلا کر کہا۔ ”ہم اسپیشل برانچ کے لوگ اسپیشل معلومات رکھتے ہیں، ہم سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ میں جانتا ہوں، تم اپنی بہو عرشہ کو ختم کر دینا چاہتے ہو۔ کروڑوں اربوں ڈالرز کا گیم جیتنا چاہتے ہو۔“

زبیر گھبرا کر حقیقت سے انکار کرنے لگا۔ جواد نے کہا۔ ”ڈرتے کیوں ہو؟ میں تمہاری مشکل آسان کر دوں گا۔“

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”پانچ لاکھ ڈالرز سامنے رکھو۔ تمہارا خواب چند گھنٹوں میں سچ ہو جائے گا۔“

”جواد صاحب! عرشہ کو قتل کیا جائے گا تو سب ہی ہم باپ بیٹے پر شبہ کریں گے۔“

”شبہ کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ تم دونوں نے اسے ہلاک کیا ہے۔ میں کیس کو پیچیدہ بنا دوں گا۔ اس کی لاش نہیں ملے گی اس کے قتل کا نہ ثبوت ملے گا، نہ تم لوگوں کو قاتل ثابت کیا جا سکے گا۔“

جواد کے رازدارانہ تعاون سے مشکل آسان ہو رہی تھی۔ زبیر راضی ہوگیا۔ وہ پہلے ہی ارب پتی تھا اب اور بے انتہا دولت مند بننے والا تھا۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ وہ دینی معاملات میں رکاوٹ بننے والا ہے۔

زبیر وہاں مسجد میں کمیٹی کا صدر تھا اور عرشہ کا باپ جبار خان سیکریٹری تھا۔ وہ دونوں ارضِ اسلام سے آنے والی تبلیغی جماعت کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔ زبیر اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ایسے وقت عرشہ کا مرڈر یا اس کی گمشدگی سنگین مسائل پیدا کردے گی۔ جبار خان اور اس کی برادری کے لوگ زبیر کی مخالفت میں فساد کریں گے۔ پھر زبیر کی برادری بھی خاموش نہیں بیٹھے گی۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف ایسے بھڑکیں گے کہ تبلیغی فرائض کھٹائی میں پڑ جائیں گے۔

جواد نے حکمرانوں کو اور یہودی اکابرین کو خوش خبری سنائی۔ ”میں نے ان کے پیروں تلے بارود بچھا دی ہے جو یہاں اپنے دین کے کرتا دھرتا ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد کمیٹی کا صدر ہے، دوسرا سیکریٹری ہے۔ یہ دونوں مسلمان اپنے ہی گھر کو آگ لگانے والے ہیں۔ بلکہ فسادات میں کئی مارے بھی جائیں گے۔“

اس بات پر سب ہی ہنسنے لگے۔ تالیاں بجانے لگے۔ دنیا دیکھتی آرہی ہے کہ مسلمان کس طرح اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتے ہیں۔

یہ واردات تو ہونی تھی۔ لہٰذا ہوگئی۔ ایک رات عرشہ کے بیڈروم سے اس کی چیخ سنائی دی۔ ماں باپ اور رشتے دار.... دوڑتے ہوئے آئے تو وہ خواب گاہ میں دکھائی نہیں دی۔ بیڈ پر لہو کے دھبے دکھائی دیے۔ اسے پوری رہائش گاہ میں پکارتے ہوئے تلاش کیا گیا۔ اگر اسے قتل کیا جاتا تو اس کی لاش وہاں پڑی ہوتی۔ واردات کرنے والے اسے زخمی کرکے لے گئے تھے۔ کوٹھی کے باہر ایک مسلح گارڈ مردہ پایا گیا تھا۔ دوسرا زخمی اور بے ہوش تھا۔

جبار خان نے فوراً ہی زبیر اور عمیر پر الزام لگایا جیسی توقع کی گئی تھی۔ اس کے مطابق برادری کے لوگ بھی ان باپ بیٹے کے خلاف ہوگئے۔ وہاں پہلی بار مسجد کمیٹی اور دینی ادارے میں مسلمان، مسلمان کے دشمن ہونے لگے۔

جواد بھائی فساد برپا کرنے کے بعد انہیں سمجھا رہا تھا کہ آپس میں نہ لڑیں۔ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں۔ جب تک عرشہ کی لاش نہیں ملے گی، اس کا قتل ثابت نہیں ہوگا۔ وہ ابھی کہیں زندہ ہوگی، اسے جاسوس اور پولیس والے تلاش کر رہے ہیں۔

حقیقتاً اسے نہ قتل کیا گیا تھا، نہ اسے تلاش کیا جارہا تھا۔ جواد نے اسے شہری آبادی سے سیکڑوں میل دور ایک ویران کاٹیج میں قیدی بنا دیا تھا۔ اسے تھوڑا زخمی کیا تھا تاکہ لیبارٹری کی رپورٹ سے ثابت ہو کہ بیڈ پر عرشہ ہی کا لہو تھا۔

وہ باپ بیٹے عرشہ کی پراسرار گمشدگی سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے جواد سے کہا۔ ”آپ نے ہم سے پانچ لاکھ ڈالرز لیے ہیں لیکن اسے ہلاک نہیں کیا۔ وہ پھر کسی دن واپس آئے گی اور اپنی دولت اور جائداد ہم سے چھین لے گی۔“

جواد نے کہا۔ ”اسے بھول جاؤ۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔“

”آپ نے اسے زندہ کیوں رکھا ہے؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”مسجد کمیٹی کے دین دار مسلمانوں کا ایمان دیکھ رہا ہوں۔ تم لوگوں نے منافع خوری کے لیے ایسے وقت عرشہ کے مرڈر کا سودا کیا ہے جبکہ دین کی تبلیغ کے لیے ایک بہت بڑی اسلامی یونیورسٹی سے علما یہاں آرہے ہیں۔ تمہیں دین کی پروا نہیں ہے۔ مجھے تمہاری منافع خوری سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں اپنا منافع دیکھتا ہوں اور پانچ لاکھ ڈالرز دو گے تو تمہارے حریف جبار خان کو اس کی بیٹی کی لاش کسی چوراہے پر ملے گی۔“

وہ باپ بیٹے ہلاکت یا اغوا کی واردات کرانے کے بعد اس بدمعاش افسر کو رازدار بنا چکے تھے۔ اس کی مٹھی میں آگئے تھے۔ اس کے مزید مطالبات پورے کرنے سے ہی انہیں عرشہ کی لاش کہیں نظر آسکتی تھی۔

ابھی اس کھیل کو آگے بڑھانا تھا۔ لہٰذا جواد بھائی نے عرشہ کے باپ جبار خان سے ملاقات کی۔ اس سے کہا۔ ”بیٹی کا سوگ منانے سے وہ واپس نہیں آئے گی۔ اپنے داماد عمیر کو ٹھکانے لگا دو یا عرشہ کی طرح اسے بھی غائب کرا دو تو زبیر تمہاری بیٹی کی دولت اور جائداد کا حق دار نہیں بن سکے گا۔“

جبار خان نے کہا۔ ”میں اپنی بیٹی کی دولت کا ایک تنکا بھی ان باپ بیٹے کو چھونے نہیں دوں گا۔“

اس نے جواد کی طرف جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”کیا آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کرسکیں گے؟“

”میں مدد کرنے ہی آیا ہوں۔ پانچ لاکھ ڈالرز لوں گا اور آج ہی رات کو صبح ہونے سے پہلے عمیر کو غائب کردوں گا۔“

جبار خان نے فوراً ہی اس کا ہاتھ تھام کر کہا.... ”یا خدا...... ! کیا آج ہی اس کانٹے کو نکال پھینکو گے؟ میں اس

لالچی داماد کی لاش دیکھنے کے لیے ابھی رقم ادا کروں گا۔"

جواد نے جبار خان سے بھی سودا طے کرلیا۔ اس کے لیے قتل اور اغوا کی واردات کرنا بچوں کا کھیل تھا۔ عمیر نائٹ کلب میں رمی کھیل رہا تھا۔ وہ ٹوائلٹ میں آیا تو وہاں ماسک میں چھپے ہوئے دو گن مینوں نے اسے نشانے پر رکھ لیا۔ اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر اسی ویران کاٹیج میں لے آئے، جہاں عرشہ کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔

وہ میاں بیوی وہاں ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک گئے۔ عرشہ نے اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ تم نے مجھے اغوا کرایا ہے۔ اب یہاں دیکھنے آئے ہو کہ میں کس حال میں ہوں۔"

وہ غصے سے بولا۔ "بکواس مت کرو۔ مجھے خود اغوا کیا گیا ہے۔ مجھے یہاں گن پوائنٹ پر لایا گیا ہے۔ یہ لوگ یقیناً تمہارے باپ کے زرخرید بدمعاش ہیں، ہم نے جس بدمعاش (جواد سجانی) سے معاملات طے کیے تھے، اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔"

ایسے وقت جواد ان کے سامنے آگیا۔ وہ دونوں اسے حیرانی سے تکنے لگے۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں نے تم دونوں کو اٹھوایا ہے۔

"تم باپ بیٹے چاہتے ہو کہ عرشہ کو ہلاک کردیا جائے تو اسی طرح عرشہ کا باپ تمہاری ہلاکت چاہتا ہے۔ خاندانوں میں خون کے رشتوں میں درپردہ کیسی کمینگی چھپی رہتی ہے۔ تمہارے بزرگوں نے تم دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے بڑی رقوم ادا کی ہیں۔"

اس نے اپنی گن نکال کر اسے سہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے ابھی تک تم دونوں کو زندہ رکھا ہے۔ جب چاہوں گا ایک ایک گولی تمہارے اندر اتار دوں گا۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ "لیکن میں کوئی بچہ کھلاڑی نہیں ہوں۔ مجرم قانون سے کھیلتے ہیں اور میں مجرموں سے کھیلتا ہوں۔ کھیل یہ ہے کہ تم دونوں کو زندہ رکھوں گا اور ہر ماہ تمہارے بزرگوں سے پچاس پچاس ہزار ڈالرز وصول کیا کروں گا۔"

وہ عمیر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہارا باپ رقم ادا کرنے سے انکار کرے گا تو میں عرشہ کو زندہ اس کے باپ کے پاس پہنچا کر تمہارے باپ کے پاس تمہاری لاش پہنچا دوں گا۔ یوں عرشہ بیوہ ہوکر تمہاری دولت اور جائداد حاصل کرلے گی۔ ٹھیک اسی طرح عرشہ کا باپ ہر ماہ پچاس ہزار ادا کرنے سے انکار کرے گا تو میں تمہاری اس بیوی کو گولی مار کر تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔ پھر تم اپنی مقتولہ بیوی کی دولت حاصل کرسکو گے بشرطیکہ میری ماہانہ آمدنی کا میٹر آن رکھا کرو گے۔"

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "آئندہ کیا ہوگا؟ تم دونوں کے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ زندگی یا موت......؟ دولت کی ہوس میں تم باپ بیٹی، باپ بیٹے، تم میاں بیوی ایسی جگہ پہنچ گئے ہو جہاں ایک دھکے سے موت کی گہری کھائی میں چلے جاؤ گے۔"

اس نے ان کو بری طرح پھنسا دیا تھا۔ وہ اس کے شکنجے سے کبھی نکلنے والے نہیں تھے۔ جواد اپنے ملک کے اعلیٰ حکام کو خوش کررہا تھا کیونکہ اس کی چالبازیوں کے نتیجے میں مسلمان آپس میں لڑ پڑے تھے اور دوسرے دن ریاست ارض اسلام سے علمائے دین کی ایک جماعت وہاں پہنچنے والی تھی۔ دین و ایمان کے خلاف کس طرح پیچیدہ سازشیں ہوتی ہیں، یہ پہلے سمجھ میں نہیں آتا۔ اکثر تب سمجھ میں آتا ہے جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

ویسے مراد اور ماروی بے خبر رہنے والے نہیں تھے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ شرپسند اپنے تخریبی ارادوں پر عمل کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ ماروی بہت پہلے ہی جواد سجانی کے دماغ میں جگہ بنا چکی تھی۔ وہ جسمانی طور پر طاقتور ہونے کے باوجود اس کی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کرتا تھا کیونکہ نشے کا عادی تھا، شراب نوشی نے اس کے ذہن کو قدرے بے حس کردیا تھا۔ اگر وہ نشے کا عادی نہ ہوتا، تب بھی ماروی اپنی غیر معمولی روحانی قوتوں سے اس کے چور خیالات پڑھ لیتی۔

مراد اپنی ریاست سے نکل آیا تھا۔ اسی شہر میں جواد سجانی کے قریب ہی تھا۔ اس سے نمٹنے کے لیے اسی کا ہم شکل بن کر اسی کی چالیں چلنے والا تھا۔ دشمن کی نقل و حرکت کو، اس کی سازشوں کو اور اس کی مجرمانہ واردات کے طور طریقوں کو سمجھ رہا تھا۔

ماروی خیال خوانی کے ذریعے اسے سمجھا رہی تھی۔ جواد کی آواز اور لہجے کو آڈیو کے ذریعے اور حرکات و سکنات کو ویڈیو کے ذریعے دکھا رہی تھی۔ وہ اس طریقۂ کار کے مطابق مکمل جواد سجانی بن چکا تھا۔

اس نے بیٹی سے کہا۔ "جواد کو چند گھنٹوں کے لیے کہیں غائب کردو۔ وہ کسی کو نظر نہ آئے۔ میں اس کی جگہ لے کر گیم شروع کروں گی۔"

جواد جیسے کرمنل کی رہائش گاہ میں ایک تہ خانہ تھا۔ ماروی نے اس کے دماغ پر قبضہ جما کر اسے تہ خانے میں

پہنچا دیا۔ اس پر تنویمی عمل کر کے اسے اپنی ذات سے غافل بنا دیا۔ وہ عارضی طور پر وہاں سے نکلنے کا راستہ بھول گیا۔

مراد اس رہائش گاہ میں آ کر جواد کے ماتحتوں اور سپاہیوں سے بولنے لگا۔ فون کے ذریعے حکمرانوں سے رابطہ کرنے لگا۔ اسے چہرہ تبدیل کرنے اور شخصیت کو بدل دینے میں مہارت حاصل تھی۔ وہاں کوئی اس پر شبہ نہیں کر رہا تھا۔

اس نے بیٹی سے کہا کہ جواد کو تہ خانے میں ہی رہنے دیا جائے۔ جب ضروری ہوگا تو اسے باہر لایا جائے گا۔ ماروی نے کہا۔ ''عمیر کے بھی اغوا ہونے سے دونوں برادری کے درمیان سخت کشیدگی پھیل گئی ہے۔ وہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ہمارے علما کل شام تک یہاں پہنچنے والے ہیں۔ حالات کو جلد سے جلد معمول پر لانا ہوگا۔''

عرشہ اور عمیر ایک چھت کے نیچے قیدی بن گئے تھے۔ وہاں ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کاٹیج میں تین کمرے تھے۔ مراد نے دو کمروں کو لاکڈ کر دیا۔ وہ دونوں ایک ہی کمرے میں ساتھ رہنے اور سونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ماروی ان کے اندر رہ کر خیالات بدل رہی تھی۔ وہ اپنے موجودہ حالات کے پیش نظر موت کو سر پہ منڈلاتے دیکھ کر غصے اور نفرت کو بھول گئے تھے۔ دولت کے لالچ اور آپس کی مخالفتوں کو نادانی تسلیم کر رہے تھے۔ ذرا دھیمے پڑ کر ایک دوسرے سے شکایتیں کر رہے تھے۔ صلح وصفائی کی روش اختیار کر رہے تھے۔ ماروی اور مراد کے اس طریقہ کار کے مطابق ان میاں بیوی کی عداوت، محبت میں بدل رہی تھی۔

اب انہیں اندیشہ تھا کہ جواد آ کر دشمنی کرے گا۔ انہیں مار ڈالے گا لیکن انہیں میاں بیوی کی حیثیت سے گھر واپس نہیں جانے دے گا۔ ادھر مراد نے طے کر لیا تھا کہ ان دونوں کو اچانک ڈرامائی انداز میں ان کے گھر پہنچا دے گا تو جبار خان اور زبیر کی برادری والوں کو ان سے حقیقت معلوم ہوگی۔ غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ وہ عداوت پر اتر آنے والے مسلمان پھر ایک دوسرے کے گلے لگ جائیں گے پھر تبلیغی مشن کسی رکاوٹ کے بغیر رواں دواں رہے گا۔

یہ تو دیکھنے میں آیا ہے کہ مشکل کبھی آسانی سے آسان نہیں ہوتی۔ آسانی کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کاٹیج کے بند کمرے میں عمیر نے بار پچھتا کر عرشہ کو بڑی محبت سے گلے لگایا تو شیطان کا دستِ راست عذر باد کھٹک گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ اچانک دوست کیسے بن رہے ہیں؟

یہ معلوم کرنے کے لیے وہ جواد سبحانی کے دماغ میں پہنچا۔ ماروی اس کی کھوپڑی کو لاکڈ کر چکی تھی۔ اس کا لب ولہجہ اور سوچ کی لہریں مراد کے دماغ میں منتقل ہو گئی تھیں۔ لہٰذا شیطان بھٹک کر مراد کے اندر آ گیا۔

اس نے مراد سے کہا۔ ''جواد! تم نے عرشہ اور عمیر کے ذریعے بڑی کامیابی سے عداوت پھیلائی ہے۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑایا ہے۔ ان کا تبلیغی مشن ناکام رہے گا لیکن دیکھ رہا ہوں کہ ان میاں بیوی میں دوستی ہو گئی ہے۔ ان کے خیالات بدل گئے ہیں۔ ان کی یہ تبدیلی ہماری کوششوں پر پانی پھیر دے گی۔ ان دونوں کو ختم کر دو۔''

مراد نے کہا۔ ''سوری۔ میں انہیں ہلاک نہیں کروں گا۔ اپنی پلاننگ کے مطابق کام کروں گا۔ انہیں ان کی برادری کے سامنے پہنچا کر کہوں گا کہ وہ میاں بیوی ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور رہیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''اب نہیں رہیں گے۔ ان کے خیالات بدل گئے ہیں۔ وہ پھر سے محبت کرنے والے میاں بیوی بن گئے ہیں۔ انہیں پھر سے ایک دوسرے سے متنفر کر دو۔''

''تم شیطان کے چیلے ہو۔ ان کے خیالات بدل دو۔''

وہ بولا۔ ''یہی کرنا ہوگا۔ میں ان کی سوچ بدلنے جا رہا ہوں۔''

وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مراد نے ماروی کو کال کی۔ اسے عذر باد کے متعلق بتایا۔ وہ بولی۔ ''میں عرشہ اور عمیر کے اندر رہوں گی۔ دیکھوں گی کہ وہ کیا کرنے والا ہے؟''

ماروی ان کی طرف چلی گئی۔ وہ باپ بیٹی پچھلے آٹھ برسوں سے شیطان اور تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے دھوکا کھاتے آ رہے تھے۔ ایک طویل مدت سے یہی سمجھتے آ رہے تھے کہ تینوں شیطانی خیال خوانی کرنے والے ناکارہ اور بے ضرر ہیں۔ اب یہ بھید کھلنے والا تھا۔

عذر باد اپنے ان خیال خوانی کرنے والوں سے ابھی کام لینا چاہتا تھا۔ لارا گم ہو گئی تھی۔ اب دو ٹیلی پیتھی جاننے والے رہ گئے تھے۔ اس وقت آبنوس اپنے بیڈروم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کسی خیال میں محو تھا۔ عذر باد نے اس کے سامنے آ کر چٹکی بجائی تو وہ چونک کر فوراً ہی یوں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا آبنوس ہے۔

اس نے سامنے کھڑے ہوئے عذر باد کو یعنی اپنے عامل کو دیکھا۔ عامل نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک میاں بیوی کے دماغوں میں پہنچا رہا ہوں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ اب اچانک محبت کرنے لگے ہیں۔

تم ان کی سوچ کو اور ان کے جذبات کو بدل دو۔ ان کے دلوں میں پھر نفرت اور عداوت پیدا کر دو۔"

اس نے آبنوس کو وہاں کے حالات سمجھا کر عرشہ اور عمیر کے پاس پہنچا دیا۔ وہ باری باری ان کے اندر خاموشی سے جا کر خیالات پڑھنے لگا۔ جب تک خیال خوانی کے ذریعے نہ بولتا تب تک یہ معلوم نہ ہوتا کہ ان کے دماغوں میں کوئی پہنچا ہوا ہے لیکن ماروی نے روحانی ٹیلی پیتھی کی قوت سے معلوم کر لیا کہ اس وقت عرشہ کے اندر پرائی سوچ کی لہریں ہیں۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگی۔ تین ٹیلی پیتھی جاننے والے تو ناکارہ ہیں۔ پھر عرشہ کے دماغ میں یہ کون آیا ہے؟

وہ ابھی خاموش تھا۔ ایک ذرا بھی بولتا تو ماروی اس کے لب و لہجے کو سن کر اس کے دماغ پر بھی دھاوا بول دیتی۔ ابھی وہ حیرانی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی نیا خیال خوانی کرنے والا پیدا ہو گیا ہے۔

آبنوس تھوڑی دیر تک عرشہ کی سوچ کو پڑھتے ہوئے اس کے من مزاج کو سمجھتا رہا پھر اس نے مخاطب کیا۔ "عرشہ! انسان کے اندر منفی اور مثبت سوچیں ہوا کرتی ہیں۔ میں تمہاری ایک اچھی مثبت سوچ ہوں۔ تمہیں فریب اور نقصان سے بچانے آیا ہوں۔"

آبنوس کی آواز اور لب و لہجہ سنتے ہی ماروی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ خیال خوانی کا ایک مُردہ آٹھ برس بعد زندہ ہو گیا تھا۔ اچانک کیسے زندہ ہو گیا تھا؟

فوراً ہی دماغ نے کہا۔ "یہ شیطانی چال ہے۔ خیال خوانی کرنے والے کو مدتوں سے مردہ بنا کر رکھا گیا تھا۔ پھر تو لارا اور طاغوتا بھی مردہ بن کر رہتے ہوں گے۔ پھر تو وہ بھی اس وقت خیال خوانی کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان کی بھی خبر لینی چاہیے۔"

لارا جسمانی اور دماغی طور پر گم تھی۔ تلاش بسیار کے باوجود اب تک اس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ اس کے باوجود ماروی نے پھر ایک بار اس کی سوچ کی لہروں کو اور اس کے لب و لہجے کو گرفت میں لیا۔ اس کے اندر پہنچنا چاہا تو بھٹکتی رہ گئی۔ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ وہ زندہ تھی اور ٹیلی پیتھی کی لہروں کو اس کا دماغ نہیں مل رہا تھا۔

وہ طاغوتا کے دماغ میں آئی۔ اس نے ماروی کو اپنے اندر محسوس نہیں کیا۔ اس کی سوچ سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ آٹھ برس سے خود کو بھولا ہوا ہے اور ٹیلی پیتھی نہیں جانتا ہے۔

یعنی اس وقت صرف آبنوس بیدار تھا۔ وہ ٹیلی پیتھی سے محروم نہیں تھا۔ ماروی نے فوراً دانش کو بلایا پھر مراد کے پاس آ کر بولی۔ "بابا جانی! ایک حیران کرنے والا تماشا ہو رہا ہے۔ تاریک دنیا کے تین ٹیلی پیتھی جاننے والے جو ناکارہ ہو گئے تھے، ان میں سے ایک آبنوس اب ناکارہ نہیں رہا ہے۔ وہ عرشہ کے دماغ میں پہنچا ہوا ہے۔ میں اس سے نمٹنے کے بعد آپ کے پاس آؤں گی۔"

پھر وہ دانش سے بولی۔ "جب آبنوس خیال خوانی کر رہا ہے تو تمہاری مام کو بھی کرنا چاہیے لیکن وہ ابھی تک لاپتا ہیں۔ ان کا دماغ ان کا وجود نہیں مل رہا ہے۔ ابھی طاغوتا کے پاس گئی تھی۔ وہ فعال نہیں ہے۔ ابھی تک ناکارہ ہے۔ خیال خوانی کی صلاحیتوں کو بھولا ہوا ہے۔ آؤ ہم معلوم کریں کہ آبنوس اچانک خیال خوانی کرنے عرشہ کے اندر کیسے پہنچ گیا ہے؟ شیطان کوئی نئی چال چل رہا ہے۔"

دانش بہن کے ساتھ عریشہ کے اندر آ گیا۔ وہ ماں کے لیے جذبات سے سرشار ہو کر سوچ رہا تھا۔ وہ جہاں بھی ہوں گی، آبنوس کی طرح خیال خوانی کر رہی ہوں گی۔ پتا نہیں ان کی موجودہ آواز اور سوچ کا لب و لہجہ کیا ہے؟ یا میرے اللہ! میں مام تک کیسے پہنچوں؟

ماروی بڑی خاموشی سے آبنوس کے اندر پہنچ گئی تھی۔ وہ روحانی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ماروی کی آمد سے بے خبر تھا۔ اس کی سوچ کہہ رہی تھی کہ وہ عذرا کی مرضی کے مطابق زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی مرضی سے ضرورت کے وقت خیال خوانی کرتا ہے، اس کے بعد خود سے غافل ہو جاتا ہے۔

اس کے چور خیالات راز کھول رہے تھے۔ یہ بتا رہے تھے کہ پچھلے آٹھ برسوں میں پرنس عابی کو سلو پوائزن دینے کے لیے ان تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے؟

یہ زہریلی حقیقت مراد کو بتائی جا رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ "یا اللہ......! یہ کیسی شیطانی سازش تھی۔ میرا پہاڑ جیسا بیٹا ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا ہے۔ ہم اپنی ذہانتوں سے اور صلاحیتوں سے معلوم نہ کر سکے اور وہ آہستہ آہستہ گھلتا ہوا ختم ہوتا آ رہا ہے۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر کمال کو زوال ہے۔ عابی پر جو زوال آیا ہے، اسے ہم روک نہیں سکتے تھے۔ ہم شہ زور اور ناقابلِ شکست کہلانے والے قانونِ قدرت سے لڑ نہیں سکتے تھے۔ کیسی بے بسی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے کہ دشمن ٹیلی

پیتھی جاننے والوں کو سزائے موت دیں گے۔ آئندہ بھی یہی ہوگا' شیطانی قوتوں سے لڑتے رہیں گے لیکن قدرتی زوال سے اور ناکامیوں سے بھی دوچار ہوتے رہیں گے۔''

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ''کسی نے مجھ سے ایسی دشمنی آج تک نہیں کی۔ شیطان میرے بیٹے کو ختم کرچکا ہے۔ میں اسے ختم نہیں کرسکوں گا۔ ہم بھی شیطان کو مار نہیں سکتے۔ میں اس کے چیلوں کو آلۂ کاروں کو اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا ...... اور یہ خیال خوانی کرنے والے تو بڑے معصوم بنتے رہے۔ خود فراموشی کی آڑ میں میرے بیٹے کو مارتے رہے۔''

وہ دانش کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لاراماں ہوکر تمہیں پہچاننے سے انکار کرتی رہی اور عابی کو پہچان کر دشمنی کرتی رہی۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''بے شک مام نے ناقابل معافی جرم کیا ہے لیکن شیطان کے شکنجے میں رہ کر کیا ہے۔ اگر وہ مردود مام کو سوچنے سمجھنے کی آزادی دیتا تو وہ بھی بھائی جان (عابی) سے دشمنی نہ کرتیں کیونکہ انہوں نے زومبی گاسنا جیسے درندے جادوگر سے ان کی آبرو بچائی تھی۔''

وہ ماں کی صفائی پیش کررہا تھا۔ ''بابا جانی! آپ کی روحانی صلاحیتوں سے مام بھی رہتی تھیں۔ وہ بھائی جان کو بھی اپنی خیال خوانی سے نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرسکتی تھیں۔ میں چاہتا ہوں، آپ ان کی مجبوریوں کو سمجھیں۔ کوئی سخت سزا نہ دیں۔ اللہ کرے وہ زندہ سلامت ہوں۔ واپس آئیں گی تو اب انہیں شیطان کے شکنجے سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

مراد نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''اللہ کرے وہ زندہ ہو اور واپس آئے۔ میں ایک ماں کے لیے بیٹے کے دلی جذبات سمجھتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ وہ واپس آئے اور تمہیں سینے سے لگائے۔''

ادھر عذرباد دیکھ رہا تھا کہ برسوں سے چھپائے رکھنے والا راز کھل گیا تھا۔ مراد انتقامی کارروائی کی انتہا کردے گا۔ اس کے تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی شامت آگئی تھی۔ ان تینوں کی سلامتی کے لیے آئندہ مراد اور ماروی سے جنگ لڑنا ضروری ہوگیا تھا۔

پھر یہ کہ تبلیغی مشن کو ناکام بنانے کی جو کوششیں کامیاب ہو رہی تھیں، وہ اب ناکام ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ماروی نے عرشہ اور عمیر کے ضمیر کو جگا دیا تھا۔ ان میاں بیوی کو جب بھی واپس لایا جاتا تو وہ محبت اور صلح صفائی کی باتیں کرتے۔ مسلمانوں کے جو دو گروہ بن چکے تھے، وہ متحد ہوجاتے۔ دشمنی ختم ہوجاتی۔

اس نے جواد سبحانی (مراد) کے پاس آکر کہا۔ ''عرشہ اور عمیر کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ دونوں کی لاشوں کو ان کے گھر تک پہنچاؤ، تب ہی فسادات برپا ہوں گے۔''

مراد نے مسکرا کر کہا۔ ''بڑے نیک ارادے ہیں۔ ابھی پریزیڈنٹ ہاؤس میں جارہا ہوں۔ وہاں اعلیٰ حکام اور آرمی کے افسران کو ایک تماشا دکھاؤں گا۔ تم بھی دیکھوگے، وہاں چلے آؤ۔''

ایک گھنٹے بعد صدر کے محل میں اعلیٰ حکام اور افسران موجود تھے۔ ماروی جواد سبحانی کے اندر پہنچ کر اسے تہ خانے سے باہر لے آئی۔ اس کی یادداشت بھی واپس لے آئی۔ وہ خود کو جواد سبحانی کی حیثیت سے پہچاننے لگا۔ ایسے وقت اس کے دماغ میں یہ خیال نقش ہوگیا تھا کہ اسے کسی نے سحرزدہ کرکے قیدی بنا رکھا تھا۔ اب ہوش وحواس میں رہ کر صدر کے پیلس میں جارہا ہے۔

وہ وہاں پہنچا تو ایک نہیں دو جواد سبحانی کو دیکھ کر سب ہی حیران رہ گئے۔ مراد نے جواد کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اے! تو کون ہے؟ بالکل میرے جیسا ہے۔''

جواد ایک ہم شکل کو دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں تیرے جیسا نہیں ہوں۔ تو میرے جیسا بن کر آیا ہے۔''

وہ تمام اکابرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کسی نے مجھے جادو کے یا ٹیلی پیتھی کے ذریعے قیدی بنا دیا تھا۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ جھوٹ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تجھے نہیں، مجھے کسی نے قیدی بنا دیا تھا۔ میں ابھی وہاں سے آرہا ہوں۔''

مراد نے تمام اکابرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری جگہ لے کر جواد سبحانی بن کر ہمیں نقصان پہنچانے آیا ہے۔''

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''بات سمجھ میں آرہی ہے۔ ماروی نے ہمیں الجھانے اور ہمارے مشن کو ناکام بنانے کے لیے ایک جعلی جواد سبحانی پیدا کیا ہے۔ اس جعلی کو اصلی ثابت کرکے ہمارے جواد سبحانی کو ہم سے بدظن کرنا چاہتی ہے اور ہمارے ہی ہاتھوں سے اسے نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔''

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''ہم دھوکا نہیں کھائیں گے۔ یہاں جو فراڈ آیا ہے، وہ سیدھی طرح خود کو ظاہر کردے۔ ورنہ ہم اس کی گردن دبوچنے کے بعد اسے گولیوں سے چھلنی کردیں گے۔''

تمام اکابرین اور جاسوس ان دو عدد جواد سبحانی

کو بڑی توجہ سے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ ماروی کی ٹیلی پیتھی انہیں بچا نہیں سکے گی۔ جو بہروپیا ہوگا، اس کی لاش وہاں سے جائے گی۔

مراد نے کہا۔ "سچ ابھی سامنے آجائے گا۔"

اس نے ایک منسٹر سے کہا۔ "جناب عالی! کل آپ نے عرشہ کے بارے میں فون پر مجھ سے کچھ کہا تھا۔ وہ بات صرف میں جانتا ہوں۔ اگر یہ فراڈ نہیں ہے تو اس سے پوچھیں۔ آپ نے فون پر کیا کہا تھا؟"

منسٹر نے جواد سبحانی سے پوچھا۔ "ہاں بولو، کل میں نے فون پر کیا کہا تھا۔"

جواد نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں کیسے بتاؤں؟ مجھے تو دشمنوں نے قیدی بنا کر رکھا تھا۔"

ایسے وقت ماروی نے جواد کے دماغ میں تحریک پیدا کی۔ اس نے اپنے لباس سے ریوالور نکال کر مراد کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں اصلی ہوں۔ اس نقلی کو زندہ نہیں رہنے دوں گا۔"

سپاہیوں نے فوراً ہی آ کر اسے پکڑ لیا۔ آرمی کے ایک افسر نے اس سے گن چھین کر کہا۔ "خود کو اصلی کہہ کر ہمارے اصلی کو گولی مارنا چاہتے ہو۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم نقلی ہو۔"

مراد نے کہا۔ "میں نے عرشہ اور عمیر کو جہاں چھپا کر رکھا ہے، وہاں سے ابھی ان کی لاشیں لا کر ان کے رشتے داروں کے سامنے پھینکوں گا تو مسلمانوں کے درمیان فسادات کی آگ بھڑک اٹھے گی۔"

جواد کا دماغ ماروی کی گرفت میں تھا۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق بولا۔ "ہرگز نہیں۔ میں عرشہ اور عمیر کو ہلاک نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے پلاننگ بدل دی ہے۔ وہ زندہ رہیں گے۔ میں ان میاں بیوی کے ماں باپ کو مار ڈالوں گا تو ان کی ہلاکت کے باعث فساد کی آگ بھڑک جائے گی۔ مجھے اپنی پلاننگ پر عمل کرنے دو۔"

ایک اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ "تم عرشہ اور عمیر کو ہلاک کیوں نہیں کرنا چاہتے؟"

وہ بولا۔ "عرشہ پر میرا دل آگیا ہے۔ میں اسے داشتہ بنا کر رکھوں گا۔"

مراد نے کہا۔ "آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ جواد سبحانی عاشق مزاج نہیں ہے۔ میں حسین عورتوں کو کبھی منہ نہیں لگاتا۔ ہمارا مقصد تبلیغی مشن کو ناکام بنانا ہے۔ ایسے اہم اور سنگین موقع پر یہ بہروپیا عرشہ سے عشق کر رہا ہے۔ میں ابھی جا کر عرشہ کی لاش مسلمانوں کے پاس پہنچا دوں گا۔"

ایک آرمی افسر نے مراد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بے شک! تم ہمارے جواد سبحانی ہو۔ یہ بہروپیا ہے۔ اسے یہاں سے جانے نہ دو۔"

ایک حاکم نے کہا۔ "یہ مراد اور ماروی کا آدمی ہے۔ اسے زندہ نہ چھوڑو۔ اس کی لاش اس روحانی قوت رکھنے والی کے پاس پہنچا دو۔"

ایک افسر نے اپنی گن کے ٹریگر کو دبایا۔ انتہائی مکار درندہ کہلانے والا جواد سبحانی گولی لگتے ہی چیخ مار کر ایک صوفے پر گرتے ہوئے بولا۔ "میں...... میں تمہارا جواد سبحانی ہوں۔ پچھلے بیس برسوں سے تمہاری غلامی کر رہا ہوں۔ تمہارا نمک حلال چیف آفیسر ہوں۔ میں نے مسلمان ہو کر یہاں کبھی مسلمانوں کو پنپنے نہیں دیا۔"

ماروی نے اس کے غلامانہ الفاظ کو بدل دیا۔ وہ مراد کی طرف انگلی اٹھا کر بولنے لگا۔ "تو بھی میری طرح حرام موت مرے گا۔ یہ یہودی اور عیسائی تجھے بھی میری طرح حرام موت ماریں گے۔ یہ جتنے حکمران ہیں، یہ کتے ہیں۔ میں ان پر تھوکتا ہوں۔"

وہ تمام لوگ یہ گالی برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ انہیں کتا کہا جائے۔ کئی سمتوں سے تڑا تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ جن کے لیے اپنے مسلمانوں سے غداری کرتا رہا، وہی اسے انعام دے رہے تھے۔

وہ چھلنی ہو کر جہنم میں چلا گیا۔

مراد نے کہا۔ "یہ کمبخت ماروی کا آلۂ کار تھا۔ اب وہ کوئی دوسری چال چلے گی۔ میں اس سے پہلے ہی جا کر عرشہ کو ہلاک کردوں گا اور اس کی لاش مسجد کے سامنے پھنکوا دوں گا۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ تمام اعلیٰ حکام اور آرمی کے افسران اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار کر مطمئن تھے۔ اب نئے تماشے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اطلاع ملی کہ ریاست ارض اسلام کا حاکم مراد علی منگی اسکائپ کے ذریعے کچھ بولنے والا ہے۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ کیا بولے گا۔ ماروی ہمارے خلاف ناکام رہی ہے۔ وہ غصے سے تلملا کر ہمیں چیلنج کرے گا۔"

ایسے وقت عذرباد نے آ کر پوچھا۔ "تم لوگوں نے بہروپیے جواد سبحانی کو مار ڈالا ہے لیکن وہ اصلی کہاں ہے؟ میں اس کے دماغ میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی سوچ کی لہریں نہیں مل رہی ہیں۔"

ایک افسر نے کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ زندہ ہے۔ تھوڑی دیر پہلے یہاں سے گیا ہے۔ پھر اس کا دماغ تمہیں کیوں نہیں مل رہا ہے؟''

وہ بولا۔ ''تم لوگ دھوکا کھا چکے ہو۔''

''کیا؟'' سب نے چونک کر عذرباد کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''اس کا دماغ اس کی سوچ کی لہریں نہیں ملتیں، جو مردہ ہوجاتا ہے۔''

ایک نے پوچھا۔ ''کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ جواد یہاں سے جا کر مردہ ہوگیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''کچھ ایسا ہی ہوسکتا ہے۔ یا تو یہاں سے جانے والا جواد مرگیا ہے یا پھر وہ جواد نہیں ہوگا۔ تم لوگوں نے اصلی کو یہاں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا ہے۔ بہرحال جو مرچکا ہے، وہی اصلی تھا اسی لیے مجھے اس کا دماغ نہیں مل رہا ہے۔''

ایک نے کہا۔ ''جو جواد یہاں سے گیا ہے، اسے فون پر کال کرو۔ وہ زندہ ہوگا تو جواب دے گا۔''

ایک افسر نے اس کے نمبر پنچ کیے۔ فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ''آپ کے مطلوبہ نمبر پر فی الحال رابطہ نہیں ہورہا تھوڑی دیر بعد کال کریں۔''

اسی وقت اسکائپ کے ذریعے رابطہ ہوگیا۔ جب اسکرین روشن ہوئی تو سب ہی چونک پڑے۔ وہاں مراد کی جگہ جواد سبحانی دکھائی دے رہا تھا جبکہ یہ کہا گیا تھا کہ ارضِ اسلام کا حکمران مراد علی منگی بولنے والا ہے۔

چند لمحوں تک جیسے سب پر سکتہ طاری ہوگیا۔ پھر ایک افسر نے پوچھا۔ ''جواد! یہ تم ہو؟ ہم سے کہا گیا تھا کہ......''

مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ ''میں جواد نہیں ہوں۔ یہ درست کہا گیا تھا کہ ابھی یہاں سے مراد بولنے والا ہے اور میں بول رہا ہوں۔''

وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کے سامنے جواد کی صورت میں مراد علی منگی بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے اپنے وفادار غلام چیف آف انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کو بری طرح حرام موت مارا ہے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم لوگوں نے مجھے ریاست سے باہر آنے پر مجبور کردیا، لو میں آگیا ہوں۔ تم سب شیطان کے تابعدار ہو۔ اس سے پوچھو، کیا وہ تمہاری مشکل آسان کرے گا؟ مجھے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کرسکے گا؟ میں جواد بنا بیٹھا ہوں۔ کیا مجھے پکڑ کر تمہارے سامنے جھکا سکے گا؟ کل میری ریاست سے تبلیغی جماعت آرہی ہے۔ کیا ہمارے تبلیغی فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹیں پیدا کرسکے گا؟ اپنے ملک میں میری قوت اور حکمتِ عملی دیکھو۔ تم میں سے کوئی نہ عرشہ اور عمیر کو قتل کراسکے گا، نہ مسلمانوں کے درمیان نفرت اور فساد پھیلا سکے گا۔ اگر ایک عرشہ یا عمیر کو ہلاک کرنے کی حماقت کرو گے تو میں یہاں کے تمام اعلیٰ حکام اور آرمی افسران کی بیٹیوں اور بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ ایک مسلمان کو ہلاک کیا جائے گا تو میں تمہاری دس نسلوں کو خاک میں ملادوں گا۔''

دشمنوں کے بیوی بچوں سے کبھی دشمنی نہیں کی جاتی۔ انہیں جانی نقصان نہیں پہنچایا جاتا۔ مراد محض انہیں دھمکیاں دے رہا تھا اور سمجھا رہا تھا کہ اپنی سلامتی چاہتے ہو تو مسجد سے اور مسلمانوں سے دور رہو۔ عرشہ اور عمیر گھر واپس آرہے ہیں۔ انہیں سیکیورٹی فراہم کرتے رہو۔

وہ ماروی کی روحانی قوتوں کے آگے دم نہیں مار سکتے تھے پھر یہ کہ مراد ایک طویل مدت کے بعد ریاست سے باہر میدانِ عمل میں آیا تھا۔ ایک عرصے بعد ان سے ایسے نمٹ رہا تھا کہ تمام مخالفین اس کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرشہ اور عمیر اسی شام گھر آگئے۔ انہوں نے بیان دیا کہ وہ میاں بیوی ایک دوسرے کے جانی دشمن نہیں ہیں۔ اب وہ دین و ایمان کے مطابق محبت سے زندگی گزاریں گے۔

یوں بازی پلٹ گئی۔ مسلمانوں کے درمیان مضبوط اتحاد پیدا ہوگیا۔ دوسرے دن تبلیغی جماعت وہاں آئی تو بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا گیا۔ مخالفین خاموش تماشائی بنے دور سے ایمان پرور اجتماع کو دیکھتے رہے۔ حالات سے مجبور ہوکر ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں لیکن سر نہیں جھکے تھے۔

شرپسند جھکنا نہیں جانتے۔ وہ عارضی طور پر خود کو شکست خوردہ تسلیم کرتے ہیں۔ دشمنی سے باز آجانے کا وعدہ کرتے ہیں پھر وہی چال بے ڈھنگی کے مصداق دوستی کے پردے میں دشمنی کی بارود بچھا کر اچانک دھماکے کرتے ہیں۔

عذرباد نے مراد کے پاس آکر کہا۔ ''بے شک ابھی تمہارا پلڑا بھاری ہوگیا ہے۔ ان بے چارے حکمرانوں کو اور دیگر مخالفین کو دھمکیاں دے رہے ہو کہ آئندہ دشمنی کے نتیجے میں ان کی بیٹیوں اور بیٹوں کو ہلاک کرو گے۔ وہ بے چارے سہم گئے ہیں، تم سے دشمنی کی جرأت نہیں کریں گے۔''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ مراد نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ

بڑے مزے میں بولا۔ ''شیطان کی نہ کوئی بیوی ہے، نہ بیٹی بیٹے ہیں۔ تم اسے کیسی دھمکیاں دو گے؟ اسے تو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکو گے؟''

وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ''جیت تب ہوتی ہے جب دشمن مات کھاتا ہے، شیطان کو کیسے مات دو گے؟ اسے موت نہیں آتی۔ کیسے مارو گے؟ زیادہ سے زیادہ اس کے چیلوں کو، تابعداروں کو ہلاک کرو گے۔ ایسا کرنے سے شیطان کا نہ کبھی کچھ بگڑا ہے، نہ تم اس کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ تمام ممالک کے حکمران اور دیگر اکابرین میری پناہ میں ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ وہ تم سے دشمنی کرنے کے لیے سامنے نہیں آئیں گے۔ سامنے صرف شیطان رہے گا یعنی میں اس کا دستِ راست تم سے نمٹنے کے لیے کافی ہوں۔ تم حکمرانوں کو اور دیگر مخالفین کو کسی ثبوت کے بغیر الزام نہیں دے سکو گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے، ہر ملک ہر علاقے میں شیطان آرمی کے ادارے قائم ہو چکے ہیں۔ ان اداروں کا ہر فرد اپنی ذات میں ایک شیطان ہے اور ہر شیطان میں ایسی بارود بھری ہے کہ ان سے ٹکراتے ہی تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''بہت بول رہے ہو۔ مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے اور کتنا بولو گے؟ میں تم لوگوں کا طریقۂ کار اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ مجھ سے مخالفت رکھنے والے حکمران اور یہودی لابی کے اکابرین دشمنی کرنے کے لیے بھی کھل کر سامنے نہیں آئیں گے۔ بظاہر دوستی، بھائی چارگی اور سفارت کاری ہوگی۔ دشمنی کے تمام حربے شیطان کے ذریعے جاری رکھے جائیں گے۔ وہ مردود پچھلے آٹھ برسوں سے تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو بڑی مکاری سے ہمارے خلاف استعمال کرتا رہا ہے۔ اس نے میرے پہاڑ جیسے بیٹے کو ریزہ بنا دیا ہے۔ میں ان تینوں کو ابھی ہلاک کر سکتا ہوں لیکن جس طرح میرے بیٹے کا جسم رفتہ رفتہ گلتا آیا ہے، اسی طرح میں ان تینوں کو دن رات اذیتوں میں مبتلا کر کے ماروں گا۔ آئندہ تم انہیں استعمال نہیں کر سکو گے۔''

عذر باد نے کہا۔ ''ہمارا شیطان ان خیال خوانی کرنے والوں کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ایسی قوت والا ہے کہ کسی کے بھی دل و دماغ میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے۔ نمازی، متقی، پرہیزگار بھی اسے اپنے اندر آنے سے روک نہیں پاتے۔'' مراد نے کہا۔

''خدا کا شکر ہے۔ وہ مجھ پر خیال خوانی کے حملے نہیں کر سکے گا۔ بظاہر سیاسی وسماجی مجرمانہ حملے کرتا رہے گا۔ وہ اپنی شیطانی فطرت سے باز نہیں آئے گا اور ہم اپنے ایمانی فرائض کی ادائیگی میں ہمیشہ ثابت قدم رہیں گے۔''

عذر باد نے کہا۔ ''ہمارے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے سلسلے میں سمجھوتا کرو۔ انہوں نے کبھی ہوش و حواس میں رہ کر پرنس عالی سے دشمنی نہیں کی۔ میں ضرورت کے وقت انہیں استعمال کرتا رہا اور وہ سحر زدہ رہ کر میرا کام کرتے رہے۔ انہیں سزائیں نہ دو۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ہم ان تینوں کو چھ ماہ کے لیے تمہارے حوالے کر دیں گے، تم انہیں اپنا محکوم اور تابعدار بنا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکو گے۔ وہ غائب دماغ رہ کر تمہارے وفادار رہیں گے۔ انہیں دھوکا اور بے ایمانی یاد نہیں رہے گی۔ اگر میں کبھی ان کے اندر جا کر کوئی چال چلوں گا تو ماروی خیال خوانی کے ذریعے ان کی چوری اور غداری کو سمجھ لیا کرے گی۔''

''یہ مشورہ اپنے ہی پاس رکھو۔ ہمیں کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بے شک! وہ تمہارے لیے ضروری نہیں ہیں لیکن انہیں سزائیں دینے کے طور پر اپنا قیدی اور محکوم بنا کر ان سے مشقت لے سکتے ہو۔ ہم دانش کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ یہ جانتے ہیں کہ تم نے اسے بیٹا بنایا ہے جبکہ وہ لارا کا بیٹا ہے۔ وہ اپنی ماں کی بہتری اور سلامتی تم سے چاہے گا۔''

مراد نے دل ہی دل میں تسلیم کیا۔ بیٹا یہی چاہتا تھا اور وہ دانش کے دل کو کبھی تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔

عذر باد نے کہا۔ ''دانش چاہے گا کہ اس کی ماں چھ ماہ تک تمہاری قید میں ہی سہی، زندہ سلامت رہے۔''

لارا دانش کی وجہ سے اہم ہو گئی تھی۔ اگرچہ ابھی لاپتا تھی لیکن کبھی واپس آسکتی تھی۔ مراد جانتا تھا کہ اسے سزائیں دے گا تو بیٹا خاموشی سے برداشت کرتا رہے گا۔ انصاف کے تقاضوں کو مانتا رہے گا لیکن اندر سے ٹوٹ جائے گا۔

اس نے عذر باد سے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں مجھے دانش کی خاطر سمجھوتا کرنا چاہیے۔ اس کی ماں لاپتا ہے مگر کسی دن کسی وقت آسکتی ہے۔ وہ تین خیال خوانی کرنے والے چھ ماہ تک میرے قیدی اور غلام بن کر رہیں گے۔ اگر وہ چھ ماہ تک سچائی اور دیانتداری سے رہیں گے تو انہیں قید سے رہائی دوں گا لیکن پوری آزادی نہیں دوں گا۔ انہیں شیطان کی پناہ میں واپس نہیں جانے دوں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ

وہ تینوں ہمارے دین کی چھاؤں میں آجائیں۔''

دانش وہاں دوسرے کمرے میں بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ عذرباد اور شیطان کے کسی چیلے کے سامنے نہیں آتا تھا۔ کوئی دشمن اسے صورت شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔

عذرباد نے آبنوس اور طاغوتا کو مراد کے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ دونوں اس کے سامنے آکر ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ عذرباد نے کہا۔ ''شیطان تم دونوں کو مراد علی منگی کی انتقامی کارروائی سے بچانا چاہتا ہے۔ اس لیے تمہیں اپنی بندگی اور تابعداری سے آزاد کر رہا ہے۔ تم دونوں ابھی اس لمحے سے مراد کے قیدی اور تابعدار رہو۔''

آبنوس نے کہا۔ ''شیطان ہمارا خالق ہے۔ ہم اس کی پرستش کرتے رہیں گے، اسی کے تابعدار رہیں گے۔''

طاغوتا نے کہا۔ ''ہمیں سزائیں منظور ہیں لیکن یہاں غلامی منظور نہیں ہے۔ ہم صرف شیطان کے احکامات کی تعمیل کرتے رہیں گے۔''

عذرباد نے کہا۔ ''یہ شیطان کا حکم ہے۔ تعمیل کرو اور کرنا ہی ہوگی۔ اگلے چھ ماہ تک ان مسلمانوں کے غلام بن کر رہنا ہوگا۔''

مراد نے کہا۔ ''غلام بن کر رہو گے یا پھر حرام موت مرو گے؟ غلام بن کر رہو گے تو میں تم لوگوں کی وفاداری کو آزماؤں گا۔ اگر شیطان کو خوش کرنے کے لیے ہمارے خلاف کوئی حرکت کرو گے تو میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

عذرباد نے ان سے کہا۔ ''مراد سے بحث نہ کرو۔ شیطان کے حکم کی تعمیل کرو۔ چھ ماہ تک زندہ رہو گے۔''

وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے چھ ماہ تک سانسیں لیتے رہنے کے لیے مراد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

ان دنوں وہ برمنگھم میں تھے۔ ریاست ارض اسلام کی دوسری تبلیغی جماعت وہاں آئی ہوئی تھی۔ دشمنوں کو اچھا سبق حاصل ہوگیا تھا۔ اس لیے اب مسلمانوں کے دینی معاملات میں کسی لابی سے بھی کسی طرح کی سازش نہیں ہو رہی تھی۔

☆☆☆

دشمنوں کی طرف سے عارضی طور پر ایک ذرا اطمینان حاصل ہوا تھا لیکن آج نہیں تو کل جو ماتمی حالات پیش آنے والے تھے، وہ پیش آ گئے۔ پہاڑ جیسا فولادی بیٹا بستر مرگ پر تھا جس پر زہریلی سازشیں کی گئی تھیں۔ جس طرح اس کا گوشت گلایا گیا تھا، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک ہی دن میں پھڑ پھڑا کر مر جاتا لیکن وہ بہت ہی سخت جان تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گیا تھا پھر بھی روح نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑا رہتا تھا۔ کچھ بول نہیں پاتا تھا۔ اس کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ سماعت سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ اسے اذان بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔

مراد اپنے ذاتی طیارے میں واپس آ گیا تھا۔ محل میں بیٹے کے پاس تھا۔ اس کے کمرے میں عبادت کر رہا تھا۔ رب کریم سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ زندگی ہے تو اسے مل جائے۔ نہیں ہے تو سکون سے اس کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ ایک دن سب کو جانا ہے۔ پہلے باپ کو جانا تھا لیکن بیٹے کا بلاوا آ رہا تھا۔

ایسے وقت عذرباد نے آکر کہا۔ ''تمہارا بیٹا آسانی سے نہیں مرے گا۔ جب یہ صحت مند اور تنومند تھا، تب بھی موت آکر اسے ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ اب بھی یہی نظر آ رہا ہے۔ موت اسے نہیں چھو رہی ہے۔ شیطان اور اس کے تابعدار خوش خبری سننے اور جشن منانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے راستہ دو۔ میں اسے ابھی اوپر پہنچا دوں گا۔''

وہ اجازت کے بغیر عالی کے کمزور دماغ میں گھس کر اسے ہلاک کر سکتا تھا لیکن راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ماروی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تو کسی کے بھی دل و دماغ میں گھس جاتا ہے لیکن میں بھائی جان کے اندر ہوں۔ تجھے قریب نہیں آنے دوں گی۔''

وہ بولا۔ ''اس طرح تم بھائی سے دشمنی کر رہی ہو۔ یہ جانکنی کے عذاب میں ہے۔ نہ جان جا رہی ہے، نہ رہ رہی ہے۔ جاتے جاتے اٹک رہی ہے۔ اسے مر جانے دو۔ مجھے اس پر احسان کرنے دو۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''چلے جاؤ یہاں سے......''

ایسے وقت شیطان نے عذرباد کے ذریعے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں ازل سے ناقابلِ شکست ہوں۔ کوئی مجھے مار سکتا ہے نہ میرا راستہ روک سکتا ہے۔ خدا نے مجھے قیامت تک آزاد اور بے لگام رکھا ہے۔

''صرف وہی خدا مجھے روک سکتا ہے اور تمہارا وہ معبود جانتا ہے کہ مجھے شر پسند اور بے لگام کیوں رکھا گیا ہے۔ بہرحال تمہارے بھائی کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ نہیں ہوا ہے تو میں پورا کر رہا ہوں۔ میں اس کی ناک میں گھس کر سانسوں کو الجھا کر تڑپاؤں گا۔ اسے جی بھر کے اذیتیں پہنچاؤں گا پھر اسے زندگی کی چوکھٹ سے باہر پھینک دوں گا۔''

وہ بول رہا تھا۔ ماروی، مراد اور دانش وہاں عذرباد کو

دیکھ سکتے تھے۔ شیطان کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پتا نہیں وہ مردود کمرے میں کہاں تھا۔ عابی سے کتنی دور تھا۔ ماروی اور دانش، عابی کے دماغ میں جم کر بیٹھ گئے۔ وہ دشمنی کرنے آتا تو انہیں معلوم ہو جاتا۔ تب وہ اسے روکنے اور بھگانے کی کوشش کرتے۔

بڑی پر اسرار خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ عابی کے دماغ میں نہیں جا سکتا تھا، اس کے سر کے پاس بابا صاحب جھک رہے تھے۔ وہ حملہ کرنے کا دعویٰ اور غرور بھول گیا تھا۔ حیرانی اور بے یقینی سے خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔

عابی کو کھلی آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ تب اس کے حلق سے بہت ہی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ سب نے اور قریب ہو کر اس کی طرف جھک کر سنا۔ وہ کلمہ پڑھ رہا تھا۔ بابا صاحب کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ وہ اسے کلمہ پڑھانے آئے تھے پھر انہوں نے ہاتھ ہٹا لیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ گہری ابدی نیند سو گیا تھا۔

ایک اللہ ہی رہنے والا ہے۔ ہم سب جانے کے لیے آتے ہیں۔ ماروی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ارض اسلام سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب ہی اللہ کو پکارنے اور عابی کی مغفرت کے لیے گڑگڑانے لگے۔ پورا شہر بند ہو گیا، سڑکیں گاڑیوں سے خالی ہو گئیں۔ سب ننگے پاؤں چلنے لگے۔ مسجدوں، مدرسوں اور گھروں میں قرآن خوانی ہونے لگی۔ تمام سوگوار خاموش تھے۔

تمام حکمران اور تمام سیاسی اور مذہبی اکابرین کی طرف سے اظہارِ تعزیت کے پیغام آنے لگے۔ تمام حکمران اور تمام سیاسی اور مذہبی اکابرین اظہارِ تعزیت کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیس سیکنڈ کے لیے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ قتل کی سازشوں میں شریک رہنے والے بڑی معصومیت سے سر جھکائے ہوئے تھے۔

مراد، ماروی اور دانش گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ تمام دنیاوی مصروفیات کو چھوڑ دیا تھا۔ عذر باد نے حکمرانوں اور اکابرین سے کہا۔ ”مراد اور ماروی پتا نہیں کتنے دنوں کے لیے ہم سے کٹ گئے ہیں، وہ فی الحال نہ تمہاری طرف آئیں گے، نہ ماروی تمہارے چور خیالات پڑھ کر دوستی کے پیچھے چھپی ہوئی دشمنی کو سمجھ سکے گی۔ تم سب ایزی ہو جاؤ۔ ابھی میدان صاف ہے۔ آزادی سے بے خوفی سے آپس میں سر جوڑ کر سوچو کہ کہاں ایسی بارود بچھائی جائے کہ وہ واپس آتے ہی تمہارے خلاف کچھ کیے بغیر فنا ہو جائیں۔“ یہ واقعی حکمرانوں کے اور دیگر اکابرین کے شیطانی ارادوں کے لیے اچھا موقع تھا۔

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”وہ تین دنوں تک یا سات دنوں تک ضرور سوگ منائیں گے۔ ویسے کوئی دن رات ماتم نہیں کرتا، وہ باپ بیٹی کھاتے پیتے گھومتے پھرتے ہوں گے۔ اپنے دشمنوں کو یعنی ہم کو نقصان پہنچانے کی پلاننگ کرتے ہوں گے۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ہم سے غافل ہوں گے۔“

جب تک عداوت جاری رہتی ہے، طرح طرح کے اندیشے سکون برباد کرتے رہتے ہیں۔ کئی شیطانی اداروں کے سربراہ باپ بیٹی کی واپسی کے منتظر تھے۔ وہ تمام چالباز سربراہ ماروی کی روحانی ٹیلی پیتھی سے محفوظ رہنے کے لیے روپوش رہتے تھے۔ وہ کسی کو نہ اپنی آواز سناتے تھے اور نہ ہی اپنی صورت دکھاتے تھے۔ جس طرح لارا کہیں گم ہو گئی تھی، اسی طرح وہ شاطر سربراہ بھی نادیدہ ہو گئے تھے۔

دشمن کہہ رہے تھے کہ وہ تمام عمر سوگ نہیں منائیں گے۔ امن و امان آج نہیں تو کل ختم ہوگا۔ کوئی کسی کے لیے عمر بھر نہیں روتا، چاہے وہ کتنا ہی جان سے پیارا ہو۔

مراد اور ماروی کو بھی بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کرنے تھے۔ انہوں نے عابی کو اپنے دلوں میں رکھ لیا، پھر گوشہ نشینی سے نکل آئے۔

☆☆☆

افریقا کے نیگرو سیاہ فام باشندے پچھلی صدی تک جنگلوں میں رہ کر جانوروں کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ آج بھی جنوبی افریقا کے جنگلوں میں کئی سیاہ فام قبیلے ایسے ہیں جو برہنہ جانوروں کی طرح رہتے ہیں۔ وہ صرف جانوروں کو ہی نہیں، انسانوں کو بھی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر یا آگ میں بھون کر کھاتے ہیں۔ شیطان کا مجسمہ بنا کر اسے پوجتے ہیں اور جادو ٹونے کے ذریعے دکھ بیماریوں اور دشمنوں سے لڑتے رہتے ہیں۔

بیشتر قبائل صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ مہذب بنتے آئے ہیں۔ وہ جن جنگلوں میں رہتے تھے، انہیں شہری آبادی بناتے آئے ہیں۔ زومبی گاگنا بھی خود کو اور اپنے تابعداروں کو رفتہ رفتہ مہذب بناتا آیا تھا۔ اپنے پر اسرار علوم کے ذریعے دنیا کے تمام مہذب انسانوں کو متاثر کرتا اور انہیں مرعوب کرتا آیا تھا۔

اس نے ایک ناقابلِ شکست جادوگر کی حیثیت سے

بڑا نام کمایا تھا۔ یہ غرور سما گیا تھا کہ شیطان اسے کسی سے شکست کھانے نہیں دے گا۔ وہ پرنس عابد علی منگی کو بھی کچل کر رکھ دے گا۔

اب وہ تمام جسمانی اور جادوئی قوتوں کے ساتھ فنا ہو گیا تھا۔ شیشے کے ایک تابوت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی لاش کو مختلف مرکبات سے حنوط کیا گیا تھا۔ اس کے بیوی بچوں اور تمام محکوم تابعداروں کا خیال تھا کہ وہ اپنی جادوئی قوتوں سے پھر زندہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اسے کیڑے نہیں کھا رہے تھے۔

وہ اپنی زندگی میں عورت کے بغیر نہیں رہتا تھا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے لیے عورت کو ضروری سمجھا گیا۔ اس کے تابوت کو ڈبل بیڈ بنایا گیا تھا۔ ایک زندہ عورت اس کی ہم بستر رہتی تھی اور وہ لارا تھی۔

زومبی گائنا اسے حاصل کرنے سے پہلے مر گیا تھا۔ وہ اس کی آخری آرزو تھی۔ لاش کے پاس اٹھتی بیٹھتی، کھاتی پیتی اور سوتی رہتی تو وہ شاید زندہ ہو جاتا۔

اور وہ جو زندہ تھی، ایک مردے کی طرح خود کو بھولی ہوئی تھی۔ زندہ تھی لیکن نہ ہونے کے برابر۔ اس کے ذہن میں یہ باتیں نقش تھیں کہ اس کا ایک جوان بیٹا گم ہو گیا ہے۔ وہ زومبی گائنا کے ساتھ دن رات گزارتی رہے گی تو جلد ہی بیٹا اسے مل جائے گا۔

وہ ایک لاکٹ پہن کر رہتی تھی۔ اس لاکٹ میں دانش کی تصویر تھی۔ اسے بڑی محبت اور ممتا سے دیکھتی رہتی تھی۔

خواب اپنی مرضی سے دیکھے نہیں جاتے۔ یہ خود ہی بند آنکھوں کے پیچھے آتے ہیں۔ لارا کو جادو کے ذریعے خواب میں دانش کی جھلکیاں دکھائی جاتی تھیں۔ ایک بار اس نے خواب میں کہا تھا۔ ''مام! زومبی گائنا کے قریب رہا کرو۔ وہ مہاشکتی مان ہے۔ مجھے تمہاری آغوش میں پہنچا دے گا۔ میں آنے ہی والا ہوں۔''

اس نے کہا تھا۔ ''بیٹے! میں کون ہوں؟ تمہارا باپ کون ہے؟ میں ساری دنیا کو اور خود کو بھول گئی ہوں۔ صرف تم ہی دل و دماغ میں نقش ہو۔ میرے خوابوں میں خیالوں میں آتے رہتے ہو۔''

''مام! میں اپنے پورے وجود کے ساتھ سر سے پاؤں تک تمہارے پاس آؤں گا۔ انتظار کرو۔''

پھر وہ خواب ٹوٹ گیا تھا۔ بیٹا کئی راتوں سے نیند میں نہیں آ رہا تھا۔ گم رہ کر ممتا کو تڑپا رہا تھا۔ جدائی کا یہ سلسلہ ایک دن ختم ہونے والا تھا۔ ایک دن اچانک پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا والوں نے فون کالیں سنیں۔ کوئی عورت بول رہی تھی۔ ''لارا زندہ ہے اور میرے شکنجے میں ہے۔''

یہ ایسی چونکا دینے والی اطلاع تھی کہ تمام خبر رساں ایجنسیاں لارا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ خبریں نشر کرنے کے لیے تڑپ گئیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کون ہو؟ ہم سے ابھی ملو۔ ہمیں اپنا نام اور پتا بتاؤ، ہم ابھی تمہارے پاس آئیں گے۔''

جواب ملا۔ ''کیسے آؤ گے؟ میں آکاش میں ہوں، پاتال میں مجھے کہاں پاؤ گے؟''

''تم نے ہم سب سے رابطہ کیا ہے۔ ہم سے بول رہی ہو تو اس کی وجہ ہو گی؟''

''ہاں۔ خاص وجہ ہے۔ میں تمہارے کانوں میں بول رہی ہوں۔ تم مراد علی منگی کے کان میں بولو۔ اس کے بیٹے نے میرے بھائی زومبی گائنا کو مار ڈالا تھا لیکن وہ آدھا زندہ ہے۔ وہ پیاسا کیسے مر سکتا ہے؟ لارا کا پیاسا تھا۔ پیاس بجھائے بغیر اس دنیا سے نہیں جائے گا۔ اس لیے میں زومبی کی بہن کیملی گائنا اس چھلکتے ہوئے جام کو اٹھا کر لے آئی ہوں۔''

کسی نے پوچھا۔ ''اوہ گاڈ! تم زومبی گائنا کی بہن ہو؟ لارا کو یہاں سے کیسے لے گئیں؟''

وہ بولی۔ ''صرف اور صرف جادو کی شکتی سے۔ جادو ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ یہ ہماری رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑتا ہے۔ دنیا کا کوئی گرو گھنٹال جادوگر نہیں جان سکے گا کہ میں لارا کو کس طرح تمہاری دنیا سے چرا کر لے آئی ہوں اور یہ روحانی تماشے دکھانے والے مسلمان کیا ہیں میرے سامنے؟ سنا ہے میرے بھائی کے قاتل عابی کی بہن بڑی روحانی شکتی والی ہے۔ اگر ہے تو پھر دکھائے اپنی شکتی۔ یہاں آئے اور لارا کو لے جائے۔''

ایک نے کہا۔ ''ایک عرصہ ہوا، مراد نے لارا کو طلاق دے دی تھی۔ وہ لارا سے نفرت کرتا ہے پھر اسے حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس کیوں آئے گا؟ مراد کو چیلنج کرنے اور للکارنے کے لیے اس کی بیٹی کو اغوا کرنا چاہیے تھا۔ تب وہ اس کی محبت میں تمہارے چیلنج کو قبول کرتا۔''

وہ بولی۔ ''میں روحانی شکتی رکھنے والی بیٹی کو اغوا نہ کر سکی۔ اس لیے اس کے بیٹے دانش کی ماں کو اٹھوالیا۔ تم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ دانش مراد کا اپنا بیٹا ہے۔ لارا نے برسوں پہلے بچے تبدیل کر کے مراد سے دھوکا کیا تھا۔ مراد فریب میں آ کر ایک لاوارث بچے کو اپنا سمجھ کر لے گیا تھا۔

جبکہ دانش لارا کی گود میں ہی رہا تھا۔"

وہ بول رہی تھی اور ساری دنیا کو معلوم ہو رہا تھا کہ پرنس عابد علی منگی کے بعد دانش ہی مراد کا اپنا لہو ہے۔ کمبلی گاتنا کہہ رہی تھی۔ "مراد کے ایک بیٹے پرنس عابی نے میرے بھائی کی جان لی۔ ہم نے عابی پر جادو کیا ہے تو وہ بھی مرنے والا ہے۔ میں مراد کے دوسرے بیٹے دانش کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔ وہ اپنی گم شدہ ماں کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ اس کے بعد مراد اپنے بیٹوں سے محروم ہو جائے گا۔ بس وہی بیٹی ماروی رہ جائے گی۔ میں اپنے منتروں کی شکتی سے اسے بھی جلا کر بھسم کردوں گی۔"

اس کی باتیں مراد کے کانوں تک پہنچیں۔ دانش اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کسی حد تک ماں کا سراغ مل گیا تھا۔ آگے اور بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ ماروی نے کہا۔ "زومبی گاتنا جنوبی افریقا کی جادوگری کے ایک علاقے پر حکومت کرتا تھا۔ اس کی بہن نے لارا کو وہیں کہیں چھپایا ہے۔"

نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ باپ بیٹی اور بیٹا اپنے معبود کے آگے دست بستہ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ لارا کے متعلق تجسس تھا کہ وہ کہاں ہوگی۔ اب معلوم ہوا کہ اسے کالے جادو کی کالی دنیا میں چھپایا گیا ہے اور یہ روحانیت کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔

وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے لگے۔ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارنے لگے۔ سیاہ جادو کی تاریکی میں روشنی پانے کا یہی ایک راستہ تھا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے جو ہوتا ہے وہ حقیقتاً نہیں ہوتا۔ سراسر فریبِ نظر ہوتا ہے۔ وہ زومبی گاتنا کی بہن کمبلی گاتنا اچانک کہاں سے آگئی تھی؟

بے شک وہ جادوگروں کا قبیلہ تھا لیکن زومبی کی موت کے بعد وہاں کوئی خطرناک چیلنج کرنے والا جادوگر نہیں رہا تھا۔ کمبلی گاتنا بھی ڈھول کا پول تھی۔ اوپر سے بج رہی تھی۔ اندر سے کھوکھلی تھی۔

اس کے باوجود وہ باپ بیٹی اور بیٹا وہاں تک پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ اس کھوکھلی کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ وہ خود ہی جادو کے زیر اثر تھی۔ عذر باد اپنی شیطانی انگلیوں پر اسے نچا رہا تھا۔

اس نے پراسرار علوم کے ذریعے کمبلی کے دماغ کو اپنے شکنجے میں رکھا تھا۔ وہ اس کے احکامات کی تعمیل کر رہی تھی۔ لارا کو اس نے اغوا نہیں کیا تھا۔ عذر باد نے اسے وہاں پہنچایا تھا۔

وہ چاہتا تھا لارا کی گمشدگی کا الزام اس پر اور شیطان پر نہ آئے۔ اگر ماروی کبھی روحانی صلاحیتوں سے لارا تک پہنچے تو یہی معلوم ہو کہ کمبلی نے اسے اغوا کر کے اپنے بھائی کی حنوط شدہ لاش کے پاس رکھا ہے۔

اس نے اپنے منصوبے کے مطابق لارا کے دماغ میں یہ نقش کیا تھا کہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں ہے۔ بیٹا اس سے بچھڑ گیا ہے لیکن جلد ہی ماں کی دھڑکنوں سے لگنے آجائے گا۔

منصوبے کے مطابق لارا بیٹے سے ملنے کے بعد دین اسلام قبول کر کے اپنے بیٹے کا، مراد اور ماروی کا اعتماد حاصل کرنے والی تھی۔ عذر باد عظیم اسلامی یونیورسٹی کے اندر جانے میں ہمیشہ ناکام رہا تھا۔ جب بیٹا اپنی ماں کو اس یونیورسٹی کی اپنی رہائش گاہ میں لے جاتا تو عذر باد بڑی رازداری سے لارا کے اندر رہ کر اس فولادی قلعے میں جا سکتا تھا۔

یہ کھیل وہ بہت سوچ سمجھ کر کھیل رہے تھے۔ انہیں نتائج حاصل کرنے کی جلدی نہیں تھی۔ یقین تھا کہ وہ ماں بیٹے کے ذریعے اسلامی یونیورسٹی کے نہایت رازدارانہ معاملات کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔

مراد اور ماروی کے خلاف بظاہر کسی ملک کے حکمران اور کسی مذہب کے پیشوا، عالم اور سیاسی اکابرین نہیں تھے۔ وہ مراد کے ہاتھوں زبردست نقصان اٹھا کر مگرمچھ کے آنسو بہا کر دوست بن گئے تھے۔ عذر باد نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے دوستی کرے گا نہ دشمنی۔ لارا کی موجودہ گمشدگی کے معاملے میں بھی وہ معصوم اور بے ضرر بنا ہوا تھا۔

اس معصومیت کے پیچھے کئی شیطانی ادارے قائم ہو گئے تھے۔ کئی ملکوں میں یہ مختلف ادارے مراد کا جینا حرام کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک ادارے کا نام "دی کیچر" تھا۔ اس کا سربراہ راجر ہارڈی بہت ہی مکار اور شاطر تھا۔ اس نے عذر باد سے کہا۔ "لارا جب بن زیان کے زیر اثر رہتی تھی، تب ہی سے وہ میری نظروں میں ہے۔ اب میں اس کی ٹیلی پیتھی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے میری طرف مائل کردو۔"

عذر باد نے کہا۔ "تمہیں بہت رازداری سے مراد کے مقابلے پر رہنا ہے۔ نہ اپنی صورت دکھانی ہے، نہ اپنی آواز اور لب و لہجہ سنانا ہے۔ ہم لارا اور دانش کے ذریعے بہت بڑا گیم کھیل رہے ہیں۔ ایسے وقت ماروی اپنی صلاحیتوں سے معلوم کرلے گی کہ لارا درپردہ تم سے تعلق

رکھتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں بہت محتاط رہنا چاہتے ہیں۔"

"بے شک محتاط رہو۔ لارا پر ایسا تو بھی عمل کرو کہ میرا نام میری شخصیت اس کے ذہن سے مٹی رہے۔ وہ میرے اندر آکر خیال خوانی کرنا بھول جائے۔ صرف میری ضرورت کے مطابق دوسروں کے دماغوں میں جایا کرے۔"

وہ قائل ہوکر بولا۔ "تم لارا کی خیال خوانی سے بہت فائدہ اٹھا سکو گے۔ میں اسے تمہاری طرف مائل کررہا ہوں۔ محتاط رہنا۔"

عذرباد نے لارا پر عمل کیا۔ وہ ایک مُردے کے ساتھ دن رات گزار رہی تھی۔ ایک زندہ جوان مرد کو اس کے دل اور دماغ میں پہنچا دیا۔ وہ خوش ہوگئی۔ اس کی زندگی میں بھرپور تبدیلی آگئی تھی۔

راجر ہارڈی بڑی رازداری سے کمبلی گانا کی خفیہ رہائش گاہ میں آگیا۔ وہاں ایک تہ خانے میں زومبی گانا کی لاش پڑی رہتی تھی۔ لارا وہاں رات کو جاکر سوتی تھی۔

اس نے ہارڈی کو دیکھ کر کہا۔ "میں پہلی بار ایک چلتے پھرتے زندہ مرد کو دیکھ رہی ہوں۔ کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے؟"

"ہاں۔ ہمیشہ ساتھ رہوں گا اور جلد ہی یہاں سے تمہیں لے جاؤں گا۔"

پھر اس نے عذرباد سے کہا۔ "میں لارا کی ٹیلی پیتھی کو صرف اپنے استعمال میں رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں چاہتا کہ میرے معاملات میرے راز تمہارے یا دوسرے لوگوں تک پہنچیں۔ لارا میری پرسنل لائف میں بھی اہم رہے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ صرف تمہارے لیے ریزرو رہے گی۔"

"میں اپنے اطمینان کے لیے اسے قانونی شریکِ حیات بناؤں گا۔ مجھے اپنا اطمینان کرنے دو۔"

راجر ہارڈی کی طرح شیطانی اداروں کے اور جتنے سربراہ تھے، وہ سب شیطان کے لیے بہت اہم تھے۔ عذرباد ہر ایک کی ضرورت اور خواہش پوری کرتا تھا۔ ہارڈی کی یہ خواہش بھی پوری کردی۔ لارا مسز ہارڈی بن گئی۔

وہ اپنی دنیا سے اپنی ذات سے گم ہوکر شیطانی کھیل تماشے میں ایک کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اب اس کی زندگی میں دو اہم ہستیاں تھیں ایک تو راجر ہارڈی تھا، دوسرا دانش۔ وہ بیٹا اس کے گلے کے لاکٹ میں دل کی دھڑکنوں کے ساتھ لگا رہتا تھا۔

اور بیٹے کی دھڑکنیں تڑپ تڑپ کر پوچھتی رہتی تھیں۔

"مام! کہاں ہیں؟ میں آپ کو ڈھونڈنے کہاں جاؤں؟"

ماروی بھی خیال خوانی کی پرواز کرتی رہتی تھی۔ وہ اپنی روحانی قوتوں سے اس علاقے تک پہنچتی تھی لیکن شیطانی حصار بندی کے باعث بھٹک جاتی تھی۔

مراد سوچ رہا تھا۔ "کمبلی گانا نے لارا کو اپنے علاقے میں چھپا کر رکھا ہوگا۔ کیا مجھے وہاں جانا چاہیے؟"

ماروی نے کہا۔ "میں ادھر جاتی ہوں پھر ایک جگہ پہنچ کر بھٹک جاتی ہوں۔ میری سوچ کی لہریں آگے جاتے جاتے رک رک جاتی ہیں۔ اس حصار کو توڑنا ہوگا۔"

"کیسے توڑو گی؟"

"چالیس دنوں تک گوشۂ تنہائی میں عبادت کروں گی انشاء اللہ وہ شیطانی حصار بندی ٹوٹ جائے گی۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔"

اسی وقت کالنگ ٹون نے مراد کو پکارا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "ہیلو! میں راجر ہارڈی بول رہا ہوں۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ ابھی جاننے کے بعد کبھی بھول نہیں پاؤ گے۔ اگر زندہ رہو گے۔ بائی داوے میں اس سے بولتا ہوں جس کی زندگی مختصر ہوجاتی ہے۔"

مراد نے اپنی طرف سے کوئی تاثر نہیں دیا۔ خاموش رہا۔ وہ بولا۔ "تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا معاملہ ہے۔ اسکائپ کے ذریعے بات کرو اگر منظور ہو۔ لارا تو لاپتا ہے۔ اب آبنوس اور طاغوتا کو بھی چھ ماہ تک اپنا غلام بنا کر نہیں رکھ سکو گے؟ کم آن۔ ہری اپ آن اسکائپ......"

تھوڑی دیر بعد اسکائپ کے ذریعے رابطہ ہوگیا۔ دوسری طرف اسکرین پر راجر ہارڈی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میری کوئی صورت شکل نہیں ہے۔ میں کسی کو نظر نہیں آتا۔"

وہ ہنستے ہوئے بول رہا تھا۔ "میرے منہ میں زبان ہے مگر میں بولتا نہیں ہوں۔ کوئی اور بولتا ہے۔ میری اپنی آواز اور لب ولہجہ نہیں ہے۔ یقین نہ ہو تو اپنی بیٹی اور بیٹے سے بولو کہ وہ اس آواز اور لب ولہجے کو گرفت میں لے کر میرے دماغ میں آئیں۔"

ماروی نے فوراً ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ اس بولنے والے کے اندر پہنچی۔ وہ ایک ریوالونگ چیئر پر بیٹھا اسکائپ کے ذریعے بول رہا تھا۔ "ابھی اپنے دماغ میں سوچ کی لہروں کو محسوس کررہا ہوں۔ یقیناً ماروی اور دانش آئے ہیں۔"

ماروی نے کہا۔ "میں آئی ہوں۔"

"تو پھر میرے چور خیالات پڑھو اور بولو میں کون ہوں؟"

وہ چند لمحوں تک پڑھتی رہی پھر بولی۔ "تم راجر

ہارڈی نہیں ہو۔ اس کے دست راست ہو۔ وہ کہیں روپوش ہے۔ وہاں سے تحریر کے ذریعے تم سے بول رہا ہے۔ وہی باتیں تم میرے بابا جانی سے کہہ رہے ہو۔''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے مراد سے بولا۔ ''سنا تم نے؟ میں تم سے بول رہا ہوں مگر میں بولتے ہوئے بھی نہیں بول رہا ہوں۔ نہ مجھے دیکھا جاسکے گا۔ نہ سنا جاسکے گا۔ میں ہوا ہوں۔ کبھی تمہاری اور ٹیلی پیتھی کی مٹھی میں نہیں آؤں گا۔''

مراد نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم نے منوالیا کہ بہت شاطر ہو۔ ہم تمہارے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ آگے بولو؟''

وہ بولا۔ ''تم نے شیطان سے کہا تھا کہ دانش کی خاطر اس کی ماں لارا کو سزائے موت نہیں دو گے۔ وہ تو لاپتا ہے۔ پتا نہیں زندہ ہے یا مرچکی ہے۔ تم نے آبنوس اور طاغوتا کو چھ ماہ کے لیے اپنا قیدی اور تابعدار بنایا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم ایسا کیوں کررہے ہو؟ کیا تم خدائی فوجدار ہو؟ جسے چاہو گے، سزائیں دو گے۔ تمہیں یہ پاور، یہ حقوق کس نے دیے ہیں؟ وہ بیٹا جو دنیا کا سب سے طاقتور شخص کہلاتا تھا۔ تنہا پوری فوج کو مار بھگاتا تھا۔ وہ مٹی دھول ہوچکا ہے۔''

وہ حقارت سے بولا۔ ''تمہارے اندر بیٹھے جیسا دم خم نہیں ہے۔ تمہارا قانون اور تمہاری دی ہوئی سزائیں کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ تم چھ ماہ تک ان دو ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو سزائیں دینا اور انہیں غلام بنائے رکھنا چاہتے ہو۔ میں نے تمہارے اس حکم کو رد کردیا ہے۔ تم ان دونوں کو اپنا غلام نہیں بنا سکو گے۔ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکو گے۔ انہیں دیکھ بھی نہیں سکو گے۔ جو میری مٹھی میں آجاتے ہیں، وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ جاؤ دیکھو، وہ کہاں ہیں؟ انہیں تلاش کرو۔ یہ بتادوں کہ وہ زندہ سلامت ہیں۔ آئندہ ان کی خیال خوانی میرے کام آتی رہے گی۔ جب انہیں نہ پاسکو تو تسلیم کرلینا، یہ راجر ہارڈی تمہیں مات دے رہا ہے۔ تم پر حاوی ہورہا ہے۔ تمہارے برے دن آگئے ہیں۔ ٹلنے والے نہیں ہیں۔ یہ تمہارے آخری دن تک تمہیں پہنچائیں گے۔ آئندہ تم اور ماروی جس ملک میں جاؤ گے، وہاں تمہاری طاقت، چالبازی اور ماروی کی روحانی قوتیں کام نہیں آئیں گی۔ میں گیم کھیلنا جانتا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو کس طرح ذلیل کرتے رہنا چاہیے۔''

وہ پھر حقارت سے بولا۔ ''لعنت ہے تم پر۔ ہم یہودیوں اور عیسائیوں کو الزام دیتے ہو کہ ہم تمہارے دین کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور تمہیں اندر سے توڑتے بکھیرتے رہتے ہیں۔ اونہہ! تم لوگوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟

''یہ دنیا ہماری ہے۔ یہاں طاقت کے تمام ذرائع ہمارے ہیں اور ہم دوسروں کی طاقت چھین لینا جانتے ہیں۔ جیسا کہ پرنس عابی جیسے ناقابلِ شکست شہ زور کو چھین لیا۔ وہ تین ٹیلی پیتھی جاننے والے جنہیں تمہارے خوف سے برسوں تک ناکارہ بنا کر رکھا تھا، ان میں سے دو کو ابھی چھین لیا ہے۔ لارا جب کبھی واپس آئے گی تو اسے بھی تمہارے ہاتھ لگنے نہیں دیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''بڑی دیر سے بولتے ہی جارہے ہو۔ تمہیں بولنے کی بیماری ہے۔ یہ سن کر خوش ہوجاؤ کہ تم نے اپنی باتوں سے دہشت طاری کردی ہے۔ میں خوف سے لرز رہا ہوں۔ تم نے ایسا خوف طاری کردیا ہے کہ میں بولنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ اس لیے رابطہ ختم کررہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ ماروی نے کہا۔ ''میں آبنوس اور طاغوتا کو تلاش کررہی ہوں۔ خدا جانے انہیں کہاں چھپا رکھا ہے؟ یہ پراسراریت بتارہی ہے کہ راجر ہارڈی کے پیچھے عذر باد کی شیطانی قوتیں کام کررہی ہیں۔''

''ہاں۔ وہ آبنوس اور طاغوتا کو مجھ سے چھین کرلے گیا ہے۔ ایسی شیطانی قوت اسے عذر باد سے ہی حاصل ہورہی ہوگی۔ بہرحال راجر ہارڈی یوکے میں کہیں ہوگا۔ لندن، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں کہیں چھپا رہتا ہوگا۔ کہیں بھی اس کا وجود کسی بہروپ میں ہوگا۔ اپنی پیدائشی آواز اور لب ولہجے میں بولتا ہوگا اور ہم تو اس کے دست راست کے لب ولہجے کو سن رہے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہے۔ تم اس کے آس پاس لاکھوں افراد کے دماغوں میں نہیں جاسکو گی۔ لاکھوں دماغوں میں جاتے جاتے زندگی گزر جائے گی، میں فی الحال یوکے جارہا ہوں۔''

دانش ان کے پاس آگیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بابا جانی! میں ابھی یہاں آیا تھا۔ راجر ہارڈی کی باتیں سنتے ہی آبنوس اور طاغوتا کو تلاش کرنے چلا گیا۔ وہ میری تو کیا روحانی ٹیلی پیتھی کی گرفت میں بھی نہیں آرہے ہیں۔''

ماروی نے کہا۔ ''میں حیران ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں تاریکی میں زیادہ نہیں بھٹکوں گی۔ مجھے روشنی ملے گی۔ ابھی جارہی ہوں۔ دو رکعت نفل نماز پڑھوں گی۔ پھر گمشدہ کو تلاش کرتے رہنے کے لیے وظیفہ پڑھتی رہوں گی۔''

وہ مراد اور دانش کے پاس سے اٹھ کر مصلے پر آکر بیٹھ گئی' وہ باپ بیٹے وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئے۔ اسے عبادت کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ دانش نے کہا۔ ''میں مام کے لیے پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا، وہ زندہ ہیں تو آپ کی روحانی قوتوں کے زیر اثر کیوں نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



آرہی ہیں؟"
"بیٹے! آجائیں گی۔ ذرا صبر کرو اور ایسے حالات میں صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔"
"میرے اندر بے چینی بھری ہے۔ مجھے اجازت دیں۔ میں برمنگھم جانا چاہتا ہوں۔ مام آخری بار وہیں تھیں۔"
"وہاں جانے سے دل کو تسلی ہوتی ہے تو ضرور جاؤ۔"
وہ پلک جھپکتے ہی اس رہائش گاہ میں آگیا، جہاں لارا گم ہونے سے پہلے تھی۔ وہ رہائشی بنگلا خالی تھا۔ باہر سے مقفل تھا۔ اندر اس کے ملبوسات اور ضرورت کی دوسری چیزیں موجود تھیں۔
اس نے بڑے جذبے سے سوچا۔ "کیا مام یہاں چھپ کر آتی ہوں گی؟ اپنی یہ چیزیں استعمال کرتی ہوں گی؟"
اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہاں سے نہ جائے۔ وہاں نادیدہ ہو کر رہے۔ دن رات ماں کا انتظار کرتا رہے۔
وہ ایک گوشے میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اگر ہلکی سی آہٹ یا سرسراہٹ بھی سنائی دیتی تو سمجھ لیتا کہ ماں وہاں نادیدہ ہو کر آئی ہے۔
وہ وقفے وقفے سے پلکیں جھپک کر نادیدہ ہو جاتا تھا پھر اس بنگلے سے باہر دور تک جاتا تھا۔ آس پاس سے گزرنے والیوں کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھتا تھا۔ جس پر شبہ ہوتا تھا کہ وہ خیال خوانی کرتی ہوگی، اس کے دماغ میں پہنچ جاتا تھا۔
ایک اندھی تلاش تھی۔ ناکامی ہوتی تھی۔ وہ واپس بنگلے میں آجاتا تھا۔
ادھر ماروی عبادت کرتی رہتی تھی۔ مراد جنوبی افریقا میں اس جادونگری کی سمت جانا چاہتا تھا جہاں ماروی کی خیال خوانی پہنچ کر بھٹک جاتی تھی۔ وہ تینوں باپ بیٹی اور بیٹا بھٹک رہے تھے۔ انہیں بھٹکایا جارہا تھا۔ شیطان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جان سے نہیں مارتا، ہلکان کرتا رہتا ہے۔ ایمان والوں کا جینا حرام کرتا ہے۔ اپنے تابعداروں کو اپنے ماننے والوں کو تماشے دکھا کر خوش کرتا ہے۔
اور اس وقت بھی وہ دانش کی وجہ سے مراد اور ماروی کی پریشانیوں کو دیکھ کر خوش ہورہے تھے۔ اپنی خوشیاں چھپا کر ان سے ہمدردی کر رہے تھے۔ ویسے ان کے تمام جاسوس بھی لارا کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کہیں اس کا سراغ کیوں نہیں مل رہا ہے؟
یہ یقین ہوگیا تھا کہ لارا کو جنوبی افریقا کے ایک علاقے میں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ وہ جادونگری ہے۔
پراسرار منتروں کی حصار بندی کے باعث ماروی وہاں تک پہنچ نہیں پارہی تھی اور وہاں تک کسی طرح بھی پہنچنا تھا۔
مراد نے کہا۔ "میں جاؤں گا۔ معوذتین، پڑھتا جاؤں گا۔ بابا صلاح الدین اجمیری بھی میرے ساتھ نمازیں پڑھا کرتے تھے، میں انہیں پکاروں گا۔ میرا رب چاہے گا تو وہ میری مدد کے لیے آئیں گے۔"
وہ ریاست سے نکل پڑا۔ اسے رات کی تاریکی میں کسی نے نہیں دیکھا۔ اسے شیطانی آنکھوں سے بھی چھپ کر ہزاروں میل دور افریقا کے آخری کنارے تک جانا تھا۔ سفر کی ابتدا ایک ہیوی موٹر سائیکل پر کی تھی۔ آگے چہرہ بدل کر ہوائی جہاز کے ذریعے جاسکتا تھا۔ ماسٹر کوبو اس کے نئے چہرے اور پاسپورٹ وغیرہ کے انتظامات کر رہا تھا۔
ابھی وہ عارضی میک اپ میں ریاست سے باہر آیا تھا۔ دوسری صبح ایک شہر نوپانا میں پہنچا۔ وہاں ناشتا کرنے کے لیے ایک اوپن ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گیا۔ آگے ایک اور شہر میں اس کا چہرہ اس کی شخصیت تبدیل ہونے والی تھی۔ اپنی ریاست سے باہر آتے ہی کوبو کے چار شوٹرز اس کے آگے پیچھے پہنچ گئے۔ اس سے بہت فاصلہ رکھا تھا تاکہ وہ دشمنوں کو تنہا دکھائی دے۔
یہ خیال تھا کہ دشمن اس سے بے خبر ہوں گے۔ اگر کسی سے سامنا ہوگا تو وہ اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ لیکن شیطان کی آنکھیں زمین کی تہ میں بھی پہنچ جاتی ہیں اور وہ زمین کے اوپر تھا۔
سڑک کے کنارے اوپن ریسٹورنٹ کی میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ ناشتا کرنے کے بعد کافی پی رہا تھا۔ ایسے ہی وقت چھ پٹے کٹے افراد وہاں آگئے۔ دو اس کے سامنے کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ چار اس کے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔
مراد نے انہیں دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر دل میں کہا۔ "کتوں نے میری بو سونگھ لی ہے۔"
سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے مسکرا کر کہا۔ "سنا تھا بادشاہ فقیروں کا بھیس بدل کر نگر نگر گھومتے ہیں۔ آج آنکھوں سے بادشاہ سلامت مراد علی منگی کو دیکھ رہے ہیں۔"
پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔ "میرے کوٹ کی جیب میں ریوالور ہے۔ ذرا بھی چالاکی دکھاؤ گے تو یہیں مارے جاؤ گے اور ہم یہاں ہنگامہ نہیں کرنا چاہتے۔"
تیسرے نے کہا۔ "چپ چاپ اٹھو اور ہماری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔"
اس نے پوچھا۔ "جان سے نہیں مارو گے تو کیا کرو

گے؟ کہاں لے جاؤ گے؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کوئی سوال نہ کرو۔ اٹھو یہاں سے۔''

مراد نے ان کی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو تمہاری دو گاڑیوں کے آگے پیچھے دوسری گاڑیاں آکر کھڑی ہوگئی ہیں۔ مجھے گولی مار کر فرار نہیں ہوسکو گے۔ یہاں پولیس والے پہنچ جائیں گے اور اگر پولیس والوں کے سامنے میں آئے ہو تو تمہاری گاڑیوں کا راستہ روکنے والی گاڑیوں سے فائرنگ ہوگی۔''

انہوں نے پریشان ہوکر راستہ روکنے والی گاڑیوں کو دیکھا۔ اس کے اندر کچھ لوگ جھلک رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے بڑی رازداری سے ایک شاٹ گن کی جھلک دکھائی۔ یہ سمجھا دیا کہ مراد علی منگی نہ تنہا ہے، نہ نہتا ہے۔ ان میں سے کوئی وہاں سے زندہ نہیں جاسکے گا۔

مراد نے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا۔ ''اب بولو تمہارے کس باپ نے یہاں بھیجا ہے؟''

اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے وہ بولا۔ ''ہم کرائے کے شوٹرز ہیں۔ کوئی ضرورت مند ہم سے آکر ملتا ہے یا فون پر ڈیلنگ کرتا ہے۔ بینک کے ذریعے پیمنٹ کرتا ہے۔ ہم اس کا کام کر دیتے ہیں لیکن......''

وہ کچھ اور پریشان ہوکر بولا۔ ''تم یقین نہیں کرو گے، وہ کوئی جادوگر ہے۔ میرے دماغ میں آکر بولتا ہے۔ اس نے تمہارے مرڈر کے لیے بہت بڑی پیمنٹ کی ہے۔ ہم ابھی یہیں تمہیں مار ڈالتے لیکن قانون کی گرفت میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ اب تو تمہاری گرفت میں آگئے ہیں۔

''اوہ گاڈ! ہم نے آپ کے متعلق سنا تھا کہ تم آگ کا مجسمہ ہو۔ تم پر دھاوا بولنے والے تمہیں چھونے والے جل جاتے ہیں۔ تمہارے وجود میں کانٹے بھرے ہیں۔ تمہیں جدھر سے پکڑا جائے ادھر سے چبھتے ہو۔ جانے دو۔ ہم اس معاملے کو ختم کررہے ہیں۔ تم زندہ رہو۔ ہم جارہے ہیں۔''

وہ جانے کے لیے اٹھ رہا تھا۔ مراد نے میز کے نیچے سے ایک لات ماری تو وہ کرسی سمیت پیچھے گر پڑا۔ وہ ایسی سچویشن کا پکا کھلاڑی تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ پیچھے سے اور دائیں بائیں سے حملے ہوں گے۔ اس نے سامنے والے کو لات مارتے ہی اپنی کرسی پیچھے کی طرف ماری۔ آس پاس والے ذرا لڑکھڑائے۔ وہ چشم زدن میں میز کے نیچے گھس کر اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ایک دائرے میں گھوما تو سب ہی میز سے ٹکراتے ہوئے پیچھے چلے گئے۔ اتنی دیر میں ماسٹر

کو بو بو کے فائٹر گاڑیوں سے نکل کر وہاں پہنچ گئے۔

ان میں سے کوئی بھی ہتھیار استعمال کرکے حالات کو سنگین نہیں بنانا چاہتا تھا۔ لات کھا کر گرنے والے نے جلدی سے اٹھ کر چیختے ہوئے کہا۔ ''رک جاؤ۔ ہمیں آپس میں لڑنا نہیں چاہیے۔ ہم دشمن نہیں ہیں۔ رک جاؤ۔ ہم دوستی کریں گے۔''

وہ سب رک گئے۔ ایک پولیس افسر سپاہیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''سر! کوئی سنگین معاملہ نہیں ہے۔ ہم دوست بن رہے ہیں۔ یہاں محبت سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

عذرباد خیال خوانی کے ذریعے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ مراد کی دلیری اور جنگ بازی پر غصے سے کڑھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مراد وہاں سے زندہ سلامت آگے نہ جائے۔ اگر وہ نہ مرے تو کم از کم ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے۔

پولیس افسران سب کو وارننگ دے رہا تھا کہ اب اگر فساد ہوگا تو انہیں حوالات میں پہنچا دے گا۔ وہ لوگ میز کرسیاں سیدھی کرکے پھر بیٹھ گئے تھے۔ عذرباد کے آلۂ کار اب مراد سے لڑنے کی جرأت نہیں کررہے تھے۔ وہاں سے جانا چاہتے تھے۔ مراد نے کہا۔ ''جو تمہارے دماغ میں آتا ہے، اس سے بولو یہاں آئے۔ تب میں تمہیں جانے دوں گا۔''

عذرباد نے مراد کے دماغ میں آنا چاہا تو اس نے سانس روک کر بھگا دیا۔ وہ اپنے آلۂ کار کے دماغ میں آگیا پھر بولا۔ ''میں عذرباد بول رہا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''ابھی کچھ عرصے تک ہمارے درمیان امن وامان اور سکون تھا پھر یہ شیطانی حرکت کیوں شروع کردی؟ یہ تم سمجھ گئے ہو کہ میں بھیس بدل کر ریاست سے نکل کر لارا کی طرف جانا چاہتا ہوں اور تمہارا شیطان نہیں چاہتا کہ میں ادھر جاؤں۔ کیا میں درست سمجھ رہا ہوں؟''

''ہاں۔ ہم نہیں چاہتے۔''

''تم لوگوں نے کہا تھا کہ لارا کی گمشدگی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم بھی اور تمہارا شیطان بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔''

عذرباد نے کہا۔ ''کمبلی گاننا نے بھید کھول دیا۔ تم لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ لارا کو جنوبی افریقا کے کسی علاقے میں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ ماروی اور دانش خیال خوانی کے ذریعے وہاں تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ اب تم جارہے ہو۔''

مراد نے کہا۔ ''اور تم نہیں چاہتے کہ میں ادھر جاؤں؟ یعنی لارا کو غائب کرکے کمبلی کی جادوگری میں پہنچانے میں تمہارا ہاتھ ہے اور تم ہمیں دھوکا دینے کے لیے اس کمینگی سے

انکار کرتے رہے ہو۔''

''اپنے فائدے اور کامیابی کے لیے ایسی چالیں چلنا کمینگی نہیں ہے۔ یہ شیطان کا فرمان ہے۔ تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو واپس جاؤ۔ ورنہ یہاں تمہاری لاش گرنے والی ہے۔''

''چلو اپنی حسرت پوری کرو۔ میں تو تمام چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے اس جادونگری میں جاؤں گا اور لارا کو وہاں سے لاؤں گا۔''

''تم سمجھ رہے ہو، میرے یہ آلۂ کار تم سے ڈر گئے ہیں۔ یہاں ہتھیار نکال کر حملہ نہیں کریں گے۔ میں ابھی ان کے دماغوں پر قبضہ جماتا ہوں۔ تم فوراً ہی نہیں مرو گے۔ پہلے زخمی ہوتے رہو گے۔''

اس نے یہ کہہ کر اپنے ایک آلۂ کار کے دماغ پر قبضہ جمایا۔ آلۂ کار نے اس کی مرضی کے مطابق اپنے لباس سے ریوالور نکال کر مراد کا نشانہ لیا۔ ٹریگر کے دبتے ہی گولی اس کے اپنے ساتھی کو لگی۔ وہ اچھل کر زمین پر گرا پھر ذرا تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہوگیا۔

عذر باد چونک گیا۔ سمجھ گیا کہ ماروی وہاں موجود ہے۔ اس نے موت کا رخ بدل دیا ہے۔ ادھر ماسٹر کو بوبو کے فائٹروں نے ہتھیار نکال کر فائرنگ کی تو وہ تمام آلۂ کار وہاں سے بھاگنے لگے۔ اس علاقے میں بھگدڑ مچ گئی۔ پولیس والے بھی ادھر ادھر چھپ کر فائر کرنے لگے۔

مراد گولیاں چلاتا ہوا دوڑتا ہوا اپنی موٹر سائیکل پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ماسٹر کے فائٹر بھی فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونے لگے۔ سپاہیوں نے ان کا پیچھا نہیں کیا۔ وہ خطرات سے کھیل کر اپنی جان مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

وہ دور نکلتے چلے گئے۔ دوپہر تک دوسرے شہر ٹرینڈا پہنچ گئے۔ وہاں عذر باد نے اس کے روبرو آکر کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، میں نے تمہارا پیچھا چھوڑ دیا ہے؟''

مراد نے کہا۔ ''شیطان آخری سانس تک پیچھے لگا رہتا ہے۔ کبھی ہمارے اندر گھس کر بھٹکاتا ہے، کبھی باہر رہ کر مصیبتیں پیدا کرتا رہتا ہے۔''

''یہ لکھ لو کہ لارا تک پہنچ نہیں سکو گے۔''

''یہ میرے دماغ میں لکھا ہوا ہے کہ وہاں پہنچنے تک تم عذابِ جان بنے رہو گے۔''

وہ بولا۔ ''جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شیطان جان سے نہیں مارتا ہے، پریشان کرتا رہتا ہے۔ مصیبتیں لاتا رہتا ہے، اسی کہاوت کے مطابق ہم تمہیں بھی جان سے نہیں مار یں گے لیکن تمہارا جینا حرام کرتے رہیں گے۔ آئندہ تم دیکھتے رہو گے کہ اس جادونگری کے قریب پہنچنے تک کس طرح موت تمہیں چھو کر گزرتی رہے گی۔ میں آخری بار سمجھاتا ہوں۔ تمہاری سلامتی صرف ارضِ اسلام میں ہے۔ واپس چلے جاؤ۔''

''تم نے سمجھا دیا۔ اب جاؤ۔ تمہاری دھمکیاں سن سن کر سر دکھنے لگا ہے۔''

''میں دھمکیاں نہیں دے رہا ہوں۔ یہ دیکھو دھماکا کر رہا ہوں۔ لو بچو۔''

وہ غائب ہوگیا پھر چند لمحوں کے بعد ہی ایک خوف ناک دھماکا ہوا۔ وہ جس ہوٹل میں تھا، وہاں کا ایک حصہ بم دھماکے سے اڑ گیا۔ مراد جہاں تھا، وہاں کے در و دیوار لرز گئے اور کچھ تڑخ کر اور ٹوٹ کر گرنے لگے۔ وہ چلانگیں لگاتا ہوا وہاں سے بھاگنے لگا۔ اوپر چھتیں بھی کہیں کہیں سے ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ جب وہ ہوٹل سے باہر دور ایک ایمبولینس کے پاس پہنچا تو بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔

پتا نہیں اس دھماکے میں کتنے مر چکے تھے۔ کتنے زخمی ہو کر اسپتال جا رہے تھے۔ مراد کو بھی اسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ وہ ایمبولینس کے پچھلے حصے میں آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ ماروی اور دانش اس کے اندر موجود تھے۔ ایسے وقت عذر باد نے وہاں آکر مسکرا کر دیکھا پھر کہا۔ ''دیکھا تم نے میں دھمکی نہیں دیتا۔ اس پہلے دھماکے میں تم لہولہان ہوگئے۔ عقل سے سوچ کر آگے اور کیا ہونے والا ہے۔ تمہاری روحانی قوتوں والی بیٹی بھی تمہیں بچا نہیں سکے گی۔''

ماروی نے حاضر ہو کر کہا۔ ''بچانے والا خدا ہے۔ اسی معبود نے مجھے روحانی قوتیں عطا کی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے، یہ قوتیں موثر ہوتی ہیں۔ نہ چاہے تو شیطان عارضی طور پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ہمارا معبود اپنی حکمتِ عملی کو خوب سمجھتا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''اور تم سمجھ لو کہ میں زخموں سے چور ہو کر ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بھی اس جادونگری تک جاؤں گا۔''

دانش نے حاضر ہو کر کہا۔ ''میں بابا جانی کے سائے میں اپنی مام کو ضرور وہاں سے لاؤں گا۔ تو دفع ہو جا۔''

یہ کہتے ہی اس نے ایک الٹا ہاتھ عذر باد کے منہ پر رسید کیا مگر وہ شیطان ہاتھ لگنے سے پہلے ہی غائب ہوگیا۔

> حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

خوش خیالی

ثمر عباس

جرم چاہے چھوٹا ہو یا بڑا... کم سنی میں کیا جائے یا بڑھاپے میں، مجرم ہمیشہ کسی نہ کسی غفلت کا مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔ اس نے بھی بڑی ہوشیاری دکھائی مگر ذرا سی بے پروائی نے گویا چودہ طبق روشن کر ڈالے۔ معمولی سی خواہش کی تکمیل نے غیر معمولی تذلیل کے احاطے میں کھڑا کر دیا۔

ذہانت کا مظاہرہ کرنے والے ایک بے وقوف چور کی دیدہ دلیری

ڈیرن لیسٹر ن سیٹ بولیورڈ پر واقع پار کرز کلاتھیرز کے باہر کھڑا شوکیس میں سجے ہوئے اٹالین لیدر جیکٹس کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈیرن کو معلوم تھا کہ جب یہ جیکٹس انسانی مجسموں پر اتنی عمدہ دکھائی دے رہی تھیں تو اس کے جسم پر کتنی دلکش اور شائستہ نظر آئیں گی۔ پھر اس نے ایک اچٹتی نگاہ اپنی تین سالہ پرانی مصنوعی چمڑے کی جیکٹ پر ڈالی جو وہ اس وقت بھی زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس جیکٹ کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا اور وہ بے رونق نظر آنے لگی تھی۔

ڈیرن لیسٹر اب اکیس برس کا ہو چکا تھا اور یہی عمر خوش لباسی اور نمائش پسندی کی ہوتی ہے۔

وہ اسٹور میں داخل ہو گیا۔ وہاں سوٹ بوٹ میں ملبوس کئی سیلز مین متحرک تھے۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتا ہوا سیدھا اس بڑے حصے کی جانب چل دیا جہاں لیدر کی جیکٹوں کی ایک وسیع ورائٹی ڈسپلے پر تھی۔

ڈیرن نے ان جیکٹس میں سے دو جیکٹس اٹھائیں اور ان کا جائزہ لینے لگا...... ہم م م...... چاکلیٹ براؤن یا بلیک؟ اس نے وہ دونوں جیکٹس ریک پر ایک جانب رکھ دیں اور مزید دو جیکٹ منتخب کیں اور ان کو جانچنے لگا...... کمر تک



صحیح رہیں گی یا پتلون کی جیبوں تک؟ یہ فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہے، وہ سوچ میں پڑ گیا۔

یہ تمام جیکٹس اپنے اپنے اسٹائل میں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں جو بھی ان کو پہنتا اس سے اس کی اعلیٰ ذوقی اور سب سے بڑھ کر اس کی مالیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے جسم کی زینت بنا کر وہ یقینی طور پر چند خواتین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ وہ اس خیال پر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔

اس نے ان جیکٹوں کی قیمتوں کے ٹیگ پلٹ کر دیکھے تو اس کا سانس حلق میں اٹکنے لگا۔

اتنے میں ایک سیلز مین منڈلاتا ہوا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا اور خوش اخلاقی سے بولا۔ ”میں آپ کی کوئی مدد کروں، سر؟“

”اوں...... نہیں۔ میں...... میں تو بس دیکھ رہا ہوں۔“ ڈیرن نے جیکٹوں کو واپس ریک پر رکھتے ہوئے کہا۔ اسے یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ اس وقت اس کی اس بات سے کسے زیادہ افسردگی ہوئی ہے...... اسے خود کو یا سیلز مین کو؟

ڈیرن ایک اور ریک کی جانب بڑھ گیا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے وہ دیگر ملبوسات کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہو۔ اس دوران وہ سیلز مین ایک اور متوقع خریدار کی جانب متوجہ ہو کر اس کی جانب پلٹ گیا۔ ڈیرن نے ایک بار پھر ایک للچائی نظر ان لیدر جیکٹس پر ڈالی جن کی قیمتیں اس کی قوتِ خرید سے باہر تھیں۔

وہ ان میں سے ایک جیکٹ لازمی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس کلاتھیرز اسٹور سے خالی ہاتھ واپس نہیں جائے گا۔ اس نے صورتِ حال پر ایک لمحے کے لیے غور کیا۔ اسے اپنے سوال کا آسان جواب سجھائی دے گیا۔

اگر وہ ایک جیکٹ خریدنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تو کم از کم اسے چوری تو کرسکتا ہے۔

کیا ہوا اگر جیکٹوں میں مقناطیسی پٹیاں پوشیدہ ہوں جو اسٹور کے بیرونی دروازے پر لگے ہوئے الارم کے سینسر کو آن کردیتی ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ عود کر آیا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بھی ابھر آئی۔ وہ ٹہلتا ہوا واپس جیکٹوں کے ریک کی جانب چلا گیا۔

تمام سیلز مین اس وقت مصروف تھے۔ قریب میں کوئی گاہک بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

ڈیرن نے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اطمینان سے ایک جیکٹ اٹھائی اور لپک کر نزدیک ترین لباس تبدیل کرنے والے کمرے میں جا گھسا۔ اس نے ہوشیاری اور قرینے سے جیکٹ کا جائزہ لینا شروع کیا اور تلاشی لیتے ہوئے ہر ایک مقناطیسی اسٹرپ اتار کر اسے نیچے پھینکتا رہا۔ اسے ان مقناطیسی اسٹرپس کو ان کی خفیہ جگہوں سے اکھاڑنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ جیکٹ کی آستینوں، کالر، کمر پٹی اور جیبوں میں پوشیدہ تھیں۔ آخری مقناطیسی اسٹرپ اتار کر پھینکنے کے بعد اس نے پوری طرح اطمینان کرلیا کہ اب کوئی مقناطیسی اسٹرپ باقی نہیں رہی۔

پھر ڈیرن نے وہ جیکٹ اپنے کوٹ کے اندر چھپالی اور بے باکی سے لباس تبدیل کرنے والے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ اس بیرونی دروازے کی جانب تھا جس میں سینسر الارم لگا ہوا تھا۔ کتنی آسانی سے جیکٹ ہاتھ آگیا، وہ یہ سوچتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اب اس کی آزادی صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی۔

اچانک بلند ہونے والی الارم کی تیز چنگھاڑتی آواز نے ڈیرن کے قدموں کو منجمد کردیا۔

ساتھ ہی پدرانہ شکل وصورت والا ایک سیکیورٹی گارڈ نہ جانے کہاں سے اچانک ہی اس کے سامنے آگیا۔ اس نے ڈیرن کے کوٹ کے کالر کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے واپس اندر اسٹور میں گھسیٹ لیا۔

”یہیں کھڑے رہو، بیٹے۔ ذرا چیک کرتے ہیں کہ الارم کیوں آن ہوا تھا۔“

ڈیرن سوچ میں پڑ گیا۔ کیا میں نے تمام اسٹرپ نہیں اتاری تھیں؟ کوئی ایک مجھ سے کیوں کر مس ہوئی ہے؟

ڈیرن خاموش کھڑا رہا جبکہ سیکیورٹی گارڈ اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ ڈیرن کے بڑے سے کوٹ کی زپ کھولنے پر جب اندر سے چوری کی ہوئی جیکٹ برآمد ہوئی تو سیکیورٹی گارڈ مایوس کن نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”اب بتاؤ بیٹا، کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے چوری کرکے تم صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاؤ گے؟ یہ مقناطیسی اسٹرپس ساکت لیکن بھانڈا پھوڑنے والی ہوتی ہیں۔“

یہ کہہ کر سیکیورٹی گارڈ نے جیکٹ کی تلاشی لینا شروع کردی۔

”یہ کیا......؟“ اس نے جیکٹ کی دوبارہ سے تلاشی لیتے ہوئے کہا۔ پھر ڈیرن کو گھورنے لگا۔ ”اس پر تو کوئی مقناطیسی اسٹرپ نہیں ہے۔“

ڈیرن کو خود بھی اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اگر وہ جیکٹ پر سے تمام مقناطیسی اسٹرپس علیحدہ کرچکا تھا جیسا کہ

سیکیورٹی گارڈ اس کی تصدیق کر چکا تھا تو پھر الارم کیوں بجا تھا؟ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ڈیرن کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

''ہوسکتا ہے کہ سیلز کلرک نے وہ اسٹرپس علیحدہ کردی ہوں۔ یا ہوسکتا ہے کہ دروازے کا الارم سینسر ناکارہ ہوگیا ہو۔'' ڈیرن نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

سیکیورٹی گارڈ نے اپنا چہرہ ڈیرن کے چہرے پر جھکایا اور چبھتے ہوئے لہجے میں سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''کیا تم یہ جیکٹ چوری کررہے تھے، بیٹے؟''

ڈیرن کو کچھ کہنے کے لیے الفاظ سجھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ چوری کے جواز کی کوئی وضاحت پیش نہیں کرسکتا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ چوری کیوں کی تھی۔ اسے بس یہ معلوم تھا کہ اسے ہر صورت یہ جیکٹ چاہیے تھی اور اسے حاصل کرنے کا واحد راستہ اسے چوری کرنا ہی تھا تو اس نے یہ راستہ اختیار کرلیا تھا۔

لیکن وہ یہ حقیقت سیکیورٹی گارڈ کے گوش گزار نہیں کرسکتا تھا۔

''نہیں، سر۔'' اس نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ''میں نے یہ جیکٹ اپنے بھائی کے لیے خریدی ہے۔ وہ مال میں ہے اور میں اسے یہ پتا نہیں چلنے دینا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے لیے کیا چیز خریدی ہے۔''

گارڈ نے گردن ہلائی اور بولا۔ ''کیا تمہارے پاس اس کی رسید ہے؟''

ڈیرن نے شانے اچکا دیے۔ ''شاید مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔'' ڈیرن نے اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد کہا۔

''اوکے۔'' گارڈ نے کہا۔ ''ہم ایک تجربے کی کوشش کرتے ہیں۔''

گارڈ نے وہ جیکٹ ایک ڈسپلے ٹیبل پر رکھ دی اور خود الارم والے دروازے سے گزر کر پلٹ کر واپس آگیا۔

''اب تم اس دروازے سے ایک بار پھر سے گزر کر آؤ۔'' گارڈ نے ڈیرن کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈیرن کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سو اس نے گارڈ کے حکم کی تعمیل ہی میں عافیت سمجھی۔ اسی دوران بہت سے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے وہاں رک گئے تھے۔ ڈیرن کو اپنی یہ تذلیل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ لوگوں کی جانب سے اس قسم کی توجہ کا خواہشمند کبھی نہیں رہا تھا۔

اسی سوچ میں گم وہ ایک بار پھر اس دروازے سے گزرنے کے لیے پلٹ گیا۔

الارم اس مرتبہ بھی بجنے لگا تھا۔

سیکیورٹی گارڈ نے ایک بار پھر ڈیرن کو واپس اسٹور کے اندر گھسیٹ لیا۔ ساتھ ہی وقتی طور پر اپنا سر کھجانے لگا۔ پھر اس نے سرتاپا ڈیرن کا غور سے جائزہ لیا۔ ڈیرن کا خستہ حال لباس خصوصی طور پر اس کی توجہ کا مرکز تھا۔

''کیا تم نے کوئی اور شے بھی چوری کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''نہیں۔'' ڈیرن نے جواب دیا۔ وہ خود بھی حیران اور گومگو کی کیفیت میں تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس کی اکھاڑی ہوئی مقناطیسی اسٹرپس میں سے کوئی ایک اس کے کوٹ کے اندر تو چپک کر نہیں رہ گئی ہے؟

ادھر سیکیورٹی گارڈ نے بھی جیسے ڈیرن کے ذہن میں ابھرنے والے اس خیال کو فوراً پڑھ لیا۔ ''اوکے، بیٹے۔'' اس نے ڈیرن کو نیا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اب تم اپنا کوٹ اتار دو اور سینسر کے سامنے سے دوبارہ گزرو۔''

ڈیرن نے وہی کیا جیسا کہ اسے کہا گیا تھا۔

الارم اس بار بھی بجنے لگا۔

''دیکھا!'' ڈیرن نے کہا۔ ''یقیناً اس میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔''

اب ڈیرن کو یقین آنے لگا تھا کہ وہ اپنی چوری کی جیکٹ کے ساتھ بچ نکلنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

ابھی وہ اس خوش خیالی میں تھا کہ سیکیورٹی گارڈ نے اسے ایک اور نیا حکم دیا۔

''مجھے اپنے جوتے چیک کراؤ، بیٹے!''

''میرے جوتے؟'' ڈیرن نے حیرانی سے کہا۔

اسے سیکیورٹی گارڈ کی یہ خواہش بے ضرر لگی تھی۔ اس نے نہایت اعتماد کے ساتھ گارڈ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے جوتے اتار دیے۔ پھر دونوں جوتے گارڈ کی جانب بڑھا دیے۔

گارڈ نے جوتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جوتوں کے دونوں تلووں میں مقناطیسی اسٹرپس چسپاں تھیں۔

ڈیرن کا منہ لٹک گیا۔

''میں نے چپکواں انگلیوں کے بارے میں تو سن رکھا تھا لیکن چپکواں جوتوں کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا۔'' سیکیورٹی گارڈ نے کہا۔

''اب تم خود کو شاپ لفٹنگ کے جرم میں زیر حراست سمجھو، بیٹا!''

حضرت محبوب سبحانی

غوث پاک علیہ الرحمۃ اللہ

ضیا تسنیم بلگرامی

جب جب انسان ربّ کائنات کے بارے میں سوچنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے تجسس کی ابتدا شاید اپنی ہی ذات سے ہوتی ہے کیونکہ یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق ہوئی اور انسان کو کائنات کی سب سے معتبر حیثیت سے نوازا گیا... لیکن تمام انسانوں میں اسے محبوب وہی بندے ہیں جو اس کے اطاعت گزار اور برگزیدہ ہیں... غوث پاکؒ کا شمار بھی انہی خاص اور مقرب بندوں میں ہوتا ہے جن کی کوئی بات باری تعالیٰ رد نہیں کرتا۔ سبحان اللہ۔ اگرچہ ان رستوں میں شیطان قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالتا ہے مگر بندگی کا اصل مزہ ہی ان رکاوٹوں کو عبور کرنے میں ہے۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی زندگی کے ایمان افروز واقعات



اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی۔ ان کا نام فاطمہ، کنیت ام الخیر اور لقب امتہ الجبار تھا۔ جب انہیں اپنی اس عمر میں یہ معلوم ہوا کہ وہ امید سے ہیں تو مجسم سوالیہ نشان بن گئیں۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ اس کہن سالی میں بھی اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اپنے شوہر ابوصالح موسیٰ جنگی دوست کو مطلع کیا کہ وہ امید سے ہیں اور پوچھا۔ ”آپ تو جانتے ہیں کہ اس وقت میں ساٹھ سال کی ہوں۔ کیا اس عمر میں ایسا ہو سکتا ہے؟“

ابوصالح نے جواب دیا۔ ''ایسا کیوں نہیں ہوسکتا۔ کیا خدا اپنے معاملات میں کہن سالی کا پابند ہے؟ وہ جب چاہے ایسا ہوسکتا ہے۔''

فاطمہ دم بخود تھیں۔ وہ سوچتیں، یہ جو کچھ ہونے والا ہے، دنیا والوں کی نظر میں بہت عجیب ہوگا۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟

ابوصالح نے انہیں فکرمند جو دیکھا تو انہیں تسلی دی۔ ''فاطمہ! مت گھبراؤ، تم بذاتِ خود اللہ کی برگزیدہ بندی ہو اور تمہارے والد عبداللہ صومعی اللہ کے ان محبوب بندوں میں شامل ہیں جن کی دل آزاری بھی خدا پسند نہیں کرتا اور جو شخص بھی ان کا دل دکھاتا ہے، خدا اس کو رنج و مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔''

یہ 470 ہجری کی بات ہے، فاطمہ کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کا نسب نامہ باپ کی طرف سے حسنی اور ماں کی طرف سے حسینی تھا۔ یہ عجیب و غریب واقعہ ایران کے جیلان نامی مقام سے تعلق رکھتا ہے۔ جیلان کی حدود میں نیق نامی ایک قصبہ تھا۔ یہ بچہ اسی قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ ابوموسیٰ نے ایک بار پھر اپنی نیک بیوی کو تسلی دی۔ ''خدا کی نیک بندی! میں تو ایک بات جانتا ہوں، پیدا ہونے والا کوئی معمولی شخص نہیں معلوم ہوتا۔ یہ عظیم الشان شخص معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کی عظمت کا ہمیں فوری علم نہ ہوسکے لیکن جب اس کا علم ہوگا تو ایک عالم حیران اور ششدر رہ جائے گا۔''

فاطمہ بھی اپنے شوہر کی باتوں سے مطمئن اور پُرامید تھیں۔ انہیں اپنے بچے میں عظمت اور تقدس کی جستجو تھی۔ باپ نے بچے کا نام عبدالقادر رکھ دیا۔ عبدالقادر کا بڑا پن رمضان میں پہلی بار ظاہر ہوا۔ رمضان میں ماں نے مسلسل یہ محسوس کیا کہ ان کا بیٹا سحری کے بعد افطار کے وقت تک دودھ نہیں پیتا۔ انہوں نے یہ بات اپنے شوہر کو بتائی اور شوہر سے دوسروں کے کانوں تک پہنچ گئی۔ پھر تو یہ بات دور دور تک پھیل گئی۔ لوگ بچے کی زیارت کو آنے لگے۔

29 رمضان کو لوگ عید کا چاند دیکھنے کے لیے بے چین تھے مگر شام کو فضا ابرآلود دیکھ کر لوگ بہت مایوس ہوئے۔ قرب وجوار کا سہارا لیا جاسکتا تھا لیکن فضائے بسیط میں دور دور تک ابر ہی ابر تھا۔ لوگ سر جوڑ کر بیٹھے اور آپس میں عید کا چاند ہونے یا نہ ہونے پر گفتگو ہونے لگی۔ انہیں تشویش تھی کہ اگر چاند ہوا اور ابر کی وجہ سے دیکھا نہیں جاسکا تو اگلے دن کا روزہ حرام ہوگا اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ انتیس کا چاند ہوگیا اور دوسرے دن عید منالی جائے تو یہ ظن اور قیاس بھی اس صورت میں گناہ کا موجب ہوگا کہ انتیس کا چاند ہوا ہی نہ ہو۔ جب یہ مسئلہ زیرِغور تھا، کسی نے انہیں یہ مشورہ دیا۔ ''لوگو! ہمارے علم میں ایک ذریعہ موجود ہے جس سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ انتیس کا چاند ہوا ہے یا نہیں۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔''

حاضرین میں سے ایک نے پوچھا۔ ''کون سا ذریعہ؟ کیا ابرآلود فضا میں چاند دیکھا جاسکتا ہے؟ یا پھر چاند دیکھے بغیر ہی......''

مشورہ دینے والے نے جواب دیا۔ ''آپ لوگ سحری کے وقت ابوصالح موسیٰ کے گھر تشریف لے جائیں اور ان سے یہ معلوم کریں کہ ان کا نومولود دودھ پی رہا ہے یا نہیں۔ اگر وہ دودھ نہیں پی رہا ہوگا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ انتیس کا چاند نہیں ہوا اور نومولود روزے سے ہے لیکن اگر وہ دودھ پی رہا ہے تو سمجھ لو انتیس کا چاند ہوگیا۔''

لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ ابوصالح موسیٰ کا بیٹا مادرزاد ولی ہے اور اس پیچیدہ مسئلے کو وہی حل کرے گا۔ سب اس رائے سے متفق تھے۔ انہوں نے جیسے تیسے رات گزاری اور سحری کے بعد ابوصالح کے گھر پہنچ گئے اور ابوصالح کو باہر بلا کر دریافت کیا۔ ''حضرت! یہ تو فرمائیں آپ کا نومولود اس وقت دودھ پی رہا ہے یا نہیں؟''

ابوصالح نے پوچھا۔ ''دوستو! وہ تو میں بتادوں گا اندر سے پوچھ کر مگر یہ تم لوگ کیوں معلوم کررہے ہو؟''

انہیں جواب دیا گیا۔ ''اس لیے کہ آپ کا بیٹا مادرزاد ولی ہے۔ اگر وہ دودھ نہیں پی رہا ہوگا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ روزے سے ہے اور انتیس کا چاند نہیں ہوا اور اگر وہ دودھ پی رہا ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چاند ہوگیا اور صبح عید ہے۔''

ابوصالح اندر آگئے اور اپنی بیوی سے کیفیت پوچھی تو انہیں جواب ملا کہ بچہ دودھ نہیں پی رہا ہے۔

انہوں نے باہر آکر اعلان کردیا۔ ''حضرات! انتیس کا چاند نہیں ہوا کیونکہ عبدالقادر دودھ نہیں پی رہا ہے۔''

ان سب نے روزے کی نیت کرلی اور بستی بھر میں یہ اعلان کردیا گیا کہ صبح عید نہیں ہے کیونکہ انتیس کا چاند نہیں ہوا۔ جس نے بھی یہ اعلان سنا، روزے کی نیت کی اور روزہ رکھ لیا۔

☆☆☆

آپ نے جب ذرا ہوش سنبھالا تو ہم عمر بچوں نے ساتھ کھیلنے نکلے۔ بچوں کو آپ کے ساتھ کھیلنے کا بڑا اشتیاق تھا لیکن آپ میں ایک جھجک تھی۔ وہ بچوں کی طرف دیکھتے، ان کی طرف جانے کا ارادہ کرتے مگر پھر ٹھٹک کر رک جاتے۔ لڑکے اشاروں سے اپنے پاس بلاتے۔ ایک لڑکے نے آپ کو آواز دی۔ ''تم ہمارے ساتھ کھیلنے کیوں نہیں آتے؟''

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس لڑکے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

دوسرے نے کہا۔ ''ادھر کیا دیکھتے ہو، میرے پاس آؤ۔ پھر دیکھنا کیسا مزے کا کھیل کھیلتے ہیں ہم لوگ۔''

آپ نے ان بچوں کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو داہنی طرف سے آواز سنائی دی۔ ''اِلیّ یا مبارک!'' (میری طرف آؤ یا مبارک!)

یہ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ پریشان اور خوفزدہ اپنے گھر کی طرف چل دیے اور راستے میں ایک جگہ پھر وہی آواز سنائی دی۔ ''اِلیّ یا مبارک۔''

آپ کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ آپ اپنی ماں کی گود میں جا بیٹھے اور ان سے کہا۔ ''ماں! میری مقدس و محترم ماں! مجھے پناہ دیجیے۔ میں بہت پریشان اور خوفزدہ ہوں۔''

ماں نے پوچھا۔ ''کس بات کی پریشانی؟ کیسا خوف؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ماں! جب میں اپنے ہم عمر بچوں کے بلانے پر کھیلنے کے لیے ان کی طرف جانے والا تھا، تو مجھے میری دائیں جانب سے کسی نے آواز دی...... ''اِلیّ یا مبارک'' جب میں نے دائیں جانب پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔''

ماں نے انہیں سینے سے لگا لیا۔ ''میرے بچے! مت ہراساں ہو۔ خدا تیرے ساتھ ہے، جو کچھ ہوگا بہتر ہی ہوگا۔''

آپ جب بھی بچوں کی طرف جانا چاہتے، یہی آواز سنائی دیتی۔ آخر آپ نے کھیل کود کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

آپ کو مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ پہلے دن مدرسے میں داخل ہوتے ہی آپ نے کسی کی آواز سنی۔ ''لوگو! اللہ کے ولی کو جگہ دو۔''

آپ نے بار بار یہ آواز سنی لیکن آواز دینے والے کی شکل نہیں نظر آرہی تھی۔ آپ نے ایک بار پھر اپنی ماں سے اس عجیب و غریب آواز کا ذکر کیا۔ فرمایا۔ ''ماں! میں حیران ہوں کہ مجھے آواز تو ضرور سنائی دیتی ہے مگر دکھائی کوئی بھی نہیں دیتا۔ اب میں کیا سمجھوں کہ یہ کس کی آواز ہے؟''

ماں نے پھر تسلی دی۔ ''بیٹے پریشان نہ ہو، اللہ تیرے ساتھ ہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، بہتر ہی ہو رہا ہے۔''

آپ خاموش ہو گئے۔ کئی دن بعد جب آپ مدرسے سے جا رہے تھے تو انہوں نے اپنے گرد و پیش چند نورانی پیکروں کو اپنے ساتھ چلتے دیکھا۔ یہ سب کے سب خاموش تھے لیکن یہ جیسے ہی مدرسے میں داخل ہوئے، نورانی پیکروں کی زبانیں کھل گئیں اور انہوں نے جوش و خروش سے کہنا شروع کر دیا۔ ''اے لوگو! اللہ کے ولی کو راستہ دو۔''

آپ نے ان پیکروں کو دیکھا اور انہیں اپنے ذہن میں بٹھا لیا اور ایک بار پھر ماں کو سب کچھ بتا کر پوچھا۔ ''ماں! میں کیا کروں؟ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے! میں تجھے کیا مشورہ دوں؟ میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔''

آپ کو ماں کے جواب نے پُرسکون کر دیا۔ یہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ آپ مدرسے میں پڑھ رہے تھے کہ محلے کا ایک شخص بدحواس بھاگتا ہوا مدرسے میں داخل ہوا اور پوچھا۔ ''صاحبزادے عبدالقادر کہاں ہیں؟''

استاد نے پوچھا۔ ''کیوں، کیا بات ہے؟ تو کچھ پریشان دکھائی دے رہا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''استادِ محترم! صاحبزادے عبدالقادر کے نانا سید عبداللہ صومعی کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ میں یہی خبر دینے آیا ہوں۔''

یہ خبر عبدالقادر نے بھی سن لی۔ ابھی انہوں نے اپنے استاد سے چھٹی کی درخواست بھی نہیں کی تھی کہ استاد نے کہہ دیا۔ ''عبدالقادر! تم گھر جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ تم پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔''

انہیں اپنے نانا سے بڑی محبت تھی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ نے انہیں اپنی انگلیوں پر لے کر ایک طرف چھڑک دیا۔ اس شخص نے پوچھا۔ ''اے شخص! میرے نانا کو کیا ہو گیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہوا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بس بڑھاپے کی بیماری نے ان کا کام تمام کر دیا۔''
انہوں نے اسی وقت چھٹی لی اور ماں کے پاس روانہ ہو گئے۔
ماں نے انہیں گلے لگالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ آپ ماں کو تسلیاں دیتے رہے۔ ''ماں! آپ جانتی ہی ہیں کہ میرے نانا کافی عمر کے انسان تھے۔ آخری دنوں میں یہی پیش آتا ہے۔ جو آیا ہے، اسے واپس بھی جانا ہے۔ ہر شے اپنی اصل کی طرف بھاگتی ہے اور ہر ذی روح کو اللہ کے پاس واپس جانا ہے۔''
ماں نے بیٹے کی باتیں سنیں تو ان کا اضطراب جاتا رہا۔ دکھ کم ہو گیا، طبیعت ٹھہر گئی۔

☆☆☆

ماں نے ان کی ذمے داریاں قبول کیں اور جیلان میں جس حد تک پڑھایا جاسکتا تھا، پڑھادیا لیکن بیٹے کی طلب علم کی پیاس کسی طرح بجھتی ہی نہیں تھی۔ وہ جیلان کے اساتذہ اور ذی علم حضرات کی گفتگو سے یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ اگر انہیں مزید پڑھنا ہے تو ان کو بغداد کا رخ کرنا چاہیے کیونکہ وہاں یگانۂ روزگار و نادرہ کار علمی شخصیات رہتی ہیں۔
وہ اسی فکر میں گھومتے پھرتے کسی دیہات میں پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے کسانوں کو کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ ان کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ انہیں کاشت کار اچھے لگ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے ان کے دل میں خیال آیا کہ انہیں کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے لیکن اسی وقت کسی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''عبدالقادر! تم اس لیے پیدا نہیں ہوئے۔''
آپ نے واپسی اختیار کی اور گھر چلے گئے۔ جب گھر میں بھی دل نہیں لگا تو چھت پر چڑھ کر آس پاس کا نظارہ کرنے لگے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے پیش نظر جو منظر تھا، وہ کچھ اور ہی تھا۔ انہوں نے بے شمار آدمیوں کو ایک میدان میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ انہیں حیرت اس بات کی تھی کہ ان کے آس پاس ایک بھی ایسا میدان نہیں تھا جہاں اتنے بہت سارے بلکہ بے شمار لوگ ایک جگہ جمع ہوتے۔ پھر ان کے کانوں میں ایک آواز گونجنے لگی۔ ''عبدالقادر! یہ جو تم دیکھ رہے ہو، میدان عرفات ہے۔''
وہ آہستہ آہستہ چھت سے اترے اور اپنی ماں کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔
ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیٹے! تم چپ کیوں ہو؟''
آپ نے فرمایا۔ ''ماں! میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا تھا مگر طلب علم مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں آپ سے جدا ہو جاؤں۔''
ماں نے جواب دیا۔ ''عبدالقادر! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہو۔ تکلف اور خوف سے کام مت لو۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ماں! آپ مجھے خدا کی راہ میں وقف کر دیں اور بغداد جانے کی اجازت دے دیں۔''
ماں نے حیرت سے پوچھا۔ ''مگر بغداد جا کر کیا کرو گے؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''وہاں علم حاصل کروں گا۔''
ماں نے ایک اور سوال کر دیا۔ ''مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ اچانک بغداد جانے کا خیال آیا کس طرح؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنی چھت پر سے میدان عرفات کا نظارہ کیا ہے۔ خدا نے میری ذات میں کوئی غیر معمولی بات رکھی ہے، جس سے میں عجیب و غریب آوازیں سن لیتا ہوں اور اب ان آوازوں کے علاوہ کچھ دیکھنے بھی لگا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں بغداد جاسکتا ہوں۔ خدا مجھے بغداد جانے کا حکم دے رہا ہے۔ میں اپنے علم اور......''
ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم بغداد چلے جاؤ گے۔''
انہوں نے جواب دیا۔ ''ماں! میں واقعی بغداد جانا چاہتا ہوں۔ ظاہری اور باطنی علوم کی تحصیل کے لیے۔''
ماں نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔''
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اندرونی کمرے میں چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد جب واپس آئیں تو ان کی آنکھیں اور زیادہ بھیگ چکی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔
بیٹے نے تھیلی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ماں! اس تھیلی میں کیا ہے؟''
ماں نے جواب دیا۔ ''دینار۔''

انہوں نے تھیلی کا منہ کھول کر الٹ دیا۔ بہت سارے دینار زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

ماں نے بیٹے کو حکم دیا۔ ”انہیں گنو اور مجھے بتاؤ کہ یہ کل کتنے دینار ہیں؟“

بیٹے نے دیناروں کی گنتی کی اور اعلان کیا۔ ”یہ کل اسی ہیں ماں!“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! تیرا ایک بھائی اور ہے۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔“

بیٹے نے بھی حیرت اور شکایت کا اظہار کیا۔ ”ماں! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے عبدالقادر! بات صرف اتنی سی ہے کہ تمہارے باپ نے تم دونوں کے لیے بس اسی دینار چھوڑے تھے۔ میں نے تم دونوں کی اس امانت کی بڑی حفاظت کی ہے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ماں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے! میں نے جو کچھ بھی کہا سچ کہا۔ تم دونوں کے لیے میرا یہ حکم ہے کہ جہاں بھی رہو علم اور سچائی کا دامن پکڑے رہنا۔“ پھر اسی دیناروں میں سے آدھے نکال کر بیٹے کے حوالے کر دیے۔

بیٹے نے ان دیناروں کو لے لیا اور کافی دیر تک انہیں دیکھتے ہوئے ایک بار پھر ماں کا شکریہ ادا کیا۔ ماں کو اپنی آغوش میں لے کر سینے سے لگا لیا۔

ماں نے کہا۔ ”بدتمیز! یہ تو بڑھ بڑھ کر باتیں کیوں کر رہا ہے؟ جو کچھ بھی تو......“

بیٹے نے عاجزی سے کہا۔ ”ماں! خدا کے لیے آپ یوں دل برداشتہ ہو کر یہاں سے جانے کا حکم نہ دیجیے۔ میں جاتے وقت آپ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ماں کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی، فرمایا۔ ”عبدالقادر! میں تمہارے اس سفر سے خوش ہوں، ملول نہیں۔“ اس کے بعد ماں نے یہ دینار لے کر گدڑی میں سی دیے۔

بیٹے نے پوچھا۔ ”یہ دیناروں کو آپ کیوں سی رہی ہیں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! راستے میں ڈاکے پڑ جاتے ہیں، اس طرح تیرے دینار محفوظ رہیں گے۔ ڈاکو انہیں دیکھ کر شاید نظرانداز کر دیں۔“

بیٹے کو ہنسی آگئی۔ ”ماں! کیا ڈاکو اتنے ہی سادہ لوح اور بھولے بھالے ہوا کرتے ہیں کہ وہ گدڑی کو دیکھے بغیر ہی چھوڑ دیں گے؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے بیٹے! ڈاکو بلا کے چالاک اور عیار ہوتے ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں میرا دل بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ تیری گدڑی کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔“

بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو پھر میری ماں ولی ہیں، میں حیران ہوں کہ میں نے ابھی تک اپنی ماں کے اس مقام کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں، انہیں اپنے حافظے میں محفوظ کر لو اور جب ان کی تصدیق یا تردید کا وقت آجائے تو تم ان کی تصدیق یا تردید بھی کر لینا۔“

بیٹا لاجواب ہو گیا تو سکوت اختیار کر لیا۔ ماں بیٹے میں کچھ دیر تو یوں ہی باتیں ہوتی رہیں، آخر میں بیٹے نے سامانِ سفر سنبھالا اور پڑاؤ کی طرف جانے سے پہلے ماں سے پوچھا۔ ”ماں! کوئی نصیحت؟ کوئی حکم؟“

ماں نے کچھ دیر ٹکٹکی لگائے بیٹے کو دیکھا اور پھر دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ”عبدالقادر! خواہ کسی حال میں بھی ہو، راست گوئی کو مت چھوڑنا۔ سچ، سچ، سچ...... ہمیشہ سچ بولنا، ہر حال میں سچ بولنا۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ماں! میں ہمیشہ سچ بولوں گا۔ ہر حال میں۔“

بیٹے نے باہر کا رخ کیا تو ماں اس کو باہر تک چھوڑنے گئیں۔ بیٹا دروازے سے نکل گیا۔ ماں دروازے کے اندر ہی رہ گئیں۔ انہوں نے آخری الفاظ ادا کیے۔ ”عبدالقادر! میں تمہیں اللہ کے لیے، اللہ کی خاطر خود سے جدا کر رہی ہوں۔ اب قیامت کے دن ہی تمہیں دیکھ سکوں گی۔“

عبدالقادر نے بھی ماں کو آخری بار جی بھر کر دیکھا اور پڑاؤ کی طرف چل دیے جہاں قافلہ مسافروں کا منتظر تھا۔

☆☆☆

قافلہ بغداد کی طرف چل پڑا۔ اٹھارہ سالہ عبدالقادر کو اپنی اٹھتر سالہ ماں شدت سے یاد آتی رہیں۔ ان کے وطن سے بغداد کا فاصلہ چار سو میل سے زائد تھا۔ کوہستانی سلسلوں، بیابانوں اور صحراؤں میں بڑے خطرات تھے مگر قافلے کو ان میں سے گزر کر ہی اپنی منزل مقصود تک پہنچنا تھا۔ یہ قافلہ ہمدان سے نکل کر ترنک کے سنسان کوہستانی علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہاں کیچڑ بہت زیادہ تھی۔ قافلے کی تیز رفتاری میں فرق آ گیا۔ تجربہ کار مسافروں نے اپنے آس پاس نظریں رکھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس دلدلی علاقے میں راہزنوں کا بڑا زور تھا اور قافلے کی سست رفتاری ڈاکوؤں کو حملہ آوری کا موقع فراہم کرتی ہے۔ قافلے کے شمشیر زنوں کو اپنی شمشیروں اور بازوؤں پر بڑا ابھروسا تھا مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر حملہ اچانک کیا جائے تو بات خطرناک ہو جاتی ہے۔

قافلے نے اس دلدلی علاقے میں قیام کا فیصلہ کر لیا کیونکہ یہاں قیام کر کے ڈاکوؤں پر نظریں رکھی جا سکتی تھیں۔

رات کو عشا کی نماز کے بعد قافلے کی طلایہ گرد جمعیت نے پہرا دینا ضروری سمجھا اور ان لوگوں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر محلِ وقوع کا جائزہ لیا۔ یہ بڑی اچھی جگہ اس لیے تھی کہ یہاں درندوں کا خوف نہیں تھا اور دور تک آنے جانے والوں پر نظر بھی رکھی جا سکتی تھی۔ قافلے کی پشت پر دلدلی علاقہ تھا۔ ان کے دائیں بائیں پہاڑی سلسلے تھے لیکن ذرا فاصلے پر۔ قافلے میں چند ایسے لوگ بھی تھے جو کئی بار یہاں سے گزر چکے تھے۔ انہوں نے قافلے والوں کو بتایا کہ یہ بڑی خطرناک جگہ ہے کیونکہ دونوں طرف کی پہاڑیاں ڈاکوؤں کا مسکن ہیں اور ڈاکو اس جگہ قافلوں پر شب خون مارا کرتے ہیں۔ قافلے والوں نے الاؤ جلائے اور اس کی روشنی میں طلایہ گردوں نے چوکیداری کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔

رات کے پچھلے پہر طلایہ گرد بھی اونگھنے لگے لیکن ان میں ایک شخص اس وقت بھی مستعد اور بیدار تھا۔ اس نے بائیں طرف کی پہاڑی میں سے پچیس تیس گھڑسواروں کو باہر نکلتے اور اپنی طرف آتے دیکھا۔ پھر اس کی نظر اچانک دائیں طرف اٹھ گئی۔ ادھر سے بھی پچیس تیس گھڑسوار نمودار ہوئے اور انہوں نے بھی آہستہ آہستہ قافلے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ پھر ان سواروں نے نصف دائرہ بنا لیا اور یہ دائرہ قافلے کی طرف بڑھتے ہوئے مختصر ہونے لگا۔ بیدار طلایہ گرد چیختے چلّانے لگا۔ ”لوگو! ہوشیار خبردار...... ڈاکو ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ خدا کے لیے جلدی سے بیدار ہو جاؤ، اٹھو اور ان کا مقابلہ کرو۔“

اونگھتے ہوئے طلایہ گرد بھی بیدار ہو گئے اور قافلے والے بھی اپنے ہتھیار سنبھالنے لگے۔ ڈاکوؤں نے قافلے میں بیداری کے آثار جو دیکھے تو شاہینوں کی طرح قافلے پر جھپٹ پڑے اور انہیں مارنا کاٹنا شروع کر دیا۔ شوروغل، چیخ پکار، بھاگ دوڑ اور ہتھیاروں کی شپاشپ اور جھنا جھن سے پورا ماحول گونج گیا۔ ڈاکو آزمودہ کار تھے۔ انہوں نے بڑی جلدی قافلے کو مغلوب کر لیا۔ چند آدمی خیموں کے پیچھے بھاگے مگر وہ دلدل میں پھنس گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ بزدلوں اور مصلحت اندیشوں نے ڈاکوؤں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ڈاکوؤں نے قافلے والوں کے مال وزر پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ بقیۃ السیف لوگوں سے مال وزر کا پتا پوچھنے لگے اور پھر انہی کی نشاندہی پر چھاپے مار کر چھپا ہوا مال نکالنا شروع کر دیا۔

عبدالقادر ایک طرف کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ایک ڈاکو ان کے پاس بھی آیا اور پوچھا۔ ”لڑکے! تیرے پاس بھی ہے کچھ؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں! میرے پاس بھی چالیس دینار موجود ہیں۔ یہ دینار میری ماں نے مجھے دیے تھے۔“

ڈاکو زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ”آدمی دلچسپ ہو، ہم سے بھی مذاق! تمہارے پاس چالیس دینار ہیں، خوب! اب تم مزے کرو کیونکہ ہمیں تمہارے دینار نہیں درکار ہیں۔“

یہ ڈاکو اپنے ایک ساتھی کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ اس قافلے میں سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اس کے پاس چالیس دینار موجود ہیں۔

ڈاکو کا ساتھی ہنسنے لگا، بولا۔ ”تو اس میں ہنسنے یا تعجب کی کیا بات ہے؟“

ڈاکو نے جواب دیا۔ ”میں ہنسا اس لیے کہ اگر اس نوجوان کے پاس دینار موجود بھی ہیں تو وہ سامنے نہیں ہوں گے اس لیے انہیں برآمد کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا بظاہر محسوس ہو رہا ہے۔“

ساتھی نے پوچھا۔ ”وہ نوجوان کہاں ہے؟“

ڈاکو نے جواب دیا۔ ''آؤ، میرے ساتھ آؤ۔ میں اس سے ملائے دیتا ہوں۔''

ڈاکو اپنے ساتھی کو آپ کے پاس لے گیا۔ ساتھی ڈاکو نے آپ سے پوچھا۔ ''صاحبزادے! کیا تم نے میرے ساتھی سے یہ کہا تھا کہ تمہارے پاس چالیس دینار موجود ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں! میں نے تیرے ساتھی سے یہی کہا تھا۔''

ڈاکو کے ساتھی نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میری گدڑی میں۔''

ساتھی نے انہیں حیرت سے بغور دیکھا اور اپنے ڈاکو ساتھی کو سوالیہ نظروں سے گھورا۔ ڈاکو نے کہا۔ ''سن لیا تم نے اس کا جواب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔''

ڈاکو کے ساتھی نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے اس نوجوان کو ہمارے خوف نے حواس باختہ کر دیا ہے ورنہ یہ ایسی بات نہ کرتا۔''

دونوں ڈاکوؤں نے آپ سے کہا۔ ''صاحبزادے! کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے؟''

آپ نے پوچھا۔ ''کہاں؟''

جواب ملا۔ ''ہم تمہیں اپنے سردار کے پاس لے چلیں گے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے سردار کو ہماری طرح تم جیسا نوجوان آج تک نہیں ملا ہوگا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تم دونوں کے ساتھ چلتا ہوں، چلو۔''

دونوں ڈاکو انہیں اپنے ساتھ اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ اس وقت سردار لوٹ کے مال کے حصے بخرے کر رہا تھا۔ اس نے آپ کو سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ اس نوجوان کو میرے پاس کیوں لائے ہو؟ کیا اس نے کوئی زیادتی کی ہے تم دونوں کے ساتھ؟''

ایک ڈاکو نے جواب دیا۔ ''نہیں سردار! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ عجیب وغریب نوجوان ہے...... آپ اس کی باتیں سن کر دنگ رہ جائیں گے۔''

سردار نے مال وزر کی تقسیم موقوف کی اور آپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا خاص بات ہے اس نوجوان میں؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں وہ خاص بات۔''

ڈاکو نے کہا۔ ''سردار! ہم دونوں اس نوجوان کے پاس یکے بعد دیگرے گئے اور اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس بھی کچھ ہے بھلا، اس نے جواب دیا۔ 'چالیس دینار' ہم نے پوچھا، وہ کہاں ہیں؟ جواب دیا۔ 'میری گدڑی میں سلے ہوئے ہیں۔' سردار! اب آپ ہی بتائیں، یہ نوجوان عجیب ہے یا نہیں؟ ہم دونوں کا خیال ہے کہ یا تو نوجوان ہم سے مذاق کر رہا ہے یا طنزاً کہہ رہا ہے یا پھر یہ کہ یہ شخص ہم سے ڈر گیا ہے اور اس وقت اس کے ہوش وحواس درست نہیں ہیں۔''

سردار نے پوچھا۔ ''صاحبزادے! تمہارا نام کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''عبدالقادر۔''

سردار نے پوچھا۔ ''کہاں سے آ رہے ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جیلان سے۔''

''کہاں جاؤ گے؟''

''بغداد۔''

سردار نے پوچھا۔ ''وہاں کیوں جا رہے ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ظاہری اور باطنی علوم کی تحصیل کے لیے۔''

سردار نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اس نوجوان کے ہوش وحواس بالکل صحیح ہیں اور لہجے کا اعتماد بتا رہا ہے کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔'' اس کے بعد آپ سے پوچھا۔ ''صاحبزادے! تمہارے پاس کتنی رقم ہوگی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''چالیس دینار۔''

سردار نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ "میری گدڑی میں بغل کے نیچے۔"
سردار نے ایک ڈاکو کو حکم دیا۔ "ذرا گدڑی کو ادھیڑ کر دیکھو تو سہی۔"
ڈاکو نے گدڑی کو ادھیڑ ڈالا اور اس میں سے چالیس دینار نکال کر سردار کے سامنے رکھ دیے۔ سردار پریشان ہوگیا اور ڈاکو حیرت واستعجاب سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ سردار کے دل ودماغ میں ہنگامہ برپا تھا، اس نے پوچھا۔ "صاحبزادے! جن دیناروں کو تم نے اس طرح چھپا رکھا تھا، انہیں اتنی آسانی سے کیوں بتا دیا؟"
آپ نے جواب دیا۔ "جب میں جیلان سے چلا تھا تو میری والدہ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں کبھی جھوٹ نہ بولوں، ہمیشہ سچ پر قائم رہوں، چنانچہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔"
سردار کے دل پر ایک اور چوٹ لگی، اس نے کہا۔ "تمہاری یہ رقم تو چھن جائے گی تم سے، اب تم کیا کرو گے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "مال تو آنی جانی شے ہے، اس کا افسوس بیکار ہے۔ میرا توکل اللہ پر ہے۔"
سردار کا دل بھر آیا۔ دینار ان کی طرف بڑھا دیے، بولا۔ "صاحبزادے! انہیں رکھ لو۔ میں انہیں نہیں لے سکتا۔ تم نے تو میری کایا ہی پلٹ دی ہے۔ تمہیں اپنے اس وعدے کا اتنا زیادہ پاس ہے جو تم نے اپنی ماں سے کیا ہے اور ایک میں ہوں کہ میں نے روزِ اول اپنے رب سے جو عہد کیا تھا، اس کو یکسر بھلا چکا ہوں۔ نوجوان! تم عظیم انسان ہو اور میں سرتاپا گناہ گار...... میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔ اب میں کیا کروں؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اپنے رب سے کیے ہوئے وعدے پر قائم ہو جا، اب بھی وقت ہے۔"
سردار اتنا بے قابو ہو چکا تھا کہ آپ کے قدموں میں گر گیا، بولا۔ "نوجوان! تم مجھے معاف کر دو۔"
آپ نے اس کو اٹھا کر اپنے روبرو کھڑا کر لیا، فرمایا۔ "معافی مجھ سے نہیں اپنے رب سے مانگ جس سے عہد شکنی کا تو مرتکب ہو چکا ہے۔"
سردار سجدے میں گر گیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ "اے میرے رب! میں عاجز اور گناہ گار انسان کس زبان سے معافی مانگوں۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں ایسا کوئی بھی کام نہیں کروں گا جس سے روزِ قیامت مجھے شرمندگی اٹھانا پڑے۔ میری پچھلی کوتاہیوں اور زیادتیوں کو معاف فرما۔"
کچھ دیر بعد سردار نے اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا کہ اب وہ راہزنی سے توبہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی یہی کرنا چاہیے۔
اس نوجوان نے پورے گروہ کو متاثر کر لیا تھا۔ ہر شخص نے توبہ کی اور سردار کی تقلید میں سجدے میں گر کر معافیاں مانگتا رہا۔
سردار نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "تم لوگ قافلے میں واپس جاؤ اور وہاں میری طرف سے اعلان کر دو کہ ہر شخص مجھ سے اپنا سامان واپس لے جائے۔"
اس اعلان نے قافلے کو حیرت زدہ کر دیا۔ کسی کو بھی اس اعلان کی صداقت پر یقین نہیں تھا۔ کسی شخص نے کہا۔ یقیناً اس اعلان میں بھی کوئی نہ کوئی چال ہوگی لیکن آپ نے جب یہ اعلان کر دیا کہ سردار سچ بول رہا ہے، اپنا اپنا سامان اس سے واپس لے لو، تو قافلہ ٹوٹ پڑا۔ جو لوگ مارے جا چکے تھے، ان کا سامان ایسے لوگوں کو دے دیا گیا جن سے مرنے والوں کی کسی قسم کی رشتے داری تھی۔
آپ ڈاکوؤں کو وہیں چھوڑ کر بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

جب آپ بغداد میں داخل ہوئے تو بارش ہو رہی تھی، آپ حضرت حماد کی درس گاہ کے در پر پہنچے اور مارے شرم کے بلند آواز میں نہ کہہ سکے کہ لوگو! دروازہ کھولو، ایک پردیسی طالب علم آیا ہے۔
شاید آپ کی آواز اندر نہیں پہنچی کیونکہ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ آپ خانقاہ کے در پر ہی پڑ رہے۔ یہ خانقاہ بھی تھی اور درگاہ بھی۔ آپ رات بھر خانقاہ کے در پر پڑے رہے۔ صبح جب خانقاہ کا در کھلا تو آپ بھی اندر داخل ہوئے۔ اندر حضرت حماد اپنے شاگردوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے۔ حضرت حماد نہایت عالم و فاضل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ حماد نے انہیں دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ جب یہ ان کے پاس گئے تو انہوں نے مصافحہ کیا اور فرمایا۔ "اے عبدالقادر! علم و عرفان کی دولت آج ہمارے پاس ہے تو کل تمہارے پاس ہوگی، تمہاری ملکیت ہوگی اور تمام دنیا کے دل تیری

ذات سے سرسبز و شاداب ہوں گے۔''

آپ نے اپنے استاد کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور وہیں رہنے لگے۔

آپ کو اب یہ دشواری پیش آئی کہ آپ جو کچھ جیلان سے لے کر چلے تھے، وہ ختم ہو چکا تھا۔ کھانے کا سامان کہاں سے خریدتے۔ وہ کسی کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلانا چاہتے تھے۔ آپ دریائے دجلہ کے ساحل پر چلے جاتے اور وہاں دور تک ایسے درختوں اور پودوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے جنہیں کھا کر وہ اپنی بھوک مٹا سکتے۔

بھوک کے عالم میں یہ ایک دن بغداد کے مشہور بازار سوق الریحانین میں پہنچ گئے۔ اس بازار میں ایک شاندار مسجد تھی۔ آپ اس مسجد میں داخل ہو گئے۔ بھوک نے آپ کو بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ آپ اپنے آپ کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کرتے رہے مگر بھوک کی شدت نے آپ کو بے بس کر دیا تھا۔

اسی وقت ایک فارسی نوجوان مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئی پوٹلی کھولی تو اس میں سے چند نان اور بھنا ہوا گوشت سامنے آ گیا۔ اب تو صبر کا یارا بھی نہ رہا۔ اس نوجوان نے کھانے کو فرش پر رکھا اور ہاتھ دھونے چلا گیا۔ پھر واپس آ کر وہ کھانا کھانے لگا۔ آپ کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ ہر نوالے کے ساتھ آپ کا منہ کھلتا اور بند ہو جاتا۔

نوجوان کو اچانک ان کی موجودگی کا احساس ہوا اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب! آپ بھی شریک ہو جائیں۔''

آپ نے انکار کر دیا، فرمایا۔ ''بس جناب بسم اللہ...... آپ ہی کھائیں۔''

فارسی نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ''آپ کو خدا کی قسم میرے ساتھ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی کھانا پڑے گا۔''

آپ کے نفس نے آپ کو مجبور کر دیا اور اس کے ساتھ کھانے لگے۔ فارسی نوجوان نے پوچھا۔ ''جناب! آپ کون ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ایک طالبِ علم۔''

فارسی نوجوان نے پوچھا۔ ''آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں جیلان کا رہنے والا ہوں۔''

فارسی نوجوان بہت خوش ہوا، بولا۔ ''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ بغداد میں مقیم اپنے ہم وطن سے تو خوب واقف ہوں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''شاید نہیں کیونکہ میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں اور لوگوں سے کم ہی ملتا ہوں۔''

فارسی نوجوان نے کہا۔ ''افسوس کہ میں جیلان کے رہنے والے عبدالقادر نامی نوجوان کی تلاش میں ہوں۔ کئی دنوں سے اسے تلاش کر رہا ہوں مگر وہ نہیں مل رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''جس کی آپ کو تلاش ہے، یہ وہی خاکسار ہے۔ فرمائیں مجھ سے آپ کو کیا کام ہے؟''

فارسی نوجوان بے چین ہو گیا، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، بولا۔ ''بھائی! میں تمہیں کئی دنوں سے تلاش کر رہا ہوں۔ جب میں بغداد میں داخل ہوا تھا تو اس وقت میرے پاس اپنا ذاتی جیب خرچ بھی تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ خرچ ہوتا رہا اور جب وہ ختم ہو گیا تو میں پریشان رہنے لگا۔ میں تین دن تک بحالتِ فاقہ تمہیں تلاش کرتا رہا۔ آج جب بھوک نے بہت زیادہ پریشان کیا اور یارائے صبر نہ رہا تو میں نے آج تمہاری امانت میں سے ایک وقت کا کھانا خرید لیا۔ اب آپ بخوبی کھاتے رہیے کیونکہ یہ آپ ہی کا کھانا ہے اور میں آپ کا مہمان ہوں حالانکہ بظاہر تھوڑی دیر پہلے آپ میرے مہمان تھے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں...... یہ کیا معاملہ ہے؟''

فارسی نوجوان نے جواب دیا۔ ''جناب! آپ کی والدہ نے آپ کو آٹھ دینار بھیجے تھے، یہ کھانا اسی میں سے خریدا تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں، تین فاقوں کے بعد تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔''

آپ نے خندہ پیشانی سے فرمایا۔ ''یہ خیانت نہیں ہے۔''

کھانا کھا چکنے کے بعد آپ نے بقیہ دینار بھی اس فارسی نوجوان کو دے دیے تاکہ وہ ذہنی اذیت سے بچ جائے۔

آپ جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہ اپنے وقت کے امام تھے۔ ان میں ابوسعید بارک مخزومی اور ابوالخیر

حماد کا تو کوئی جواب ہی نہ تھا۔ یہ دونوں حضرات صاحب حال بھی تھے۔ ابوسعید مبارک مخزومی وہ ذات تھی جس کے دستِ حق پرست پر آپ نے بیعت کی اور انہی سے خرقہ خلافت بھی پایا۔

اس دوران آپ کو یہ احساس ستانے لگا کہ بغداد میں فتنہ وفساد بہت زیادہ ہے، اس لیے اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اس احساس نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ آپ نے قرآن پاک سنبھالا اور بغداد کے محلہ حلبہ کے دروازے کی طرف چل دیے۔

راستے میں کسی نے انہیں آواز دی۔ ''عبدالقادر کہاں ...... یہ کہاں چل دیے؟''

انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ پھر چل دیے۔ اس بار کسی نے زوردار دھکا دیا، یہ گر گئے لیکن دھکا دینے والا کہیں نظر نہیں آیا۔ آپ کچھ دیر ساکت وصامت کھڑے ادھر ادھر دیکھتے رہے اور جب کوئی بھی نظر نہیں آیا تو آپ پھر چل دیے۔

پیچھے سے پھر کسی نے آواز دی۔ ''عبدالقادر! لوٹ جاؤ۔ خلق کو تمہاری ذات سے فائدے پہنچیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''خلق کا مجھ پر کیا حق ہے؟ میں اپنے دین کی حفاظت کی خاطر بغداد چھوڑ رہا ہوں۔''

جواب ملا۔ ''نہیں، تم یہیں رہو، تمہارا دین سلامت رہے گا۔''

آپ خود کو بے بس محسوس کررہے تھے، آپ نے خدا سے دعا کی۔ ''اے اللہ العالمین! مجھے کسی ایسے آدمی سے ملادے جو مجھے اس تذبذب اور کشمکش سے نکال دے۔ میرے لیے کیا ٹھیک ہے؟ بغداد میں قیام یا ترکِ بغداد؟ میں اپنی اس الجھن کا حل چاہتا ہوں۔''

انہوں نے ایک رات محلہ حلبہ کے دروازے ہی پر گزار دی۔ علی الصباح کسی نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ ''کیوں عبدالقادر! تم نے اپنے اللہ سے کس بات کی خواہش کی تھی؟''

آپ خاموش رہے کیونکہ کچھ یاد نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے کس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

اس شخص نے دروازے کو بڑے زور سے بند کردیا۔ دروازے کی گرد اڑ کر ان کے چہرے پر آگئی۔ اسی وقت انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اللہ سے کیا خواہش کی تھی۔ انہوں نے دروازے کے دوسری طرف ان صاحب کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے پھر معلوم نہیں کس طرح یہ شبیہ ان کے دل ودماغ پر ابھرنے لگی۔ یہ بزرگ ابوالخیر حماد تھے، ان کے استاد...... آپ ان کی خدمت میں پہنچے اور انہیں ایسا لگا گویا سکون مل گیا ہو۔

ان دنوں آپ دوسرے اساتذہ سے پڑھ رہے تھے۔ جب پڑھائی سے فرصت ملتی، یہ حضرت حماد کے پاس چلے جاتے۔

حماد نے ایک دن پوچھا۔ ''کیوں عبدالقادر! تم میرے پاس کیوں آتے ہو؟''

اس وقت حماد کے پاس ان کے شاگردوں اور ارادت مندوں کا ہجوم تھا۔ آپ نے پوچھا۔ ''میں آپ کے پاس کیوں نہ آؤں؟''

حماد نے جواب دیا۔ ''تم فقیہہ ہو، فقہا میں جاؤ۔ یہاں میرے پاس تمہارا کیا کام؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔''

حماد نے انہیں مارا اور حکم دیا۔ ''لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم میرے پاس آؤ جاؤ۔ تم اسی وقت چلے جاؤ یہاں سے، میں تمہیں دھکے دے کر نکلوادوں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''آپ جو چاہیں کریں لیکن میں آنا جانا ترک نہیں کروں گا۔''

حماد نے حکم دیا۔ ''تب پھر تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں چلا جاؤں گا لیکن ابھی اسی وقت نہیں جاؤں گا۔'' اس کے بعد آپ حماد کی صحبت میں کچھ دیر اور بیٹھے اور پھر اپنے گھر چلے گئے۔

کئی دن بعد جب آپ دوبارہ حضرت حماد کے پاس گئے تو انہوں نے کہا۔ ''عبدالقادر! آج تو غضب ہی ہوگیا۔ میرے پاس اتنا کھانا آیا تھا کہ محلے والوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچا سکتا تھا لیکن میں نے وہ سب کھالیا۔ تمہارا خیال بھی آیا تھا مگر میں نے سوچا کہ مجھ کو تمہارے حصے کا کھانا نہیں رکھنا چاہیے۔''

حماد کے ارادت مندوں نے جو یہ دیکھا کہ ان کے پیرومرشد عبدالقادر کو جھڑک سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سب بھی

عبدالقادر کی خبر لے کر اپنے استاد کو خوش کر دیں۔ ایک دن آپ جو حماد کی خدمت میں پہنچے تو چند ارادت مندوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان لوگوں نے کہا۔ ”عبدالقادر! تم تو فقیہہ ہو، تم یہاں کیا لینے آتے ہو؟ تمہارا یہاں کیا کام؟“

حضرت حماد کو غصہ چڑھا اور کہا۔ ”نامعقولو! یہ کیا ہے؟ اس شریف انسان کو کیوں تکلیفیں پہنچاتے ہو۔ تم میں تو ایک بھی اس جیسی حمیت اور غیرت کا مالک نہیں ہے۔ اگر میں اس نوجوان کو تکلیف دیتا ہوں تو صرف امتحان کے لیے مگر میں دیکھتا ہوں کہ عبدالقادر نہایت مستقل مزاج شخص ہے پہاڑ کی طرح، جو کسی بھی طرح جنبش نہیں کر سکتا۔“

☆☆☆

اس عہد کے مشہور صوفی شیخ ابوالوفا اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے ہم سخن تھے۔ اسی دوران ان کی خدمت میں آپ بھی پہنچ گئے۔ شیخ ابوالوفا باتیں کرتے کرتے ایک دم چپ ہو گئے اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔

”میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ اس شخص کو ہماری مجلس سے نکال باہر کرو۔“

مریدوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور انہیں پکڑ کر مجلس سے نکال باہر کیا۔

شیخ ابوالوفا دوبارہ حاضرین مجلس سے مخاطب ہو گئے۔

کچھ دیر بعد آپ دوبارہ اس مجلس میں پہنچ گئے۔ شیخ ابوالوفا پھر خاموش ہو گئے اور آپ کو مخاطب کیا۔ ”عبدالقادر! جب میں نے تمہیں اس مجلس سے نکلوا دیا تھا تو دوبارہ پھر بغیر بلائے کیوں آ گئے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس مجلس میں خاص و عام کی کوئی تخصیص نہیں، جو چاہے آ سکتا ہے پھر مجھ پر یہ پابندی کیوں؟“

شیخ ابوالوفا نے غصے میں حکم دیا۔ ”اس کو زبردستی نکال باہر کرو اور اس کو اتنی دور پھینک آؤ کہ یہ پھر نہ آ سکے۔“

مریدوں نے آپ کو اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور بہت دور پھینک آئے۔

شیخ ابوالوفا دوبارہ حاضرین مجلس سے مخاطب ہو گئے۔ وہ فرما رہے تھے۔ ”اللہ کے ہاں طلب کو بہت اہمیت حاصل ہے، وہاں تکبر اور انا نہیں چلتی، وہ دلوں کا حال جاننے والا سمیع و بصیر ہے۔“

ابھی شیخ ابوالوفا کی تقریر ختم نہیں ہوئی تھی کہ آپ تیسری بار اس مجلس میں پہنچ گئے۔

اس بار شیخ ابوالوفا نے انہیں آتے جو دیکھا تو اپنے تخت سے اتر پڑے اور چند قدم آگے بڑھ کر ان سے معانقہ کیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور حاضرین سے فرمایا۔ ”اے اہالیان بغداد! تمہارے سامنے ولی اللہ موجود ہے، اٹھو اور ان کی تعظیم بجا لاؤ۔“

حاضرین مجلس نے پوچھا۔ ”حضرت! ابھی تو آپ نے دوبار ان کی اہانت کر کے مجلس سے نکلوا دیا تھا اور اب آپ انہیں ولی اللہ کہہ رہے ہیں، آخر ایسا کیوں؟“

شیخ ابوالوفا نے جواب دیا۔ ”میں نے انہیں اہانت کی غرض سے اپنی مجلس سے نہیں نکالا تھا بلکہ اس طرح ان کا امتحان مقصود تھا اور تم سب کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس ذات کو خوب اچھی طرح پہچان لو۔“

اس کے بعد آپ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”عبدالقادر! میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا، اس کو بھلا دیجیے۔ آج وقت ہمارے ساتھ ہے اور عنقریب یہ وقت آپ کے ہاتھ آنے والا ہے۔ دنیا کے تمام چراغ روشن ہو کر بجھ جاتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ آپ کا چراغ قیامت تک روشن رہے گا۔“

شیخ ابوالوفا نے اپنی جائے نماز، تسبیح، قمیص، پیالا اور اپنا عصا ان کے حوالے کر دیا اور خود دوبارہ اپنے تخت پر جا بیٹھے اور حاضرین سے خطاب فرماتے رہے۔

خطابت سے فارغ ہو کر آپ نیچے آئے اور مجلس ختم کر کے آپ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا ہاتھ تھام لیا اور پھر اخیر سیڑھی پر بیٹھ کر لوگوں کے سامنے فرمایا۔ ”عبدالقادر! تمہارا ابھی عظیم الشان وقت ہوگا۔ جب ایسا ہو جائے تو خدا کے لیے میری سفید ڈاڑھی کا خیال ضرور رکھنا۔“

اس کے بعد آپ کا جسم تھرتھرایا اور شیخ ابوالوفا آہستہ آہستہ زمین پر گر گئے۔ ہر طرف تہلکہ مچ گیا اور شیخ کی روح جسد خاکی کو چھوڑ کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملی۔ لوگوں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ آپ نے انہیں رونے دھونے سے روک دیا اور فرمایا کہ اللہ کو اس طرح رونا دھونا بالکل پسند نہیں اور پھر شیخ ابوالوفا اگر ہمارے ساتھ رہ رہے ہوتے اور ان کے سامنے یہ واقعہ پیش آتا تو کیا تم سب اسی طرح ان کے سامنے بھی رو دھو سکتے؟ اس کے بعد خود ہی جواب دیا۔ کہا ”اگر شیخ آج اس دنیا میں ہم سب کے درمیان موجود ہوتے تو وہ اپنا فیصلہ حاضرین کو اسی وقت سنا دیتے اور رونے دھونے سے تم سب کو جبراً روک

دیتے۔ اب آئی سمجھ میں ہماری بات؟''
ہجوم نے جواب دیا۔ ''ہاں پیرومرشد! غور کرنے کی ہر بات ذہن نشین کرلی ہے آپ مطمئن رہیں۔''
یادِ الٰہی کی لذت نے انہیں دنیا سے بیگانہ کردیا تھا۔ آپ بغداد کے قریب ایک قدیم ویرانے میں چلے جاتے۔ یہاں ایک برج بنا ہوا تھا۔ آپ اس برج میں عبادت وریاضت کیا کرتے تھے۔ بغداد والے یہ دیکھتے تو ہنستے۔ انہوں نے اس برج کا نام برجِ عجمی رکھ دیا تھا۔
آپ نے اس برج میں تقریباً گیارہ سال عبادت کی۔ ایک دن معلوم نہیں کیوں، آپ نے اپنے دل میں یہ عہد کرلیا کہ میں اس وقت تک بھوکا رہوں گا جب تک کہ کوئی اللہ کا بندہ اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھلائے گا۔
اس عہد کو کئی دن گزر گئے مگر کوئی شخص بھی ایسا نہیں آیا جو انہیں اپنے ہاتھ سے کچھ کھلاتا پلاتا۔
ایک دن ایک پہر دن چڑھے ایک صاحب آپ کے حجرے میں آئے۔ ان کے ساتھ انواع واقسام کے کھانوں سے لدا دسترخوان تھا۔ آنے والے نے کھانا اور پانی رکھ دیا اور خود کہیں چلا گیا۔ آپ کا بھوک سے بہت برا حال تھا۔ نفس نے آپ کو مشورہ دیا کہ عہد تو تمہارا پورا ہوچکا ہے، اب اسے توڑ دو لیکن آپ کا ضمیر بیدار تھا۔ اس نے آپ کو منع کیا۔ ''خبردار عبدالقادر! ایسا نہ کرنا۔ تم نے جو عہد کیا ہے، اس پر ڈٹے رہو۔''
انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کھانے کا ارادہ ترک کردیا اور بہت گڑگڑا کر بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا۔ ''بارالٰہا! میں کمزور اور ناتواں انسان۔ بھلا میں اپنے عہد کو کیسے نبھا سکتا ہوں۔ مجھے اپنے عہد کو نباہنے کی توفیق عطا فرما۔''
ابھی یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے انہیں مخاطب کیا۔ ''عبدالقادر! آؤ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔''
لیکن ان کے ساتھ ایک دشواری تھی، کیا اس طرح وہ اپنے عہد پر قائم رہ سکیں گے؟ کیا ان کے عہد میں جگہ کی پابندی بھی ہے؟ اس مسئلے کو ایک عجیب وغریب ذات نے حل کردیا۔ ایک اور شخص عجمی برج میں آیا اور اس نے عبدالقادر کے کان میں کہا۔ ''اٹھیے! اور ابوسعید مخزومی کے ساتھ ان کے گھر تشریف لے جائیں۔''
آپ نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''
جواب ملا۔ ''میں...... میں وہ ہوں جو بندگانِ خاص کی راہنمائی کرتا ہے، خضر!''
آپ اٹھے اور ابوسعید مخزومی کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔ وہاں شیخ ابوسعید مخزومی نے انہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور پانی پلایا، فرمایا۔ ''عبدالقادر! اللہ نے تیری خواہش کو پورا کرنے کے لیے مجھے بھیج دیا تھا۔''
انہوں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔
وہ ظاہری وباطنی علوم اور مجاہدات وریاضات میں کمال حاصل کرچکے تھے۔ یہ شوال کی سولہ تاریخ اور 521 ہجری تھی۔ شمسی حساب سے 1127ء اور دن منگل کا تھا۔ دوپہر کے وقت آپ کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول مقبول ﷺ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ ''عبدالقادر! تم لوگوں کو فسق وفجور اور گمراہی سے بچانے کے لیے وعظ ونصیحت کیوں نہیں کرتے؟''
آپ نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''یارسول اللہ ﷺ! میں عجمی ہوں اور شاید عرب فصحا...... میرے کلام پر توجہ نہیں دیں گے۔''
حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''عبدالقادر! اپنا منہ کھول۔''
آپ نے اپنا منہ کھول دیا۔ حضور ﷺ نے اپنا لعاب دہن سات بار آپ کے منہ میں ڈالا اور فرمایا۔ ''عبدالقادر! اب جا اور مسلمانوں کو وعظ ونصیحت کر اور انہیں پروردگارِ عالم کے راستے پر لا تاکہ یہ قرآن وحدیث کی راہ اختیار کرسکیں۔''
بیداری کے بعد آپ نے وقت ضائع کیے بغیر فوراً ہی نمازِ ظہر ادا کی اور منبر پر بیٹھ کر وعظ فرمانے لگے۔ جو وہاں موجود تھے ان کا وعظ چھوڑ کر ہلنا اور ادھر ادھر جانا محال ہوگیا۔ آپ کی آواز کڑک دار تھی اور دور دور تک سنی جاسکتی تھی۔ جس نے بھی یہ آواز سنی، آپ کے قریب ہوگیا اور نہایت توجہ اور انہماک سے آپ کا وعظ سننے لگا۔ ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور انہیں اپنے دلوں میں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے عبدالقادر جیسا فصیح وبلیغ شخص نہیں دیکھا۔ آواز میں کڑک، سوز اور لفظوں میں سحر ہے۔
وعظ کے ختم ہونے کے بعد کچھ دیر تک سامعین مسحور سے اپنی جگہ پر بےحس وحرکت بیٹھے رہ گئے لیکن جب انہیں ہوش

آیا تو وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ عام تاثر یہ تھا کہ اس عجمی نے تو کمال ہی کر دیا۔ یہ انسان ہے یا کوئی ملکوتی مخلوق، اس کی آواز میں جادو ہے اور جملوں میں مٹھاس کی چمک، آخر یہ شخص ابھی تک کہاں تھا؟

کسی نے کہا۔ ''شاید اس شخص سے بڑا مقرر اور واعظ پورے بغداد میں نہیں ملے گا۔''

ایک اور شخص نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''تم بغداد کی بات کر رہے ہو، میں یہ کہتا ہوں کہ پورے عرب میں اس جیسا فصیح و بلیغ شخص نہیں ملے گا۔''

آپ نے ہجوم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اے طلب گار، توبہ کر باسم اللہ، اخلاص حاصل کر باسم اللہ، معافی مانگ باسم اللہ، خدا تک رسائی کی کوشش کر۔ ایک ہفتے میں اس تک پہنچ جا۔ یہ مشکل ہو تو ایک ماہ میں جا۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا تو ایک سال میں جا۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو ساری عمر میں ایک دفعہ جا۔ کیونکہ سب کچھ اس کے پاس ہے۔''

آپ کے وعظ کی ایسی دھوم مچی کہ ہجوم میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہونے لگا، یہاں تک کہ نوبت ستر ہزار تک پہنچ گئی۔ جس جگہ آپ وعظ فرماتے تھے، وہ جگہ ناکافی ثابت ہوئی تو ہجوم نے آپ کی کرسی کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر شہر کے باہر ایک وسیع میدان میں پہنچا دیا۔ اس ہجوم میں چار سو ملفوظ نویس موجود تھے۔ یہ آپ کے وعظ کو قلمبند کرنے پر مامور تھے۔ آپ نے تقریر شروع کی تو لوگوں کا برا حال ہو گیا۔ غش آنے لگے اور انہوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے اور اکثر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ کی تقریر کے اثر سے سیکڑوں یہودی اور عیسائی مسلمان ہو گئے۔

لوگوں میں سے کسی نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ کیسا وعظ ہے کہ لوگ دیوانے ہوتے جا رہے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے واعظوں جیسا نہیں ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بات کہتا ہوں اور باطن کی قوتیں میرے ساتھ ہوتی ہیں۔''

ایک عرصے بعد آپ کے صاحبزادے ابوعبداللہ عبدالوہاب کئی ملکوں کی سیاحت اور تحصیل علوم و فنون کے بعد گھر واپس آئے تو آپ سے اجازت طلب کی کہ میں وعظ کہنا چاہتا ہوں، اپنے منبر پر بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔

آپ نے فرمایا۔ ''اجازت ہے۔''

صاحبزادے عبدالوہاب اپنے والد کے منبر پر گئے اور وعظ شروع کر دیا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے اور موثر طرزِ نصائح کا کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اس محفلِ وعظ میں خود آپ بھی موجود تھے۔ ادھر وعظ جاری تھا۔ دوسری طرف ہجوم باتوں میں مشغول تھا۔ اس رنگ نے عبدالوہاب کو دل برداشتہ کر دیا۔ آپ اپنی جگہ سے اٹھ کر منبر پر تشریف لے گئے اور اپنے بیٹے سے کہا۔ ''بہت باتیں کر چکے، اب تم ہٹو، میں وعظ کہوں گا۔''

آپ نے منبر پر بیٹھتے ہوئے فرمایا۔ ''کل میں روزے سے تھا۔ ام یحییٰ نے کچھ انڈے بھون کر ایک کورے سکورے میں طاق پر رکھ دیے تھے۔ ایک بلی نے اس سکورے کو طاق سے نیچے پھینک دیا۔ سکورہ ٹوٹ گیا اور انڈے خاک میں مل گئے۔ میں کہ میری تلوار مشہور ہے، میری کمان کھنچی ہوئی ہے، میرا تیر سینہ شگاف ہے۔ میرا نیزہ نشانہ باز ہے۔ میں محفوظ ہوں، میں ہی محفوظ ہوں۔ روزے دارو آؤ۔ پہاڑوں کے عبادت گزارو آؤ۔ خانقاہ نشینو آؤ۔ خدا کے کلام کے لیے میرے پاس آؤ کہ میں اسی کے امر سے تم کو بلاتا ہوں۔''

مجلس سے ہوحق کے نعرے بلند ہونے لگے اور آن کی آن میں محفل گرم ہو گئی۔

عبدالوہاب نے پوچھا۔ ''باوا جان! کیا بات ہے، میرے وعظ کا ان پر اثر کیوں نہ ہوا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''صاحبزادے! اس میں غور کی بات یہ ہے کہ تمہارے عالمانہ اور عاقلانہ وعظ کا اثر کیوں نہ ہوا اور میرے معمولی الفاظ نے یہ ہنگامہ کیوں برپا کر دیا۔ صاحبزادے سنو! تم کو اپنے ظاہری سفر پر ناز ہے مگر افسوس کہ تو نے عالمِ باطن کا سفر نہیں کیا۔ میں جب کلام کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی تجلیاں اثر لے کر نمودار ہو جاتی ہیں کیونکہ میری نظر حقیقت پر رہتی ہے۔ میں خود کو گم کر کے کلام کرتا ہوں اور تم خودی میں قائم ہو کر بولتے ہو۔''

صاحبزادے عبدالوہاب نے آہستہ سے فرمایا۔ ''آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ ظاہر میں انڈے، سکورے اور بلی کا بیان تھا۔ ظرفِ گل اور انڈے کی شکست و خرابی کا بیان مگر حقیقت میں وجود، نفس اور شیطان کے اشارات تھے۔ سمجھنے والے سمجھ گئے اور اثر ڈالنے والے نے ''ہی'' اثر بھر دیا۔''

☆☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا۔ دور دور تک آپ کا چرچا، مقبولیت اور شہرت ہو چکی تھی۔ آپ نے حج پر جانے کا ارادہ کیا تو آپ کے پرستاروں نے آپ کو اپنے درمیان لے لیا۔ آپ سفر فرما رہے تھے۔ دورانِ سفر آپ کو ایک جگہ قیام کرنا پڑا۔ اس وقت تک قرب و جوار کے دولت مندوں اور مشائخ کو آپ کی تشریف آوری کا کوئی علم نہیں تھا۔ آپ نے اس بستی میں اترتے ہی دریافت فرمایا۔ ''اس بستی میں غریب ترین شخص کون ہے؟''

بستی کے ایک شخص نے کہا۔ ''اگر آپ میرے ساتھ چلنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو میں آپ کو بستی کے ایک ایسے گھر تک پہنچا سکتا ہوں جو ناداری، افلاس اور غریبی میں کم ترین ہے۔ دونوں میاں بیوی بوڑھے ہو چکے ہیں اور گھر میں ان کا ایک ہی بچہ ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مجھ کو ان کے پاس لے چلو۔''

وہ شخص آپ کو ان دونوں کے پاس لے گیا۔ آپ نے دروازے پر کھڑے ہو کر دریافت فرمایا۔ ''اے اس مکان میں رہنے والو! میں تمہارا مہمان بننا چاہتا ہوں۔''

اندر سے بوڑھا نمودار ہوا اور پوچھا۔ ''حضرت! آپ کی تعریف؟''

آپ کے ساتھیوں نے جواب دیا۔ ''اے شخص! یہ شیخ عبدالقادر جیلانی ہیں، ان کو کون نہیں جانتا۔''

بوڑھا آپ کا نام سن کر سہم گیا، ادب سے کہا۔ ''بسر و چشم مکان حاضر ہے لیکن میں انتہائی نادار و مفلس ہوں اور اس لائق نہیں ہوں کہ آپ کی خدمت کر سکوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو اس کی فکر نہ کر، بس ہمیں اپنا مہمان بنا لے۔''

بوڑھے نے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ آپ اس کے مہمان ہو گئے۔ آپ کے قیام کی خبر وہاں کے مشائخ اور دولت مندوں کو ہو گئی۔ یہ سب بھاگم بھاگ آپ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ ''حضرت! جب ہم لوگ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں تو اس نادار اور مفلس شخص کے گھر میں قیام کی کیا ضرورت تھی؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کر رہا ہوں۔ آپ ﷺ کو اپنے فقر پر فخر تھا، مجھے غریب پسند ہیں۔''

ان لوگوں نے درخواست کی۔ ''حضرت! پھر ہم آپ کی کس طرح خدمت کریں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہو، یہیں اس شخص کے گھر میں کرو۔''

ان لوگوں نے ازراہِ عقیدت غلہ، بکریاں، بھیڑیں اور سونا چاندی سب کچھ اس بوڑھے کے گھر میں لا کر ڈھیر کر دیا۔ آپ کے ارادت مند اور پرستار اتنا بہت سارا سامان دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بعض نے کہا۔ ''حضرت! اتنا بہت سا سامان۔ اب اس بوڑھے کا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''کچھ بھلا ہو جائے گا کیا مطلب؟ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ جو کچھ ہے، اس گھر کے مالک کا ہے۔ میں یا میرے ساتھی اس میں سے کچھ بھی نہیں لیں گے۔''

آپ نے گھر کے مالک سے کہا۔ ''بھائی! یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، سب تمہارا ہے۔ میں کل صبح ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

بوڑھے نے درخواست کی۔ ''حضرت! دو چار دن تو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے اس عاجز کو بھی سرفراز فرمائیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں اس بستی میں جس مقصد سے ٹھہرا تھا، وہ پورا ہو چکا۔''

آپ وہاں مزید نہیں ٹھہرے اور آگے روانہ ہو گئے۔

(جاری ہے)

اقتباسات

اخبار الاخیار، عبدالحق محدث دہلوی۔ حیاتِ جاودانی، عفیف الدین حسین۔ حدیقۃ الاولیاء، مفتی غلام سرور لاہوری۔ مشائخ قادریہ، محمد دین کلیم قادری۔ انوار الاولیاء، رئیس احمد جعفری

"میں ویت نام کی جنگ سے بھاگا نہیں تھا۔ آخر تک لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ جنگ ختم ہوگئی۔ ویت کانگ فوجیوں نے ہمیں گھیر لیا اور گرفتار کرلیا۔ کاش اسی وقت مجھے گولی مار دیتے، جان لے لیتے۔ کسی بھی طریقے سے، بغیر مقدمہ چلائے ہوئے یا مقدمہ چلاکر۔ گولی مارنا کیا مشکل ہوتا ہے۔ کتنوں ہی کو مارا ہوگا انہوں نے، جیسے ہم نے مارا تھا فوجیوں کو، نہتے شہریوں کو، عورتوں اور بچوں کو مگر میں بچ گیا۔ نہیں مارا ان لوگوں نے۔"

ڈونگ ڈیانگ فونگ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

جنگ چاہے ہتھیاروں کی ہو یا احساسات کی، انسان کو اندر سے مار دیتی ہے یا پھر حیوان بنا دیتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار ہوا تھا جس نے پہلے اسے انسان سے حیوان بننے پر مجبور کیا اور پھر اس کے اندر کی دنیا کو ہی برباد کرڈالا کیونکہ احساسات کے نیزے روح تک کو چھلنی کردیتے ہیں۔

ضمیر کے کٹہرے میں کھڑے ایک اذیت پسند فوجی کا ماجرا



یہ کہہ کر بڈ ہارٹی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کا سارا درد آہستہ آہستہ ڈھیرے ڈھیرے آنسوؤں کی طرح بہہ رہا ہے۔

وہ میرا مستقل مریض تھا۔ گزشتہ دو سال سے وہ میرے پاس آرہا تھا۔ آج وہ پھر آیا تھا، اپنے طے شدہ وقت پر۔ اسے میں ہمیشہ آخر میں دیکھتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اسے وقت دینا ہوگا۔ وہ مستقل طور پر ٹینشن اور گھبراہٹ کا شکار رہتا تھا۔

''ویت نام کی جنگ کے خاتمے کے بعد میں ٹھیک تھا ڈاکٹر، بالکل ٹھیک۔ جنگ ختم ہوئی تو میں ہیرو کی طرح واپس آیا۔ فوج سے اتنے پیسے ملے کہ میں نے دوبارہ کالج کی پڑھائی شروع کردی۔ ڈگری لینے کے بعد میں نے ایڈمنسٹریشن کا کورس کرکے نیویارک میں بڑی اچھی جگہ پر کام شروع کردیا تھا۔'' آج اس نے اپنے بارے میں اس طرح بتانا شروع کیا تھا۔

''لیکن تم نے مجھے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ تم ویت نام کی جنگ لڑکر آئے ہو؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ضرورت نہیں سمجھی تھی میں نے۔ پھر ڈپریشن کا جنگ سے کیا تعلق ہے۔ تم نے جو دوائیں دی تھیں میں اس سے صحیح ہوگیا تھا، بالکل ٹھیک ٹھاک۔'' وہ صحیح نہیں ہوا تھا بلکہ وہ آہستہ آہستہ خرابی کی ہی طرف بڑھتا جارہا تھا۔ دواؤں کی تعداد اور مقدار بڑھتی چلی گئی۔ اس کی طبیعت میں سدھار نہیں آیا۔ پھر بڈ ہارٹی نے نوکری چھوڑ دی تھی۔

ویت نام کی جنگ سے واپس آئے ہوئے بہت سارے فوجی میرے مریض تھے، عام سپاہی سے لے کر بڑے افسر تک۔ بہت سے فوجی جو وہاں گئے، لڑے اور مرگئے، ان کے خاندانوں کی کہانی اور ہے لیکن جو لڑے، زخمی ہوئے، قید ہوئے، رہا ہوئے اور واپس آگئے ان میں سے کئی امریکی زندگی میں پھر کبھی اس طرح سے شامل نہیں ہوسکے جیسے پہلے تھے۔ ان کی زندگی شاید کہیں تھم سی گئی تھی بلکہ ایک خاص محور پر رک گئی تھی۔ وہ اس دوڑ سے نکل گئے تھے جو ایک عام امریکی کی دوڑ ہے۔

بڈ ہارٹی الاباما کا رہنے والا تھا۔ متوسط طبقے کے خاندان کا اور بہت سارے امریکیوں جیسا عام امریکی۔ اس زمانے میں ہر ایک کو فوجی خدمات کے لیے جانا پڑ رہا تھا۔ صرف وہی لوگ بچ سکے تھے جو صحت کی خرابی کی بنا پر فوجی خدمات کے قابل ہی نہیں تھے یا پھر اپنے تعلقات کی وجہ سے کسی ایسی فوجی ڈیوٹی پر چلے گئے تھے جس کے لیے امریکا چھوڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''جنگ انسان کو بدل دیتی ہے ڈاکٹر۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''اچھا خاصا آدمی جو انسانیت، محبت، برداشت کی طاقتوں سے مسلح ہوتا ہے، وہ ان سارے ہتھیاروں سے محروم ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں دوسرے ہتھیار آجاتے ہیں، مرنے مارنے والے۔ وہ انسان سے حیوان بن جاتا ہے۔ اس کی محبت کی جگہ نفرت لے لیتی ہے۔ اس کی نگاہیں صرف دشمن کو تلاش کرتی ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوتے ہیں اور وہ جنگ کے نام پر سب کچھ کرگزرنے کو تیار ہوتا ہے۔ قتل، تشدد، عورتوں کی پامالی، قوموں کی تذلیل، نہ جانے کیا کیا کچھ۔''

اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کے پپوٹے پھڑک رہے تھے اور آنکھوں کے دونوں کناروں سے آنسو چھلک رہے تھے اور چہرہ ایک بار پھر اداس ہوگیا تھا۔

''مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ، بالکل شروع سے۔ پہلے دن سے، کچھ چھپائے بغیر۔ یہ پریشانی شروع کب ہوئی، کیسے ہوئی، تب ہی میں تمہیں صحیح دوائیں لکھ سکوں گا۔ یہ ضروری ہے بڈ کہ مجھے سب پتا ہو۔'' میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ سب کچھ میری شادی والے دن شروع ہوا، ڈاکٹر۔ شادی والے دن۔ چار سال سے جینٹ میری گرل فرینڈ تھی۔ پھر ہم نے شادی کا فیصلہ کیا اور ہماری شادی بھی ہوگئی لیکن اس رات ڈنر کے بعد، شادی کی پہلی رات مجھے ایک اور شادی یاد آگئی پھر میرا کچھ نہیں رہا تھا۔ مجھے پتا نہیں ہے ایسا کیوں ہوا۔ میں اور جینٹ تین سال سے ساتھ رہ رہے تھے، بہت اچھے تعلقات تھے ہمارے۔ بہت خوش تھے ہم لوگ، پر اس دن، شادی کی پہلی رات ہوٹل کے اس ہنی مون سوئٹ میں سب کچھ بھسم ہوگیا جیسے وہ لوگ بھسم ہوگئے تھے، برسوں پہلے ویت نام میں۔ مجھے وہ سب کچھ یاد آگیا تھا، اس ویت نامی کو دیکھ کر جو اس ہوٹل میں بیرا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہی ویت نامی شکل صورت، چھوٹا قد، پتلے پتلے ہونٹ، ویسی ہی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور گول سا چہرہ، سینے کے بیج پر لکھا ہوا عام سا ویت نامی نام...... نگویان وان ترائے۔

''پھر کمرے میں جاتے جاتے میرے دماغ میں جیسے دھماکے ہوئے۔ دھماکوں کے ساتھ روشنیوں کے جھماکے تھے جنہوں نے میرے پورے وجود کو ہلا کے رکھ دیا پھر مجھے وہ ویت نامی دلہن یاد آرہی تھی جسے میں نے، نام

نے، جیک نے، جان نے، ول پٹ نے باری باری ریپ کیا تھا یہاں تک کہ وہ مرگئی تھی۔''

''کہاں ہوا تھا یہ سب کچھ اور کیسے؟ یہ تو فوجی ڈسپلن کے خلاف ہے۔'' میں نے سوال کیا۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' اس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔ ''مگر اس دن ہمیں ہماری انٹیلی جنس نے خبر دی تھی کہ اس گاؤں میں شادی کی تقریب ہے اور اس تقریب میں ویت نامی گوریلا لیڈر جمع ہوکر میٹنگ بھی کر رہے ہیں۔

''ویت نامیوں نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ نہ ان کے پاس ایٹم بم تھا، نہ ہی نیپام بم، نہ ہی کیمیائی گیس کے لیے وہ سب کچھ جو ہمارے پاس تھا اور نہ ہی وہ فائٹر بمبار تھے جو ہمارے پاس تھے۔ دبلے پتلے، فاقہ زدہ بھوکے چوہوں جیسے ویت نامیوں نے شیر جیسے امریکا کی کمر توڑ دی تھی اور گھٹنے ٹکوا دیے تھے۔

''جنگ کا عجیب طریقہ تھا ان کا۔ شہروں، گاؤں، دیہاتوں، قصبوں، کھیتوں، کھلیانوں، جنگل، ندی نالوں میں جہاں بھی ہم جاتے ہمارا نقصان ہوتا۔ کدو کے کھیت میں اور تربوزوں کے اندر بھی بم لگا یا ہوا تھا انہوں نے۔ اس صبح بھی ہمارے سات ساتھی مارے گئے تھے۔ شام کو ہم نے وہ پورا گاؤں جلا دیا تھا۔ ایک ایک آدمی قتل ہوگیا تھا۔ جو بچ گیا، وہ بھاگ گیا ہوگا۔ جو بھی لڑکیاں تھیں دلہن سمیت ہر ایک کو پامال کیا ہم لوگوں نے، ڈسپلن کے خلاف لیکن اسٹریٹجی کے ساتھ۔ یہی حکم تھا کہ دشمن کو دہشت زدہ کردو۔ اس دن ہم سب حیوان بن گئے پھر...... ہم حیوان ہی رہے جب تک ویت نام میں رہے۔

''اس شادی کی رات ویتنامی، مری ہوئی، پامال کی ہوئی دلہن میرے اور جینٹ کے درمیان آگئی پھر جا نہیں سکی۔ میرے اور جینٹ کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ انہی دنوں میں تمہارے پاس آیا تھا ڈپریشن کی شکایت لے کر۔ تمہاری دواؤں سے میں ٹھیک ہوگیا تھا، تھوڑے دنوں کے لیے مگر پھر وہ مجھے چھوڑ گئی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ گھومنے والے پنکھے کو گھورنے لگا تھا۔

''کیوں، کیا کوئی نئی بات ہوگئی تھی؟'' میں نے اسے ٹوکا تھا۔

''جینٹ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ شدید محبت میں چار سال کا طویل عرصہ گزرا تھا اس کے ساتھ۔ ویت نام سے آنے کے بعد کالج میں بہت ساری لڑکیوں سے دوستی ہوئی۔ وہ میری زندگی میں خاموشی سے آئیں اور خاموشی سے ہی چلی گئیں۔ تھوڑے دنوں، ہفتوں، مہینوں کی دوستی۔ کوئی کنکشن نہیں بن سکا ان سے۔ کوئی طویل رفاقت نہیں ہوئی کسی سے مگر جینٹ کی بات اور تھی۔ وہ مجھے نیویارک میں ہی ملی تھی۔ میری نئی نئی نوکری تھی اور میں نیا نیا نیویارک میں آیا تھا۔ وہ بھی اسی کمپلیکس میں رہتی تھی جس میں، میں نے اپارٹمنٹ لیا تھا۔ اس سے میری ملاقات سوئمنگ پول میں ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات اور پھر سب کچھ کلک کر گیا تھا ہم دونوں کے درمیان۔ پہلی ملاقات ہی محبت میں بدل گئی تھی۔ وہ چار سال ہی میری زندگی کے شاندار سال تھے مگر شادی کے بعد ویتنامی دلہن نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ سب کچھ لٹا کر بھی جینٹ میرے ساتھ ہی تھی مگر اس دن وہ بھی چھن گئی مجھ سے۔ اس رات ہم دیر تک بات کرتے رہے۔ وہ مجھے دلاسا دیتی رہی، سمجھاتی رہی، بتاتی رہی کہ اب مجھے دنیا کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اب امریکا میں وہ سب کچھ بھول جانا ہوگا جو ماضی کا حصہ ہے۔ اس نے پیار سے مجھے تھپکیاں دی تھیں۔ میرے ماتھے کو چوما اور میں سو گیا لیکن رات کو میں جنگل میں تھا، اپنے یونٹ کے ساتھ۔ جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ رینگتا ہوا پانی، کیچڑ، دلدلی زمین پر۔ پھر یکایک فائرنگ شروع ہوگئی اور ہم سب زمین سے چپک کر رہ گئے۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے، وہ چار تھے، ویتنامی چوہے۔ ہم نے ان چاروں کو پکڑ لیا تھا اور ان کو درختوں کے ساتھ ہاتھ پیر باندھ کر لٹکا دیا تھا۔ وہ چاروں برہنہ الٹے لٹکے رہے۔ ہم نے چاقوؤں سے ان کے اعضا کاٹ دیے۔ ان کا خون آہستہ آہستہ بہتا رہا۔ ان کے پیٹ اور ان کی پیٹھ پر چاقوؤں سے بنائی ہوئی لکیروں سے خون رستا رہا اور ہم لوگ ان کی چیخوں کو سنتے رہے، ہنستے رہے، بولتے رہے پھر وہ چاروں اسی طرح سے مرگئے۔ خون گر رہا تھا...... ٹپ ٹپ اور ایک ٹپ پر میری چیخ نکل گئی، ایسی چیخ کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پسینے سے تر۔ نہ جانے میں کب تک چیختا رہا تھا۔

''اسی صبح کو جینٹ مجھے چھوڑ گئی۔ کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ بہت دن رہی میرے ساتھ۔ لڑتی رہی راتوں کو...... گولیوں کی بوچھاڑ میں چھپاتی رہی۔ ہیلی کاپٹروں کے شور میں سمجھاتی رہی۔ انجانی سمتوں سے آنے والی گولیوں سے بچاتی رہی مجھے۔ کب تک ساتھ دیتی میرا، ڈاکٹر میری جنگ تو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ میں کیا کرتا، میں کیا کروں۔''

وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، یہ جنگ تو ویت نام میں ختم ہوئی ہے۔ امریکا میں تو لڑی ہی نہیں گئی۔ جنگ ویت نام میں شروع ہوئی اور ویت نام میں ہی ختم ہوگئی مگر امریکا میں تو

ابھی شروع ہوئی تھی ویت نام کی جنگ کے بعد۔ دس ہزار دنوں کی لڑائی کے بعد۔

میں نے بڈہارٹی کو سمجھایا تھا کہ ایسا ہوتا ہے، ایسا ہو رہا ہے بہت سارے فوجیوں کے ساتھ۔ جنگ ابھی تک ان کے ذہن و دماغ پر مسلط ہے۔ یہ ایک خاص قسم کا سنڈروم ہے اور اس قسم کی جنگوں کے بعد یہ ہوتا ہے۔ پریشانی، ٹینشن، ڈپریشن، بلڈ پریشر کا بڑھ جانا، راتوں کو نیند نہیں آنا، ایسا لگتا ہے جیسے فوجی ایکشن جاری ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ بمباری شروع ہوگئی ہے اور مریض بستروں، دروازوں، الماریوں کے پیچھے چھپنے لگتا ہے۔ کبھی اسے ہیلی کاپٹروں اور بمباری کرنے والے جہازوں کی آواز آتی ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے دشمن اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ ایسا تو ہوتا ہے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا تھا لیکن مریض کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اب میدانِ جنگ میں نہیں ہے۔ وہ واپس اپنے ملک میں آگیا ہے، دوستوں کے درمیان، یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا میں۔

''مجھے پتا ہے ڈاکٹر کہ میں امریکا میں ہوں، جنگ میں نہیں ہوں۔ جنگ ختم ہوچکی ہے لیکن یہی سب کچھ ہوتا ہے میرے ساتھ۔ پہلے کم ہوتا تھا مگر اب بڑھ گیا ہے، وقفے وقفے سے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا، تھوڑی دیر رکا اور پھر میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا تھا۔

''گرفتاری سے پہلے ہمارا یونٹ ڈونگ ڈیانگ فونگ کی بربادی میں شامل تھا ڈاکٹر۔ بڑی بھاری لڑائی تھی وہ، بڑی بے جگری سے لڑے تھے ہم لوگ اور دشمن بھی بہت مضبوط تھا، لیکن ہماری ہوائی فوج کی سرپرستی نے انہیں نکلنے نہیں دیا پھر ہم لوگوں نے شہر جلا دیا تھا۔ کمیونسٹوں کو چن چن کر مارا تھا۔ گلیوں میں، گھروں میں، بچے، بوڑھے جل کر مر گئے۔ عورتیں، لڑکیاں گھروں سے بھاگ گئیں اور نہ جانے کتنوں کو ہم لوگوں نے پامال کر دیا۔ تم یہ کہتے ہو یہ جنگ ختم ہوگئی ہے۔ ڈونگ ڈیانگ فونگ تباہ ہوچکا ہے۔ کمیونسٹ مر چکے ہیں، دشمن پسپا ہوچکا ہے مگر یہ جنگ تو کل ہی رات لڑی ہے میں نے۔ رات پھر اپنے کمرے میں، بستر کے اوپر سے اور کبھی بستر کے نیچے چھپ چھپ کر گولیوں کی بوچھاڑ میں لڑتا، بھٹکتا رہا ہوں میں۔ اس جنگ نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ میری نوکری چلی گئی ہے۔ جینٹ میری بیوی، میری دوست، میری ساتھی مجھے چھوڑ کر نہ جانے کہاں کھوگئی ہے۔ سب کچھ لٹ گیا ہے میرا، کیا رہ گیا ہے میرے پاس۔ مستقل ڈپریشن اور تمہاری دی ہوئی گولیاں۔''

یہ کہہ کر اس نے جیسے اپنے بازوؤں میں اپنا منہ چھپالیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ رو رہا ہے۔ میں بھی خاموش رہا کہ وہ اسی طرح سے تھوڑی دیر رو لے تو بہتر ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو رس رہے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔ ''ڈونگ ڈیانگ فونگ کی جنگ تو ہم لوگ وہاں جیت گئے ڈاکٹر لیکن...... یہاں امریکا میں ڈونگ ڈیانگ فونگ جاری ہے۔ وہاں سے تو میں بچ کر آگیا۔ جان بھی بچ گئی اور ہاتھ، پیر بھی نہیں کٹے لیکن اس اندر کی ڈونگ ڈیانگ فونگ میں، میں روز مر رہا ہوں، روز میرا ہاتھ کٹتا ہے، پیر کٹتا ہے اور انگلیاں کاٹ کاٹ کر پھینکی جاتی ہیں۔ یہ امریکی ڈونگ ڈیانگ فونگ ہم سب کو مار دے گا ڈاکٹر...... مار دے گا، ختم کر دے گا...... ہمیشہ کے لیے......''

حیرت

''میں اکثر اس بات پر حیرت کیا کرتا تھا کہ انگریز اتنی زیادہ چائے نوشی کے عادی کیوں ہوتے ہیں؟''

''تمہارے جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تمہیں انگریزوں کی زیادہ چائے نوشی پر حیرت نہیں ہوتی؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے کیونکہ اب مجھے حقیقت کا علم ہوچکا ہے۔ آج صبح میں نے ان کی کافی پی تھی۔''

لطیفہ

تین سردار موٹر سائیکل پر جا رہے تھے۔ ٹریفک پولیس والے نے ہاتھ کا اشارہ دے کر روکا۔

ادھر سے سردار نے بھی ہاتھ دیا۔

''نہ باوا جی نہ...... اسی پہلے ہی تین آں۔ تینوں کتھے بٹھاویے۔''

اقوالِ زریں

یہ ضروری نہیں کہ انسان گھر کو خوب صورت بنائے بلکہ یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے دل کو خوب صورت بنائے۔

مرسلہ۔ محمد شہباز ناز، سرگودھا

آخری لمحہ

کاشف زبیر

زندگی چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو آخری لمحے میں محض ایک پل کی محسوس ہوتی ہے اور جب وقت رخصت آتا ہے تو گزرنے والے بے شمار لمحات میں سے آخری لمحہ گویا امر ہو جاتا ہے، اب یہ سفر چاہے زمین کے اندر کا ہو یا زمین کے اوپر کا... تیاریاں تو دونوں کے لیے ہی کرنا پڑتی ہیں کیونکہ زادِ سفر بن، سفر کا ارادہ بے معنی ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی سفر کی طرف گامزن ہوئے جس میں قدم قدم پر آزمائشیں پلکیں بچھائے ان کی منتظر تھیں لیکن جو زندگی کی حقیقتوں کو سمجھ کر بتدریج اسے گزارنے کی سعی کرتے ہیں وہ کبھی منہ کے بل نہیں گرتے... جو اس فلسفے پر یقین نہیں رکھتے، ان کے سارے کس بل ٹھوکریں نکال دیتی ہیں لیکن افسوس یہ بات انسان کو بہت آخر میں سمجھ آتی ہے، جب پلٹنے کی گنجائش ہرگز نہیں رہتی... بہرحال زیرنظر کہانی مصنف کے آخری لمحات کی کاوشوں میں سے ایک ثابت ہوئی جس میں کچھ تبدیلی کے حوالے سے بات چیت بھی ہوئی مگر وقت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی۔ دنیا کی روایت ہے کہ جانے والے کی آخری نشانی سنبھال کر رکھی جاتی ہے لہذا محبوب قلم کار کی یہ آخری نشانی قارئین کے لیے حاضر ہے۔

زندگی کے نشیب و فراز پر مشتمل سسپنس کے آخری صفحات کے لیے کاشف زبیر کی آخری تحریر





زندگی کتنی طویل ہوتی ہے لیکن بعض اوقات بہت تیزی سے گزر جاتی ہے۔ یہ جملہ اس نے سوشیالوجی کی لیکچرر آمنہ انصاری سے سنا تھا۔ اس وقت اس نے بس سنا اور ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ کرلیا اور یہ جملہ اسے اب یاد آیا تھا۔ جب اس کی اپنی زندگی صرف تین پل کی تھی لیکن یہ تین پل اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گئے تھے۔ عالیہ احمد ولد شبیر احمد ملک۔ کل ہی تقریباً پورے چوبیس برس کی ہوئی تھی۔ آج چوبیس برس اور ایک دن۔ پونے آٹھ ہزار سے اوپر کچھ دن کم نہیں ہوتے مگر آج یہ بہت کم پڑ گئے تھے۔ اسے لگا جیسے ابھی وہ اس دنیا میں آئی ہو اور فوراً ہی اس کا آخری سفر شروع ہو گیا ہو۔ پہلا لمحہ شروع ہوا تو اس نے ماضی کی کھڑکی سے ایک باپ کو دیکھا جو اپنی ایک یا سوا سال کی بچی کو ہوا میں اچھال کر پکڑ رہا تھا۔ بچی کے چہرے پر مسرت، خوف، سنسنی اور تحیر کے ملے جلے تاثرات تھے۔ باپ کے چہرے پر صرف محبت اور شفقت تھی۔

☆☆☆

پہلا لمحہ معصومیت......!

باپ نے اسے ہوا میں اچھالا تو اس نے خود کو خلا میں پایا۔ اس لمحے کی سنسنی، مسرت اور ایک انوکھا تحیر ایسا تھا جو دو سال کی عمر میں بھی اس کے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ وہ سب سے چھوٹی لیکن سب سے بلند تھی۔ آس پاس زیادہ دور تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ مشکل سے ایک لمحہ خلا میں رہی اور دوسرے لمحے دوبارہ باپ کی مضبوط اور محفوظ گرفت میں تھی مگر اس ایک لمحے میں اس نے جتنا لطف محسوس کیا، وہ اس کی ساری زندگی کے لیے کافی تھا۔ جب باپ نے اسے اوپر اچھالا تو اس نے چیخ ماری اور زور سے بابا کہا تھا۔ باپ کا قہقہہ گونجا تھا۔ اوپر جاتے ہوئے اس نے خود کو آزاد محسوس کیا پھر کشش ثقل اور اپنوں کی محبت نے اسے واپس کھینچا۔ یہ لمحہ خوف والا تھا۔ واپس گرنے کا خوف۔ ساتھ ہی اسے باپ پر اعتبار بھی تھا کہ وہ اسے گرنے نہیں دے گا۔ مگر خوف ایسا جذبہ ہے جو خالقِ کائنات کے یقین کے سامنے بھی ابھر آتا ہے۔ جو پلِ صراط پر بھی ساتھ رہے گا جو جنت کے دروازے تک ساتھ جائے گا۔ صرف جنت خوف کے سائے سے پاک ہوگی۔ جیسا کہ رب کائنات نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ اللہ کے دوستوں کو کوئی غم یا خوف نہیں ہوگا۔

وہ باپ کے بڑے اور مضبوط ہاتھوں میں یوں آرام سے اتر آئی جیسے یہ ہاتھ اسی کے لیے بنے ہوں۔ جب وہ خلا میں تھی تو اسے پتا نہیں تھا کہ اس کے چاچو نے اس کی تصویر لی تھی۔ اس تصویر میں اس کا چہرہ اور اس پر نقش تاثرات پوری طرح نمایاں تھے۔ اس کی ماں نے سکون کا سانس لیا اور شوہر سے کہا۔ ”ملک صاحب! اب ایسا نہ کرنا، میرا دل رک جاتا ہے۔“

ملک صاحب ہنسے۔ ”تیرا دل رک جاتا ہے اور اس کا دل دیکھ کیسے دھڑک رہا ہے۔“

ماں نے اسے گود میں لیا اور چومنے لگی۔ ”میری بیٹی...... میری رانی۔“

”بابا! ہم بھی عالی کو اچھالیں۔“ اس کے بڑے بھائی ظہیر نے کہا۔ وہ سات سال کا تھا۔ اس کے بعد پانچ سال کا عمیر تھا اور پھر وہ تھی عالیہ احمد ملک۔ اس خاندان کی پہلی لڑکی۔ شبیر احمد ملک کا خاندان خاصا بڑا تھا۔ اس کے ایک بڑے اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ دو بہنیں تھیں۔ جب عالی پیدا ہوئی تو سوائے اس کے سب سے چھوٹے چاچو کے سب شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔ تایا رفیق کے چار بیٹے تھے۔ پھر شبیر احمد کے دو بیٹے، اس سے چھوٹے نعیم کے بھی دو بیٹے تھے۔ شفیق ابھی ملازمت سے لگا تھا اور اسی سال اس کی شادی کا ارادہ تھا۔ بڑی پھپو شاہین کے تین بیٹے تھے اور چھوٹی پھپو ثنا کے دو بیٹے تھے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے ددھیال میں پہلی لڑکی تھی۔ ننھیال میں صرف ایک خالہ تھی اور اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ شبیر احمد کا سارا خاندان مع بہنوں کے گل پور میں آباد تھا۔ البتہ عالیہ کا ننھیال گل پور سے کچھ فاصلے پر ایک اور قصبے چاند پور میں رہتا تھا۔ اس کے نانا نانی اور شادی شدہ خالہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ چاند پور میں تھے۔

گل پور چھوٹے سرسبز پہاڑوں کے درمیان آباد چھوٹا لیکن پرانا قصبہ تھا۔ پھولدار پودے اور بیلیں یہاں خود رو تھیں۔ اسی لیے اس کا نام گل پور پڑا۔ اب پہلے کی سی بات نہیں رہی لیکن بزرگ بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں یہاں کی فضا پھولوں سے مہکی رہتی تھی۔ انگریزوں کے دور میں اسے ترقی ملی۔ جب یہاں سے نوجوان فوج میں بھرتی کے لیے گئے۔ اسکول بنا اور اس علاقے میں سڑک تعمیر ہوئی۔ تقسیم کے بعد ترقی کی رفتار سست رہی مگر رفتہ رفتہ گل پور تمام سہولیات حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ جب عالیہ پیدا ہوئی تو یہاں صرف بجلی کی سہولت تھی۔ گیس نہیں آئی تھی، لوگ گھروں میں لکڑی کے چولہے جلاتے تھے۔ پانی کنویں سے بھرا جاتا تھا۔ چند ایک گھروں میں بورنگ کرکے موٹر سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ فون نہیں تھا مگر چند سالوں میں آگیا۔ قصبے

کی مرکزی سڑک اور چند گلیاں ہی پکی تھیں۔ بلدیاتی نظام کے دور میں گل پور نے نہایت تیزی سے ترقی کی۔ یہاں گیس آئی، پانی کی لائنیں اور سیوریج لائنیں ڈالی گئیں۔ تمام گلیوں کو پختہ کیا گیا۔ فون اور انٹرنیٹ کی سہولت آئی۔

مرکزی ہائی وے گل پور سے دو میل کے فاصلے سے گزرتی تھی مگر یہ دو میل کا راستہ ہمیشہ کچا پکا اور ناہموار رہا پھر یہاں اعلیٰ معیار کی سڑک بن گئی۔ جو فاصلہ پہلے پندرہ منٹ میں جھٹکوں کے ساتھ طے ہوتا تھا، وہ اب پانچ منٹ میں سکون سے طے ہونے لگا مگر گل پور میں معاشی لحاظ سے زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یہاں کے لوگ اب بھی زیادہ تر نوکری پیشہ تھے۔ اکثر سکیورٹی اداروں میں ملازمت کرتے تھے۔ روزگار کا دوسرا ذریعہ زمین تھی۔ گل پور کی زمین زرخیز تھی۔ پہاڑوں سے ایک درمیانے سائز کا دریا بہتا تھا۔ پہلے یہ سردیوں میں خشک اور گرمیوں میں پانی سے بھرا رہتا تھا۔ سیلاب تقریباً ہر سال فصلوں اور باغوں کو نقصان پہنچاتا تھا۔ پھر اوپر چھوٹا بند بن گیا اور گل پور والوں کا دیرینہ مسئلہ حل ہوگیا۔ اب ان کی زمینوں کو سارے سال پانی ملتا تھا اور سیلاب کا خطرہ بھی بہت کم ہوگیا تھا۔ چار پانچ سال بعد جاکر جب بارش زیادہ ہوتی تو معمولی سا سیلاب آتا تھا۔

شبیر احمد ملک نے بڑے بھائی رفیق کے ساتھ مل کر زمین سنبھال لی۔ اس نے زرعی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا، اس لیے وہ کاشت کاری کے جدید طریقے لایا۔ اس نے زمین کو منظم کیا۔ آس پاس کے زمینداروں سے مل ملا کر اپنی زمین ایک جگہ کرلی۔ اسے مکمل ہموار کیا۔ حد بندی کی اور اس پر اچھی نسل کے یوکلپٹس لگائے۔ چند سالوں میں زمین کے چاروں طرف ان بلند و بالا درختوں کی قدرتی حد بن گئی تھی اور کوئی اس میں مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں حد بندی کے جھگڑے عام تھے۔ اوپری زمین پر شبیر نے اعلیٰ درجے کے مالٹے کا باغ لگایا اور باقی زمین پر مختلف فصلیں کاشت کرنے لگے۔ جدید طریقے استعمال کرنے کی وجہ سے ان کی زمین دوسروں کی نسبت زیادہ پیداوار دیتی تھی۔ ان کی فصل بھی ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔ خاص طور سے مالٹے کی فصل مڈل ایسٹ کے تاجر پوری لے جاتے تھے۔

نعیم سرکاری ملازمت کرتا تھا اور وہ بیوی بچوں کے ساتھ صوبائی دارالحکومت میں رہتا تھا۔ سال میں ایک دو بار بیوی بچوں سمیت آجاتا تھا مگر اس کا ارادہ مستقل شہر میں رہنے کا تھا۔ اس نے وہاں گھر بھی بنالیا تھا۔ عتیق نے ایم کام کیا تو نعیم نے اپنے ایک واقف کار کی مدد سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت دلوادی۔ شادی کے بعد اس کا ارادہ بھی شہر میں رہنے کا تھا۔ ابھی گل پور میں زمین کی طرح گھر بھی مشترک تھا۔ کوئی ڈیڑھ کنال رقبے پر پھیلے اس مکان میں چاروں طرف صحن تھا۔ مکان پرانے طرز کا تھا۔ آگے پیچھے آٹھ کمرے تھے اور دو کمرے عقبی صحن کے آخر میں بنے ہوئے تھے۔ انہیں مہمانوں کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا۔ رفیق اور شبیر کے پاس دو دو کمرے تھے۔ ایک کمرا نشست گاہ کے لیے مخصوص تھا۔ ایک ایک کمرا نعیم اور عتیق کا تھا۔ ایک کمرا مشترک تھا۔ کھانے پینے اور بیٹھک لگانے کے کام آتا تھا۔ موسم سرد ہوتا تو بچے یہیں کھیلتے تھے۔

عالیہ کو اپنے بچپن کا یہ مکان اچھی طرح یاد تھا۔ صحن اس کی پیدائش کے بعد پکا ہوا تھا۔ چار دیواری کے ساتھ کیاریاں تھیں یا درخت لگے ہوئے تھے۔ عقبی صحن میں شیشم اور ٹاہلی کے بڑے اور چھاؤں والے درخت تھے۔ ان کے تلے چارپائیاں پڑی تھیں اور مضبوط شاخوں سے جھولے لگے ہوئے تھے۔ عالیہ گھنٹوں جھولتی تھی اور جب تک ماں زبردستی آکر نہیں لے جاتی، وہ جھولے کی جان نہیں چھوڑتی تھی۔ برآمدوں کے آگے پھولدار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ جب ہوا ان پھولوں سے چھو کر اندر آتی تو اپنے ساتھ خوشبو بھی لاتی تھی۔ بڑے ہونے کے بعد اسے تعجب ہوتا کہ پھولوں سے اب ایسی خوشبو کیوں نہیں آتی؟

ہوش سنبھالنے کے بعد اسے گھر میں سب سے پُرکشش شخصیت باپ کی لگتی تھی۔ وہ شروع سے باپ کی دیوانی تھی۔ رات اس کی بانہوں میں سوتی اور اگر وہ کسی وجہ سے گھر سے باہر ہوتا تو بہت مشکل سے سوتی تھی۔ ماں کو بہت تنگ کرتی تھی۔ خود شبیر ملک کو بھی اس گڑیا کے بغیر چین کہاں تھا۔ گھر سے باہر ہوتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ جلد گھر پہنچ جائے اور کسی کام سے قصبے سے جاتا تو جلد واپس آنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عالیہ اس کے بغیر اداس ہوجاتی ہے۔ سلمٰی کبھی کبھی باپ بیٹی کی اس محبت پر چڑ کر کہتی تھی۔

''مجھے تو اس لڑکی نے ایک طرف لگادیا ہے۔''

شبیر ہنستا۔ ''کیونکہ یہ میری بیٹی ہے۔''

شبیر عام طور سے نو دس بجے زمین پر چلا جاتا تھا۔ کبھی دوپہر کا کھانا کھانے گھر آجاتا ورنہ ملازموں کے ساتھ وہیں کھالیتا تھا۔ رفیق کی ہارڈ ویئر کی دکان بھی تھی۔ وہ زمین پر اسی وقت آتا تھا جب ضرورت ہوتی تھی۔ شبیر شام پانچ چھ بجے تک گھر واپس آجاتا تھا۔ سردی میں تو اس وقت تک رات ہوجاتی تھی مگر گرمیوں کے طویل دنوں میں پونے آٹھ

تک روشنی رہتی تھی۔ پانچ بجتے ہی عالیہ تیار ہو جاتی تھی اور جیسے ہی شبیر کی بائیک کا ہارن گونجتا وہ باہر کی طرف لپکتی تھی اور اسے اندر آنے کی مہلت بھی نہیں دیتی تھی کہ مبادا اس کے سیر کے وقت میں کچھ کمی آجائے۔ شبیر اسے باہر سے ہی ساتھ لے جاتا۔ قصبے کے باہر تک سیر کراتا اور آدھے پون گھنٹے بعد وہ واپس آجاتے۔

بائیک پر بیٹھ کر اسے لگتا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ کبھی شبیر اسے قصبے کی مارکیٹ لے جاتا اور وہاں اسے اس کی پسند کی چیزیں دلاتا۔ اسے قلفی یا ملائی والا فالودہ کھلاتا تھا۔ پھر وہ اسے قصبے کے باہر لے جاتا۔ کبھی کبھی وہ بند کے اوپری حصے تک جاتے تھے، وہاں سے نیچے پورا گل پور صاف نظر آتا تھا۔ گل پور کے پہاڑوں پر جنگل بھی تھے۔ کسی زمانے میں جب گیس نہیں تھی تو جنگل لوگوں نے تقریباً صاف کر دیے تھے مگر گیس آنے کے بعد سے جنگل پھر سے بڑھنے لگے تھے۔

گل پور کا قبرستان اوپری حصے میں ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھا۔ لوگوں نے صدیوں پہلے نیچے سے اپنے مُردے دفنانا شروع کیے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اوپر تک چلے گئے تھے۔ اب قبرستان تقریباً نصف کلومیٹر تک پھیل گیا تھا۔ اس کے اوپر اور دائیں بائیں جنگل تھا۔ عالیہ کا دادا اور باقی پرکھے اسی قبرستان میں دفن تھے۔ شبیر احمد نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، وہ ہر تدفین میں شامل رہا تھا، ان دنوں عالیہ پانچ سال کی ہونے والی تھی جب ایک شام ڈیم کی طرف سے آتے ہوئے شبیر نے بائیک کا رخ قبرستان کی طرف موڑ دیا۔ دو دن پہلے وہ زمین کے کام سے باہر گیا ہوا تھا، اسی دوران میں اس کے واقف کار صفدر علی کے چھوٹے بھائی اسد علی کو قتل کے سلسلے میں پھانسی کی سزا ہوئی اور اس کی میت قصبے میں لائی گئی۔

اسد علی نوجوان تھا۔ شہر میں پڑھتا تھا۔ وہاں اس کا کسی لڑکی کے چکر میں اس کے بھائیوں سے جھگڑا ہوا اور اس کے ہاتھ سے لڑکی کا ایک بھائی مارا گیا اور دوسرا زخمی ہوا تھا۔ لہٰذا اسے سزائے موت ہوئی اور دو دن پہلے اسے پھانسی دے دی گئی تھی۔ شبیر نے اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ سنا تھا۔ وہ اچھے کردار کا لڑکا نہیں تھا۔ جب یہاں گل پور میں تھا تب بھی اس کے بارے میں ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں۔ شاید ان ہی سے تنگ آکر گھر والوں نے اسے پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا تھا۔ بہرحال شبیر کو ان باتوں سے غرض نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مرنے والے کے اعمال اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والوں کا فرض تھا کہ اس کے جنازے میں شریک ہوں اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ وہ میت میں شریک نہیں ہوا تھا اس لیے اس نے سوچا کہ آج قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ لے۔ مگر عالیہ کچھ اور سمجھی۔ اس نے چہک کر باپ سے کہا۔ ”بابا! ہم اڈے جا رہے ہیں؟“

اڈے کا لفظ ہائی وے کے لیے مخصوص تھا کیونکہ وہاں بس اسٹاپ تھا۔ کچھ دکانیں اور ایک ہوٹل تھا۔ صبح سے شام تک وہاں خاصی رونق رہتی تھی۔ شبیر نے جواب دیا۔ ”نہیں بابا کی جان! ہم قبرستان جا رہے ہیں۔“

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ قبرستان جا رہی تھی۔ شبیر نے باہر ہی بائیک روکی اور عالیہ سے کہا۔ ”آپ یہیں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“

شام کا وقت تھا اور وہاں ویرانی تھی۔ عالیہ سہم گئی۔ ”نہیں، میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

خود شبیر بھی اسے چھوڑتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ نزدیک ہی جنگل تھا اور وہاں چھوٹے موٹے جانور بھی ہوتے تھے۔ اس نے سر ہلایا اور عالیہ کو گود میں اٹھا لیا کہ وہ بچی ہے غلطی سے کسی قبر پر پاؤں نہ رکھ دے۔ شبیر برسوں سے یہاں آرہا تھا۔ اسے ایک ایک قبر کا علم تھا کہ کس کی ہے۔ وہ اوپری حصے کی طرف بڑھا جہاں نئی قبریں بن رہی تھیں۔ یہ جگہ ڈھلانی تھی، اس لیے مٹی کو سرکنے سے بچانے کے لیے کثرت سے درخت لگائے گئے تھے۔ خاص طور سے پیلو کے درختوں کی بہتات تھی۔ اوپر جانے کے لیے اور پھر دائیں بائیں قبروں تک جانے والے راستے پتھر اور اینٹ کی مدد سے پختہ کیے گئے تھے۔

اوپر سے آنے والے بارش کے پانی سے بچاؤ کے لیے قبرستان کے اوپری حصے میں چار فٹ اونچی پتھروں کی دیوار بنائی گئی تھی۔ شبیر نے اس دیوار کے پاس بائیک روکی تھی ورنہ نیچے اترنے کی صورت میں اسے خاصا دور تک پیدل چلنا پڑتا۔ یہاں سے نئی قبروں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ تازہ قبروں والی جگہ پہنچا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ اسد علی کی قبر کون سی ہے۔ ویسے وہ کسی ایک فرد کے لیے نہیں بلکہ تمام اہل قبرستان اور دنیا سے گزر جانے والے مسلمانوں کے لیے دعا کرتا تھا کیونکہ اللہ کسی ایک فرد کو اتنا ہی ثواب دیتا ہے جتنا کہ سب کو دیتا ہے۔ شبیر نے عالیہ کو گود سے اتار کر برابر میں کھڑا کیا اور فاتحہ خوانی کرنے لگا۔ اس دوران میں عالیہ قبرستان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا

اور تجسس بھی ہو رہا تھا۔ اس نے باپ کا پاؤں پکڑ لیا۔ شبیر نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا مگر دعا جاری رکھی۔ دعا کر کے وہ پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب عالیہ سوال کرے گی۔

''بابا! یہ کون ہے؟'' عالیہ نے قبر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ لڑکا......'' شبیر نے جواب دیا۔ ''جیسے تمہارے عتیق چاچو ہیں۔''

''اسے کیا ہوا تھا بابا؟''

''اسے سزا ہوئی تھی، اس نے ایک آدمی کو مارا تھا اس لیے اسے موت کی سزا ہوئی۔''

''وہ کیا ہوتی ہے؟''

''ابھی آپ چھوٹی ہیں جب بڑی ہو جائیں گی تو آپ کو خود پتا چل جائے گا۔'' شبیر نے پیار سے سمجھایا۔ وہ باپ کی جتنی لاڈلی تھی، اتنی ہی فرماں بردار بھی تھی۔ شبیر کا صرف ایک بار کا کہنا کافی ہوتا تھا اور بات اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی تھی۔ اس نے سر ہلایا اور اوپر والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

''بابا! وہ کیا ہے؟''

''وہ دیوار ہے۔ اوپر جنگل سے جانوروں اور بارش کے پانی کو قبرستان میں آنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی ہے۔''

وہ سہم گئی۔ ''ادھر جانور بھی ہوتے ہیں؟''

''ہاں لیکن وہ اس طرف نہیں آسکتے۔'' شبیر نے اسے تسلی دی۔

''ادھر ''ہو'' بھی ہوتے ہیں؟''

''ہو'' سے مراد بھوت وغیرہ تھا جیسا کہ بچوں کو ڈرانے کے لیے ایک لفظ بنا لیا جاتا ہے۔ شبیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہو کہیں نہیں ہوتا۔''

''امی کہتی ہیں۔''

جب باپ گھر میں نہیں ہوتا تھا تو سلمیٰ اسے سلانے کے لیے خوف کا سہارا لیتی تھی۔ شبیر ہنسا۔ ''تمہاری امی خود ہو ہیں۔ ان سے پوچھنا کہ ہو کہاں رہتا ہے۔''

عالیہ قبر کی طرف دیکھ رہی تھی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''بابا! یہ اچھا لڑکا نہیں تھا نا؟''

شبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ اچھا لڑکا نہیں تھا؟''

''اس نے کسی کو مارا تھا اور جو دوسروں کو مارتے ہیں وہ اچھے نہیں ہوتے۔''

''ہاں، وہ اچھا نہیں تھا مگر اب وہ مر گیا ہے اس لیے اسے برا نہیں کہنا چاہیے۔''

''کیوں بابا؟''

''کیونکہ وہ اس دنیا سے چلا گیا ہے اور اس دنیا سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ جو اس دنیا سے چلا جائے اس کی برائی کو بھول جانا چاہیے۔''

''یہ اچھا آدمی نہیں تھا۔'' عالیہ نے اصرار کیا۔ ''اسے جنگل میں دفن کرنا چاہیے تھا۔''

شبیر نے حیرت سے اپنی چھوٹی سی بیٹی کو دیکھا۔ وہ عام طور سے ایسی باتیں نہیں کرتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیوں میری جان؟''

''بس یہ اچھا آدمی نہیں تھا۔''

''آپ کو بتایا تو ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اسے برا نہیں کہتے۔''

عالیہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ شبیر سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں پھر کوئی سوال آرہا ہے۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ بالآخر عالیہ نے پوچھا۔ ''بابا! اگر کوئی شخص بہت برا ہو۔''

''بے شک وہ بہت برا ہو لیکن اللہ کو ماننے والا ہو اور کلمہ گو مسلمان ہو تو اسے برا نہیں کہتے۔'' شبیر احمد کو کہتے ہوئے فضل کا خیال آیا۔ فضل ایسا شیطان صفت آدمی تھا کہ آج بھی لوگ اس کا فعل یاد کرتے تو ان کی روح کانپ جاتی تھی۔ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے شبیر اس وقت لڑکپن میں تھا جب گل پور کی ایک عورت کے انتقال کے بعد اس کی تدفین کی گئی تو اس کی لاش اگلے دن قبر سے باہر پائی گئی تھی۔ اس کا کفن اتار دیا گیا تھا اور لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس نے پورے گل پور کو سہما دیا تھا پھر فضل جو شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا، اچانک ہی کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور کوڑھ بھی ایسا کہ چند ہفتوں میں اس کا جسم گل سڑ کر رہ گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا۔ تب مرنے سے پہلے اس نے اعتراف کیا کہ عورت اور بچی کی لاش کو قبر سے نکال کر ان کی بے حرمتی اسی نے کی تھی۔ یہ بیماری اللہ کی طرف سے سزا تھی۔ اس نے عورت اور بچی کے گھر والوں سے معافی مانگی۔ شبیر یہ بات معصوم عالیہ کو نہیں بتا سکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب عالیہ یہ سب جان جائے گی۔ شام تیزی سے اپنا روپ بدل رہی تھی۔ شبیر نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

''اب گھر چلیں؟''

اس نے اپنا سر ہلایا تو شبیر نے اس کا ماتھا چوما اور

ڈھلان سے اترنے لگا۔ گزشتہ رات اس نے سلمٰی سے کہا تھا کہ عالیہ پانچ سال کی ہونے والی ہے اور چند ہفتے بعد اسکول میں داخلے شروع ہونے والے تھے۔ گل پور میں لڑکیوں کے لیے الگ اسکول تھا جس میں پرائمری سے لے کر مڈل تک کلاسیں ہوتی تھیں۔ البتہ لڑکوں کے لیے مخصوص اسکول میٹرک تک چلا گیا تھا اور اس سال سے وہاں انٹر میڈیٹ کی کلاسز بھی شروع ہونے والی تھیں۔ زیادہ تر ٹیچرز کا تعلق گل پور سے ہی تھا اور یہ سب اچھے تعلیم یافتہ تھے اس لیے معیار تعلیم بھی خاصا بہتر تھا۔ سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے لوگوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے کا رجحان بڑھا تھا۔

شروع میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں تھا اور دس میں سے ایک ہی لڑکی پڑھی لکھی ہوتی تھی مگر پچھلے پندرہ بیس سال میں صورتِ حال بدل گئی تھی۔ اب لڑکیوں کی تعلیم پر بھی اتنی ہی توجہ دی جا رہی تھی جتنی کہ لڑکوں کی تعلیم پر۔ لڑکیوں کا اسکول اگلے سال میٹرک تک ہو جاتا کیونکہ مقامی لوگوں نے لیب اور لائبریری کی شرط اپنے خرچ سے پوری کر دی تھی۔ شبیر عالیہ کو پڑھانا چاہتا تھا اگرچہ اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کتنا پڑھے گی مگر اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی جتنا ممکن ہو تعلیم حاصل کرے۔ اسے امید تھی کہ جب تک عالیہ بڑی کلاسز تک پہنچے گی لڑکیوں کا اسکول ہائر سیکنڈری ہو جائے گا اور ممکن ہے گل پور میں گرلز کالج بھی بن جائے۔

اگرچہ گل پور کے آس پاس کئی بڑے شہر تھے جہاں اعلیٰ تعلیمی ادارے موجود تھے۔ لڑکیوں کا اسکول گل پور کے اوپری حصے میں تھا، اس کے پاس سے گزرتے ہوئے شبیر نے عالیہ سے کہا۔ ''آپ پڑھنے کے لیے اس اسکول میں آئیں گی۔''

شبیر کی توقع کے خلاف عالیہ خوش ہو گئی تھی۔ ''کب بابا؟''

''اسی سال۔'' شبیر نے جواب دیا اور اس نے گھر آ کر سلمٰی سے کہا کہ وہ عالیہ کے اسکول میں داخلے کی تیاری شروع کر دے۔ سلمٰی زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی اس نے میٹرک پاس کیا تھا۔ اس لیے شبیر خود عالیہ کو پڑھاتا تھا۔ شبیر اس کے لیے کے جی کلاسز والی کتابیں لے آیا تھا اور ان سے اس کی اتنی اچھی تیاری کرا دی تھی کہ اسے آرام سے پہلی کلاس میں داخلہ مل سکتا تھا۔ شبیر نے سلمٰی سے کہا اور عالیہ نے سنا تو خوشی سے پورے گھر میں اچھلتے کودتے اس نے سب کو بتایا کہ وہ جلد اسکول جائے گی۔ سوائے تایا رفیق کی بیوی نورین کے سب ہی خوش تھے۔ گھر میں کچن ایک ہی تھا اور خاصا بڑا تھا۔ سب آرام سے اپنا اپنا کھانا بناتے تھے۔

رات کے کھانے کی تیاری کرتی نورین نے سلمٰی سے کہا۔ ''لڑکی ہے، کیا کرنا ہے پڑھ کر؟''

''بھابی! کیسی بات کر رہی ہو؟'' سلمٰی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''آج کل تو سب لڑکیوں کو پڑھا رہے ہیں اور پھر ہمارا دین بھی مرد عورت دونوں کو پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔''

نورین نے منہ بنایا۔ ''وہ قرآن پاک پڑھانے کی بات کرتا ہے۔''

''عالیہ قرآن پاک پڑھ رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو چند سال میں ناظرہ ختم کر لے گی۔ ابھی قاعدے پر ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' نورین نے منہ بنا کر کہا۔ ''پر اسکول کی تعلیم ...... نری بے حیائی ہے۔''

عالیہ کو ایک بی بی گھر میں قرآن پاک پڑھانے آتی تھیں۔ انہوں نے تجوید کے ساتھ قرآن پاک پڑھا ہوا تھا اور اب گھر گھر جا کر بچیوں کو پڑھاتی تھیں۔ بیوہ عورت تھیں اور اسی سے ان کا ذریعۂ روزگار چلتا تھا۔ عالیہ نے نصف قاعدہ ختم کر لیا تھا اور اس کی بنیاد مضبوط ہو گئی تھی۔ شبیر نے بی بی سے کہا ہوا تھا کہ بے شک کئی سال لگ جائیں مگر عالیہ کی بنیاد مضبوط ہونی چاہیے۔ جب تک قاعدے پر عبور نہ ہو آدمی ٹھیک سے قرآن پاک نہیں پڑھ سکتا ہے۔ اگر شبیر زور نہ دیتا تو بی بی اب تک اسے قاعدہ ختم کرا کے ناظرہ پر لے آتیں مگر وہ ایک ایک تختی پر زور دے رہی تھیں۔ اب اس کے اسکول کی تعلیم کا دور شروع ہونے والا تھا۔ سلمٰی نے رات سوتے وقت شبیر کو نورین کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''بھابی خود ان پڑھ ہیں اس لیے عورت کی تعلیم کی اہمیت نہیں سمجھتی ہیں۔''

''وہ کہہ رہی ہیں کہ اسکول کی تعلیم بے حیائی سکھاتی ہے۔''

شبیر کو غصہ آ گیا۔ ''یہ نری جہالت ہے۔ گل پور کی لاتعداد بچیاں اسکول اور کالج کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ میں نے آج تک کسی کی بے حیائی کا قصہ نہیں سنا۔ ہاں جنہوں نے اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی ہوتی ہے وہ جوان ہونے پر جو گل کھلاتی ہیں وہ سب ہی جانتے ہیں۔ جب کوئی برائی کی طرف جاتا ہے تو اس کی وجہ تعلیم نہیں ہوتی ہے۔''

سلمٰی خوش ہو گئی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب اگر انہوں نے کہا تو میں یہی جواب دوں گی۔''

سلمٰی اور شبیر دو دن بعد عالیہ کو لے کر اسکول گئے اور عالیہ کو داخلہ مل گیا۔ جب تک کلاسز کا آغاز ہوتا اس کے دو عدد یونیفارم سل گئے تھے۔ اسکول گھر سے خاصے فاصلے پر تھا۔ بڑی لڑکیاں تو آرام سے پیدل آ جا سکتی تھیں مگر عالیہ

ابھی چھوٹی تھی۔ وہ اتنا فاصلہ چل کر طے نہیں کر سکتی تھی جبکہ اس پر بیگ کا بوجھ بھی ہوتا۔ اس لیے شبیر نے فیصلہ کیا کہ وہ خود اسے صبح چھوڑے گا اور دوپہر میں لے کر آئے گا۔ جب وہ کہیں گیا ہوگا تو یہ کام رفیق کا بڑا بیٹا شفیق کرے گا جو اب پندرہ سال کا ہو گیا تھا اور اسے بائیک چلانی آتی تھی۔

اسکول کی زندگی عالیہ کے لیے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ اسے کسی اجنبی یا کسی مشکل سے واسطہ نہیں پڑتا تھا مگر اسکول ایک الگ دنیا تھی۔ یہاں سب اجنبی تھے اور کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ چند دن تک اسے بہت مشکل ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ عادی ہوتی گئی اور پھر اسکول کا ماحول اس کے لیے مانوس ہو گیا۔ اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے وہ ٹیچرز کی گڈ بک میں آگئی۔ ششماہی امتحان میں عالیہ نے نہ صرف اپنی کلاس بلکہ پہلی کلاس کے تمام سیکشنوں میں سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔

ساڑھے بارہ بجے پرائمری اسکول کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ وہ باہر نکلتی تو شبیر پہلے سے اس کا منتظر ہوتا لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ لیٹ ہو جاتا تو اس نے عالیہ کو سمجھایا ہوا تھا کہ وہ گیٹ کے سامنے رہے۔ اسکول کا چوکیدار شبیر کے جاننے والوں میں سے تھا۔ شبیر نے اس کی ذمے داری لگائی ہوئی تھی کہ وہ اس کے نہ آنے کی صورت میں عالیہ کو اپنے پاس رکھے۔

ظہیر اور عمیر لڑکوں والے اسکول میں تھے۔ یہ اسکول گل پور کے نچلے حصے میں تھا۔ شفیق نے آٹھویں کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا۔ اس کا تعلیم میں دل نہیں لگتا تھا اس لیے رفیق نے اسے اپنے ساتھ ہارڈ ویئر شاپ پر لگا لیا۔ اس سے چھوٹے راشد، نسیم اور وسیم اسکول میں تھے مگر ان کا رجحان پڑھائی کی طرف کم ہی تھا۔ مارے باندھے پڑھ لیتے تھے۔ نعیم کے بچے شہر میں پرائیویٹ اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ اس بار نعیم گرمی کی چھٹیوں میں بیوی بچوں سمیت آیا اور اس نے عالیہ کو پڑھتے دیکھا تو اسے حیرت ہوئی اس نے شبیر سے کہا۔ ”عالی بہت ذہین ہے۔ اتنا کچھ تو میرے بچوں نے پرائیویٹ اسکول میں بھی نہیں سیکھا جتنا یہ چند مہینے میں سرکاری اسکول میں سیکھ چکی ہے۔ میرا مشورہ ہے آپ اسے اعلیٰ تعلیم دلوائیے گا۔“

”ارادہ تو یہی ہے اور خود عالیہ کو بھی پڑھنے کا شوق ہے۔“ شبیر نے جواب دیا۔ ”کم سے کم ہائی اسکول کی تعلیم تو یہ حاصل کر لے گی۔“

نعیم نے حیرت سے بھائی کو دیکھا۔ ”آج کل انٹر کچھ بھی نہیں ہے۔ لڑکیاں پروفیشنل تعلیم حاصل کر رہی

ہوائی قلعہ

اگر ٹرین تین گھنٹے لیٹ ہو تو ویٹنگ روم میں لیٹ کر ہوائی قلعے بنانا صحت کے لیے بے حد مفید سمجھا جاتا ہے۔ پھر مجھ سا بااصول آدمی (کیپٹن حمید) تو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب فرصت میسر ہو اور کب اپنے دشمنوں سے انتقام لینا شروع کر دے۔ لال قلعے پر دھاوا بولا جا سکتا ہے...... لیکن ہوائی قلعے پر دشمنوں کے فرشتوں کی بھی نظر نہیں پڑ سکتی۔ لہٰذا دشمنوں سے نمٹنے کے لیے ہوائی قلعے سے زیادہ محفوظ اور کوئی مورچا نہیں ہو سکتا۔ ہوائی قلعے میں بیٹھ کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھیے کہ آپ اپنے حریف کے ہاتھوں پٹ جانے کو انسانیت تصور کرتے ہیں اور دم دبا کر بھاگ جانے کو انسانیت کی معراج...... لیکن رات کو سونے سے قبل آپ کو اپنے حریف پر بہت شدت سے غصہ آتا ہے اور آپ ہوائی قلعے میں بیٹھ کر اسے اس قدر پیٹتے ہیں کہ وہ بے دم ہو کر رحم رحم چلانے لگتا ہے اور آپ اس کی پروا کیے بغیر کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں۔ اگر اس وقت ہوائی قلعہ آپ کو پناہ نہ دے تو آپ رات بھر جھلا جھلا کر رزمیہ شاعری ہی کرتے رہ جائیں۔

ابن صفی (مرحوم) کی کتاب قابل اعتراض تصویر سے اقتباس

معجزہ

ایک فوجی کی محبوبہ نرس بن گئی تو فوجی نے اس کو خط لکھا۔ ”مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم نرس بن گئی ہو۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کسی طرح بیمار ہو کر تمہارے اسپتال پہنچ جاؤں۔“

کچھ دنوں بعد فوجی کو جواب ملا۔ ”بیماری تو کیا...... ہاں کوئی معجزہ ہی تمہیں یہاں پہنچا سکتا ہے کیونکہ میری ڈیوٹی زچہ اسپتال میں ہے۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ہیں۔ آپ آگے یونیورسٹی کا سوچیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے اتنی ذہین بچی نہیں دیکھی ہے۔"

شبیر یونیورسٹی کا سن کر چپ ہوگیا، وہ تو اسے اکیلا گھر کے دروازے سے باہر جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ عالیہ کے بارے میں شروع سے حساس رہا تھا۔ اسے خوف تھا کہ عالیہ باہر جا کر کہیں گم نہ ہو جائے۔ وہ تھی بھی بہت پیاری سی۔ سرخ و سفید رنگت، سنہری مائل بھورے بال اور اس سے ملتے رنگ کی آنکھیں، فراک میں وہ بالکل گڑیا لگتی تھی۔

اس نے سلمٰی کو سختی سے کہہ رکھا تھا کہ جب وہ گھر میں نہ ہو تو عالیہ کا پورا خیال رکھے۔ عالیہ کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی پھر اسکول جانے لگی تو اسے کھیلنے کے لیے وقت بھی مشکل سے ملتا تھا۔ دوپہر میں آتی اور کھانا کھا کر سو جاتی تھی۔ سہ پہر میں اٹھ کر کچھ دیر جھولا جھولتی تو قاعدہ پڑھانے والی بی بی آجاتیں۔ وہ صرف ان دنوں میں بور ہوتی تھی جب شبیر کہیں باہر گیا ہوتا تھا۔ کئی بار سلمٰی نے شبیر سے کہا۔

"عالیہ لڑکی ذات ہے۔ اسے دوسرے گھر جانا ہے، آپ نے اسے اپنا اتنا عادی بنا لیا ہے کہ آپ ایک دن نہ ہوں تو اس کی حالت دیکھنے والی ہو جاتی ہے۔"

"ابھی بچی ہے، بڑی ہوگی، نئے رشتے اور ماحول ملے گا تو خود کو بدل لے گی۔ ابھی تو میں اور تم اس کے لیے سب کچھ ہیں۔" شبیر نے کہا۔ "تم پریشان نہ ہو۔"

"کیسے نہ ہوں...... ماں ہوں۔" سلمٰی نے کہا۔

"ایک ذات اوپر والے کی بھی ہے اور وہی اصل وارث ہے ہر بندے کا۔ اس نے ہماری بیٹی کے لیے بھی طے کر رکھا ہوگا۔ وہی سب سے بہتر کرنے والا ہے۔" شبیر نے رسانیت سے سمجھایا تو سلمٰی کسی قدر شانت ہوگئی۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ عالیہ تعلیم حاصل کرے مگر سلمٰی کے ذہن میں اس کی تعلیم بس اسکول تک ہی تھی۔ شبیر نے اسے بتایا تھا کہ آنے والے دنوں میں اسکول انٹر تک ہو جائے گا اور سلمٰی کے خیال میں انٹر تک تعلیم کافی تھی۔

سلمٰی باپ بیٹی کی محبت دیکھ کر فکرمند بھی ہو جاتی تھی اگرچہ اسے خوشی ہوتی تھی کہ گل پور کے مردانہ معاشرے میں باپ بیٹیوں سے زیادہ لاڈ نہیں کرتے تھے۔ خود سلمٰی کا باپ اس سے اور اس سے چھوٹی بہن سے بہت سختی سے پیش آتا تھا حالانکہ اس کا کوئی بیٹا بھی نہیں تھا۔ شادی کے بعد اس کے رویے میں نرمی آگئی تھی۔ اس کے باوجود سلمٰی کو اپنے باپ کا بہت خیال رہتا تھا۔

سلمٰی کے پاس کچھ رقم جمع ہوگئی تھی۔ اس نے شبیر سے کہا کہ وہ اسے شہر لے چلے، اسے کچھ گولڈ لینا ہے۔ شبیر سمجھا کہ وہ اپنے لیے لینا چاہ رہی ہے۔ اس نے سلمٰی سے کہا۔ "نیک بخت! تیرے پاس اچھا خاصا زیور تو ہے اور بنا کر کیا کرنا ہے؟"

"میں عالیہ کے لیے لے رہی ہوں۔"

شبیر نے حیرت سے کہا۔ "عالیہ کے لیے کیوں...... وہ تو ابھی بچی ہے۔"

"بچیوں کو بڑا ہوتے دیر نہیں لگتی۔" سلمٰی نے کہا۔ "ٹھیک ہے اللہ نے سب دیا ہوا ہے، کوئی کمی نہیں ہے مگر آدمی پہلے سے کچھ جوڑ لے تو آنے والے وقت میں آسانی ہی ہوگی۔"

شبیر متفق نہیں تھا مگر اس نے پھر منع نہیں کیا۔ "ٹھیک ہے بھئی جو تیری مرضی۔"

"تو کب چلیں گے؟"

"ابھی تو گندم پک رہی ہے، فصل اتر جائے تو پھر چلیں گے۔" شبیر نے کہا۔ "تب تک عالیہ کا امتحان بھی ہو جائے گا۔"

مارچ کے آخر میں عالیہ کا پہلی کلاس کا امتحان ہوا اور جب تک فصل کٹی اس کا نتیجہ بھی آگیا۔ عالیہ نے ایک بار پھر ٹاپ کیا تھا اور اسکول کی طرف سے اسے خصوصی شیلڈ اور نقد انعام بھی ملا تھا۔ شبیر احمد خوش تھا۔ اس نے سلمٰی سے کہا۔ "اب ہماری بیٹی بہترین انعام کی مستحق ہے۔"

"ہم اس کے لیے اچھا والا سیٹ بنوائیں گے۔" سلمٰی خوش ہو کر بولی۔

"سیٹ کی بات کون کر رہا ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اپنی پسند کا تحفہ دلواؤں گا۔"

جب شبیر نے عالیہ سے پوچھا تو اس نے کہا۔ "مجھے بی ایم ایکس سائیکل چاہیے۔ جیسی نعیم چاچو کے بیٹے کے پاس ہے۔"

"میں اپنی بیٹی کو اس سے بھی اچھی سائیکل دلاؤں گا۔" شبیر نے کہا۔ وہ اور سلمٰی کچھ عرصے بعد شہر گئے جہاں سلمٰی نے عالیہ کے لیے گولڈ سیٹ لیا اور شبیر نے اس کی عمر کی مناسبت سے بہترین غیر ملکی سائیکل لی۔ سلمٰی نے کہا۔

"آپ لے تو رہے ہیں، یہ وہ چلائے گی کہاں؟"

"گھر کے صحن میں چلائے گی اور گلی میں چلائے گی۔"

"ملک صاحب! کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ گلی میں کسی لڑکی کو کبھی سائیکل چلاتے دیکھا ہے۔"

"مگر میری بیٹی چلائے گی۔"

''آپ تو اسے پیدل گلی میں نہیں جانے دیتے تھے، اب سائیکل چلانے کی اجازت دیں گے؟''

''میں اس لیے نہیں جانے دیتا تھا کہ اسے دنیا کا پتا نہیں تھا۔ اب وہ ایک سال سے اسکول میں ہے اور اسے دنیا کا پتا چل رہا ہے۔''

''لوگ کیا کہیں گے؟''

''میں نے لوگوں کی کبھی پروا نہیں کی۔'' شبیر نے بے پروائی سے جواب دیا۔

وہ واپس آئے اور جب عالیہ نے اپنی سائیکل دیکھی تو اس کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ گل پور میں لڑکیوں کا کیا، چھوٹی بچیوں کے سائیکل چلانے کا رواج نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ٹرائی سائیکل چلاتی تھیں، وہ بھی تین چار سال کی عمر تک۔ شاید عالیہ پہلی بچی تھی جسے سائیکل ملی تھی۔ شبیر سائیکل کے ساتھ چھوٹا سا ہیلمٹ اور گھٹنوں پر پہننے والے حفاظتی پیڈ بھی لایا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سائیکل چلاتے ہوئے وہ کئی بار گرے گی اور جب تک سیکھ نہیں لے گی گرتی رہے گی۔ اس نے سائیکل چلانے کی تربیت بھی خود دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ حیران ہوا جب دو دن میں اس نے سائیکل چلانا سیکھ لی اور وہ مکان کے چاروں طرف واقع صحن میں فراٹے سے سائیکل دوڑاتی پھرتی رہی۔ نورین نے اس کے سائیکل چلانے کی مخالفت بھی کی تھی اور سلمٰی سے کہا۔ ''شبیر کو کیا ہو گیا ہے۔ اب کل کو یہ گلی میں کرکٹ اور دوسرے کھیل بھی کھیلے گی۔''

''بھابی، سائیکل الگ چیز ہے اور باہر جا کر کھیلنا الگ بات ہے۔ ہم اس کی ایسی کوئی بات نہیں مان سکتے۔''

''لڑکیوں کی فرمائش اس طرح پوری کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

سلمٰی کو غصہ آنے لگا تھا۔ ''بھابی! اب دور بدل گیا ہے۔ لڑکیوں کو مناسب آزادی دینے کا وقت آ گیا ہے۔''

نورین منہ بنا کر چپ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اتنا کہا۔ ''مرضی تم دونوں کی...... اولاد تو تمہاری ہے۔''

سلمٰی نے شبیر سے کہا اور اس نے سمجھایا۔ ''بھابی خود جاہل ہے اور اس نے تو اپنی اولاد کی تعلیم میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ شفیق نے مڈل کر کے چھوڑ دیا اور راشد بھی پڑھتا نظر نہیں آ رہا۔ وہ ساتویں میں رہ گیا ہے۔ یہی حال نسیم اور وسیم کا ہے۔''

''راشد فیل ہو گیا۔'' سلمٰی حیران ہوئی۔ ''رفیق بھائی نے اسے کچھ نہیں کہا؟''

''وہ بھی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے۔'' شبیر نے افسوس

فرق

''ڈیوڈ نے تم سے شادی کرنے سے انکار کیوں کر دیا؟''

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے اپنی امیر ترین بیوہ خالہ کے بارے میں بتایا تھا؟''

''بتایا تھا۔'' سہیلی نے افسردگی سے جواب دیا۔

''بتانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا؟''

''بہت فرق پڑا۔ وہ اب میرا خالو بن گیا ہے۔''

قابلِ غور

ایک مرتبہ ایک عورت نفسیاتی معالج کے پاس گئی اور شوہر سے روز روز جھگڑے کی شکایت کرنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب! ہم دونوں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ بات بات پر شوہر غصہ کرنے لگتے ہیں اور پھر مجھے بھی غصہ آ جاتا ہے۔''

اس پر ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس کا علاج نہایت آسان ہے۔ تم شیر کی گردن کے تین بال لے آؤ۔''

عورت ہمت کر کے چڑیا گھر گئی۔ شیر کے لیے کچھ گوشت لے گئی جسے شیر نے کھا لیا۔ عورت کا ڈر کچھ کم ہوا۔ وہ روزانہ شیر کے لیے گوشت لے جانے لگی۔ پہلے وہ گوشت دور سے پھینکتی تھی پھر نزدیک سے پھینکنے لگی، یہاں تک کہ جب وہ گوشت کھانے لگتا تو پنجرے میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن پر پیار کرنے کی کوشش کرتی۔ جب شیر اس سے کافی مانوس ہو گیا تو اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تین بال کھینچ لیے اور معالج کے پاس لے آئی۔

اس پر اس نے کہا۔ ''کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے رویے اور نرم دلی سے شیر کو تو مانوس کر سکتی ہو جو وحشی جانور ہے مگر ایک مرد وہ بھی تمہارا شوہر تم سے مانوس نہیں ہوتا۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، ہنل ہزارہ

سے کہا۔ ''وہ بعد میں افسوس کریں گے جب ان کی اولاد تعلیم میں پیچھے رہ جائے گی اور یہ فرق انہیں دوسروں سے الگ کر دے گا۔ اب لوگ ملنے جلنے اور رشتے ناتوں میں تعلیم دیکھنے لگے ہیں۔''

سلمٰی نے دبی زبان میں کہا۔ ''بھابی دو تین بار راشد کے لیے عالیہ کا کہہ چکی ہیں۔''

شبیر فکرمند ہو گیا۔ ''ایک گھر میں رہتے ہوئے وقت سے پہلے ایسی باتیں مناسب نہیں ہیں۔''

''میں اپنی بچی راشد کے لیے نہیں دوں گی۔'' سلمٰی نے جلدی سے کہا۔ ''اب بھابی نے بولا تو میں صاف منع کر دوں گی۔ عمر کا بہانہ کر دوں گی۔ وہ عالیہ سے پورے آٹھ سال بڑا ہے۔''

''رفیق بھائی نے اب تک ایسی بات نہیں کی ہے۔'' شبیر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر کی تو میں بھی منع کر دوں گا۔''

''مگر دیکھ کر منع کیجیے گا۔ بھائی ہیں اور ساتھ ہی رہتے ہیں۔''

مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اسی سال جب عتیق کی شادی تھی تو نورین نے اچانک ہی اپنے بیٹوں کے لیے اپنے بھائی کی بیٹیوں سے منگنی کرنے کا اعلان کر دیا۔ وہ حیران ہوئے تھے کیونکہ نہ مشورہ کیا اور نہ بتایا تھا۔ شبیر نے بھائی سے شکوہ کیا۔ ''لوگ تو غیروں میں بھی پوچھ لیتے ہیں، آپ نے ساتھ رہنے والے بھائی سے بھی مشورہ نہیں کیا اور نہ بتایا۔''

''بس یار۔'' رفیق نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''ہم وہاں گئے تھے، تیری بھرجائی نے کہا...... میں نے ہاں کی تو اس نے اسی وقت بھائی سے بات کر لی۔ بھلی لوک نے مہلت ہی نہیں دی۔''

شبیر اور سلمٰی کبیدہ خاطر تھے مگر ساتھ ہی انہوں نے اطمینان کا سانس بھی لیا کہ سر پر لٹکتی تلوار ہٹ گئی۔ شاید نورین نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ وہ عالیہ کے رشتے کے لیے راضی نہیں ہوں گے اس لیے اس نے اچانک ہی اپنے بھائی کی بیٹیاں مانگ لیں۔ مگر طریقہ ایسا تھا کہ سلمٰی نے محسوس کیا کہ وہ جتا رہی ہو کہ اس کے بیٹوں کو لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔

یہ اور بات تھی کہ اس کے بھائی کی لڑکیاں قطعی ان پڑھ تھیں جب یہ لڑکیاں بیاہ کر اس گھر میں آتیں تو گھر کا ماحول ہی بدل جاتا۔ لڑکیاں ماحول اپنے ساتھ لاتی ہیں اور جلد یا بدیر وہ اپنے گھر میں یہ ماحول رائج کر دیتی ہیں۔

شبیر زمین پر زیادہ محنت کرتا تھا مگر اسے اتنا ہی ملتا تھا جتنا کہ رفیق کو ملتا تھا حالانکہ اس کی زیادہ توجہ اپنے کاروبار کی طرف تھی اور وہ اس سے اچھا کما رہا تھا۔ بیٹا بڑا ہوا تو اسے بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔ شبیر کے دونوں بیٹے پڑھ رہے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیں۔ اس کے لیے وہ انہیں شہر بھیجنے کو بھی تیار تھا۔ گویا آنے والے دس پندرہ سالوں تک اسے اکیلے ہی زمین کا کام دیکھنا تھا۔ نعیم اور عتیق کو فصل میں سے حصہ ملتا تھا اور یہ ان کے حصوں کا تہائی ہوتا تھا۔ اسی طرح بہنوں کو ایک ایک حصہ ملتا تھا۔ کل آمدنی کے اٹھارہ حصے ہوتے تھے۔ زمین تقریباً ایک مربع تھی۔ اگر وراثت تقسیم کی جاتی تو شبیر کے حصے میں چھ ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں آتی۔ ان ہی دنوں رفیق نے پہلی بار وراثت تقسیم کرنے کی بات کی تھی۔

عام طور سے زمین اور جائداد سے غیر متعلق وارث بٹوارے کی بات کرتے ہیں مگر یہ مطالبہ متعلق فرد کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس لیے شبیر اور سب حیران ہوئے مگر جلد معلوم ہو گیا کہ رفیق کا مقصد کیا تھا۔ اسے زمین سے پورا حصہ ملتا تھا اور کاروبار سے بھی اچھا خاصا کما لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بہنوں کا حصہ براہِ راست خرید لے۔ بھائیوں سے معاملہ کر لے اور انہیں قسطوں میں ادائیگی کرتا رہے۔ معاملہ یہاں آ کر اٹک گیا کیونکہ نعیم اور عتیق نے قسطوں میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ نعیم نے کہا۔ ''خوب! جو ہمیں حصہ مل رہا ہے، وہی ہمیں قسط میں دے دیا جائے گا اور زمین تم لوگوں کی ہو جائے گی۔''

شبیر کو بھی یہ تجویز نامناسب لگی تھی۔ اس نے نعیم اور عتیق کی تائید کی۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... یا تو ایک ساتھ رقم دے دی جائے یا پھر جب تک رقم نہیں دی جاتی انہیں حصہ دیا جاتا رہے۔''

''حصہ کیوں؟'' رفیق نے خراب لہجے میں کہا۔ ''زمین ہم نے آباد کی ہے۔ ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ ان کو قسطوں میں لینے میں کیا مسئلہ ہے؟''

''زمین تم نہیں، صرف شبیر دیکھ رہا ہے۔'' نعیم نے جواب دیا۔ ''ہمیں یہ منظور نہیں ہے اگر بٹوارا کرنا ہے تو پورا حصہ دو یا زمین دو۔ ہم خود سودا کر لیں گے۔''

شبیر اس جھگڑے سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس رات وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا اور عالیہ اس کے پاس تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''بابا! آپ لوگ کیوں لڑ رہے تھے؟''

''بس بیٹا! زمین بہت بری چیز ہوتی ہے، بھائی کو

بھائی سے لڑا دیتی ہے۔"

"بابا! تاؤ غصے میں تھے۔"

"ہاں کیونکہ ہم ان کی بات نہیں مان رہے۔"

"تو آپ مان جائیں نا۔"

"وہ غلط بات کہہ رہے ہیں۔"

عالیہ کو ماں باپ دونوں نے ادب و آداب سکھائے تھے کہ بڑے ہر حال میں بڑے ہوتے ہیں اور ان کی بات ماننا چاہیے۔ اس لیے اسے تعجب ہوا۔ "بابا! تاؤ بڑے ہیں۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ بڑوں کی بات ماننا چاہیے۔"

شبیر نے چونک کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ "آپ نے ٹھیک کہا، اگر تاؤ مجھ سے کہتے تو میں مان جاتا مگر وہ تمہارے چاچو کے لیے غلط کہہ رہے ہیں۔ انسان اپنے لیے غلط بات مان سکتا ہے لیکن کسی دوسرے کے لیے اسے کبھی نہیں ماننا چاہیے۔"

عالیہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ "بابا! اگر کوئی دوسرے کے لیے غلط بات کرے تو اسے نہیں ماننا چاہیے؟"

"ہاں کیونکہ اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ آدمی کا اپنا نقصان ہو تو بری بات نہیں ہے لیکن کسی دوسرے کو نقصان ہو، یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

اچانک رفیق والے حصے سے اس کے زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی۔ عالیہ سہم کر باپ سے لپٹ گئی۔ "بابا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

شبیر نے اسے تھپکی دی۔ "کچھ نہیں ہوگا بیٹا! آپ فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

عالیہ نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔ "آپ ٹھیک کر لیں گے۔"

شبیر نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ہاں، میں ٹھیک کر دوں گا۔"

عالیہ کی بات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بے شک یہ اس کا براہِ راست مسئلہ نہیں تھا۔ تنازعہ رفیق، نعیم اور عتیق کے درمیان میں تھا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ دخل نہ دے۔ اس نے اپنی بات کہہ دی تھی مگر اب اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے دخل نہ دیا تو بات زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔ رفیق نے زیادتی والی بات کی تھی اور اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ نعیم بھی کم اکھڑ نہیں تھا۔ بات بڑھتی تو بھائیوں میں خلیج آ جاتی اور شبیر ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اگلے روز اس نے پھر سب بھائیوں کو بٹھایا اور بولا۔ "دیکھو یار! ہم ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ہماری رگوں میں دوڑنے والا خون ایک ہے۔ اگر ہم جھگڑیں گے تو کسی کا بھلا نہیں ہوگا اور دنیا تماشا دیکھے گی۔"

"یہ بات ان لوگوں کو سمجھاؤ۔" رفیق نے نعیم اور عتیق کی طرف اشارہ کیا۔

"رفیق بھائی! آپ بڑے ہیں اور ایسی باتیں چھوٹے کرتے ہیں۔ آپ معاملے کو سلجھانے کی بات کریں۔" اس بار شبیر نے لہجہ بدل کر کہا۔ "اگر آپ نرمی نہیں کریں گے تو بٹوارا زمین کا ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ ہمارے پرکھوں کی زمین غیروں کے پاس چلی جائے۔"

رفیق کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ ویسے بھی شبیر سے ذرا دبتا تھا کیونکہ شبیر کی وجہ سے وہ زمین کی فکر سے آزاد ہو کر کاروبار کرتا رہا تھا۔ اگر شبیر سارا بوجھ خود پر نہ لیتا تو وہ آج لاکھوں کے ہارڈ ویئر اسٹور کا مالک نہ ہوتا۔ رفیق نے کہا۔ "اچھا بھئی اگر تو کوئی حل نکال سکتا ہے تو نکال لے۔"

"میری ایک تجویز ہے۔ تم سب ٹھنڈے دل سے اس پر سوچو۔" شبیر نے بھائیوں کو دیکھا۔ "سوچنا بھی خود ہے، بیویوں سے مشورہ کیا تو بات نہیں بنے گی۔"

شبیر نے یہ بات مزاحیہ انداز میں کہی تھی اس لیے سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر نعیم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بھی نہیں چاہتا کہ ہم بھائیوں کا دل بٹے۔"

"تجویز یہ ہے کہ رفیق بھائی بہنوں کا حصہ خرید لیں۔ میں ایک بھائی کا حصہ خرید لیتا ہوں کیونکہ میری گنجائش اتنی ہی ہے۔ اب رہا دوسرے بھائی کا حصہ تو رفیق بھائی جتنی رقم نقد دے سکتے ہیں، وہ دے دیں اور باقی ہم بینک سے قرض لے کر ادا کر دیں گے۔"

"میں بینک سے قرض نہیں لوں گا۔" رفیق نے اعتراض کیا۔ "اس پر سود دینا پڑے گا۔"

"آپ نے اسٹور کے لیے بینک سے ہی قرض لیا تھا۔" شبیر نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں لیکن میں سود کی اضافی رقم کیوں دوں؟" رفیق نے کہا۔

"اب تم دونوں کیا کہتے ہو؟" شبیر نے نعیم اور عتیق کی طرف دیکھا۔ "تمہیں زیادہ رقم مل جائے گی اور کم رقم قسطوں کی صورت میں لو گے۔"

"تب ہم آمدنی سے اتنا ہی حصہ بھی لیں گے۔" نعیم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"مجھے منظور نہیں ہے۔" رفیق نے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" شبیر نے کہا۔ "تمہیں آمدنی میں سے حصہ میں اپنے حصے کی آمدنی سے دوں گا لیکن......" اس نے کہتے ہوئے رفیق کی طرف دیکھا۔ "اب آپ زمین کو برابر

کا وقت دیں گے۔ دوسری صورت میں آپ جتنا کم وقت دیں گے، آپ کے حصے کی آمدنی اتنی ہی کم ہوجائے گی۔"

رفیق کا منہ لٹک گیا۔ "لیکن مجھے اپنی دکان کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔"

"میں نے آپ سے لازمی وقت دینے کو نہیں کہا ہے۔ اگر آپ اپنے حصے کی پوری آمدنی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو برابر کا وقت دیں ورنہ حصہ کم ہوجائے گا۔"

اب رفیق کے پاس ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا سخت رویہ دکھا کر اپنے لیے لچک کا دروازہ خود بند کرلیا تھا۔ بٹوارا طے ہوگیا تھا اس لیے انہوں پٹش کار سے رابطہ کر کے زمین کا مکمل ریکارڈ حاصل کیا۔ اس کے بعد زمین اور مکان کی مالیت نکلوائی۔ بہنوں کا حصہ رفیق نے اپنے ذمے لے لیا تھا مگر بہنوں نے کہہ دیا کہ وہ اپنا حصہ مشترکہ چاہتی ہیں اور فوری چاہتی ہیں۔ یعنی جب تک انہیں رقم نہیں ملتی بٹوارا مکمل نہیں ہوتا۔ غالباً رفیق کے ذہن میں تھا کہ وہ بہنوں کو بھی توڑ توڑ کر رقم دے گا مگر انہوں نے فوری مانگ کر اس کا منصوبہ ناکام بنا دیا اور اسے ان کو پوری رقم ایک ساتھ دینا پڑی۔ تمام بہن بھائیوں نے شبیر پر اعتماد کیا تھا اور اسی نے چند مہینوں میں بٹوارے کی کارروائی بہ احسن وخوبی مکمل کرلی تھی۔ پچیس میں سے دس ایکڑ زمین اس کے حصے میں آئی اور پندرہ ایکڑ رفیق کے حصے میں آئی۔ مکان کے لیے طے ہوا کہ اس میں نعیم اور عتیق کا برابر کا حصہ ہوگا۔ بہنوں کا حصہ وہ چاروں خرید لیں گے۔ بعد میں اگر کوئی چاہے تو اپنا حصہ کسی کو فروخت کرسکتا ہے۔ مکان کی ساخت ایسی تھی کہ اس کے بہ آسانی چار حصے کیے جاسکتے تھے۔

رفیق نے کہہ دیا تھا کہ وہ زمین کو وقت نہیں دے سکتا اس لیے آمدنی میں حصہ ستر اور تیس فیصد طے ہوا تھا۔ ستر فیصد شبیر کو ملتا جس سے وہ دونوں بھائیوں کو آمدنی میں حصہ اور اپنے حصے کی قسط ادا کرتا جبکہ رفیق صرف قسط کی رقم ادا کرتا۔ چار سال میں شبیر نے اپنے حصے کی قسطیں ادا کر دیں۔ رفیق حسبِ توقع اب تک پوری رقم نہیں دے سکا تھا۔ اگرچہ وہ اب زیادہ نہیں رہی تھی۔ نعیم اور عتیق نے اب شبیر کو منع کردیا تھا کہ آمدنی میں سے حصہ نہ دے۔ اس نے جتنا دے دیا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ ان چار سالوں میں شبیر کو ذرا تنگی رہی تھی کیونکہ اس کی نصف آمدنی تو ایسے ہی نکل جاتی تھی۔ پھر زمین کے خرچے بھی کم نہیں تھے۔ شبیر نے زمین کا باغ والا حصہ لیا تھا اور اس میں نئے درخت لگائے تھے اس لیے اخراجات بڑھ گئے تھے اور پھل کم ہونے سے آمدنی گھٹ گئی تھی۔ بہر حال جیسے تیسے یہ وقت گزر گیا تھا۔

عالیہ تیسری کلاس میں تھی جب اس کی چھوٹی بہن فاریہ پیدا ہوئی۔ اس وقت تک شبیر اور سلمیٰ مزید اولاد کے بارے میں سوچنا بھی ترک کرچکے تھے۔ یہ اوپر والے کی طرف سے تھا۔ اچانک ہی سلمیٰ کو پتا چلا کہ وہ امید سے ہے۔ عالیہ بہن کی آمد پر خوش تھی۔ اسے ایک نئی مصروفیت ہاتھ آگئی تھی۔ اسکول سے آتے ہی وہ فاریہ کے ساتھ لگ جاتی۔ فاریہ کی پیدائش کے وقت عالیہ کو سخت تجسس تھا۔ ماں کو اس نے پل پل دیکھا کہ اس کی جسمانی ہیئت بدل رہی ہے۔ پھر فاریہ کی پیدائش کے بعد وہ پہلے جیسی ہوگئی۔ عالیہ اس بارے میں سوالات کرتی تو سلمیٰ کے لیے جواب دینا مشکل ہوجاتا۔

وہ فاریہ میں مگن ہوگئی تھی۔ چند مہینے بعد جب فاریہ خاصی وزنی ہوگئی تھی تو عالیہ کے لیے اسے گود میں اٹھانا ممکن نہیں رہا تھا۔ تب وہ اسے واکر میں لے کر صحن میں گھومتی تھی۔ کبھی اسے واکر میں چھوڑ کر اس کے اردگرد اپنی سائیکل چلاتی تھی۔ فاریہ اس سے بہت خوش ہوتی۔

اسکول اور تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ پرائمری میں عالیہ نے ایک بار پھر ٹاپ کیا اور اس بار اس نے پورے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔ یہ اسکول کی تاریخ میں ریکارڈ تھا۔ آج تک کسی بچی نے اتنے نمبر حاصل نہیں کیے تھے۔ وہ ضلع میں سب سے زیادہ نمبر لینے والے بچوں میں تیسرے نمبر پر آئی تھی اور اسے وزارتِ تعلیم کی تقریب انعامات میں خصوصی طور پر والدین سمیت بلایا گیا تھا۔ وزیر اعلیٰ اس تقریب میں آئے تھے اور انہوں نے بچوں میں انعامات تقسیم کیے تھے۔ عالیہ کی وزیر اعلیٰ سے انعام لیتے ہوئے تصویر اخباروں میں بھی آئی تھی۔ شبیر نے یہ تصویر انلارج کروا کے گھر کی نشست گاہ میں لگائی تھی۔ اس نے عالیہ کی تعلیمی کارکردگی کی ایک فائل بھی بنائی تھی۔

سب خوش تھے سوائے نورین اور رفیق کے۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے قائل نہیں تھے تو خوش کیوں ہوتے۔ اسی سال انہوں نے شفیق کی شادی کرنے کا اعلان کردیا۔ رفیق اپنے حصے کی زمین اب خود دیکھ رہا تھا۔ ہارڈویئر اسٹور کا کام اس نے مکمل طور پر شفیق کے سپرد کردیا تھا۔ راشد اس کے ساتھ تھا۔ نسیم اور وسیم اسی طرح مارے باندھے پڑھ رہے تھے۔ رفیق اس بات پر شبیر سے خاصے دن ناراض رہا تھا کہ اس نے زمین کی دیکھ بھال کیوں چھوڑی تھی۔ شبیر نے

اس سے کہا تھا کہ اب وہ جوان نہیں رہا ہے اس لیے ساری زمین کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا۔

جس سال عالیہ نے پرائمری پاس کی، اسی سال ظہیر نے میٹرک کرلیا اور کالج میں پڑھنے کے لیے شہر گیا۔ اگرچہ گل پور کا بوائز اسکول اب ہائر سیکنڈری ہو چکا تھا مگر اس کا تعلیمی معیار اچھا نہیں تھا اس لیے شبیر نے ظہیر کو پڑھنے کے لیے شہر نعیم کے پاس بھیج دیا۔ اس نے ایف ایس سی میں داخلہ لیا تھا اور اس کا ارادہ زرعی یونیورسٹی سے کوآپریٹ فارمنگ کے شعبے میں ماسٹر کا تھا۔ عمیر نویں میں آیا تھا۔ شبیر کا ارادہ اسے بھی کالج کے لیے شہر بھیجنے کا تھا۔ عالیہ نے شبیر سے پوچھا۔ ”بابا، جب میں میٹرک کرلوں گی تو کیا مجھے بھی پڑھنے کے لیے شہر بھیجیں گے؟“

”کوئی ضرورت نہیں ہے شہر جانے کی۔“ سلمٰی نے مداخلت کی۔ ”جتنا یہاں پڑھ سکتی ہو بس اتنا کافی ہے۔“

عالیہ گیارھویں سال میں لگ گئی تھی۔ سات آٹھ سال کی عمر میں شبیر نے اسے گود میں اٹھانا اور بٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ سلمٰی نے بھی سمجھایا تھا کہ اب وہ بڑی ہو رہی ہے اور جب لڑکیاں بڑی ہو جائیں تو انہیں باپ سے بھی فاصلہ رکھنا چاہیے لیکن باپ سے لاڈ ویسے ہی تھے۔ ماں کی بات پر اس نے ٹھنک کر باپ کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں نہیں اگر آپ نے اچھے گریڈ سے میٹرک کیا تو میں آپ کو آگے پڑھنے کے لیے شہر بھیجوں گا۔“

”ملک صاحب!“ سلمٰی نے تنک کر کہا۔ ”آپ اسے اور بگاڑیں۔“

”کیا بگاڑ ہے میری بچی میں۔“ شبیر کو اس بات پر غصہ آگیا تھا۔ ”تم ماں ہو کر اس کے بارے میں ایسی بات کر رہی ہو دوسروں کی زبان بول رہی ہو۔“

سلمٰی شرمندہ ہو گئی۔ ”میرے منہ سے نکل گیا۔ خدا نہ کرے جو میری بچی میں کوئی بگاڑ ہو۔“

کچھ عرصے پہلے عتیق نے مکان میں اپنا حصہ شبیر کو فروخت کر دیا تھا۔ اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اور اپنا کام کر رہا تھا۔ بزنس بڑھانے کے لیے سرمایہ چاہیے تھا۔ اس نے پہلے رفیق سے کہا مگر اس نے جو قیمت لگائی وہ عتیق کو قبول نہیں تھی۔ اس نے شبیر سے بات کی۔ ذرا سے فرق سے عتیق کی مطلوبہ قیمت اسے مل گئی اور شبیر نے اس کا حصہ خرید لیا۔

اب شبیر تقریباً ہزار گز کے پلاٹ میں نصف کا مالک تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے اگرچہ اس کے بیٹے شہر میں

پڑھتے اور شاید وہیں ملازمت بھی کرتے لیکن وہ گل پور واپس بھی آسکتے تھے۔ خاص طور سے ظہیر کا ارادہ زرعی یونیورسٹی سے پڑھ کر زمین پر کام کرنے کا تھا۔ عمیر نے ابھی تک اپنا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ رفیق کے بچے خاصے بڑے ہو چکے تھے۔ شفیق، راشد، نسیم اور وسیم کے علاوہ نورین کے ایک فوت ہو جانے والے کزن کی بیٹی بھی ان کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ تعلیم کا فرق دونوں گھرانوں میں بنیادی فرق بن گیا تھا اور اس وجہ سے کزنز کا آپس میں زیادہ میل جول بھی نہیں تھا۔ پھر نورین جس طرح عالیہ کے پیچھے پڑی رہتی تھی، شبیر کو یہ بات بھی بری لگتی تھی۔ شبیر ماحول کی اس تبدیلی سے اپنے خاندان کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے مکان تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب اس نے رفیق سے بات کی تو اس نے حیرت سے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔''

''اللہ نہ کرے جو کوئی مسئلہ ہو مگر اب بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ پہلے ہم ایک خاندان تھے اب خود ہمارے خاندان بن گئے ہیں اس لیے میں نے مکان میں حصہ الگ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسرے میں اپنے حصے کو نئے سرے سے تعمیر بھی کرانا چاہتا ہوں اور ایسا الگ ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔''

رفیق نے برا منایا تھا مگر نورین نے ہنگامہ کر دیا۔ دراصل نو میں سے چھ کمرے عملاً اس کے پاس تھے اور تقسیم کی صورت میں اسے کم سے کم دو کمروں سے دست بردار ہونا پڑتا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سخت ردعمل دیا تو شبیر نے بھی اسی کی طرح جواب دیا۔ ''بھابی میں کسی کا حق نہیں مار رہا ہوں، اپنا حصہ لے رہا ہوں۔ آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟''

شبیر کے دوٹوک انداز پر نورین نے بات بدلی۔

''میں تو کہہ رہی ہوں کہ دونوں بھائی مل کر رہیں۔''

''بھائی کب الگ ہو رہے ہیں۔'' شبیر نے کہا۔

''ساری دنیا میں بھائی اسی طرح الگ الگ رہتے ہیں مگر ان کے رشتے تھوڑی ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے مکان الگ ہوں گے، ہم الگ نہیں ہوں گے۔''

طوعاً و کرہاً رفیق اور نورین اس تقسیم پر آمادہ ہوئے۔ مکان کو سامنے کے رخ سے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ شبیر کے حصے میں چار کمرے آئے تھے لیکن عقب میں واقع مہمان خانے والے دو کمرے بھی اس کے حصے میں آئے تھے۔ اگرچہ یہ شبیر کے کام کے نہیں تھے مگر رفیق نے انہیں اس کے حصے میں شمار کر دیا اور تقسیم پر جو خرچہ آ رہا تھا، وہ اس کے ذمے کر دیا۔ شبیر نے تقسیم ہوتے ہی اپنے حصے کا مکان تڑوا دیا اور اس کی جگہ جدید انداز کے مکان کی تعمیر شروع کر دی۔ یہ دو منزلہ اور پانچ بیڈ رومز والا مکان تھا۔ اس میں دو بیڈ رومز نیچے اور تین اوپر تھے۔ نیچے ڈرائنگ روم کے ساتھ لاؤنج بھی تھا۔ اوپر تین بیڈ رومز کے ساتھ ایک لاؤنج تھا۔ اوپر اور نیچے دو مکمل کچن تھے۔ جب تک مکان تعمیر ہوتا رہا وہ لوگ مہمان خانے والے کمروں میں رہتے رہے۔ تعمیر مکمل ہونے میں ایک سال کا عرصہ لگا اور یہ سال انہوں نے خاصا مشکل سے گزارا تھا لیکن جب مکان مکمل ہوا اور وہ اس میں منتقل ہوئے گویا ایک سال کی تکلیف کا ازالہ ہو گیا۔

عالیہ ساتویں کلاس میں آ گئی تھی۔ بچپن سے وہ جسمانی طور پر متحرک تھی۔ اسے ایسے کھیل پسند تھے جس میں اچھل کود اور بھاگ دوڑ ہو۔ سائیکل کا جنون اب بھی برقرار تھا۔ اسے کھانے کا شوق نہیں تھا مگر غذائیت والی چیزیں پسند کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بڑھوتری اپنی عمر کے مقابلے میں تیز تھی۔ وہ ابھی بارہ کی نہیں ہوئی تھی لیکن لگتا تھا جیسے چودھویں سال میں لگ گئی ہو۔ اس کی جسمانی تبدیلیوں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ سلمٰی نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر دوپٹا اوڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اسکول کے لیے سفید رنگ کی چادر لے لی تھی۔ چھٹی میں آنے کے بعد وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ پیدل آتی جاتی تھی۔ بلوغت کے آثار بھی قبل از وقت نمودار ہو گئے تھے۔

سلمٰی کے لیے اب اسے سمجھانا آسان ہو گیا تھا۔ عالیہ کے لیے یہ ایک نئی دنیا تھی۔ وہ تعجب سے ماں کی باتیں سنتی کہ چند تبدیلیوں سے سب کچھ ہی بدل جاتا ہے۔ پہلے اس کی شرماہٹ لاشعوری ہوتی تھی، اب وہ شعوری طور پر شرم و حیا کا خیال رکھنے لگی تھی۔

جب وہ دس سال کی ہوئی اور سلمٰی نے باپ کے ساتھ اس کی شام کی سیر پر پابندی لگائی تو اس وقت عالیہ بہت روئی تھی شبیر نے بھی حمایت کی مگر سلمٰی ڈٹ گئی۔ اس نے کہا۔ ''یہ بڑی ہو رہی ہے اس کا یوں روز باہر جانا مناسب نہیں ہے۔''

''اسکول بھی تو جاتی ہوں۔'' عالیہ نے روتے ہوئے کہا۔

''وہ سب لڑکیاں جاتی ہیں مگر یوں باپ کے ساتھ کون لڑکی روز شام کو سیر کو جاتی ہے۔'' سلمٰی نے جواب دیا۔ ''بس میں نے کہہ دیا، یہ روز کی سیر بند۔''

اب اس نے بلا ضرورت نکلنا بند کر دیا تھا۔ وہ پہلے

باہر جاتی تھی تو کوئی توجہ نہیں دیتا تھا مگر اب باہر جاتی تو لوگ گھورتے اور اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسکول میں اس کی چند سہیلیاں بن گئی تھیں اور یہ سب پڑھنے لکھنے والی سلجھی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ عالیہ بھی کسی لڑکی کے ساتھ اور کبھی ماں کے ساتھ ان کے گھر جاتی تھی۔

اس کے بھائی یہاں نہیں تھے۔ شفیق کا رویہ بھائیوں جیسا تھا مگر راشد اب اسے کسی اور نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس کے آس پاس منڈلاتا اور اسے غصہ آتا تھا مگر ایک گھر میں رہنے والے کو منع بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ انسان سارا دن کمرے میں بند ہو کر بیٹھا رہے۔ پھر علیحدگی سے ذرا پہلے شفیق کی شادی ہوئی تھی اور اس کی بیوی نے آ کر رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ وہ صرف جاہل اور ان پڑھ ہی نہیں، بدتمیز اور اجڈ بھی تھی۔ عالیہ سے اس نے پہلے دن سے بیر پال لیا تھا اور بلاوجہ اس پر تعلیم کے حوالے سے طنز کرتی رہتی تھی۔ عالیہ نظر انداز کرتی کہ ایک تو وہ اس سے عمر میں خاصی بڑی تھی بلکہ شفیق سے بھی ایک سال بڑی تھی۔ پھر عالیہ کو اس کی سطح پر آ کر اس کی باتوں کا جواب دینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اگر سلمٰی کبھی غصے میں آجاتی تو وہ ماں کو ٹھنڈا کرتی تھی۔

اس لیے جب ان کی رہائش الگ ہوئی تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ یہاں کوئی اسے گھورنے والا اور باتیں سنانے والا نہیں تھا۔ ماحول بھی بدل گیا تھا۔ اس کے ماں باپ مہذب تھے۔ ان کا طرزِ گفتگو اور زندگی کے ادب وآداب اس کے تایا کے گھرانے سے بالکل مختلف تھے۔ وہ خود بھی ماں باپ کا پرتو تھی۔ اس لیے الگ ہونے پر وہ سب سے زیادہ خوش تھی۔ جدید طرز کا یہ مکان اس کو بے حد پسند آیا تھا۔ پہلے عالیہ اپنی سہیلیوں کو گھر نہیں بلا سکتی تھی کیونکہ اسے بعض اوقات شرمندگی بھی اٹھانا پڑتی تھی۔ اب وہ اپنی سہیلیوں کو بلا سکتی تھی۔ امتحان کے دنوں میں وہ سب مل کر پڑھتی تھیں۔

وہ نویں میں آئی تو فاریہ نے بھی اسکول جانا شروع کر دیا۔ جیسے باپ نے اسے ابتدائی پڑھنا لکھنا سکھایا تھا اسی طرح عالیہ نے چھوٹی بہن کو سکھایا اور اسے آسانی سے اسکول میں داخلہ مل گیا۔ بورڈ کے امتحان کا وقت آیا تو عالیہ پڑھائی کو پہلے سے زیادہ وقت دینے لگی۔ اب وہ ہر روز رات کے کھانے کے بعد دو سے ڈھائی گھنٹے پڑھتی تھی۔ خاص طور سے انگریزی اور اردو میں بہت محنت کر رہی تھی کیونکہ اس نے میٹرک کرنے والی لڑکیوں کو دیکھا تھا کہ وہ ان مضامین کو خاص اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ بورڈ میں پوزیشن حاصل کرے۔

سلمٰی اس کی اتنی محنت سے پریشان ہو جاتی تھی۔ اسے بیٹی کا پڑھنا اور پوزیشن لینا اچھا لگتا تھا مگر اس کی وہی روایتی سوچ تھی کہ عالیہ بہت پڑھ کر کیا کرے گی۔ وہ عالیہ سے کہتی۔

”بیٹا اتنی محنت مت کرو کہ بیمار پڑ جاؤ۔ اپنی صحت بھی دیکھو۔“

”امی ٹھیک تو ہوں۔“ وہ بے پروائی سے کہتی لیکن یہ حقیقت تھی کہ بہت زیادہ محنت اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ وہ صبح چھ بجے جاگتی تھی اور اس کے بعد اسے آرام کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ عالیہ نے ناظرہ دوسری جماعت میں ختم کر لیا تھا مگر وہ اس کے بعد بھی مسلسل پڑھتی رہی تھی۔ بی بی اب فاریہ کو بھی پڑھا رہی تھیں۔ بی بی کے جانے کے بعد عالیہ کا کچن ٹائم شروع ہو جاتا تھا۔

سلمٰی نے شام کی چائے اور دوسرے لوازمات اس کے ذمے لگا دیے تھے۔ اس وقت شبیر بھی آجاتا تھا۔ وہ باپ کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتی۔ پھر فاریہ کو پڑھانے بیٹھ جاتی۔ اس کا اور فاریہ کا بیڈروم مشترک تھا۔ وہ جلدی سو جانے کی عادی تھی اس لیے عالیہ اسے ڈسٹرب نہیں کرتی تھی اور پڑھنے کے لیے نشست گاہ میں آجاتی۔ اس نے سائنس لی تھی۔ اختیاری مضامین کی تیاری تو اسکول میں بہت اچھی کرادی جاتی تھی۔ اسے گھر میں صرف اسی وقت پڑھنے کی ضرورت پیش آتی تھی جب اگلے دن کوئی ٹیسٹ یا پریکٹیکل ہو۔

میٹرک کے پیپرز ہوئے تو اس نے بہت اچھی تیاری کے ساتھ پیپرز دیے اور جب نتیجہ آیا تو اس نے اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور بورڈ میں اس کی بارھویں پوزیشن آئی تھی۔ گل پور گرلز اسکول کی کسی لڑکی نے آج تک بورڈ میں پوزیشن نہیں لی تھی۔ اسکول نے عالیہ کے اعزاز میں ایک تقریب کی جس میں مقامی قومی اسمبلی کے ممبر کو بہ طور مہمانِ خصوصی بلایا تھا۔ ملک شاہد عظیم کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ روایتی جاگیر دار تھا اور اس نے دھونس دھاندلی اور اثر رسوخ سے اپنی زمین اور دولت میں بہت اضافہ کیا تھا۔ اس علاقے کی سیٹ پر وہ ہمیشہ منتخب ہوتا آیا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ عادی شرابی اور عورتوں کے چکر میں رہنے والا شخص تھا۔ تین شادیاں کی تھیں اور اس کے علاوہ اس نے کتنی رکھی ہوئی تھیں، اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ اخبارات میں آئے دن اس کے اسکینڈل شو بزنس

سے وابستہ خواتین کے حوالے سے آتے تھے۔ جب عالیہ اس سے انعام لینے آئی تو اس نے بہت غور سے اس کا جائزہ لیا اور آہستہ سے بولا۔

''تم جتنی ذہین ہو اتنی ہی خوب صورت بھی ہو۔''

عالیہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ آج تک کسی غیر مرد نے یوں اس کی تعریف نہیں کی تھی۔ ملک شاہد کے انداز میں ہوس نمایاں تھی مگر عالیہ ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ اس تعریف میں چھپی ہوس کو پہچان سکتی۔ ملک شاہد نے شیلڈ اور سرٹیفکیٹ کے ساتھ اسے اپنی جیب سے دس ہزار روپے کا انعام بھی دیا۔ نہ جانے کیوں عالیہ کو اس بڑی رقم کی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ ماں باپ کے ساتھ گھر جا رہی تھی تو اس کے ذہن میں رہ رہ کر ملک شاہد کا جملہ گونج رہا تھا۔ اس نے گھر آکر آئینے میں خود کو دیکھا۔ کیا وہ واقعی خوب صورت تھی؟ اس کا رنگ گلابی تھا۔ جیسے دودھ میں گلاب ملا دیا گیا ہو۔ ہلکی براؤن چمکتی ہوئی آنکھیں۔ بڑے ہونے پر بالوں کا رنگ بھی اسی طرح براؤن ہو گیا تھا اور اب گولڈن شیڈ نہیں آتا تھا۔ نازک سے ہاتھ پاؤں تھے۔ جسم میں نسوانی نزاکتیں نمایاں ہونے لگی تھیں۔

اسکول میں فنکشن ہوا تو دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی تیار ہو کر اور اپنا ایک بہترین سوٹ پہن کر گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے سادہ چوٹی یا پونی ٹیل کے بجائے ہیئر اسٹائل خود بنایا تھا۔ اس کی سہیلیاں جو برسوں سے اسے دیکھ رہی تھیں، اس روز اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ سب نے اسے گھیر لیا اور اس کی اتنی تعریفیں کیں کہ وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔ جب وہ فنکشن کے لیے جا رہی تھی تو سلمٰی نے اسے نظرِ بد سے بچانے کے لیے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا تھا اور بولی۔ ''اللہ بری نظر سے بچائے۔ آج میری بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہے۔''

وہ اسے ماں کی محبت سمجھی تھی۔ پھر راستے میں شبیر نے بھی کہا۔ ''آج میری بیٹی چاند جیسی لگ رہی ہے۔''

شبیر نے گاڑی لے لی تھی۔ وہ اسی میں انہیں چھوڑنے اور لینے آتا تھا لیکن ہر روز نہیں۔ ایسا کبھی کبھی اور خاص موقع پر ہوتا تھا۔ اس روز بھی وہ فنکشن کی وجہ سے اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔ شبیر ہی اسے لینے آتا۔ جانے سے پہلے شبیر نے اسے اپنا اضافی موبائل دے دیا۔ ''جب فنکشن ختم ہونے والا ہو تو مجھے کال کر دینا، میں آجاؤں گا۔''

فنکشن کے بعد جب وہ گھر جا رہی تھی تو اس نے سنسنی خیز انداز میں باپ کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''بابا! آج میری سب سہیلیوں نے اور ٹیچرز نے میری اتنی تعریف کی کہ میں بہت اچھی اور پیاری لگ رہی ہوں۔''

شبیر نے آج تک اس پر غور نہیں کیا تھا کہ اب اس کی بیٹی بڑی ہو رہی تھی۔ جب عالیہ نے یہ بات کہی تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور اسے پہلی بار احساس ہوا کہ عالیہ اب بچی نہیں رہی تھی۔ عالیہ نے کہا۔ ''بابا! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

وہ چونک کر بولا۔ ''میں تو ہمیشہ سے کہتا ہوں کہ میری بیٹی سب سے پیاری لگتی ہے۔''

عالیہ جھینپ گئی۔ ''ہاں، آپ اور امی تو ہمیشہ کہتے ہیں۔''

عالیہ اس پر جھینپ گئی تھی کہ اس کے نزدیک ماں باپ کے کہے کی اتنی اہمیت نہیں تھی لیکن آج جب دوسروں نے کہا تو وہ اتنی پُرجوش ہو رہی تھی۔ شبیر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''عالیہ! اب آپ بڑی ہو رہی ہیں۔ آپ کی ذمے داریاں بڑھ رہی ہیں۔ اب آپ نے اپنے ساتھ ہمارا خیال بھی رکھنا ہے۔''

''بابا! میں آپ کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔'' عالیہ فکرمند ہو گئی۔ ''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟''

''اللہ نہ کرے جو آپ سے کبھی غلطی ہو۔ میں گھر کی نہیں گھر سے باہر کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کی ایک زندگی گھر سے باہر بھی ہے۔ اس کی ذمے داریاں آپ کو خود پوری کرنی ہیں اور ہمارا خیال یوں رکھ سکتی ہیں کہ ہماری عزت کا خیال رکھیں کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ہمیں اللہ یا دوسروں کے ساتھ اپنی نظر میں بھی شرمندہ ہونا پڑے۔''

عالیہ اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''مجھے کیا کرنا ہوگا بابا؟''

''وہ سارے کام جو کرتے ہوئے آپ کے دل اور ذہن پر بوجھ نہ آئے اور آپ کو فکر نہ کرنی پڑے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ اس کے الٹ ایسے سارے کاموں سے دور رہنا ہوگا جن کے کرنے سے آپ کے ذہن پر بوجھ آئے۔'' شبیر نے اسے آسان لفظوں میں سمجھایا۔

''بابا! میں ایسا کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔'' اس نے وعدہ کرنے کے انداز میں کہا۔

یہاں سے عالیہ کی معصومیت کے ساتھ ساتھ ذمے داری کا دور بھی شروع ہو گیا تھا۔ وہ باپ کی بات پوری طرح سمجھ نہیں سکی تھی مگر اس نے باپ کی دی ہوئی مثال ذہن میں بٹھا لی تھی اور اس کے مطابق عمل کرنے لگی تھی۔ اور اس نے اپنی سہیلیوں کی طرح بابا سے موبائل کی فرمائش نہیں کی تھی

اور اسی طرح جب وہ کسی سہیلی کے ہاں جاتی اور اسے دیر ہو جاتی اور سہیلی اس بارے میں جھوٹ بولنے کو کہتی تو وہ انکار کر دیتی کہ اس کے نزدیک ماں باپ سے جھوٹ بولنا گناہ سے کم نہیں تھا۔ ماں باپ پر اعتماد کے معاملے میں وہ اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اس نے دو لڑکیوں سے دوستی اسی وجہ سے چھوڑ دی تھی کہ وہ ماں باپ سے جھوٹ بولتی تھیں اور ان کے اعتماد کو دھوکا دیتی ہیں۔ عالیہ کے لیے ماں باپ اور خاص طور سے باپ ایک سایہ دار درخت کی طرح تھا۔ اس کا اعتماد اور محبت عالیہ کی سب سے بڑی دولت تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ چھاؤں اور دولت اچانک اس سے چھن جائے گی۔

میٹرک میں اس کی کامیابی کی خوشی میں شبیر نے خاندان اور واقف کاروں کی دعوت کی تھی۔ دعوت کا اہتمام باغ میں ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔ وہیں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سیکڑوں لوگ مدعو تھے۔ گاؤں میں دعوت دوپہر کی ہوتی ہے۔ وہ شام کے وقت گھر آئے تو شبیر کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اسے پیٹ میں تکلیف اور متلی کی کیفیت ہو رہی تھی۔ اس نے توجہ نہیں دی اور اسے بدہضمی سمجھا۔ اس کے پاس حکیمی چورن تھا، اس نے رات وہی کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح کے قریب شدید تکلیف سے وہ بیدار ہوا۔ اس کا پیٹ نیلا ہو گیا تھا اور پھول رہا تھا۔ تکلیف ایسی تھی کہ وہ چیخیں مار رہا تھا۔ ظہیر اور عمیر آئے ہوئے تھے۔ وہ اسے لے کر گل پور کے واحد ڈاکٹر کے پاس بھاگے اور اس نے شبیر کو دیکھتے ہی کہا۔ ''اس کا اپنڈکس پھٹ گیا ہے، فوری کسی بڑے اسپتال لے جاؤ ورنہ یہ بچے گا نہیں۔''

ہائی وے پر ایک بڑا اسپتال تھا مگر وہ گل پور سے خاصے فاصلے پر تھا۔ ظہیر اور عمیر نیم بے ہوش شبیر کو لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ ظہیر تیز ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ کچھ دیر میں اسپتال پہنچ جاتے مگر بدقسمتی سے ایک بڑا ٹریلر ٹرک اس طرح الٹ گیا تھا کہ اس نے پوری ہائی وے بلاک کر دی تھی۔ کچے میں ساتھ نالا تھا۔ ظہیر نے گاڑی واپس موڑی اور کئی کلومیٹر پیچھے کے کٹ تک لا کر وہ پہلے ہائی وے کی مخالف سمت میں گیا اور جب اگلا کٹ آیا تو وہ دوبارہ راستے پر آیا۔ اس چکر میں آدھا گھنٹا ضائع ہوا تھا اور یہی زندگی و موت میں فرق بن گیا۔ وہ اسپتال پہنچے اور شبیر کو آپریشن روم لے جایا جا رہا تھا کہ اس نے ظہیر اور عمیر سے کہا۔ ''میرے بعد اپنی ماں اور بہنوں کا خیال رکھنا۔''

ظہیر روہانسا ہو گیا۔ ''ایسا نہ کہیں بابا......''

''نہیں، وعدہ کرو ایسا ہی کرو گے؟'' شبیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ظہیر نے سر ہلایا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

شبیر نے آپریشن ٹیبل پر آخری سانسیں لی تھیں، اس کا پیٹ صاف کیا جا رہا تھا کہ اس نے کلمہ پڑھا اور جان دے دی۔ کچھ دیر بعد آپریشن کرنے والا ڈاکٹر ظہیر اور عمیر سے افسوس کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اگر انہیں آدھا گھنٹا پہلے لے آتے تو یہ بچ سکتے تھے۔''

آدھے گھنٹے کا فرق زندگی و موت کا فرق بن گیا تھا۔

☆☆☆

اس کے لیے ایک لمحہ معصومیت کا تھا۔ اگرچہ یہ اتنا طویل تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے سترہ سال اس میں دیکھ لیے تھے۔ اس کے باوجود یہ پلک جھپکتے طے ہو گیا۔ پھر آگہی کا لمحہ شروع ہوا۔ اس نے کھڑکی سے ایک لڑکے اور لڑکی کو ہم آغوش ہوتے دیکھا۔ لڑکی کے چہرے کی چمک اور ہاتھوں کی حنا بتا رہی تھی کہ اس کے لیے آگہی کا لمحہ گزرے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ نو بیاہتا جوڑا تھا۔

☆☆☆

دوسرا لمحہ آگہی......!

یونیورسٹی میں اس کا دوسرا ہفتہ تھا اور اس کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ بس چند کلاس فیلو لڑکیوں سے ہیلو ہائے تھی۔ یونیورسٹی کا ماحول اس کے لیے ایسا ہی تھا کہ ساری عمر کسی چھوٹی سی ندی یا جھیل میں رہنے والی مچھلی اچانک کسی بڑے اور بپھرے ہوئے دریا میں پہنچ جائے۔ جہاں بے شمار لہریں تھیں اور ہر لہر کے پیچھے ایک نئی دنیا اور اس دنیا کے اجنبی باسی تھے۔ جب یونیورسٹی کے وی سی نے آڈیٹوریم میں اس گروپ کا تعارف کرایا جن کی انٹر میں پوزیشن کی وجہ سے انہیں یونیورسٹی نے اسکالرشپ دیا ہے، تب وہ اس مجموعے سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی کیونکہ اس میں لڑکے لڑکیاں مکس تھے اور وہ سب آپس میں یوں مل کر کھڑے تھے کہ ان کے جسم ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ وی سی نے اسے دور کھڑے دیکھ کر ڈائس سے ہی کہا۔ ''مس شبیر! کلوز یور فرینڈز...... بی کاز دے ول بی یور کلوز فرینڈز۔''

وی سی کی بات پر سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا تھا اور وہ شرمندگی کے ساتھ گروپ کے نزدیک آگئی تھی۔ اسے لڑکوں سے اتنا نزدیک ہونے میں الجھن ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس نے آج تک کو ایجوکیشن میں نہیں پڑھا تھا۔ اس

نے انٹر بھی اپنے اسکول سے کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے جس سال اس نے میٹرک کے پیپرز دیے اسی سال اسکول انٹر بورڈ میں رجسٹرڈ ہو گیا اور اسے انٹر کلاسز کی اجازت مل گئی تھی۔ عالیہ کو خدشہ تھا کہ انٹر میں اسکول کا وہ معیار نہیں ہو گا کیونکہ اس کے لیے ساری ٹیچرز نئی اپائنٹ کی گئی تھیں اور ان میں سے بیشتر نے پہلے بھی کہیں نہیں پڑھایا تھا، صرف ڈگری کے بل بوتے پر ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ شبیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس نے اچھے گریڈ سے میٹرک کیا تو اسے شہر کے کالج بھیجے گا مگر اس کا وعدہ اس کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ جب اس کے آگے پڑھنے کا وقت آیا تو سلمیٰ نے اس سے یہیں پڑھنے کو کہا۔ اس کے پاس ماں کی بات ماننے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

باپ کی اچانک موت ایسا سانحہ تھی کہ اسے لگا جیسے باپ نہیں وہ خود مر گئی ہو۔ اپنڈکس کا زہر جسم میں بھی پھیل رہا تھا اور لاش خراب ہونے کا خدشہ ہی تھا۔ اس لیے میت کو جلد تدفین کے لیے پہلے سے غسل کفن کے مرحلے سے گزار کر گھر لایا گیا تھا۔ اگر شبیر کے ہونٹ نیلے اور کسی کسی قدر سیاہی مائل نہ ہوتے تو لگتا کہ وہ سو رہا ہے۔ عالیہ کو بالکل یقین نہیں آرہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح بار بار بھائیوں سے پوچھ رہی تھی۔ ”بابا سو تو نہیں رہے ہیں۔ ڈاکٹر غلط بھی کہہ سکتا ہے۔“

ظہیر بڑا ہونے کی وجہ سے ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر عالیہ کی حالت اور سوال اسے بھی رلا رہے تھے۔ دوپہر تک شبیر کو اسی قبرستان... میں دفنا دیا گیا جہاں وہ ہر جمعے کو باقاعدگی سے فاتحہ خوانی کے لیے جاتا تھا۔ اس وقت قبرستان کا یہ حصہ بھی بھرنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اسے حفاظتی دیوار کے پاس جگہ ملی تھی۔ میت والے گھر میں پہلے چوبیس گھنٹے بہت مشکل ہوتے ہیں۔ عالیہ کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ سلمیٰ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جب پانی چھڑکا اور پلایا جاتا تو اس کے حواس بحال ہوتے تھے۔ چوبیس گھنٹے بعد عالیہ نے محسوس کیا کہ اسے ماں اور چھوٹی بہن کی خاطر خود کو سنبھالنا ہو گا۔ وہ باپ کے زیادہ نزدیک تھی اس لیے اس کی ذمے داری بھی زیادہ بنتی تھی۔ وہ خود کو، ماں اور بہن کو سنبھالنے لگی۔ گھر تعزیت کے لیے آنے والے رشتے داروں اور واقف کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ تین دن کا سوگ گزرا تو گھر خالی ہونے لگا۔ وہ بھی غم کے اس مرحلے میں آگئے تھے جب یہ برداشت کے قابل ہو جاتا ہے۔

ظہیر زرعی یونیورسٹی میں ماسٹر کے پہلے سال میں تھا۔ اسے تعلیم مکمل کرنے کے لیے مزید پونے دو سال درکار تھے۔ عمیر نے انجینئرنگ لی تھی اور اس کے دوسرے سال میں تھا۔ شبیر گھر کا واحد کفیل تھا۔ اگرچہ زمین، باغ اور دوسرا سب ویسا ہی تھا مگر ان سب کو دیکھنے اور چلانے والا نہیں رہا تھا۔ سوئم کے بعد نعیم اور عتیق نے سلمیٰ سے بات کی اور اس سے پوچھا کہ اب زمین اور باغ کے معاملات کا کیا ہو گا۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے کسی مرد کی ضرورت تھی۔ ظہیر اور عمیر ابھی پڑھ رہے تھے۔ نعیم اور عتیق اپنی ملازمتوں پر ہوتے تھے۔ اس موقع پر رفیق نہیں تھا کیونکہ نعیم اور عتیق نے سلمیٰ کا عندیہ لینے کے لیے ملاقات کی تھی۔ وہ دونوں اپنے بڑے بھائی کی خود غرضی بھگت چکے تھے۔ سلمیٰ کے ہوش اب تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ اس نے ان سے ہی پوچھا۔

”میں کیا کروں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“

نعیم نے آہستہ سے کہا۔ ”بھابی! آپ کو حوصلہ کرنا ہو گا۔ زمین کی دیکھ بھال آپ کو ہی کرنا ہو گی جب تک ظہیر اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتا۔“

”نعیم بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اسے وقتی طور پر کسی کے حوالے کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ شبیر بھائی کے وارث آپ لوگ ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟“

سلمیٰ اب سمجھ رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”تم دونوں ٹھیک کہہ رہے ہو اور مجھے بروقت خبردار کر دیا۔ اب میں اس بات کو ذہن میں رکھوں گی۔“

عتیق نے سر ہلایا۔ ”ہم یہی چاہتے ہیں، کاش کہ ہم یہاں ہوتے تو آپ کے لیے سب کرتے مگر ہماری اپنی مجبوریاں ہیں۔ ورنہ ہمارے اصل بڑے بھائی تو شبیر بھائی ہی تھے۔ اس کے باوجود اگر ضرورت پڑی تو میں اپنے کام چھوڑ کر بھی آپ کے پاس آجاؤں گا۔ کوئی مشکل ہو تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔“

سلمیٰ اپنے دیوروں کی شکر گزار ہوئی جنہوں نے اسے بروقت خبردار کیا تھا۔ اس نے اسی رات ظہیر سے بات کی۔ وہ بھی سمجھدار تھا اور اپنے تایا کی فطرت سمجھتا تھا اس نے بھی ماں سے یہی کہا۔ ”باغ اور زمین ہمیں خود دیکھنی ہے، ایک دن کے لیے بھی کسی کے حوالے نہیں کرنی ہے۔“

مسئلہ یہ تھا کہ جب تک سلمیٰ عدت میں تھی، وہ باہر نہیں جاسکتی تھی۔ ظہیر یا عمیر میں سے کسی کی موجودگی لازمی تھی۔ اس موقع پر ظہیر نے اپنے سمسٹر کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ تین مہینے گزر چکے تھے اور اب تین مہینے بعد نیا سمسٹر شروع ہوتا مگر مجبوری تھی۔ اگرچہ سلمیٰ کی عدت چار مہینے بعد ختم ہوتی مگر تب تک ایک مہینے کا فرق رہ جاتا۔ ظہیر کو

باغ کے معاملات سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اوراس نے سوئم کے بعد ہی باغ جانا شروع کر دیا تھا۔شبیر کی وفات کے دو ہفتے بعد رفیق نے سلمٰی سے کہا کہ وہ زمین کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے رہا ہے تو ماں سے پہلے ظہیر نے انکار کر دیا۔ ''شکریہ تایا جی! میں دیکھ لوں گا۔''

رفیق مایوس ہوا۔ ''پتر! تجھے ابھی ان معاملات کا نہیں پتا۔''

''نہیں ہے تو پتا چل جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں تایا جی...... اگر مجھے مشکل ہوئی تو میں آپ سے مشورہ ضرور کروں گا۔''

نورین نے کہا۔ ''لو جی، آپ ان کی ہمدردی میں مرے جا رہے ہو اور یہ ہیں کہ منہ ہی نہیں لگا رہے۔''

''آج کل ہمدردی کا دور ہی نہیں ہے۔ خود بھگتیں گے۔'' رفیق نے بگڑ کر کہا اور وہاں سے اٹھ گیا اس کے بعد ان لوگوں نے آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ سلمٰی اور بچوں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ عمیر واپس چلا گیا تھا۔ ظہیر کو سلمٰی کی عدت ختم ہونے سے ذرا پہلے جانا پڑا تھا مگر وہ ماں کو باغ کے معاملات کے بارے میں سب بتاتا رہتا تھا اور سلمٰی زبانی طور پر بہت کچھ جان گئی تھی۔ عدت ختم ہونے کے بعد اس نے خود باغ کے معاملات دیکھنا شروع کر دیے۔ پھل اترنے کا وقت آیا تو ظہیر اور عمیر مختصر چھٹی لے کر آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی نگرانی میں یہ کام کرایا تھا۔ ابھی وراثت کا مسئلہ نہیں اٹھایا تھا اور سارے معاملات جوں کے توں چل رہے تھے۔ البتہ بینک اکاؤنٹ سلمٰی کے نام سے کھولا گیا تھا اور ساری رقم اسی میں آتی تھی۔ سلمٰی ذہین عورت تھی۔ اس نے زمین بھی دیکھی اور فصل کے تاجروں سے کاروباری ڈیلنگ بھی کرتی رہی۔

عالیہ کی انٹر کی کلاسز شروع ہونے والی تھیں۔ خوش قسمتی سے اہم مضامین پڑھانے والی ٹیچرز محنتی اور طالبات پر توجہ دینے والی تھیں۔ اس نے ایف ایس سی یعنی سائنس ہی چنی تھی۔ اس میں ایک اضافی مضمون کمپیوٹر کا تھا۔ سال کے اختتام تک وہ اپنی تیاری سے مطمئن ہو گئی تھی۔ اضافی مدد اسے انٹرنیٹ سے ملی۔ جب وہ میٹرک کر رہی تھی تب ہی شبیر نے کمپیوٹر لیا تھا اور ڈی ایس ایل لگوا لیا تھا تا کہ عالیہ اور قاریہ ان چیزوں سے بھی واقف ہو سکیں۔ یہ جدید کمپیوٹر اس نے نعیم سے منگوایا تھا۔ فون لائن پہلے ہی تھی بس اسے ڈی ایس ایل کرنا تھا۔ گل پور میں بھی انٹرنیٹ دستیاب تھا۔

ایک شخص کے نہ ہونے سے اتنا فرق پڑتا ہے کہ انسان کی زندگی ہی بدل کر رہ جاتی ہے۔ یہ بات عالیہ نے باپ کے بعد جانی تھی اگرچہ ظہیر اور عمیر لڑکے اور اس سے بڑے تھے۔ قاریہ سب سے چھوٹی تھی مگر جو مقام عالیہ کو حاصل تھا، وہ کسی کو نہیں ملا تھا۔ باپ تھا تو اس کے چہرے کی ہلکی سی کبیدگی اور آنکھوں کی نہ دکھائی دینے والی نمی بھی جان لیتا تھا۔ مگر اس کے جاتے ہی سب بدل گیا۔ بھائیوں کا رویہ اس سے اچھا تھا۔ وہ اس کا خیال بھی رکھتے تھے۔ سلمٰی ماں تھی اس کی محبت بے شک تھی۔ اس کے باوجود عالیہ نے جان لیا تھا کہ اس کی راجدھانی چھن گئی ہے۔ اب اس کی کوئی خاص حیثیت باقی نہیں رہی۔ اب ظہیر اور عمیر خاص ہو گئے تھے۔ سلمٰی بھی ان کی طرف ہی دیکھتی تھی۔

ابھی تک سلمٰی یا بھائیوں نے اس کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی مگر عالیہ کے ذہن میں کہیں تھا کہ شاید اسے انٹر کے بعد آگے پڑھنے کی اجازت اتنی آسانی سے نہ ملے۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ وہ ایسی پوزیشن حاصل کرے جو سب کو چونکا دے۔ جیسی اس نے میٹرک میں حاصل کی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ بنا کسی شور شرابے کے محنت کر رہی تھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ رات کے وقت پڑھ رہی ہوتی تو ظہیر اسے چائے یا کسی اور کام کا کہتا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر کر دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کو توقع نہیں تھی کہ وہ انٹر میں اتنی شاندار پوزیشن حاصل کر لے گی۔ خود اسے بھی توقع نہیں تھی۔ پورے بورڈ میں اس کی ساتویں پوزیشن آئی تھی۔ ماں اور بھائی حیران رہ گئے تھے۔ جس دن نتیجہ آیا، اسکول پرنسپل اور ٹیچرز خود ان کے گھر آئے تھے۔

یہ پوزیشن ایسی تھی کہ وہ کسی سرکاری یونیورسٹی میں آرام سے داخلہ لے سکتی تھی مگر اس کا ارادہ نجی شعبے کی ایک اچھی یونیورسٹی میں داخلے کا تھا مگر دارالحکومت کی یہ یونیورسٹی بہت مہنگی تھی۔ وہاں فیس لاکھوں میں تھی۔ اگر شبیر ہوتا تو عالیہ کو فکر ہی نہیں ہوتی مگر اب سب بھائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ لوگ مبارک باد دے رہے تھے اور جو ملنے والا آتا، وہ عالیہ کو آگے پڑھانے کے بارے میں ضرور کہتا اور اس پر ظہیر اور سلمٰی خاموش ہو جاتے۔ ان کی خاموشی دیکھ کر عالیہ کا دل ڈوبنے لگتا۔ صوبائی حکومت نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں صوبے کے تمام انٹر بورڈز کے تینوں شعبوں میں پہلی دس پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علموں اور ان کے اہل خانہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں ان کو گولڈ میڈل دیے اور پروفیشنل ڈگری کے لیے اسکالرشپ کا اعلان کیا۔

اسکالرشپ یونیورسٹیز کے تعاون سے دی جا رہی تھی۔ اس میں

عالیہ کی پسندیدہ یونیورسٹی بھی شامل تھی۔
تقریب میں عالیہ کے ساتھ سلمیٰ اور فاریہ بھی تھے۔ ظہیر نہیں آیا تھا مگر عمیر تقریب میں شریک تھا۔ وہ نعیم کے گھر رکے تھے۔ جب وہ تقریب سے آئے تو سب نعیم کے گھر جمع ہوئے تھے۔ نعیم اور عتیق اس معاملے میں پُر جوش تھے۔ انہوں نے عالیہ کو کھلے دل اور محبت سے مبارک دی۔ انہوں نے سلمیٰ سے کہا کہ یہ ان کے خاندان کے لیے اعزاز ہے کہ ان کی ایک بیٹی کو اعلیٰ تعلیمی کارکردگی پر اسکالرشپ ملی ہے۔ میڈیا اور پریس نے اس تقریب کی بھرپور کوریج کی تھی۔ سلمیٰ بھی خوش تھی مگر عالیہ کی آگے تعلیم کے حوالے سے اس کا رویہ زیادہ گرم جوش نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں وہی خدشات تھے جو عالیہ کے ذہن میں تھے کہ شاید ظہیر اور عمیر اسے آگے پڑھنے کی اجازت نہ دیں۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”امی! میں آگے پڑھوں گی۔“
”میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“ سلمیٰ نے گہری سانس لی۔ ”لیکن تیرے بھائی......“
”انہیں کیا اعتراض ہوگا؟“ اس نے تڑپ کر کہا۔ ”بابا نے مجھے اجازت دی تھی۔“
”ہاں مگر اب گھر کے بڑے تیرے بھائی ہیں۔ وہی تیرے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔“ سلمیٰ نے جواب دیا۔ ”وہ بھی منع نہیں کریں گے۔ اصل مسئلہ رفیق ہے۔“
عالیہ کو معلوم تھا کہ اس کے بھائی تایا رفیق کے دباؤ میں آ سکتے ہیں اس لیے اس نے اپنے چچاؤں سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پہلے نجی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے آن لائن درخواست دی۔ انٹر کے دوران عالیہ اپنی پسند کے شعبے کو تلاش کرتی رہی تھی۔ اسے ماس کمیونیکیشن میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اسی میں آنرز کے لیے درخواست دے دی۔ اسکالرشپ یونیورسٹی ہی دے رہی تھی۔ اس کی درخواست منظور ہوگئی۔ اسے یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ اس کی سمسٹر فیس اور ہاسٹل کے اخراجات اسکالرشپ سے ادا کیے جاتے۔ ہاسٹل میس کے ساتھ تھا یعنی اسے کھانا بھی فری میں پڑتا۔ دوسرے کچھ اخراجات اور تھے لیکن وہ اتنے زیادہ نہیں تھے۔ اس لحاظ سے اس کی تعلیم کا بوجھ اب گھر والوں پر نہیں آتا مگر اسے خطرہ دوسرا تھا۔ حسب توقع رفیق اور نورین نے اس کے آگے پڑھنے کی شدید مخالفت کی تھی۔
نورین اپنی دوسری بھتیجی کو بھی راشد سے بیاہ کر لے آئی تھی۔ شفیق کی بیوی جاہل اور منفی ذہنیت رکھتی تھی۔ مگر وہ شریف عورت تھی۔ راشد کی بیوی بالکل مختلف ثابت ہوئی تھی۔ وہ بھی بہن کی طرح ان پڑھ اور ذہنی طور پر جاہل تھی مگر اسے زمانے کے سارے نئے فیشن کا پتا تھا اور وہ ان پر عمل بھی کرتی تھی۔ اس نے آ کر گھر کا ماحول ہی بدل دیا تھا۔ اس کی بہن ایک طرح کی جہالت لائی تھی اور وہ دوسری طرح کی جہالت لائی۔ اس کی گفتگو اس کا لباس اور اس کے انداز دیکھ کر نورین بھی دنگ رہ گئی تھی جو اس کی سگی پھوپی تھی۔ رفیق اور نورین کی طرف سے روک ٹوک ہوئی تو اس نے جھگڑے شروع کر دیے۔ راشد بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ وہ مشکل سے چھ مہینے رہی اور پھر ایک دن جھگڑے کے بعد راشد نے اسے طلاق دے دی۔ اس کے بعد رفیق اور نورین لڑکیوں کی تعلیم کے مزید خلاف ہوگئے تھے۔ حالانکہ راشد کی بیوی نے سرے سے پڑھا ہی نہیں تھا۔ نورین نے کئی بار سلمیٰ سے اس موضوع پر بات کی۔
شبیر کے بعد سلمیٰ اتنی مضبوط نہیں رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ اگر اس نے عالیہ کو پڑھنے کے لیے شہر بھیجا تو بہت بڑا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ تایا رفیق کی وجہ سے ظہیر اور عمیر بھی اس معاملے میں تذبذب کا شکار تھے۔ حالانکہ وہ خود شہر میں پڑھ چکے تھے مگر انہوں نے عالیہ کے شہر جا کر پڑھنے کی حمایت نہیں کی تھی۔ جب سلمیٰ نے ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ شہروں اور خاص طور سے تعلیمی اداروں کا ماحول بہت بدل گیا اور لڑکیوں کے لیے بالکل بھی ٹھیک نہیں رہا ہے۔ عالیہ پریشان تھی کہ شاید اسے اجازت نہ ملے اور اس کا اعلیٰ تعلیم کا خواب ادھورا رہ جائے گا مگر ایسے میں نعیم اور عتیق اس کی مدد کو آئے اور اسے آگے پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ خاص طور سے نعیم نے اس کے لیے وہ کردار ادا کیا جو شبیر ادا کرتا، اگر وہ زندہ ہوتا مگر وہ قدرت سے اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔
نعیم نے خود ظہیر سے بات کی۔ اصل مخالفت وہی کر رہا تھا کیونکہ اسے گل پور میں رفیق اور اپنے چچا زادوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اسے خوف تھا کہ عالیہ پڑھنے کے لیے شہر گئی اور وہاں اس کی ذات سے منسوب کوئی بات سامنے آئی تو وہ گل پور میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ ظہیر نے سلمیٰ کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ایسے میں نعیم آگے آیا۔ اس نے ظہیر کو سمجھایا کہ اب وہ عالیہ پر اعتماد کرے۔ وہ شبیر کی بیٹی ہے، ویسے بھی وہ باپ کے بہت نزدیک رہی ہے۔ نعیم سمجھتا تھا کہ عالیہ نہ صرف بہت ذہین بلکہ بہت مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ اس کی باتیں، اس کے اطوار، اس کا بولنا اور اٹھنا بیٹھنا سب شریف لڑکیوں

والے تھے۔ وہ پہننے اوڑھنے میں اپنے رسم و رواج کا پورا خیال رکھتی تھی۔

نعیم نے ظہیر سے کہا کہ وہ عالیہ کی مکمل ذمے داری لے رہا ہے۔ وہ بادل ناخواستہ راضی ہو گیا۔ عالیہ خوش ہو گئی۔ نعیم اس کے ساتھ دارالحکومت آیا۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلے اور ہاسٹل میں رہائش کے تمام معاملات اپنی نگرانی میں پورے کرائے۔ سلمٰی نے ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ وہ عالیہ کے نام ایک بینک اکاؤنٹ کھول کر اس میں جمع کرائے گئے۔ اے ٹی ایم کارڈ کی درخواست بھی دے دی۔ یونیورسٹی میں بھی اے ٹی ایم مشین تھی اور عالیہ کو رقم نکلوانے کے لیے بینک تک نہیں جانا پڑتا۔ اس کا ہاسٹل یونیورسٹی کے پاس ہی تھا۔ یہ جگہ دارالحکومت اور عام آبادی سے کسی قدر فاصلے پر ایک پُرفضا مقام پر تھی۔ مگر یہاں ویرانی نہیں تھی کیونکہ یہاں درجن سے بھی زیادہ اعلیٰ تعلیم کے انسٹی ٹیوٹ اور اسکول تھے۔

عالیہ کا ہاسٹل لڑکیوں کے لیے تھا۔ وہیں میس تھا جہاں انہیں تین وقت کا کھانا ملتا تھا۔ ہاسٹل کا ایک کمرا تین لڑکیوں کے لیے تھا۔ کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ نہیں تھا لیکن ہر فلور پر کامن واش روم تھا۔ عالیہ کو جو کمرا ملا تھا اس میں اس کے ساتھ دو لڑکیاں اسی کے شعبے سے تھیں۔ روشنی صوبے کے جنوبی حصے کے سب سے بڑے شہر سے آئی تھی۔ اس کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور جب عالیہ نے پہلی بار اسے دیکھا تو وہ عبائے اور نقاب میں تھی۔ وہ خاموش طبع تھی اور صرف ضرورت کے وقت بولتی تھی۔ مومنہ کا تعلق صوبے کے سب سے بڑے شہر سے تھا اور وہ روشنی کے برعکس خاصی ماڈرن تھی۔ اس نے جدید فیشن کے شلوار سوٹ کے ساتھ مختصر سا دوپٹا لیا ہوا تھا۔ وہ بھی اسی دن ہاسٹل میں آئی تھیں۔ علیک سلیک اور تعارف کے بعد وہ اپنا اپنا سامان سیٹ کرنے لگیں۔ یہ سارا دن سیٹنگ میں گزر گیا اور ڈنر کے بعد وہ جلد تھک کر سوگئیں۔

جس دن اسے ہاسٹل میں کمرا ملا اس سے اگلے دن کلاسز کا آغاز ہو گیا تھا۔ میس سے ناشتا کر کے وہ تینوں یونیورسٹی روانہ ہوئیں۔ جس سڑک پر ہاسٹل تھا، یہاں تقریباً ساری عمارات تعلیمی اداروں کی یا ان سے متعلق تھیں۔ اس لیے صبح نکلتے ہی طلبہ اور طالبات ہجوم کی صورت میں اپنے اپنے تعلیمی اداروں کی طرف رواں نظر آتے تھے۔ ان کے ہجوم سے اساتذہ کی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں بھی گزر رہی ہوتی تھیں۔ عالیہ کا اپنا قصبہ بھی کم خوب صورت نہیں تھا لیکن اسے یہ جگہ اور اس کی صبح بہت اچھی لگی تھی۔ یونیورسٹی میں پہلا دن تو کلاسز تلاش کرنے اور جگہیں سمجھنے میں گزر گیا تھا۔ سب سے مشکل پہلی کلاس کی تلاش تھی۔ پوچھنے پر انہیں دو الگ الگ عمارتوں کی طرف بھیجا گیا اور بالآخر ایک لیکچرر نے انہیں درست کلاس کا بتایا۔

پروفیسر کے تعارف کرانے کا کہنے پر اس نے سادگی سے اپنا اور اپنے پس منظر کا تعارف کرایا تو کلاس میں موجود طلبہ مسکرانے لگے تھے۔ وہ واحد لڑکی تھی جس نے سر پر دوپٹا لیا ہوا تھا۔ روشنی کے ساتھ دو اور لڑکیوں نے مکمل نقاب کے ساتھ عبایا لیا ہوا تھا اور باقی سب ماڈرن اور دوپٹے کے تکلف سے آزاد تھیں۔ عالیہ کا چہرہ کھلا ہوا تھا مگر اس نے خود کو بڑے سے دوپٹے سے اچھی طرح چھپایا ہوا تھا۔ تعارف کے بعد جب وہ اپنی نشست پر بیٹھی اور پروفیسر نے لیکچر شروع کیا تو عقب سے کسی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ''پینڈو۔''

اس پر عالیہ کھڑی ہو گئی۔ پروفیسر نے لیکچر روک کر عینک کے اوپر سے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اینی پرابلم مس شبیر۔''

''سر! پیچھے سے کسی نے اپنا تعارف کرایا ہے۔'' اس نے کہا اور دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس پر کلاس میں دبی ہوئی ہنسی گونجی۔ پروفیسر بھی مسکرا دیے۔ نئے آنے والوں کے ساتھ پرانوں کی چھیڑ چھاڑ تو تعلیم کی روایات کا حصہ ہیں۔ عالیہ نے بولنے والی لڑکی اور دوسروں کو جتا دیا تھا کہ وہ بے شک ایک چھوٹے قصبے سے آئی ہے لیکن اسے پینڈو نہ سمجھا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے جواب دینے سے بات آئی گئی ہو جائے گی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے جواب کو انا کا مسئلہ بنا لیا جائے گا۔ عالیہ کلاس کے بعد باہر نکلی تو راہداری میں ایک کسی قدر طویل قامت اور دبلے جسم کی لڑکی نے اس کی راہ روک لی۔ وہ بولی تو عالیہ نے اس کی آواز سے شناخت کر لیا۔ اسی نے پینڈو کہا تھا۔

''میرا نام میشا ہے اور مجھے پسند نہیں ہے کہ کوئی مجھے جواب دے۔''

''جواب طلب بات کرو گی تو جواب ملے گا۔'' عالیہ نے اطمینان سے جواب دیا تو میشا اچانک آگے بڑھی اور اس نے جان بوجھ کر عالیہ کو ٹکر ماردی اور اس کے ہاتھ سے کتابیں چھوٹ کر نیچے بکھر گئیں۔ اس کی ساتھی لڑکیاں بھی ہنستی ہوئی اس کے ساتھ گئی تھیں۔ عالیہ کو خود پر قابو پانا تھا۔ وہ کتابیں اٹھا رہی تھی کہ روشنی اور مومنہ بھی آ گئیں۔ انہوں

نے بیشا کو عالیہ سے ٹکراتے دیکھ لیا تھا۔ مومنہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"تم نے دیکھا تو ہے۔" اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ "اسے میرا جواب دینا برا لگا۔"

روشنی نے کہا۔ "اچھا ہوا تم اس کے منہ نہیں لگیں۔"

"میں جواب دے سکتی تھی۔" عالیہ نے کہا۔ "لیکن میں یہاں لڑنے نہیں پڑھنے آئی ہوں۔"

"مجھے تو یہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ سوائے پڑھنے کے اور باقی سب کچھ کرنے آئے ہیں۔" روشنی نے بدمزہ لہجے میں کہا۔ "جب سے یونیورسٹی میں داخل ہوئی ہوں، مجھے مسلسل نقاب پر جملے سننا پڑ رہے ہیں۔ سوچ رہی ہوں نقاب اور عبایا اتار ہی دوں۔"

عالیہ نے کہا۔ "اگر تم نے لوگوں کی وجہ سے پہنا ہے تو اتار دو۔"

پہلا دن تھا اور انہیں تمام کلاسز کو دیکھنا پڑا تھا۔ ان کی کلاسز تھیں بھی الگ الگ عمارتوں میں اور خاصے فاصلے پر پڑتی تھیں۔ چل چل کر ٹانگیں دکھ گئی تھیں۔ لنچ انہوں نے کینٹین میں کیا تا کہ ہاسٹل تک جانے کی ہمت کر سکیں اور ہاسٹل پہنچ کر سب ہی ڈھیر ہو گئیں۔ اس کی آنکھ چائے کی خوشبو سے کھلی۔ مومنہ اپنے ساتھ الیکٹرک کیتلی لائی تھی اور اسی میں چائے تیار کی تھی۔ ویسے انہیں کمروں میں چائے بنانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ لیکن لڑکیاں چوری چھپے اس قسم کے کام کر لیتی تھیں۔ کاغذی مگ میں گرم چائے نے مزہ دیا۔ روشنی نے کہا۔ "میرے خدا! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پہلا دن اتنا دشوار ہوگا۔"

"میں زندگی میں دن بھر کو بہت کم سوئی ہوں۔" عالیہ نے چائے لے کر کہا اور ایک سپ لے کر بولی۔ "اچھی چائے ہے شکریہ۔"

وہ چائے پر گپ شپ کرتی رہیں اور تینوں متفق تھیں کہ یونیورسٹی کا ماحول اس سے کہیں زیادہ کھلا ہوا ہے جتنا کہ وہ سوچ کر آئی تھیں۔ البتہ تینوں کے تاثرات میں فرق تھا۔ مومنہ خوش تھی اور عالیہ ناخوش تھی۔ روشنی نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ کمرے میں ایک عدد تھری ڈور لاکڈ الماری تھی۔ جس کا ایک ایک خانہ ان تینوں کے حصے میں آیا تھا۔ اوپر کپڑے لٹکانے کی جگہ تھی اور نیچے خانے بنے ہوئے تھے جن میں چیزیں رکھی جا سکتی تھیں۔ ایک چھوٹا سا ریک بھی تھا جس پر کتابیں رکھی جا سکتی تھیں۔ کمرے کی ایک ایک چابی تینوں کے پاس تھی۔ چائے پی کر انہوں نے باقی چیزیں سیٹ کیں اور ڈنر کے لیے نیچے میس میں آ گئیں۔

☆☆☆

عالیہ لان میں ایک باڑ کے ساتھ پھیلے درخت تلے بینچ پر بیٹھی اپنے تیار کیے ہوئے نوٹس دیکھ رہی تھی۔ ایک پیریڈ فری تھا۔ اس نے سوچا کہ آج جو نوٹس بنائے تھے ان کا جائزہ لے لے۔ اچانک ہی اسے باڑ کے دوسری طرف سے بیشا کی آواز آئی۔ "تم چاہتی کیا ہو؟"

"کچھ نہیں۔" دوسری نسوانی آواز عالیہ کے لیے اجنبی تھی۔ "میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم میرے بارے میں جو بکواس کرتی پھر رہی ہو وہ بند کر دو۔"

"میں جو کر رہی ہوں وہ بکواس نہیں ہے۔ میں سچ......" بیشا نے اتنا کہا تھا کہ تھپڑ کی آواز آئی۔ اس دوران میں عالیہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک خوب صورت لڑکی بیشا کے سامنے کھڑی تھی اور بیشا کا ہاتھ اپنے گال پر تھا۔ جس تھپڑ کی آواز آئی تھی وہ بیشا کے منہ پر پڑا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی بے یقینی سے دوسری لڑکی کو دیکھتی رہی پھر اس نے بپھر کر کہا۔

"کتیا......"

بیشا اس کی طرف بڑھی تھی کہ ذرا دور روش پر موجود پروفیسر صدیق احمد نے کہا۔ "گرلز واٹ از دس۔"

دونوں یک دم محتاط ہو گئیں۔ دوسری لڑکی نے کہا۔ "کچھ نہیں سر۔"

پروفیسر کچھ دیر دونوں کو دیکھتے رہے پھر سر ہلا کر آگے بڑھ گئے۔ ان کے جاتے ہی دوسری لڑکی بھی وہاں سے روانہ ہو گئی اور بیشا اسے دیکھتی رہ گئی۔

روشنی اور مومنہ فری پیریڈ میں کیفے ٹیریا چلی گئی تھیں اس لیے عالیہ اکیلی ہی لان میں چلی آئی تھی۔ عالیہ کا تعلق ایک چھوٹے قصبے سے تھا مگر وہ دور جدید اور اس کی خرابیوں سے بے خبر نہیں تھی۔ گل پور میں اس کے گھر میں کیبل ٹی وی تھا۔ اسی طرح انٹرنیٹ کی مدد سے سوشل میڈیا تک رسائی تھی۔ اس کے باوجود اس نے تصور نہیں کیا تھا کہ ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ایسی گندگی پھیل رہی تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرنا اتنا ضروری نہیں سمجھتے تھے جتنا کہ فلرٹ کرنا۔ کسی کا بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ ہونا اتنا تعجب انگیز نہیں تھا جتنا کہ کسی لڑکے یا لڑکی کا کسی سے دوستی نہ ہونا عجیب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو عام طور سے بیک ورڈ، تنگ خیال اور تقریباً بنیاد پرست سمجھا جاتا تھا۔ روشن خیال نسل اب عملی طور پر اتنا آگے نکل

گئی تھی کہ سرعام وہ حرکتیں کرنے لگی تھی جو تنہائی میں بھی معیوب سمجھی جاتی تھیں۔ پہلے سمسٹر میں ہی اسے احساس ہوا کہ ظہیر اور عمیر کیوں اس کے یونیورسٹی میں پڑھنے کی مخالفت کررہے تھے۔ اگلے دن وہ دوسرے پیریڈ کے بعد کلاس سے باہر نکلی تو مومنہ اسی لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی جس نے میشا کو تھپڑ مارا تھا۔ لڑکی نے جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کا حلیہ اس کی کلاس کی عکاسی کررہا تھا۔ مومنہ نے اسے آواز دے کر بلایا۔

''اس سے ملو عالیہ...... یہ دیا شاہ ہے۔''

دیا نے عالیہ سے ہاتھ ملایا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

عالیہ کو اگلی کلاس کی جلدی تھی۔ ''شکریہ، بٹ سوری...... مجھے اگلی کلاس میں جانا ہے۔''

''ضرور...... ویسے کیا تم مجھ سے کیفے ٹیریا میں ملو گی...... بی مائی گیسٹ؟''

''پلیز۔'' مومنہ نے اصرار کیا تو عالیہ نے سر ہلایا۔

''اوکے لیکن میرا آج کوئی پیریڈ خالی نہیں ہے۔''

''کل؟''

''دیکھوں گی اگر فری پیریڈ ہوا تو آجاؤں گی۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ اس کا ارادہ نہیں تھا مگر دوپہر میں لنچ کے وقت وہ بھوک لگنے پر کیفے ٹیریا پہنچی تو اندر داخل ہوتے ہوئے سامنے دیا، مومنہ کے ساتھ ایک میز پر نظر آئی۔ دیا نے اسے دیکھ لیا اور اشارہ کرکے اسے اپنی طرف بلایا۔ اب اس کے لیے نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ مجبوراً وہ اس کی طرف بڑھی۔ دیا نے اس سے ہاتھ ملایا اور بولی۔

''تھینک یو سوچ کہ تم نے میری بات مان لی۔''

''مجھے بھوک لگ رہی تھی۔'' عالیہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ اتفاق ہے کہ تم بھی اس وقت یہاں موجود ہو۔''

دیا ٹھٹکی پھر شانے اچکائے۔ ''جیسے تمہاری مرضی...... آج تم گیسٹ ہو کہو کیا منگواؤں؟''

عالیہ نے منع کیا مگر دیا مصر رہی تو اس نے سموسے اور فنگر فرائی کا کہہ دیا۔ سموسوں، فنگر فرائی اور خستہ پیٹیس کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کراتی رہیں۔ عالیہ نے محسوس کیا کہ دیا میشا سے زیادہ مختلف لڑکی نہیں ہے۔ ویسی ہی بے باک اور حاکمیت جتانے والی مگر ساتھ ہی وہ میشا سے خار بھی کھاتی تھی۔ جب اس کا ذکر ہوتا تو دیا کے منہ پر انگلش گالیاں آجاتیں۔ اچانک دیا نے چونک کر کہا۔ ''زوہیب آج یہاں کہاں سے آگیا۔''

مومنہ نے مڑ کر دیکھا مگر عالیہ بیٹھی رہی۔ دیا نے کہا۔ ''تم نے دیکھا ہے اس کو۔ یونیورسٹی کی آدھی لڑکیاں اس کے لیے پاگل ہیں۔''

''نہیں اور نہ ہی دیکھنا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بائی دی وے، باقی آدھی لڑکیاں کس کے پیچھے پاگل ہیں؟''

دیا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''

''پڑھنے۔'' اس نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ ''اب میں چلوں گی۔''

''کلاسز تو ختم ہوگئی ہیں۔'' دیا نے کہا۔

''ہاں، مجھے لائبریری میں کام ہے ورنہ اب تک جا چکی ہوتی۔ بھوک برداشت نہیں ہوئی تو یہاں چلی آئی۔''

دیا اور مومنہ کو چھوڑ کر وہ آگے بڑھی تو اس نے دیا کی آواز سنی۔ ''شی از مس فٹ۔''

وہ دروازے کے قریب تھی کہ اس نے کسی لڑکی کو زوہیب کا نام لیتے سنا۔ اس نے غیرارادی طور پر مڑ کر دیکھا۔ زوہیب اچھا خوش شکل لڑکا تھا۔ قد کسی قدر دراز تھا اور براؤن بال نئے انداز میں تراشے ہوئے تھے۔ ایک نظر میں عالیہ کو اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی کہ یونیورسٹی کی آدھی لڑکیاں اس پر مریں۔ ایسے درجنوں لڑکے یونیورسٹی میں جابجا نظر آتے تھے۔ وہ لائبریری کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کے لیے یونیورسٹی کے ماحول سے مطابقت رکھنا مشکل ہے۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ بہرحال وہ یہاں پڑھنے آئی تھی۔ وہ خاصی دیر سے ہاسٹل واپس آئی۔ مومنہ اور روشنی آرام کررہی تھیں۔ دونوں کے ہاتھ میں موبائل تھے۔ اس وقت اسمارٹ فون، واٹس ایپ، فیس بک اور دوسری سوشل میڈیا سائٹس بہت عام نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت ایس ایم ایس اور ایم ایم ایس کا رواج تھا۔ عالیہ نے بیگ رکھا اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سرسری سے انداز میں مومنہ سے پوچھا۔ ''یہ دیا مرزا کہاں سے مل گئی تمہیں؟''

''اچھی لڑکی ہے، مجھے پسند آئی۔'' مومنہ بولی۔ ''تمہیں کیسی لگی؟''

''تقریباً میشا جیسی۔'' عالیہ نے جواب دیا اور جوتے اتار کر دراز ہوگئی۔ آج وہ تھک گئی تھی مگر ابھی سونا نہیں چاہتی تھی اس لیے لائبریری سے لایا موپاساں کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ نکالا اور اس کا مطالعہ کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد مومنہ کا چائے کا موڈ ہوا تو اس نے اپنی برقی کیتلی نکالی اور چائے

تیار کرنے لگی۔ روشنی کا موڈ نہیں تھا، اس نے منع کر دیا۔ عالیہ نے اپنے لیے بنانے کو کہا تھا۔ جب مومنہ نے اسے کاغذی کپ میں چائے دی تو عالیہ نے کہا۔ ''ایسا نہ کریں اپنے لیے مگ لے آئیں۔''

''وہ نظر میں آسکتے ہیں۔'' مومنہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''یار! تین مگ چھپانا کون سا مسئلہ ہے۔ ہر بندہ اپنا مگ اپنے پاس رکھے اور خود دھو کر لائے۔''

مومنہ خوش ہوگئی۔ ''مجھے بھی ان میں مزہ نہیں آرہا اور خطرہ ہے کہ کچرے میں جانے والے کپ چیک نہ کر لیے جائیں۔''

''مجھے کچھ چیزیں لینی ہیں، کل یونیورسٹی سے واپسی پر مارکیٹ جائیں گے۔'' عالیہ بولی تو اونگھتی روشنی چوکنا ہوگئی۔

''کہاں جانے کی بات ہورہی ہے؟''

''مارکیٹ۔'' مومنہ نے کہا۔ ''کل یونی کے بعد۔''

''میں بھی چلوں گی، مجھے بھی کچھ چیزیں لینی ہیں۔''

اگلے دن وہ یونیورسٹی سے مارکیٹ گئیں۔ یہاں مارکیٹ نزدیک اور زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس میں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ سیٹ ہوتی چلی گئیں۔ پہلا سمسٹر تھا اور کورس کا آغاز تھا اس لیے انہیں سمجھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے میں محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ عالیہ عادی تھی مگر وہ دونوں عادی نہیں تھیں۔ ان کی مشکل دیکھ کر عالیہ کو ان کی مدد کرنا پڑتی تھی۔ وہ نزدیک ہوئیں، ایک دوسرے کو جانا اور پھر ایک دوسرے کی عادی ہوگئی تھیں۔ روشنی کا عبایا اور نقاب چند ہفتوں بعد ہی اتر گیا تھا لیکن وہ لباس رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہی پہنتی تھی۔ اس کی بھی دیا سے دوستی ہوگئی تھی اور ان چاروں کا گروپ بن گیا تھا۔ عالیہ کو دیا کی بعض باتیں مشکل سے ہضم ہوتی تھیں مگر وہ درگزر کر جاتی کیونکہ اس کی کوئی کھلی برائی عالیہ کے سامنے نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

عالیہ گھر کے سامنے اتری تھی۔ پہلے سمسٹر میں اسے آنے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ آخری پیپر کے تین دن بعد ہی نیا سمسٹر شروع ہوگیا تھا۔ یونیورسٹی سمسٹر کے درمیان میں چھٹی نہیں دیتی تھی بلکہ ایک ساتھ ہی گرما کی چھٹیاں دے دی جاتی تھیں۔ وہ پورے دس مہینے بعد گھر آئی تھی۔ شہر سے گل پور کے بس اسٹاپ تک وہ کوچ میں آئی تھی اور وہاں سے اسے ظہیر نے لیا تھا۔ جس وقت وہ گھر کے سامنے پہنچے تو رفیق باہر ہی موجود تھا۔ عالیہ نے گاڑی سے اتر کر پہلے اسے سلام کیا مگر وہ جواب دینے کے بجائے منہ پھیر کر وہاں سے چلا گیا۔ ظہیر نے اس کا بیگ نکالتے ہوئے کہا۔ ''بیکار ہے۔

انہوں نے ہم سے بھی تعلق توڑ لیا ہے۔''

''ہم سے؟'' عالیہ نے بھائی کی طرف دیکھا۔

''مطلب پورے گھر سے۔'' ظہیر نے بدمزگی سے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ عالیہ نے محسوس کیا کہ ظہیر کا رویہ اس کے ساتھ روکھا تھا۔ اس نے نہ تو اس سے زیادہ بات کی تھی اور نہ ہی لگ رہا تھا کہ اس نے اتنے عرصے بعد بہن کو دیکھا ہے۔ یہ بات عالیہ نے ہاسٹل میں محسوس کر لی تھی کہ بھائی اس سے خوش نہیں ہیں کیونکہ اس دوران میں انہوں نے اس سے مشکل سے چند ایک بار بات کی تھی اور وہ بھی اس وقت جب سلمیٰ نے اسے کال کی اور پھر ان لوگوں سے بھی بات کرائی۔ ازخود انہوں نے ایک بار بھی کال نہیں کی تھی۔ البتہ ظہیر اس کے اکاؤنٹ میں رقم باقاعدگی سے بھیجتا رہا تھا۔ وہ اندر آئی تو سلمیٰ اور فاریہ بے تابی سے اس سے لپٹ گئیں۔ سلمیٰ اس کی بلائیں لے رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی۔

''میری بچی کتنی کمزور ہوگئی ہے۔''

''ٹھیک تو ہوں امی۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں کام زیادہ ہوتا ہے۔ سب خود کرنا پڑتا ہے اور میس کے کھانے بس گزارے لائق ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ کے کھانے کہاں ملتے؟ اس لیے کمزور تو ہوں گی۔''

''اب تو آگئی ہے، تجھے ساری تیری پسند کی چیزیں کھلاؤں گی۔''

ظہیر اسے چھوڑ کر فارم پر چلا گیا تھا۔ عمیر، شہر میں تھا یہ اس کا تیسرا سال تھا اور ڈیڑھ سال بعد وہ انجینئر بن جاتا۔ کھانے کی میز پر عالیہ نے دبے لفظوں میں بھائیوں کے رویے کا ذکر کیا تو سلمیٰ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ''ان کا اتنا قصور نہیں ہے۔ یہ رفیق ہے جو ہماری جان کو آگیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ تم گل پور کی واحد لڑکی ہو جو پڑھنے کے لیے باہر گئی ہو۔ اب وہ خاندان سے باہر بھی باتیں کرنے لگا ہے۔ یہ باتیں تیرے بھائیوں تک پہنچتی ہیں تو ان کی غیرت کو ٹھیس لگتی ہے۔''

''امی کسی اور کی باتوں پر اپنی بہن سے ایسا رویہ رکھنے کا مطلب ہے کہ آپ ان کی باتوں کو سچ سمجھ رہے ہیں۔'' عالیہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اگر تایا جی ایسی باتیں کر رہے ہیں تو یہ ان کو روکیں۔ مجھے کیوں قصوروار سمجھ رہے ہیں جبکہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔''

''یہ تو بے چارے مگر رفیق اور اس کے جاہل بیٹوں کے منہ کون لگے۔'' سلمیٰ نے ٹھنڈی سانس لی۔

''ہاں، ان کے منہ نہیں لگ سکتے مگر مجھ سے منہ ضرور بنا سکتے ہیں۔'' عالیہ نے تلخ لہجے میں کہا اور میز سے اٹھ گئی۔ سلمٰی اسے آوازیں دیتی رہ گئی پھر اس کے پیچھے آئی مگر عالیہ نے مزید کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی۔ البتہ ماں کی پریشانی دیکھتے ہوئے اس نے زبردستی اپنا موڈ اچھا کر لیا تھا۔ فاریہ چھوٹی تھی، وہ سہم گئی۔ ''باجی ایسا کیوں کر رہی ہیں؟...... اتنے دنوں بعد آئی ہیں۔''

''کچھ نہیں، تم فکر مت کرو۔'' عالیہ نے اسے پیار کیا۔ اسے اپنی چھوٹی بہن بہت عزیز تھی۔ اسے افسوس تھا کہ جس طرح اس نے باپ کے پیار سے اپنا حصہ وصول کیا تھا، فاریہ اس سے محروم رہ گئی تھی۔ بہر حال ماں اور بھائی اس کے ساتھ اچھے تھے۔ دو تین دن گزر گئے تھے مگر ظہیر کا رویہ بہتر نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک بار بھی نہ تو اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور نہ ہی ٹھیک سے بات کی تھی۔ خاص طور سے اس کی تعلیم کے بارے میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔ عالیہ دیکھ رہی تھی اور اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ وہ اتنے عرصے گھر سے دور رہی تھی اور واپس آتے ہوئے بہت... پُرجوش تھی لیکن اس کا جوش ختم ہو گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی اس ماحول میں اسے پورے ڈیڑھ مہینے رہنا تھا۔ پھر سلمٰی اور فاریہ کا خیال آیا تو وہ خود کو بہلانے لگی۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ تعلیم چھوڑ کر واپس آ جائے مگر اس سوچ نے اسے روک دیا کہ جب وہ ٹھیک ہے اور کوئی غلط کام نہیں کر رہی ہے تو وہ کیوں واپس آئے۔ ڈیڑھ مہینے بعد واپس جاتے ہوئے وہ افسردہ بھی تھی اور خوش بھی۔

☆☆☆

دیا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تمہارے پاس اسمارٹ فون نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کا پانچواں سیمسٹر یعنی آنرز کا تیسرا سال شروع ہو گیا تھا۔ وہ دیا، مومنہ اور روشنی کے ساتھ کیفے ٹیریا میں تھی کہ سلمٰی کی کال آئی۔ اسے یونیورسٹی آئے آج دوسرا دن تھا۔ ماں سے بات کر کے اس نے اپنا موبائل واپس پرس میں رکھا تو دیا نے اس کے عام سے موبائل کو دیکھ حیرت کا اظہار کیا۔ ہر فرد کے پاس اسمارٹ فون تھا۔ جس کے پاس نہیں تھا وہ لینا چاہتا تھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو یار، اب تو کام کرنے والی ماسیاں بھی اسمارٹ فون لیے گھومتی ہیں۔''

''لینے کو تو میں نیا آئی فون بھی لے سکتی ہوں۔'' عالیہ کو اس کا انداز برا لگا تھا۔ ''لیکن میں نے کہا نا میں ضرورت محسوس نہیں کرتی۔''

''تم سوشل میڈیا کے بغیر کیسے رہتی ہو؟''

''رہ تو رہی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔'' عالیہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''کیا میرے سینگ نکل آئے ہیں؟''

''میرا مطلب ہے کہ یہ بہت ضروری ہے۔''

''شاید لیکن اس وقت میرے نزدیک سب سے ضروری اپنی تعلیم ہے۔ جس کے لیے میں اپنے گھر والوں سے دور یہاں اکیلی ہاسٹل میں رہ رہی ہوں۔''

مومنہ بولی۔ ''تب ہی تم نے چاروں سیمسٹرز میں ٹاپ کیا ہے۔''

''میں زیادہ وقت تعلیم کو دینا چاہتی ہوں اس لیے میرے پاس ان چیزوں کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''او کے سوشل میڈیا نہ سہی لیکن انسان کو اور بھی کئی کام ہوتے ہیں۔ اسمارٹ فون لائک اے پرسنل کمپیوٹر۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یونی میں لائبریری میں کمپیوٹرز ہیں۔'' عالیہ نے کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ سوشل میڈیا اور اسکائپ استعمال نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ نعیم اور عتیق کے بچے ان دونوں میڈیا پر تھے۔ اگر اسے ان سے بات کرنی ہوتی تو وہ کال کر لیتی تھی۔ سوشل میڈیا اس کے نزدیک وقت کا زیاں تھا۔ اس لیے لیپ ٹاپ صرف تعلیمی مقصد کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ اس کے جواب پر دیا نے منہ بنایا۔

''تم میں لگتا ہے بیس سال پرانی روح ہے۔''

عالیہ ہنسی۔ ''نہیں، اکیس سال پرانی، بیس سال کی تو ایک سال پہلے تھی۔''

دیا نے پبلک ریلیشن میں داخلہ لیا تھا۔ اس کا یہ چھٹا سیمسٹر تھا۔ یعنی وہ ان سے ایک سیمسٹر آگے تھی مگر اس کی کارکردگی زیادہ اچھی نہیں تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس بار مطلوبہ نمبر حاصل نہیں کر سکے گی اور اسے سیمسٹر ریوائس کرنا پڑے گا۔ یہی حال مومنہ کا تھا۔ اس نے عالیہ سے کہا۔ ''یار! میری مدد کرو۔ ورنہ اس بار میں سیمسٹر کلیئر نہیں کر سکوں گی۔''

''کیسی مدد...... تم مجھ سے آگے ہو؟''

''نہیں یار! پڑھنے میں پیچھے ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم کس طرح پڑھتی ہو۔''

''ویری سمپل۔'' عالیہ نے جواب دیا۔ ''میرے دو

اصول ہیں۔ ایک سب سے پہلے پڑھائی اور دوسرا آج کا کام آج۔"

"یہی تو نہیں ہوتا ہم سے۔" مومنہ نے رونی صورت بنا کر کہا۔" اگر میں رہ گئی تو پاپا واپس بلالیں گے۔ وہ وارننگ دے چکے ہیں۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ انہوں نے تمہیں بھیجا کیوں ہے۔"

"پلیز! میری مدد کرو میری ٹانگ مت کھینچو۔"

عالیہ نے محسوس کیا کہ مومنہ کچھ عرصے سے دیا کے ساتھ زیادہ ہی رہنے لگی تھی۔ اکثر پیریڈز میں وہ غائب ہوتی تھی اور بعد میں عالیہ اور روشنی سے نوٹس مانگتی مگر صرف نوٹس سے کام نہیں چلتا تھا۔ انہیں پڑھنا اور ذہن میں رکھنا بھی لازمی تھا۔ کئی بار اس نے ان کے رجسٹر لیے اور رکھ کر بیٹھی رہی تو انہوں نے اسے فوٹو کاپی دینا شروع کردی۔ اب اسے ہوش آیا تھا کیونکہ چوتھے سمسٹر میں اس کی مجموعی پرسنٹیج اتنی گر گئی تھی کہ اگر مزید گرتی تو وہ آگے نہیں جاسکتی تھی۔ اسے سمسٹر ریوائس کرنا پڑتا۔ عالیہ نے سرسری سے انداز میں کہا۔ "مدد تو میں کردوں لیکن تمہیں اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کو ذرا کم کرنا ہوگا۔"

دیا نے تیکھے انداز میں کہا۔ "پلیز! اب تم لوگ یہ بکواس بند کرو اور کوئی کام کی بات کرو۔"

"مثلاً زوہیب کی۔" عالیہ ہنسی۔ "جس پر یونیورسٹی کی اب بھی آدھی لڑکیاں مرتی ہیں۔"

دیا کا چہرہ بگڑ گیا تھا مگر اس نے پھر کچھ کہا نہیں۔ دو سال کے دوران عالیہ نے زوہیب کو کئی بار دیکھا اور اس کے بارے میں سنا تھا مگر کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ زوہیب کا تعلق ایک بیوروکریٹ گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ، چچا اور ماموں، اس کے بھائی اور کئی دوسرے رشتے دار سول سروس میں تھے۔ وہ یہاں انٹرنیشنل ریلیشن میں ماسٹر کررہا تھا اور اس کا ارادہ سول سروس میں جانے کا تھا۔ اس کا باپ انیس گریڈ کا افسر تھا لیکن یونیورسٹی میں اس کے ٹھاٹ دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی ارب پتی خاندان سے ہے۔ اس کے پاس قیمتی بی ایم ڈبلیو اسپورٹ ماڈل کار تھی۔ برانڈڈ لباس اور اعلیٰ ترین پرفیوم کے ساتھ وہ قیمتی سن گلاسز استعمال کرتا تھا۔ اس کا حلقۂ احباب اسی کی طرح کے امیر زادوں پر مشتمل تھا۔ عالیہ نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ لڑکیوں کو زیادہ لفٹ نہیں کراتا تھا اور وہ خود ہی اس کے آگے پیچھے ہوتی تھیں۔

دیا کا تعلق اوپری متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ اور بھائی اسٹیٹ ایجنسی کا کام کرتے تھے۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مگر وہ یوں پوز کرتی تھی جیسے اس کا تعلق بہت زیادہ دولت مند خاندان سے ہو۔ کیفے ٹیریا میں بہت خرچ کرتی تھی۔ بہترین لباس اور جوتے پہنتی تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ جدید قسم کا قیمتی موبائل ہوتا تھا۔ ایک دن عالیہ نے اس سے پوچھا۔ "تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں یہاں کس لیے آئی ہوں۔ آج تم بتاؤ کہ تم یہاں کس لیے آئی ہو؟"

دیا ہنسی۔ "فلرٹ کرنے۔"

"ریئلی سیریس۔"

"نان سیریس۔"

مومنہ ہنسی۔ "ظاہر ہے یہاں کون سیریس ہوتا ہے، سب ہی ٹائم پاس کرتے ہیں۔"

عالیہ دیا کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ "کہیں یہ انگور کے کھٹے ہونے والا معاملہ تو نہیں ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہیں ہی کسی نے لفٹ نہ دی ہو۔"

"بکواس مت کرو۔" دیا نے چڑ کر کہا۔

عالیہ ہنسی۔ "تم تو برا مان گئیں حالانکہ یہ تمہارا پسندیدہ موضوع ہے۔"

"میں جارہی ہوں۔" دیا کھڑی ہوگئی۔ اس کا موڈ آف ہوگیا تھا۔ مومنہ نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ چلی گئی۔ عالیہ نے حیرت سے کہا۔

"اسے کیا ہوا ہے۔ کیا میں نے ایسی کوئی بات کی ہے جو اسے ہرٹ کرگئی ہے؟"

"میں اسے دیکھتی ہوں۔" مومنہ نے کہا اور بیگ اٹھا کر دیا کے پیچھے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد روشنی نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ دیا کسی سے محبت کرتی ہے مگر ظاہر نہیں کرتی۔"

"وہ زوہیب کے چکر میں تو نہیں ہے؟"

"مجھے نہیں لگتا۔ ویسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔" روشنی نے جواب دیا۔

"زوہیب کیسا لڑکا ہے؟"

"نارمل ہے، لڑکیوں سے گھلتا ملتا ہے۔ ایک دو لڑکیوں کے ساتھ اس کا نام بھی آیا مگر یہ زیادہ عرصے کسی کے ساتھ نہیں رہتا۔"

"فلرٹی ہے؟"

''نہیں، ایسی بات بھی سننے میں نہیں آئی۔'' روشنی نے جواب دیا۔ ''شاید دیا جانتی ہو کیونکہ وہ شروع میں کچھ عرصے زوہیب کے گروپ میں شامل رہی ہے۔''

عالیہ کو الجھن ہونے لگی۔ ''ہم یہاں پڑھنے آئے ہیں اور ان چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔''

''تو کیا کریں، یونیورسٹی آئے ہیں تو یہ سب بھی دیکھنا پڑے گا۔''

''میں تو کہتی ہوں یونیورسٹی کے چکروں کو گولی مارو، ہم تینوں مل کر اسٹڈی کرتے ہیں۔ ہفتے اور اتوار کا دن فری ہوتا ہے۔ میں اپنے سارے ہفتے کے کام ایک ہی دن میں نمٹا لیتی ہوں، دوسرا دن فری ہوتا ہے۔ اس میں مل کر اسٹڈی کریں گے۔''

''آئیڈیا تو اچھا ہے۔ مومنہ آتی ہے تو اس پر بات کرتے ہیں۔'' روشنی نے کہا۔ ''ویسے دیا ٹھیک کہہ رہی تھی، تم اسمارٹ فون لے لو۔ صرف سوشل میڈیا ہی نہیں بلکہ اس میں بے شمار چیزیں ہیں جو آدمی استعمال کر سکتا ہے۔''

''مثلاً۔''

''ابھی میں وضاحت نہیں کر سکتی مگر جب آدمی استعمال کرے تو بے شمار چیزیں خود سامنے آجاتی ہیں۔''

''ابھی ارادہ تو نہیں ہے، بعد میں دیکھوں گی۔'' عالیہ نے بات ختم کر دی۔ اس نے فیس بک پر اکاؤنٹ بنایا تھا مگر زیادہ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس بار وہ گھر گئی تو یہ دیکھ کر حیران ہوئی تھی کہ چودہ سالہ فاریہ جو ابھی نویں کلاس میں تھی، اس کے پاس اسمارٹ فون تھا۔ اسے عمیر نے لاکر دیا تھا۔ اسی طرح ظہیر اور عمیر بھی اب اسمارٹ فون استعمال کرنے لگے تھے۔ گھر میں وائی فائی انٹرنیٹ کی سہولت تھی۔ یونیورسٹی میں سب کے پاس اسمارٹ فون نظر آتا تھا۔ صرف اسی کے پاس پرانے انداز کا فون تھا اور یہ تھا بھی خاصا پرانا۔ اس نے یونیورسٹی میں آنے سے ذرا پہلے لیا تھا کہ گھر والوں سے رابطہ رہے گا۔ اس دن مومنہ خاصی دیر سے آئی تھی۔ وہ دیا کے پیچھے گئی اور دوبارہ نظر نہیں آئی۔ روشنی نے پوچھا۔

''کہاں رہ گئی تھیں؟''

اس نے تھکے ہوئے انداز میں بیگ بیڈ پر ڈالا اور خود بھی ڈھیر ہوگئی۔ ''دیا کے ساتھ چلی گئی تھی۔''

''وہی تو پوچھ رہی ہوں کہاں گئی تھیں؟''

مومنہ جواب دیتے ہوئے ہچکچائی۔ ''وہ اسے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔''

عالیہ کو لگا کہ وہ سچ نہیں بول رہی ہے۔ اسے حیرت ہوئی کہ مومنہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر کچھ دیر بعد بات آئی گئی ہوگی۔ موسم سرد تھا۔ ڈنر کے بعد وہ واپس آئے تو تینوں کمبل میں گھس گئے۔ روشنی اور مومنہ اپنے موبائل لے کر واٹس ایپ اور فیس بک میں لگ گئیں۔ انہوں نے مل کر ایک وائرلیس انٹرنیٹ پرووائڈر کی وائی فائی والی ڈیوائس لے لی تھی اور مل کر اس کا بل ادا کرتی تھیں۔ اس رات عالیہ کو عجیب سا لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ دوسروں سے الگ یا پیچھے رہ گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ بھی اسمارٹ فون لے لے۔ ضروری تو نہیں تھا کہ وہ اسے مس یوز کرتی۔ یہ تو خود اس پر تھا کہ وہ اسے کتنا استعمال کرتی ہے اور کیسے کرتی ہے۔ جیسے اس کے گھر میں کیبل ٹی وی تھا مگر اس نے کبھی کوئی مووی یا فضول قسم کے شوز نہیں دیکھے۔ کبھی کوئی اچھا ڈراما آتا تو دیکھ لیتی تھی۔ گھر میں بھی وہ اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم کو دیتی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کتاب پڑھتی رہی پھر سوگئی۔ صبح موبائل نے الارم دیا اور اس نے اسے آف کرنے کے لیے ہاتھ مارا تو وہ دراز سے نیچے گر گیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ موبائل بے شمار بار گر چکا تھا اور اسے کچھ نہیں ہوا تھا مگر اس بار کچھ ہوگیا تھا کیونکہ گرتے ہی اس کی آواز بند ہوگئی اور جب اس نے اٹھایا تو وہ بند تھا اور آن نہیں ہو رہا تھا۔ مومنہ نے واش روم جانے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے یہ خراب ہوا، اب تم نیا موبائل تو لوگی۔ اسے دیکھ دیکھ کر تو میرا دل بھر گیا ہے۔''

پرانا صحیح لیکن کام کر رہا تھا اور اب عالیہ کو اسے ٹھیک کرانا تھا۔ موبائل شہر میں ملتے تھے۔ اس نے مومنہ اور روشنی سے کہا اور وہ اس کے ساتھ یونیورسٹی کے بعد چلنے کو تیار ہوگئیں۔ وہ موبائل مارکیٹ پہنچے اور عالیہ نے ایک شاپ پر اپنا موبائل دکھایا تو اسے بتایا گیا کہ اسے ٹھیک تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ پھر خراب ہوسکتا ہے۔ بہتر ہے وہ نیا موبائل لے لے۔ اس پر مومنہ اور روشنی مصر ہوگئیں کہ وہ اسمارٹ فون لے۔ اس نے سوچا اور مان گئی۔ اس کے پاس رقم تھی، اس نے ایک اچھی کمپنی کا اچھا موبائل فون لے لیا۔ اس کا کیمرا اور دوسرے فیچر بہت اچھے تھے۔ مومنہ اور روشنی جو عرصے سے اسمارٹ فون استعمال کر رہی تھیں ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے بھی اتنا اچھا موبائل نہیں دیکھا۔ اس رات پہلی بار وہ ان دونوں کے ساتھ فیس بک اور واٹس ایپ پر تھی۔ چوتھی دیا تھی۔ فاریہ واٹس ایپ استعمال کرتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



تھی اور جب عالیہ نے اس سے رابطہ کیا تو وہ بھی خوش ہو گئی۔ چند دن کے استعمال کے بعد عالیہ نے محسوس کیا کہ وہ اب تک ایک اچھی تفریح سے محروم رہی تھی۔

اس نے پڑھائی کو اول نمبر پر ہی رکھا تھا مگر اس کے بعد جو وقت بچتا تھا، اس میں سے وہ سوشل میڈیا کو بھی کچھ حصہ دینے لگی تھی۔ اسے یہ تبدیلی اچھی لگی تھی۔ ماں، بہن اور دوسرے کزنز سے رابطہ رہنے لگا تھا اور فون والی مجبوری باقی نہیں رہی تھی۔ جس سے بات کرنے کو دل چاہا اسے آواز میں پیغام بھیج دیا اور جب فرصت ملی اس کا جواب سن لیا۔ اسی طرح دوسروں پر بھی بوجھ نہیں تھا۔ وہ آرام سے فارغ ہو کر جواب دے سکتے تھے۔ وہ اپنی تصویریں لے کر فوری بھیج سکتی تھی اسی طرح دوسروں کی تصویریں اسے مل جاتی تھیں۔ ایک دن مومنہ اس کے بیڈ پر اس کے پاس گھسی ہوئی تھی۔ وہ فیس بک پر ایک پیج پر تھیں۔ اچانک مومنہ نے کہا۔ ''اف مجھے واش روم جانا ہے۔ آج یونی میں جو برگر کھایا تھا اس میں سم تھنگ رونگ تھا۔ میرا پیٹ گڑبڑ کر گیا ہے۔''

مومنہ گئی اور اپنا موبائل اس کے پاس چھوڑ گئی کیونکہ ایک ہی پیج کھلا ہوا تھا اس لیے عالیہ نے اٹھا لیا۔ اچانک ہی میسیج کا اشارہ آیا۔ فیس بک پر کوئی یونی بوائے مومنہ کو پرائیویٹ میسیج کر رہا تھا۔ عالیہ نے غیر ارادی طور پر کھول لیا۔ یونی بوائے نے لکھا تھا۔ ''کل تیار رہنا، میں یونی کے باہر سے پک کر لوں گا۔''

عالیہ چونکی اور پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے غلط کام کیا ہے۔ اسے کسی کی پرائیویسی میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ اس نے میسیج باکس بند کر کے موبائل نیچے رکھ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مومنہ کسی سے ملتی ہے مگر مومنہ نے انہیں اس بارے میں کبھی نہیں بتایا کہ وہ کسی لڑکے سے ملتی ہے۔ آخر اس میں چھپانے والی کیا بات تھی؟ کیونکہ لڑکیاں اور لڑکے تو آپس میں ملتے ہیں۔ شاید اسے احساس تھا کہ عالیہ اور روشنی اس بات کو پسند نہیں کریں گی اور شاید اس سے تعلق کم کر لیں اس لیے اس نے انہیں بے خبر رکھا تھا۔ مومنہ کچھ دیر بعد آئی اور اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور پھر چونک گئی۔ اس نے چور نظروں سے عالیہ کو دیکھا اور بولی۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے، اب میں سوؤں گی۔''

مومنہ لیٹی ضرور تھی اور اس نے کمبل بھی اوڑھ لیا تھا مگر موبائل نہیں رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں تھا البتہ اس نے اس کی ٹونز بند کر دی تھیں۔ عالیہ کو تجسس کی عادت نہیں تھی لیکن وہ سوچے بنا نہ رہ سکی کہ آخر مومنہ یوں چھپ کر کسی سے بھی بات کیوں کر رہی تھی۔ جبکہ یہاں کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا تھا۔ البتہ اسے اطمینان تھا کہ مومنہ کو پتا نہیں چل سکتا تھا کہ اس نے یونی بوائے کا میسیج دیکھ لیا تھا۔ پھر نیند حاوی ہونے لگی اور وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ چند دن بعد یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ اس کا ذہن کچھ اس قسم کا تھا کہ غیر متعلقہ باتیں اس میں زیادہ دیر نہیں رہتی تھیں۔

البتہ اسے سوشل میڈیا کا مزہ آ گیا تھا۔ واٹس ایپ پر گھر والوں اور کزنز سے بات ہوتی تھی۔ تازہ ترین کا پتا چلتا رہتا تھا۔ خبروں کے ساتھ تصویریں اور ویڈیوز کا بھی تبادلہ ہوتا تھا۔ اسی طرح فیس بک پر اس کا حلقہ بن گیا تھا۔ اس نے چند اچھے پیج جوائن کر لیے تھے مگر ساتھ ہی اس نے تعلیم کا حرج نہیں ہونے دیا تھا۔

☆☆☆

کلاس والے واقعے کے بعد میشا نے پھر کبھی اسے چھیڑنے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن جب آمنا سامنا ہوتا تو عالیہ کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی ہی نظر آئی تھی۔ عالیہ ہمیشہ اسے نظرانداز کر دیتی تھی۔ یہ اس کی فطرت تھی۔ اس دن وہ لان میں بیٹھی ہوئی جاتی سردی کی دھوپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک کتاب دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور میشا کو اپنے قریب دیکھ کر چوکنا ہو گئی۔ میشا اکیلی تھی اور اس وقت عالیہ کو اس کے چہرے پر مخصوص تاثرات بھی نظر نہیں آئے۔ اس کے برعکس وہ سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''میں تم سے کچھ کہنے آئی ہوں۔''

''کہو۔'' عالیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میشا اچانک مضطرب دکھائی دینے لگی۔ ''دیکھو شاید تم میری بات پر اعتبار نہ کرو لیکن میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں کہ دیا سے ہوشیار رہنا۔ وہ جیسی نظر آتی ہے ویسی نہیں ہے۔''

''کیسی نہیں ہے؟'' عالیہ نے سمجھنے کی کوشش کی۔

''جیسی نظر آتی ہے اس کا تعلق......''

ابھی میشا کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ نزدیک سے زوہیب کی آواز آئی۔ ''ہائی لیڈیز...... ہاؤ آر یو۔''

میشا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پینٹ کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا اور میشا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ میشا نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟''

''تمہارے سامنے ہوں۔'' وہ بولا۔ عالیہ نے کتاب

بیگ میں ڈالی اور کھڑی ہوگئی۔ زوہیب یا میشا میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور وہ روانہ ہوگئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میشا نے کیا اسے کسی شرارت کا نشانہ بنایا تھا؟ وہ اسے کسی معاملے میں گھیر رہی تھی مگر نہیں، اس کے انداز میں اسے سچائی نظر آئی تھی۔ وہ اسے کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ اسے زوہیب پر غصہ آنے لگا۔ اگر وہ اچانک وہاں نہ آجاتا تو شاید میشا مزید کھل کر بات کرتی۔ اب اسے دیا کے بارے میں تجسس ہوگیا تھا کہ اس میں ایسی کیا بات تھی جو بہ ظاہر سامنے نہیں تھی اور میشا اسی بارے میں خبردار کر رہی تھی۔ دیا، میشا اور زوہیب کی تکون اس کے دماغ میں چکرانے لگی تھی۔ دیا کے پاس زوہیب ایڈ تھا۔ عالیہ جو پوسٹ اپنے وال کے علاوہ نہیں اور کرتی تھی، وہ اکثر اس کی پوسٹ پر کمنٹس یا لائک کرتا تھا مگر عالیہ نے اسے جواب نہیں دیا۔ اگرچہ زوہیب سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا اسی طرح نہ ان میں کبھی بات ہوئی تھی کیونکہ وہ آمنے سامنے بھی ملا ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں عالیہ کے ذہن میں اس کے لیے ایک منفی تاثر تھا۔ ایک دن دیا نے اچانک اس سے فیس بک میسنجر پر پوچھا۔

"تمہیں زوہیب سے کوئی مسئلہ ہے؟"

وہ حیران ہوئی۔ "نہیں تو...... تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

"زوہیب کا کہنا ہے کہ تم اسے اگنور کرتی ہو۔"

"شاید وہ کہنا چاہتا ہے کہ میں اس سے اس طرح بات کیوں نہیں کرتی جیسے تم یا دوسری لڑکیاں کرتی ہیں۔ تو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری فطرت کیا ہے اور میری یونی کے کسی بھی لڑکے سے تعلق یا بات نہیں ہے۔"

"مگر زوہیب میرا دوست ہے۔"

"ہوگا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "ضروری نہیں ہے کہ تمہاری کسی لڑکی دوست سے میں بھی بات کروں جبکہ میں لڑکوں سے تو بات کرتی ہی نہیں ہوں۔"

"اس نے شکایت کی تھی سو میں نے تم تک پہنچادی۔"

"لیکن میں اسے ضروری نہیں سمجھتی کہ تم میری وضاحت اس تک پہنچاؤ۔" عالیہ نے جواب دیا۔ "یہ وضاحت میں نے صرف تمہارے لیے کی ہے۔ زوہیب سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

☆☆☆

خوف و دہشت کا کوئی لمحہ عالیہ نے ایسا محسوس نہیں کیا جیسا کہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔ وہ کلاس میں تھی کہ اچانک دھماکے کی آواز آئی اور پھر فائرنگ ہونے لگی۔ اس کے قریب ہی لوگوں کے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ملک کے حالات سب کے سامنے تھے اور ایسے کسی واقعے کی صورت میں ذہن فوراً دہشت گردی کی طرف جاتا تھا۔ عالیہ اور اس کے کلاس فیلوز بدحواسی میں باہر آئے تو پتا چلا کہ مین کیمپس کی طرف سے یہ آوازیں آرہی تھیں۔ وہ مخالف سمت میں بھاگے اور آڈیٹوریم میں جمع ہونے لگے۔ اکثر اپنی جان کے لیے فکرمند تھے۔ صرف کچھ تھے جو دوسروں کے لیے بھی فکرمند تھے اور ان میں ایک زوہیب بھی تھا۔ وہ اپنی کار میں مین کیمپس سے نکلنے والوں کو آڈیٹوریم تک لا رہا تھا کیونکہ فاصلہ خاصا زیادہ تھا اور پیدل آنے میں وقت لگتا۔ عالیہ اور دوسری چند لڑکیوں کو وہی کار میں یہاں لایا تھا۔ ایک گھنٹے میں تقریباً ساری یونیورسٹی وہاں جمع ہوگئی تھی۔

پولیس آگئی تھی اور حملہ آوروں کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ آگیا اور اس نے چند گھنٹوں میں حملہ آوروں کو تلاش کر کے مار دیا۔ اس وقت تک فضا رہ رہ کر فائرنگ کی آواز سے گونجتی رہی۔ اس کے بعد پوری یونیورسٹی چیک کر کے کلیئر کی تو اس کے بعد طلبا اور طالبات کو آڈیٹوریم سے باہر نکلنے کی اجازت ملی تھی۔ جو دارالحکومت کی رہنے والی تھیں، ان کے گھر والے آکر لے جا رہے تھے۔ ہاسٹل والی لڑکیاں اتنی ڈری ہوئی تھیں کہ انہوں نے پیدل ہاسٹل تک جانے سے انکار کر دیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں ان لڑکیوں کو ہاسٹل تک چھوڑ کر آئیں۔ ہاسٹل میں اس سارا دن وہ لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھی رہیں۔ میڈیا یونیورسٹی پر دہشت گردانہ حملے کی لمحہ لمحہ کوریج کر رہا تھا۔ لڑکیوں کے گھروں سے کالز آرہی تھیں۔ سلمٰی کی کال آئی تو عالیہ پولیس کی گاڑی میں ہاسٹل جا رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر اور اسے خیریت سے پا کر سلمٰی نے سکون کا سانس لیا اور اصرار کرنے لگی کہ وہ فوراً گھر آجائے۔ عالیہ نے اسے تسلی دی کہ اب خطرے کی بات نہیں ہے اور وہ ابھی کہیں نہیں جا سکتی ہے۔

حملہ آور حیرت انگیز طور پر یونیورسٹی کے دو سابق طالب علم نکلے تھے۔ ایک نے بم دھماکا کیا اور دوسرے نے فائرنگ کی تھی۔ دھماکے اور فائرنگ کے نتیجے میں بارہ طالب علم جن میں سات لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں، ہلاک ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد تیس سے زیادہ تھی۔ دونوں حملہ آور بعد میں پولیس کی فائرنگ سے مارے گئے تھے۔ یونیورسٹی تاحکم ثانی بند کر دی گئی تھی۔ جب تک حملے کے محرکات اور وجوہات کے ساتھ آئندہ ایسے حملوں سے حفاظت کا بندوبست نہیں ہوجاتا۔ یونیورسٹی بند ہونے کی وجہ سے عالیہ

نے مناسب سمجھا کہ گھر چلی جائے۔ بس سے گل پور تک صرف دو گھنٹے لگتے مگر ظہیر نے اسے بس میں آنے سے منع کر دیا۔ وہ خود اسے گاڑی میں لینے آیا تھا۔ سلمیٰ اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ ''شکر ہے تو آ گئی ورنہ میرا تو برا حال تھا۔''

''اب سب ٹھیک ہے۔'' اس نے ماں کو تسلی دی۔

''یونیورسٹی بند ہو گئی ہے اس لیے میں آ گئی۔ ورنہ وہاں ہاسٹل میں بھی مسئلہ نہیں تھا۔ پولیس نے وہاں چوکیاں بنالی ہیں۔''

''ہماری پولیس کسی قابل ہوتی تو ایسے واقعات ہی کیوں ہوتے۔'' فاریہ نے منہ بنا کر کہا تو عالیہ ہنس دی۔

''تم بھی بولنے لگی ہو۔''

''جی میں بڑی ہو چکی ہوں۔'' اس نے فخر سے کہا۔ ''تیرا کی ہو کر چودھویں سال میں لگ گئی ہوں۔''

عالیہ نے محسوس کیا کہ ماں صرف اس کے آنے سے خوش نہیں ہے بلکہ اس کی خوشی کی کوئی اور وجہ بھی ہے۔ رات جب وہ سونے کے لیے کمرے میں آئی تو کچھ دیر بعد سلمیٰ نے اسے باہر بلایا۔ فاریہ حسبِ عادت جلد سو چکی تھی۔ عالیہ باہر آئی تو سلمیٰ اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور اس نے عالیہ سے کہا۔ ''عالیہ! تجھ سے ایک بات کرنی ہے۔''

''کریں امی۔''

''تیرے چچا نعیم نے تجھے صارم کے لیے مانگا ہے۔''

صارم نعیم کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ عالیہ سے دو سال بڑا تھا اور اس وقت سافٹ ویئر انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ شکل صورت اور کردار کا بھی اچھا تھا۔ عالیہ کو اچھا لگتا تھا مگر کزن کی حیثیت سے۔ اس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ صارم سے اس کا کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا ہے۔ درحقیقت عالیہ نے کسی کے بارے میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ اس کے خیال میں یہ اس کے گھر والوں کا معاملہ تھا۔ اس نے جھینپ کر سر ہلایا۔ ''جی امی! تو آپ اور بھائیوں نے کیا سوچا ہے؟''

''یہ تو تم بتاؤ۔''

عالیہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ''امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ میں بتانے والی کون ہوتی ہوں۔ یہ فیصلہ آپ اور میرے بھائیوں نے کرنا ہے کہ میری شادی کس سے اور کب کرنی ہے۔''

سلمیٰ کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اس نے عالیہ کو گلے لگا لیا۔ ''خوش رہے عالی! میں تو سوچ رہی تھی کہ تو اپنی مرضی بھی شامل کرے گی۔''

''امی! آپ کی مرضی میری مرضی ہے۔'' اس نے سلمیٰ کے شانے سے سر ٹکایا۔ ''آگے پڑھنا میرا خواب تھا۔ میں سچ پڑھ رہی ہوں۔ میری چاروں سمسٹر میں پہلی پوزیشن آئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں خودمختار ہو گئی ہوں۔ میرے بڑے موجود ہیں۔ وہی میرے فیصلے کرنے کے مجاز ہیں۔''

سلمیٰ نے سکون کا سانس لیا۔ ''میں نے پہلے ظہیر اور عمیر سے پوچھا اور انہیں یہ رشتہ پسند ہے۔ صارم بہت اچھا لڑکا ہے اور ماشاء اللہ پڑھنے میں بھی اچھا ہے۔ اگلے سال جاب پر لگ جائے گا۔ ظہیر نے کہا کہ میں پہلے تم سے معلوم کرلوں۔ کہیں تمہیں کوئی اختلاف نہ ہو۔''

عالیہ کو دکھ ہوا تھا۔ ''امی! وہ میرے بھائی ہیں اور جیسے میں انہیں جانتی ہوں، اسی طرح وہ بھی مجھے جانتے ہیں پھر ایسی بات کیوں کی؟''

''بس بیٹا! آج کل لوگوں میں دوسروں کو سمجھنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے اسی لیے تو جھگڑے اور اختلاف بڑھ رہے ہیں۔''

''میں شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھ سے پوچھا۔ صارم بہت اچھا ہے لیکن میرے لیے اصل اہمیت آپ کی اور بھائیوں کی رضا کی ہے۔''

سلمیٰ خوش ہو گئی تھی۔ ''میں کل ہی ظہیر اور عمیر سے بات کرتی ہوں اور نعیم کو بھی اشارہ دیتی ہوں۔''

اگلے دن عالیہ نے محسوس کیا کہ ظہیر کا رویہ اس کے ساتھ اچانک ہی اچھا ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ سلمیٰ نے اس تک عالیہ کی بات پہنچا دی تھی۔ وہ اب اس سے پہلے کی طرح محبت اور بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ عالیہ کو خوشی ہوئی تھی۔ اسے اپنے گھر والوں سے محبت تھی اور وہ چاہتی تھی کہ وہ اس پر اعتماد کریں۔ عمیر کی انجینئرنگ مکمل ہو گئی تھی اور اب وہ جاب کی تلاش میں تھا۔ عالیہ کے آنے کا سنا تو وہ بھی چند دن کے لیے گھر آ گیا۔ بہت عرصے کے بعد عالیہ نے ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھا وقت گزارا۔ عمیر عالیہ کے لیے سوٹ اور دوسری چیزیں لایا تھا۔ ظہیر کھانے پینے کا شوقین تھا۔ انہوں نے ایک رات مکان کے عقبی صحن میں فائر کیمپ اور باربی کیو کیا تھا۔ سلمیٰ نے بتایا کہ اس نے نعیم کو ہاں کہہ دی ہے اور نعیم کا ارادہ ہے کہ جیسے ہی صارم تعلیم مکمل کر کے کہیں جاب پر لگے گا، وہ عالیہ کو باقاعدہ مانگ لے گا۔ اگر صارم جلد سیٹ ہو گیا تو وہ اس کی شادی جلد کر دے گا اور عالیہ اپنی تعلیم شادی کے بعد بھی مکمل کر سکے گی۔

☆☆☆

عالیہ نے واپسی پر مومنہ، روشنی اور دیا کو اپنے رشتے

کے بارے میں بتایا تو سب نے ٹریٹ کا شور مچایا۔ عالیہ نے کہا بھی کہ ابھی صرف دونوں طرف سے ہاں ہوئی ہے کوئی باقاعدہ رسم نہیں ہوئی ہے مگر وہ نہیں مانی تھیں۔ اس سے زبردستی ٹریٹ لی تھی اور اسے پیزا آرڈر کرنا پڑا تھا۔ دیا بھی ہاسٹل آگئی تھی۔ انہوں نے وہیں ٹریٹ اڑائی تھی۔ کچھ دن بعد زوہیب نے اسے فیس بک پر میسج کرکے مبارک دی۔ شاید اسے دیا نے بتایا تھا۔ عالیہ کو اچھا نہیں لگا مگر یونیورسٹی والے واقعے کے بعد وہ زوہیب سے سلام دعا کر لیتی تھی اور اگر وہ کوئی بات کرتا تو اس کا جواب بھی دیتی تھی۔ اس کے دل میں زوہیب کا تاثر بہتر ہو گیا تھا۔ خاص طور سے اس بات پر کہ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر دوسروں کو محفوظ مقام تک پہنچایا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''دیا نے۔''

بیشا کی طرف سے خبردار کیے جانے والے واقعے کے بعد اس نے کئی بار فرصت میں اس بارے میں سوچا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں بیشا خود زوہیب کے چکر میں تو نہیں تھی۔ یہ شبہ اسے دیا کے بارے میں بھی تھا مگر زوہیب دونوں کو ہی کوئی خاص لفٹ نہیں کراتا تھا اور ان کا آپس میں رویہ کولیگ سے زیادہ نہیں تھا۔ یونیورسٹی ایک ہفتے بعد کھلی تھی اور دو تین دن .... معمول پر آنے میں لگے تھے۔ ضائع ہونے والے وقت کی تلافی کے لیے سب ہی مصروف ہو گئے تھے۔ اس سیمسٹر میں عالیہ کو سوشل میڈیا استعمال کرنے کا وقت بہت کم ملا تھا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد بھی وہ کمرے میں پڑھتی رہتی تھی اور صرف کھانے کے لیے باہر جاتی تھی۔ اپنے ساتھ اسے مومنہ اور روشنی کی مدد بھی کرنا پڑ رہی تھی۔ اس لیے جب فارغ ہوتی تو اتنا تھک چکی ہوتی کہ سوائے سونے کے اسے اور کوئی خیال نہیں آتا تھا جبکہ مومنہ اور روشنی حسب معمول موبائل میں لگی رہتی تھیں۔ وہ کس وقت سوتیں، عالیہ کو علم نہیں تھا مگر صبح انہیں اٹھانا پڑتا تھا۔

روشنی نے یونیورسٹی میں آنے کے چند ہفتے بعد ہی اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ مگر اپنے گھر والوں کو وہ یہی تاثر دیتی تھی کہ وہ ویسی ہی ہے۔ اس کا اندازہ اس کی گھر والوں سے ہونے والی گفتگو اور اس کی تصویروں سے ہوا جو اس نے گھر والوں کو بھیجی تھیں۔ پھر ایک دن اتفاق سے اس کا ایک بھائی یونیورسٹی میں اس سے ملنے آگیا۔ روشنی کی خوش قسمتی کہ اس نے پہلے بھائی کو دیکھ لیا تھا اور وہ عالیہ کو ہاسٹل جانے کا کہہ کر نکل گئی۔ بعد میں عالیہ نے اس کے بھائی کو بتایا کہ وہ ہاسٹل میں ہے۔ وہ اس سے ملنے وہاں چلا گیا تھا۔ عالیہ نے محسوس کیا تھا کہ روشنی بری لڑکی نہیں تھی، بس وہ گھر والوں کی پابندیوں سے اکتائی ہوئی تھی۔ وہ جدت پسند تھی مگر ایک حد میں رہ کر۔ وہ لباس کے معاملے میں حد میں رہتی تھی اور عالیہ کی طرح اسے بھی لڑکوں سے دلچسپی نہیں تھی مگر وہ گھومنے پھرنے اور دوستوں کے ساتھ ہلے گلے کی شوقین تھی۔

عالیہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ یہ سب اپنے گھر والوں سے چھپ کر کرتی تھی۔ روشنی اس معاملے میں اتنی ہوشیار تھی کہ نہ اس نے اپنے گھر والوں کی سختی کے رونے روئے تھے اور نہ ہی اپنا حلیہ بدلنے پر ان لوگوں کو کوئی بات کرنے کا موقع دیا تھا۔ مومنہ اور دیا اس کی تبدیلی سے خوش تھیں۔ عالیہ نے سوچا کہ وہ اکیلی اعتراض کر کے اپنا تاثر کیوں خراب کرے۔ ہر شخص اپنا ذمے دار خود تھا۔ اس لیے وہ پسند نہ آنے کے باوجود روشنی کے ساتھ نارمل رہی تھی۔ اس سیمسٹر کے بعد اگلا سیمسٹر شروع ہوا۔ مومنہ نے محنت کی تھی لیکن وہ رہ گئی۔ عالیہ کے حساب سے اس نے اچھی تیاری کی تھی مگر جب رزلٹ آیا تو وہ مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکی تھی۔ اسے سیمسٹر ریوائس کرنا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ اس کا باپ اسے وارننگ کے مطابق واپس نہ بلا لے مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا اور باپ نے وارننگ کے ساتھ ایک سیمسٹر کی اور اجازت دے دی تھی۔ عالیہ نے حسب معمول ٹاپ کیا تھا اور وہ اپنے شعبے کی پہلی طالبہ بن گئی تھی جس نے مسلسل پانچ سیمسٹر میں ٹاپ کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ اعزاز کسی اور طالب علم کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ شعبے کے ڈین نے اسے خصوصی طور پر اپنے آفس بلا کر سراہا تھا۔ دیا، روشنی اور مومنہ نے اس کامیابی پر اسے پارٹی دی تھی۔ دیا اگرچہ تعلیم پر کم ہی بات کرتی تھی لیکن اس بار اس نے بھی رشک سے پوچھا۔

''تم اتنی مستقل مزاجی سے کیسے پڑھ لیتی ہو؟''

''جیسے لڑکیاں مستقل مزاجی سے زوہیب کے پیچھے لگی رہتی ہیں۔'' عالیہ نے ہنس کر کہا۔ ''یو نو ہم لڑکیاں کسی نہ کسی ایک معاملے میں تو بہت مستقل مزاج ہوتی ہیں۔''

دیا کا منہ بن گیا مگر فوراً ہی سنبھل کر ہنسنے لگی۔ ''لیکن میں کسی کے پیچھے نہیں ہوں۔''

''رئیلی؟'' روشنی نے تعجب سے پوچھا۔ ''سچی بات ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تمہارا کسی سے تعلق کیوں نہیں ہے۔ تم صورت شکل کی اتنی حسین ہو اور فلرٹ کی قائل بھی ہو۔''

دیا کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔ ''شاید اس لیے کہ میرا اسٹینڈرڈ بہت ہائی ہے۔''

''فلرٹ میں اسٹینڈرڈ کہاں سے آگیا؟ یہ تو میرج میں دیکھنا چاہیے۔'' مومنہ نے برجستہ کہا۔

عالیہ نے جواب دینے کے بجائے صرف شانے ہلائے تھے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ چھٹا سمیسٹر سب سے دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ پڑھائی کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ عالیہ کو اپنے کندھے دکھتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ خدا خدا کر کے یہ سمیسٹر ختم ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور فوری گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس بار اس کی بے تابی زیادہ تھی۔ اس لیے آخری پیپر دے کر گرمائی چھٹیوں کے پہلے دن وہ گھر کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ روشنی اور مومنہ رکی ہوئی تھیں کیونکہ وہ یونیورسٹی کی طرف سے نادرن ایریا کے ٹور پر جا رہی تھیں۔ وہ اس ٹور کے بعد اپنے گھروں کو جاتیں۔ چونکہ ٹور مکس تھا اس میں لڑکے لڑکیاں سب شامل تھے، اس لیے عالیہ نے انکار کر دیا۔ اس نے ماں اور بھائیوں سے... پوچھا ہی نہیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے اچھا نہیں سمجھیں گے۔ اگرچہ گرمی شدید تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی ٹھنڈی جگہ جائے مگر اپنے گھر والوں کے ساتھ...... اور جب وہ گھر پہنچی تو یہ جان کر خوش ہوگئی کہ ظہیر نے نادرن ایریا ٹور کا پروگرام بنا لیا تھا۔

''سچ ظہیر بھائی! میرا بہت دل چاہ رہا تھا مگر گھر کی وجہ سے یونیورسٹی ٹور پر جانے سے انکار کر دیا۔''

ظہیر نے اسے محبت سے دیکھا۔ ''تو بس سمجھ لو کہ میری بہن کا دل چاہ رہا تھا تو میں نے پروگرام بنا لیا۔''

ظہیر نے زمین اور باغ کو بہت اچھی طرح سنبھال لیا تھا بلکہ وہ اس میں جدت بھی لایا تھا۔ پرانے ہو جانے والے درختوں کی جگہ اس نے جدید نسل کے اور زیادہ پیداوار دینے والے درخت لگانے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ باغ میں شہد کی مکھی کے باکس رکھے تھے اور ریشم کے کیڑے پالنے کا بندوبست بھی کیا تھا جس سے آمدنی میں خاصا اضافہ ہو رہا تھا۔ اب تک بٹوارے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ظہیر ساری آمدنی سلمٰی کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا تھا اور وہ خود بھی ظہیر کو اس میں سے زیادہ حصہ دیتی تھی کیونکہ سارا کام وہی کرتا تھا جبکہ عمیر، عالیہ اور فاریہ کا حصہ محفوظ رکھتی تھی اور اپنے حصے کی رقم سے گھر کے اخراجات پورے کرتی تھی۔ سلمٰی نے ظہیر کا رشتہ اپنی بھانجی ایمان سے طے کر دیا تھا۔ وہ اس سال گریجویشن کر لیتی تو سلمٰی کا ارادہ اسے سردیوں سے ذرا پہلے بیاہ کر لانے کا تھا۔ عالیہ کو ایمان بہت اچھی لگتی تھی۔ پیاری اور خوش مزاج لڑکی تھی۔

عمیر کے لیے سلمٰی نے عتیق کی بیٹی کا سوچا تھا۔ وہ ابھی ایف ایس سی کر رہی تھی۔ اب صرف فاریہ رہ گئی تھی مگر وہ چھوٹی تھی اور ابھی اس کے لیے بہت وقت پڑا تھا۔ اس سال وہ میٹرک میں آئی تھی۔ اسے پڑھنے کا خاص شوق نہیں تھا مگر وہ گریجویشن کرنا چاہتی تھی۔ عمیر کا کہنا تھا کہ جب وہ کالج تک آئے گی تو اسے اپنے پاس شہر بلا لے گا۔ اس نے شہر میں رہنے اور جاب کیریئر اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ فی الحال وہ نعیم کے ساتھ رہ رہا تھا مگر جلد اس کا ارادہ اپنی رہائش الگ کرنے کا تھا۔ شمالی علاقے کے ٹور میں وہ بھی شامل تھا۔ ظہیر کے ایک دوست نے ایک ہل اسٹیشن پر اپنا ہوٹل کھولا تھا اور اسی نے اسے دعوت دی تھی کہ وہ کچھ دن وہاں آکر رہے۔ دوست شادی شدہ تھا اور اس کی ایک بچی بھی تھی۔ اس نے ہوٹل کے پاس ہی چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔

ظہیر اور باقی سب اس کے گھر میں رکے تھے۔ وہ ایک ہفتہ اس کے ہاں رہے اور پھر مزید ایک ہفتہ دوسری جگہوں پر گھومتے رہے۔ عالیہ نے اس سفر کو بہت انجوائے کیا اور یہ اتفاق تھا کہ ایک جگہ انہیں صارم اپنے کولیگز کے ساتھ مل گیا۔ وہ آخری سمیسٹر سے پہلے گروپ بنا کر ٹور پر آئے ہوئے تھے۔ عالیہ اس سے بے تکلفی سے ملتی تھی مگر اس بار اسے اس کا سامنا کرتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ صارم نے موقع پا کر اسے قوس قزح کے رنگوں والا مفلر گفٹ کیا تھا۔ اسے بھی علم تھا کہ اس کی اور عالیہ کی نسبت طے پانے والی ہے اور وہ اس سے بہت خوش تھا۔ اس نے عالیہ کو بتایا کہ کچھ عرصے سے اس کی خواہش تھی کہ اس کی شادی عالیہ سے ہو مگر ماں باپ سے یہ بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ اللہ نے خود اس کی خواہش پوری کر دی اور نعیم نے سلمٰی سے بات کر لی تھی۔ عالیہ نے وہ مفلر چھپا لیا تھا کہ کوئی اس کے بارے میں پوچھتا تو وہ کیا جواب دیتی۔

واپسی پر وہ بہت خوش تھی۔ گل پور میں بھی موسم اچھا ہو گیا تھا اور تقریباً روز بارش ہو رہی تھی۔ عالیہ اور فاریہ صحن میں لگے جھولے پر گھنٹوں بیٹھی رہتی تھیں۔ انہوں نے بارش کے پکوان بنائے۔ ظہیر نے آموں کی ڈھیروں پیٹیاں منگوائی تھیں اور انہوں نے دل بھر کر آم کھائے تھے۔ وقت کیسے گزرا... عالیہ کو پتا ہی نہیں چلا اور یونیورسٹی کھلنے کا وقت آگیا۔ اس بار جاتے ہوئے اس کا دل بہت اداس تھا اور آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ ٹور کے بعد عمیر واپس چلا گیا

تھا۔ عالیہ کے جانے سے چند دن پہلے وہ پھر آیا ہوا تھا۔ اسے ایک جگہ جاب مل گئی تھی اور پہلی تاریخ سے جوائننگ تھی، وہ اس سے پہلے گھر والوں سے ملنے آیا تھا۔ وہی عالیہ کو چھوڑنے دارالحکومت آیا تھا۔ راستے میں اس نے عالیہ کو بتایا کہ تایا رفیق نے اس کے شہر میں پڑھنے پر کتنا طوفان اٹھایا تھا اور انہیں کیا کیا باتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ عمیر نے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ عالیہ کے ساتھ ان کا رویہ اسی وجہ سے سرد تھا۔ عالیہ دکھی ہو گئی۔

"آخر تایا جی کو مجھ سے کیا پرخاش ہے، میں ان کی بیٹی کی طرح ہوں۔"

"اس کی وجہ ہے۔" عمیر نے کہا۔ "انہوں نے راشد کے لیے تمہارے رشتے کی بات کی تھی اور ہم نے انکار کر دیا۔"

عالیہ ششدر رہ گئی۔ "یہ کب ہوا؟ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔"

"تمہارے یونیورسٹی جانے کے فوراً بعد کی بات ہے۔ مخالف تو وہ پہلے بھی تھے لیکن اس کے بعد ان کا رویہ زیادہ سخت ہو گیا۔ کتنی بار جھگڑے کی نوبت آئی مگر ہم نے تحمل سے کام لیا۔"

اب عالیہ کو پتا چلا کہ رفیق تایا اور اس کے گھر والے اتنے مخالف کیوں ہو رہے تھے۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ امی اور بھائیوں نے راشد کے لیے منع کر دیا۔ وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ نہ صرف جاہل تھا بلکہ اوباش بھی تھا۔ عالیہ نے کم عمری میں اس کی گندی نظریں محسوس کر لی تھیں۔ اسے اسی وجہ سے نہیں بتایا تھا کہ وہ نئی نئی یونیورسٹی گئی تھی اور سلمٰی نہیں چاہتی تھی کہ اس کا ذہن بٹے۔ عالیہ کو صارم کا خیال آیا تو اس نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اتنے سلجھے ہوئے اور اچھے شخص کو اس کے لیے چنا تھا۔ صارم نے اتنے عرصے کے رابطے میں ایک بار ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا کہ عالیہ سے اس کا ایک اور رشتہ بننے والا ہے۔ ہاں جب وہ شمالی علاقے میں ملے تو اس نے اسے مفلر کا تحفہ دیا تھا اور کھل کر اپنی پسند کا اظہار بھی کیا تھا۔ شاید اس کے دوستوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ اس کی منگیتر بننے والی ہے۔

نعیم نے مکان میں اپنا حصہ رفیق کو فروخت کر دیا تھا۔ اگرچہ اس نے قیمت مارکیٹ سے خاصی کم لگائی تھی مگر نعیم نے مستقبل میں فساد پالنے کے بجائے ابھی اس سے جان چھڑا لینا مناسب سمجھا تھا۔ اس کے بعد رفیق نے ان سے بھی تعلق برائے نام کر لیا تھا۔ ان کے ذہن بھی رفیق سے نہیں ملتے تھے۔ اس لیے عتیق اور نعیم جب بھی گل پور آتے تو سلمٰی کے پاس ہی رکتے تھے۔ ابھی انہیں اوپری پورشن کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ سلمٰی نے اسے مہمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کی ضرورت پڑنے کا امکان بھی کم تھا۔ ظہیر کا بیڈروم نیچے تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ نیچے ہی رہتا۔ عمیر نے شہر میں رہنے کا اعلان کر دیا تھا۔ عالیہ اور فاریہ بیاہ کر اپنے گھر چلی جاتیں۔ ہاں شادی کے بعد جب ظہیر کے بچے ہوتے اور وہ بڑے ہو جاتے تب اس پورشن کو بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

آتے ہوئے سلمٰی نے عالیہ کے کان میں ڈال دیا تھا کہ شاید اگلے ماہ نعیم فیملی کے ساتھ آئے گا اور بات پکی کر جائے گا۔ شادی اسی وقت ہو گی جب صارم سیٹ ہو جائے گا۔ اس میں عالیہ کی تعلیم مکمل ہونے کی شرط نہیں تھی۔ اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ ابھی اس کا ماسٹر مکمل ہونے میں تین سال باقی تھے اور یہ خاصا طویل عرصہ تھا۔ اگر شادی کی وجہ سے اس کے دو یا تین سمسٹر رہ جاتے تو وہ بعد میں بھی دے سکتی تھی۔ عالیہ کو کچھ چیزیں لینی تھیں۔ عمیر نے اسے مارکیٹ سے وہ چیزیں دلائیں اور اسے ہاسٹل چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

جاتے وقت وہ معمولی سا سامان اور تحفے لے کر گئی تھی جو اس نے سب کے لیے خریدے تھے۔ باقی سارا سامان یہیں چھوڑ گئی تھی کیونکہ گھر میں اس کے لیے سب کچھ تھا۔ پہلے دن وہ اکیلی تھی، اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر آنے والے سمسٹر کے بارے میں ٹائم ٹیبل ترتیب دے لیا۔ روشنی اور مومنہ اگلے دن آئی تھیں۔ وہ مومنہ کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کا سرخ و سفید رنگ پھیکا پڑ چکا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے۔ روشنی بھی حیران ہوئی تھی۔ اس کا سڈول جسم بھی دبلا ہو گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا تو مومنہ نے ٹالنے والے انداز میں بتایا کہ وہ شمالی علاقے سے واپسی پر بیمار پڑ گئی تھی مگر جلد انہوں نے محسوس کیا کہ مومنہ کی حالت کی وجہ بیماری نہیں تھی۔ وہ کسی شدید پریشانی کا شکار تھی۔ اس کا طرز عمل پہلے بالکل بدل گیا تھا۔ وہ خاموش طبع اور حساس ہو گئی تھی۔ اگر کوئی اونچی آواز سے بولتا تو چونک جاتی۔ پہلے اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی مگر اب وہاں کشیدگی اور پریشانی نمایاں ہوتی تھی۔ اس کی باڈی لینگویج بھی بدل گئی تھی۔ عالیہ نے ایک دو بار اسے کریدا کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ مگر اس نے نہیں بتایا۔ اس سے پہلے اس کی دیا سے بہت زیادہ دوستی تھی مگر اب وہ دیا کا نام بھی نہیں لیتی تھی۔ یونیورسٹی میں دیا کا

ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اگر وہ کہیں نظر آتی تو مومنہ راستہ بدل کر دوسری طرف چلی جاتی تھی۔ چند ایک بار دیا، عالیہ اور روشنی کے ساتھ تھی۔ مومنہ نے ایسا ہی کیا تو دیا حیران رہ گئی۔ اس نے عالیہ سے شکوہ کیا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟ جب سے یونی کھلی ہے اس نے مجھ سے ایک بار بھی بات نہیں کی۔ میں کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی اور اب مجھ سے ملنا یا مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے اسے۔''

''ہم بھی حیران ہیں کہ اسے کیا ہوا ہے۔'' روشنی نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ ٹور سے واپسی پر یہ بیمار ہو گئی تھی۔''

''وہاں تو ٹھیک ٹھاک تھی۔'' دیا نے کہا۔

''اس کا کسی سے افیئر تو نہیں ہے!'' روشنی نے کہا تو دیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تم سے کس نے کہا؟''

''ہم لڑکیوں کی ایسی حالت عام طور سے افیئر میں ہو جاتی ہے۔'' روشنی ہنسی۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' دیا جو چند لمحے پہلے کھل کر بات کر رہی تھی، اچانک ہی وہ عجلت میں نظر آنے لگی اور کچھ دیر بعد اٹھ گئی۔ روشنی نے حیرت سے کہا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟ ابھی تو اچھی بھلی بیٹھی تھی۔''

عالیہ کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''کہتے ہیں کہ جب کسی لڑکی یا عورت کا طرز عمل خلافِ معمول ہو جائے تو سمجھ لو اس کے پیچھے کوئی مرد ہے۔''

روشنی اچھل پڑی۔ ''رئیلی؟ میں نے تو مذاق میں افیئر کا کہا تھا۔''

''بعض اوقات مذاق میں کہی بات سچ بن جاتی ہے۔'' عالیہ نے کہا۔ وہ لان چیئرز پر بیٹھی تھیں۔ ''تم نے دیکھا جیسے ہی مومنہ کے افیئر کی بات کی اس کا رویہ بدل گیا۔ پہلے وہ سکون سے بات کر رہی تھی اور پھر اچانک ہی عجلت میں چلی گئی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' روشنی بولی۔

''میں نے آج تک ایک بات کسی کو نہیں بتائی۔ ایک بار میشا نے بہت سنجیدگی سے مجھے دیا کے بارے میں خبردار کیا تھا مگر اس وقت میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ مومنہ کی دیا سے سب سے زیادہ بنتی تھی اور اب وہ اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتی ہے۔ آخر کیوں؟''

روشنی نے سر ہلایا۔ ''سوچنے کی بات ہے۔''

''دیا ہمارے لیے صرف ایک کولیگ ہے مگر ہم تینوں تین سال سے زیادہ عرصے سے ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا ایک دوسرے پر حق بنتا ہے۔ ہمیں مومنہ کے مسئلے کا کھوج لگانا چاہیے اور اس کی مدد کرنی چاہیے۔''

''مگر وہ ہمیں کچھ نہیں بتا رہی اور نہ ہی اس نے مدد طلب کی ہے۔''

''بعض اوقات انسان اپنے نفع نقصان کے بارے میں بچوں کا سا بی ہیو کرنے لگتا ہے۔ دوسروں کو اس کی کیئر کرنی پڑتی ہے۔''

روشنی اس بارے میں زیادہ رضامند نہیں تھی۔ ''ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔''

''جو ہمارے بس میں ہو۔ تم اسے دوسرے پوائنٹ آف ویو سے بھی سوچو اگر مومنہ نے کوئی حماقت کی اور وہ سامنے آ گئی تو ہم بھی اس کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔ دیا بچ سکتی ہے مگر ہم نہیں کیونکہ ہمارا تقریباً چوبیس گھنٹے کا ساتھ ہے اور کوئی نہیں مانے گا کہ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس لیے بھی ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ بے شک ہم مومنہ کا مسئلہ نہ حل کر سکیں مگر اس کے بارے میں جاننا تو لازمی ہے تاکہ ہم بے خبری میں نہ مارے جائیں۔''

روشنی نے سر ہلایا۔ ''اب تمہاری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ میرے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ان تک پہنچی تو وہ دوسرے دن ہی مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔''

''اس لیے ہمیں حقیقت معلوم ہونی چاہیے۔''

''مگر کیسے؟''

''میرے پاس ایک نام ہے یونی بوائے۔'' عالیہ نے کہا اور پھر مومنہ کے فیس بک میسج کے بارے میں بتایا جو اس نے غلطی سے دیکھ لیا تھا۔ روشنی نے سن کر حیرت سے کہا۔

''تم نے بتایا نہیں۔''

''میں تو میسج دیکھ کر پچھتا رہی تھی کہ یہ انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے، کسی اور کو کیسے بتاتی۔''

''اور اب جو کھوج کرو گی؟''

''وہ مومنہ اور اپنے تحفظ کے لیے ہے۔'' عالیہ نے رسانیت سے کہا۔ ''مقصد برا نہیں ہے۔''

روشنی نے اپنے اسمارٹ فون پر فیس بک اوپن کی اور یونی بوائے کو تلاش کیا تو درجنوں کے حساب سے یونی بوائے نکل آئے۔ ان میں ایسے بھی نصف درجن سے زیادہ تھے جنہوں نے اپنی اصل تصویر کی جگہ خالی چھوڑی تھی یا پھر کوئی اور تصویر اپ لوڈ کی ہوئی تھی۔ انہوں نے ان کو بھی کھنگالا مگر

کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ سب نے لاک لگا رکھے تھے اور کوئی ان کی پروفائل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ خاصی دیر مغز ماری کرتی رہیں مگر کام نہیں بنا۔ عالیہ نے تنگ آ کر کہا۔ ''چھوڑو ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟''

''مومنہ کے موبائل تک رسائی نہیں ہوسکتی ہے؟''

روشنی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس نے سیکیورٹی کوڈ لگایا ہوا ہے۔''

عالیہ نے گہری سانس لی۔ ''تب ہمیں روایتی جاسوسی سے کام لینا ہوگا۔ مومنہ کا پیچھا کرنا ہوگا کہ وہ کس سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے؟''

''اگر وہ یونی سے باہر کسی سے ملنے گئی تو؟''

''ہم کوشش کریں گے کہ جان سکیں، وہ کس سے ملتی ہے۔''

وہ ہاسٹل پہنچیں تو مومنہ آگئی تھی اور آج اس کا موڈ خوشگوار لگ رہا تھا۔ وہ اپنے اور ان کے لیے پیزا لائی تھی۔ روشنی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''یہ کس بات کی ٹریٹ دی جارہی ہے؟''

مومنہ جھینپ گئی۔ ''کسی بات کی نہیں، بس میرا دل چاہ رہا تھا۔''

اتفاق سے انہوں نے لنچ نہیں کیا تھا اس لیے پیزا اچھا لگا۔ کھانے کے بعد مومنہ نے اپنے کپڑے اور استری نکالی اور فرش پر چادر بچھا کر استری کرنے لگی۔ عالیہ اور روشنی چونکیں۔ روشنی نے پوچھا۔ ''کہاں کا ارادہ ہے؟''

''مجھے کچھ کام تھا۔'' مومنہ نے کہا۔ ''چار بجے جاؤں گی اور چھ بجے تک آجاؤں گی۔''

''اگر کچھ لینے جارہی ہو تو ہم بھی چلتے ہیں۔'' عالیہ نے کہا۔

''نہیں۔'' مومنہ نے ہچکچا کر کہا۔ ''یہاں میری ایک رشتے کی خالہ رہتی ہیں، ان سے ملنے جارہی ہوں۔ بہت دنوں سے بلا رہی تھیں مگر فرصت ہی نہیں مل رہی تھی اور پھر طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے سوچا آج مل آؤں۔''

''کہاں رہتی ہیں تمہاری یہ خالہ؟''

مومنہ ہچکچائی پھر اس نے دارالحکومت کے ایک سیکٹر کا بتایا جہاں زیادہ تر نچلے اور درمیانے درجے کے سرکاری ملازمین کے لیے کوارٹرز تھے۔ عالیہ نے کہا۔ ''مجھے مارکیٹ سے کچھ لینا ہے۔ تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''

مومنہ چونکی اور اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''مجھے دیر بھی ہوسکتی ہے۔''

''میں صرف تمہارے ساتھ جاؤں گی، واپسی تم خود آؤ گی اور میں تو ایک گھنٹے میں آجاؤں گی۔''

مومنہ راضی نہیں تھی مگر اسے منع بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ یہاں سے بسیں چلتی تھیں جو دارالحکومت کے مختلف سیکٹرز تک جاتی تھیں۔ مومنہ لباس بدل رہی تھی۔ وہ دونوں کمرے سے باہر آگئیں۔ روشنی نے آہستہ سے کہا۔ ''تم اس کا پیچھا کر کے دیکھو گی کہ یہ کہاں جاتی ہے؟''

''بالکل...... مجھے شبہ ہے کہ یہ کسی خالہ کے ہاں جارہی ہے۔ آج سے پہلے اس نے کبھی کسی خالہ کا ذکر نہیں کیا۔''

مومنہ تیار ہوئی۔ عالیہ نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ اس نے صرف بڑی چادر لے لی۔ وہ باہر نکلیں اور بس اسٹاپ تک آئیں۔ بس ہر دس منٹ بعد آتی تھی اور کیونکہ یہ عام روٹ نہیں تھا اس لیے بھری ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ انہیں آرام سے جگہ مل گئی۔ مارکیٹ راستے میں تھی۔ عالیہ پہلے اتری تھی۔ یہ مین اسٹاپ تھا اور یہاں بے شمار ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ بس کے روانہ ہوتے ہی عالیہ ایک ٹیکسی تک آئی اور اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ''بھائی! اس بس کے پیچھے جانا ہے...... میرا شاپر میری سہیلی کے پاس رہ گیا ہے۔''

''آجائیں جی۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''آپ کہیں تو میں بس کے آگے جا کر اسے روک لوں؟''

''نہیں جہاں میری سہیلی اترے گی میں وہیں اتر جاؤں گی۔'' عالیہ نے کہا۔ ٹیکسی والے نے اپنی یلو کیب آگے بڑھا دی۔ دو اسٹاپ بعد اسے مومنہ بس سے اترتی نظر آئی۔ یہ وہ سیکٹر نہیں تھا جہاں اس نے اپنی خالہ کی رہائش بتائی تھی۔ وہ خاصا پوش اور بڑے لوگوں کا سیکٹر تھا۔ یہاں بڑے بنگلے، کوٹھیاں اور لگژری قسم کے اپارٹمنٹ والی عمارتیں تھیں۔ اس نے ٹیکسی والے سے کہا۔ ''بھائی! یہیں روک دیں اور کرایہ کتنا ہوا؟''

ٹیکسی والے نے جو رقم بتائی اس نے اترتے ہوئے پرس سے نکالی اور ڈرائیور کو دے کر مومنہ کے پیچھے چل پڑی جو پیدل جارہی تھی۔ عالیہ کچھ فاصلے سے اس کا پیچھا کرنے لگی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ صرف یہ دیکھے گی کہ مومنہ کہاں جاتی ہے اور کس سے ملتی ہے؟ اس کے بعد وہ واپس ہاسٹل چلی جائے گی مگر کچھ آگے جا کر مومنہ ایک لگژری عمارت کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ عالیہ تیزی سے پیچھے لپکی اگر وہ کسی اپارٹمنٹ میں چلی جاتی تو عالیہ کو علم ہی نہ ہوتا۔ جب وہ اندر لابی میں پہنچی تو مومنہ ایک لفٹ میں داخل ہو رہی تھی اور اس کا دروازہ بند ہونے لگا۔ وقت نہیں تھا اور پاس ہی

سیڑھیاں تھیں۔ عالیہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہر فلور پر آکر وہ پہلے جھانکتی تھی اور اگر لفٹ وہاں نہیں رکی ہوتی تو وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیتی۔

تیسرے فلور کے بعد وہ ہانپنے لگی اور پانچویں فلور کے بعد سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہو گیا۔ بالآخر اس نے چھٹے فلور پر مومنہ کو لفٹ سے نکل کر مخالف سمت میں جاتے دیکھا۔ وہ ایک راہداری میں مڑی تو عالیہ سیڑھیوں سے نکل کر اس کے پیچھے گئی اور جب اس نے جھانک کر دیکھا تو اسے مومنہ آخری فلیٹ کے دروازے پر نظر آئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور وہ اندر چلی گئی۔ اس راہداری میں آمنے سامنے صرف دو فلیٹ تھے۔ ایک فلیٹ کا دروازہ راہداری کے شروع میں تھا لیکن مومنہ جس فلیٹ میں گئی تھی، اس کا دروازہ آخر میں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے؟ اس نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ مومنہ کہاں گئی ہے مگر وہاں کون رہتا تھا، وہ اس سے بے خبر تھی۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے قریب جا کر اپارٹمنٹ کے دروازے پر چمکتی دھات سے کندہ نمبر دیکھا اور پھر نیچے لابی میں آگئی۔ وہاں اس نے پوسٹ بکس چیک کیے جن پر اپارٹمنٹ کے نمبر تھے اور ان کے لیے آنے والے بلز اور دوسری ڈاک اسی میں ڈالی جاتی تھی۔ بکس لاک تھے مگر اس کی توقع کے عین مطابق ایک تازہ آنے والے بل کا کنارہ باہر جھانک رہا تھا۔ پوسٹ مین نے اسے ٹھیک سے اندر نہیں ڈالا تھا۔ عالیہ نے آس پاس دیکھا اور احتیاط سے بل باہر کھینچ لیا۔ اپارٹمنٹ کے مالک کے نام پر نظر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اچانک ہی میشا کی بات اس کے ذہن میں آگئی۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی اور پھر تیز قدموں سے اوپر کی طرف بڑھی۔ نیچے آتے ہوئے اس نے لفٹ استعمال کی تھی۔ دوبارہ اوپر جاتے ہوئے بھی لفٹ استعمال کی۔ وہ راہداری میں آئی اور اس دروازے کے ساتھ لگی کال بیل بجائی جس میں مومنہ گئی تھی۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھلا تو سامنے زوہیب کھڑا ہوا تھا۔ بل پر اسی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

''تم ...... میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کال بیل بجانے والی تم ہوگی۔''

''کیوں جب یہاں مومنہ آسکتی ہے تو میں کیوں نہیں آسکتی؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''مومنہ۔'' زوہیب نے اس بار مصنوعی حیرت کا سہارا لیا۔ ''وہ یہاں......''

''پلیز! میں نے صرف تین منٹ پہلے اسے اس دروازے کے اندر جاتے دیکھا ہے۔ کہاں ہے وہ؟''

زوہیب سنجیدہ ہو گیا۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''کیا تم چاہتے ہو کہ میں ابھی اس کے گھر والوں کو کال کر کے بتا دوں کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ ہے؟'' عالیہ نے کہا اور اپنا موبائل نکال لیا۔

زوہیب کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی۔ ''تم ایسا نہیں کرو گی۔''

''تب مومنہ کو یہاں بلاؤ، میں اسے لے کر جاؤں گی۔''

زوہیب کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''اوکے میں اسے بلاتا ہوں۔ مومنہ! یہاں آؤ، تمہاری دوست آئی ہے۔''

لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو زوہیب اندر گیا۔ ''مومنہ کیا بات ہے...... اوہ مائی گاڈ...... یہ تم نے کیا کیا؟''

زوہیب کی بات اور انداز ایسا تھا کہ عالیہ سوچے سمجھے بغیر اندر آگئی۔ زوہیب اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اچانک ہی کوئی چیز آکر اس کے منہ پر لگی جس سے تیز بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے بے ساختہ سانس لیا اور چکرا کر نیچے گر پڑی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی مگر سر چکرا رہا تھا اور آنکھیں بھی نہیں کھل رہی تھیں۔ پھر اسے لگا جیسے اسے گھسیٹا جا رہا ہے۔ چند لمحے بعد اسے جیسے کہیں پھینک دیا گیا۔ اسے چوٹ نہیں لگی تھی کیونکہ اسے نرم جگہ ڈالا گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی مگر اس کا ذہن اسے جھنجوڑ رہا تھا کہ اب وہ بے ہوش ہو گئی تو اپنی زندگی اور اپنی عزت کھو دے گی۔ اسے ہوش میں رہنا چاہیے۔ زوہیب نے مکاری سے اسے اندر بلا کر قابو کر لیا تھا۔ اس کے سر سے کوئی چیز چبھ رہی تھی اور اس کی چبھن اس کے حواس بیدار کر رہی تھی۔ اس نے بہ مشکل سر ہلایا تو وہ چیز اتنی زور سے چبھی کہ تکلیف سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

وہ ایک نشست گاہ میں صوفے پر پڑی تھی۔ اس کے ایک طرف شیشے کی سلائیڈنگ دیوار تھی جس کا بڑا حصہ پردے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک طرف کھلا ہوا دروازہ تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر کر کے چبھنے والی چیز کو ٹٹولا تو وہ اس کی ہیئر پن نکلی تھی جو کسی وجہ سے بالوں میں یوں ہو گئی تھی کہ سر کی کھال میں چبھ رہی تھی۔ اس نے پن نکال لی اور پھر اسے اپنی کلائی میں چبھویا۔ پن کھال میں گھس گئی۔ خون نکلا اور وہ تکلیف سے بے آواز بلبلائی اسی لمحے اسے باہر سے زوہیب کی آواز سنائی دی۔ ''دیا واٹ دی ہیل ...... ہوا یہ کہ مومنہ کے پیچھے عالیہ بھی چلی آئی ہے...... میں نے ابھی اسے قابو ہی کیا تھا کہ یہ مصیبت نازل ہو

گئی...... ہاں، میں نے اسے کلوروفارم سونگھا دیا ہے...... مگر اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس مصیبت کا کیا کرنا ہے...... پلیز تم آجاؤ اور اسے ہینڈل کرو...... یہ اچھی بات ہے کہ تم پاس ہی ہو...... پلیز! بی کوئیک۔''

زوہیب کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ نشست گاہ کی طرف ہی آرہا ہے۔ عالیہ جلدی سے آنکھیں بند کر کے اسی طرح لیٹ گئی جیسے اسے زوہیب لٹا کر گیا تھا، اس نے اپنی زخمی کلائی چھپالی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ میشا اسے دیا سے کیوں خبردار کر رہی تھی۔ شاید میشا بھی زوہیب کے چکر میں آکر دھوکا کھا چکی تھی اور اب مومنہ کی باری تھی۔ زوہیب اندر آیا اور اس نے جھک کر عالیہ کا معائنہ کیا۔ پھر اس کی للچائی ہوئی آواز آئی۔ ''یو آر سو بیوٹی فل...... مومنہ سے بھی زیادہ۔''

اس کے ہاتھ عالیہ کو ٹٹولنے لگے۔ عالیہ کا دل چاہا کہ اسے تھپڑ دے مارے مگر اس وقت اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا ردعمل روک لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ مدافعت کر سکتی۔ اس کا ذہن اور جسم اس کے قابو میں نہیں تھا۔ اگر زوہیب کو پتا چل جاتا کہ وہ ہوش میں ہے تو شاید وہ اسے سچ مچ بے ہوش کر دیتا پھر اس کے ہاتھ سے یہ موقع نکل جاتا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ اسے استقامت دے اور اس کی عزت کو محفوظ رکھے۔ یہ قبولیت کا وقت تھا کیونکہ اسی لمحے موبائل کی بیل بجی اور زوہیب اس سے دور ہو گیا۔ اس نے موبائل نکالا اور کسی سے بات کرتے ہوئے بولا۔ ''کہاں ہے یار...... پارٹی زبردست ہو گئی ہے...... پہلے ایک تھی اور اب دوسری بھی آگئی ہے...... بلکہ تین سمجھ۔ میں نے دیا کو بھی بلالیا ہے...... تم دونوں آجاؤ۔''

زوہیب کی بات سے ظاہر تھا کہ اس نے دو افراد کو اور بلایا ہے۔ اس کا مقصد بھی واضح تھا۔ زوہیب نے کال کاٹی تھی کہ کال بیل بجی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور عالیہ نے دیا کی آواز سنی۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''عالیہ کیسے آگئی؟ اس کا مطلب ہے اسے پتا چل گیا ہے۔''

''ہاں لیکن تم فکر مت کرو، میں اسے ہینڈل کرلوں گا۔''

''کیسے؟'' دیا بولی۔ ''مومنہ کو پہلے ہی مشکل سے تمہاری طرف راغب کیا تھا۔ وہ ہتھے سے اکھڑ رہی تھی۔ اف زیبی! تمہاری محبت میں جو میں نے کیا ہے، وہ کسی لڑکی نے نہیں کیا ہوگا۔''

''میں تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں۔'' زوہیب نے مکاری سے کہا۔

''پلیز! مجھے بتاؤ کہ تم سچویشن کیسے کنٹرول کرو گے؟''

''میں نے شمس اور ثاقب کو بلایا ہے۔ ان دونوں کو ریپ کیا جائے گا اور ان کی تصویریں لی جائیں گی۔'' زوہیب کے لہجے میں اب ابلیس بول رہا تھا۔ ''اس کے بعد نہ تو یہ کبھی زبان کھولیں گی اور نہ ہماری کوئی بات ماننے سے انکار کریں گی۔''

دیا کا تو عالیہ کو نہیں معلوم مگر زوہیب کے یہ مکروہ عزائم سن کر وہ کانپ اٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد دیا کی آواز آئی۔ ''زوہیب! تم اچھا نہیں کررہے ہو۔ انہیں جانے دو۔ یہ ہوش میں آجائیں تو میں انہیں سمجھا لوں گی۔ یہ زبان بند رکھیں گی۔''

اسی لمحے پھر کال بیل بجی اور زوہیب نے کہا۔ ''سوری بے بی اٹس ٹو لیٹ...... وہ دونوں آگئے ہیں۔''

''آنے دو، تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔'' دیا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یہ بہت رسکی ہو گا۔ اگر بات کھل گئی تو سب مارے جائیں گے اور میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔''

''ڈیئر! تم ویسے ہی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی ہو۔'' زوہیب نے اس بار بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ''اس لیے وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا!'' دیا کہتے ہوئے اس کے ساتھ گئی تھی۔

عالیہ کوشش کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ڈگمگاتے قدموں سے نشست گاہ کے دروازے کی طرف بڑھی اور اسے بند کرتے ہوئے اس نے اسے اندر سے لاک کر دیا۔ اوپر کا بولٹ بھی چڑھا دیا تھا پھر اس سے ٹک کر گہرے سانس لینے لگی۔ ذرا سی حرکت نے اسے ہانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اچانک باہر سے کسی نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی اور زوہیب کی آواز آئی۔ ''مائی گاڈ! اٹس لاک۔''

''وہ ہوش میں آگئی ہے۔'' دیا بولی۔

''ویئر از دا کی۔'' عالیہ نے ایک آواز اور سنی۔ ''جلدی کرو یار...... مجھے پارٹی کی بے تابی ہے۔''

''یار! یہ دو تو ہیں۔'' تیسری آواز نے کہا۔ ''جب تک زوہیب اسے نکالتا ہے، ہم اپنی پارٹی تو شروع کریں۔''

''بکواس مت کرو۔'' دیا چلائی۔ ''دور رہو مجھ سے۔''

جواب میں مردانہ قہقہے سنائی دیے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دیا جو جال دوسری لڑکیوں کے لیے بچھاتی رہی تھی، اس

میں خود بھی پھنس گئی تھی۔ عالیہ کو احساس تھا کہ اس کی پوزیشن صحیح نہیں ہے۔ صرف دروازہ بند کر لینے سے وہ ان درندوں سے محفوظ نہیں رہے گی۔ اسے اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے اس سے بڑھ کر کچھ کرنا تھا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے شیشے کی دیوار کی طرف بڑھی۔ اس کا بڑا حصہ فکس تھا صرف ایک حصہ سلائیڈر پر مشتمل تھا۔ اسے کھول کر وہ باہر ٹیرس نما بالکونی میں جا سکتی تھی۔ اس نے سلائیڈر سرکایا اس کام میں بھی اسے بہت کوشش کرنا پڑی تھی۔ اگرچہ یہ انگلی کے اشارے سے سرک جانے والا تھا۔ اس دوران میں دروازے پر دھکے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ شاید زوہیب چابی لے آیا تھا اور لاک کھول لیا تھا مگر بولٹ بند تھا اور وہ دھکے مار کر اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عالیہ باہر بالکونی میں آئی تو تازہ ہوا میں اس کے حواس کسی قدر بہتر ہوئے۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ بالکونی فلیٹ کے کونے پر تھی اور دونوں طرف دوسرے فلیٹوں کی بالکونیاں خاصے فاصلے پر اور اس وقت خالی تھیں۔ عالیہ نے ریلنگ سے نیچے جھانکا تو گلی بہت دور تھی اور وہاں اسے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ عمارت مین روڈ سے ہٹ کر تھی اور گلی گزرگاہ نہیں تھی، اس لیے صرف متعلقہ لوگ ہی اس طرف آتے جاتے تھے۔ اندر سے آتی دروازے پر ضربوں کی آواز مزید بڑھ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بولٹ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ وہ ہراساں سی کسی فرد کو تلاش کر رہی تھی جس سے مدد مانگ سکے۔ بائیں طرف موجود بالکونی میں ایک نوجوان لڑکا نکلا جو سر ہلا رہا تھا۔ عالیہ نے اسے آواز دی۔ ”اے...... میری مدد کرو...... اس طرف۔“

عالیہ کے منہ سے نکلنے والی آواز کمزور تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ تقریباً چالیس فٹ کے فاصلے پر اسے سنا جاتا لیکن لڑکے نے نہیں سنا۔ وہ اسی طرح سر ہلاتا رہا۔ تب عالیہ کو اس کے کان میں ہینڈ فری اور ہاتھ میں موبائل نظر آیا۔ وہ یقیناً میوزک سن رہا تھا اور اسی وجہ سے عالیہ کی آواز سننے سے قاصر تھا۔ عالیہ بازو لہرانے لگی کہ وہ اس کی طرف دیکھ لے لیکن وہ متوجہ ہی نہیں تھا۔ اس کی نظر موبائل کی اسکرین پر مرکوز تھی۔ اچانک عقب سے دروازے کا بولٹ آواز کے ساتھ ٹوٹا۔ عالیہ نے ریلنگ سے نیچے دیکھا اور اس پر چڑھ گئی۔ یہ چار فٹ اونچی ریلنگ تھی جس میں ایک فٹ کنکریٹ کا حصہ تھا اور باقی تین فٹ تک لوہے کے چمکیلے پائپوں کی ریلنگ تھی۔ اس میں تین پائپ متوازی تھے جنہیں اینگلز کی مدد سے مضبوط کیا گیا تھا۔ اس نے سب سے اوپر والے پائپ پر ایک پاؤں دوسری طرف لٹکا لیا

تھا اور دونوں ہاتھوں سے پائپ تھام لیا۔ اسی لمحے اندر سے زوہیب برآمد ہوا اور اسے ریلنگ پر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ عالیہ نے کانپتی آواز میں کہا۔ ”میرے پاس مت آنا ورنہ میں نیچے چھلانگ لگا دوں گی۔“

”پلیز! ایسا مت کرو۔“ زوہیب پریشان ہو گیا۔ ”تم اپنی دوست کے ساتھ یہاں سے جانا چاہتی ہو چلی جاؤ مگر ایسا مت کرو۔“

عالیہ کمزوری محسوس کر رہی تھی مگر اس کے چکر اب کم ہو گئے تھے، اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"مومنہ اور دیا کو یہاں لاؤ۔ جلدی ورنہ میرا ہاتھ شاید خود چھوٹ جائے۔"

زوہیب کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے اور بات پریشانی والی تھی بھی، اگر عالیہ بالکونی سے نیچے گر جاتی اور لازمی ماری جاتی تو اس کے بعد معاملہ بہت آگے تک جاتا اور اس کے لیے جان چھڑانا ممکن نہ رہتا۔ اس لیے وہ عالیہ کو بہرصورت ریلنگ سے اتارنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں پیچھے ہو جاتا ہوں تم ریلنگ سے اتر آؤ۔ بے شک اس کے پاس رہو لیکن اس سے اتر آؤ۔ اس طرح تو تم کسی وقت بھی گر سکتی ہو۔"

عالیہ اس کی چالاکی سمجھ رہی تھی، وہ نیچے اتر آتی تو اس کے لیے دوبارہ چڑھنا آسان نہیں تھا۔ جتنی دیر میں وہ کوشش کرتی اتنی دیر میں زوہیب اسے پکڑ لیتا۔ اس لیے وہ نیچے اترنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس گفتگو کے دوران زوہیب غیر محسوس انداز میں اس کے نزدیک آرہا تھا۔ وہ اس سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا اور غالباً جھپٹ کر اسے پکڑنے کا سوچ رہا تھا، بس اسے ایک موقع درکار تھا۔ یہ موقع برابر کی بالکونی والے نوجوان نے دیا۔ اس کی نظر عالیہ پر پڑی اور اس نے چلا کر کہا۔ "اے! یہ کیا کر رہی ہو؟...... تم گر جاؤ گی۔"

عالیہ کی نظر ایک لمحے کو نوجوان کی طرف گئی اور زوہیب کو موقع مل گیا اس نے جھپٹ کر عالیہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس کا ہاتھ ریلنگ سے ہٹ گیا تھا۔ اس کا توازن بگڑا اور عالیہ نے اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر دوسرے لمحے زوہیب کی ٹکر نے رہا سہا توازن بھی بگاڑ دیا۔ عالیہ نے غیر ارادی طور پر اس کا بازو پکڑا اور نیچے لٹک گئی۔ زوہیب جو تیزی سے آیا، اسی تیزی کی وجہ سے وہ خود غیر متوازن ہو گیا تھا۔ عالیہ نے اس کا ایک ہاتھ پکڑا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے عالیہ کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ عالیہ کے وزن نے اسے کھینچا اور وہ سینے کے بل ریلنگ پر آیا۔ وہ خود کو ریلنگ کے اندر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عین اس وقت جب اسے احساس ہوا کہ وہ خود کو نہیں روک پا رہا تو اس نے عالیہ کو چھوڑ دیا اور صرف اپنی جان بچانے کی کوشش کی مگر اس وقت تک دیر ہو گئی تھی۔ اس کے پاؤں اوپر اٹھے اور وہ دونوں خلا میں گئے۔ نیچے زمین تک کوئی سہارا نہیں تھا۔

☆☆☆

تیسرا لمحہ، آخری وقت......!

آگہی کا دور بھی خاصا طویل تھا۔ تقریباً چھ سال جاری رہا تھا۔ اس میں وقت سست ہو گیا تھا اور اس نے بہت کچھ جانا تھا مگر یہاں یہ وقت ایک لمحے میں گزر گیا اور پھر وقتِ آخر شروع ہوا۔ اس نے دیکھا کھڑکی کے پار بستر پر بوڑھا آدمی آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کا جسم ایک لمحے کو اینٹھا اور پھر سانس نکلتے ہوئے ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ روح نے اس کا جسم چھوڑ دیا تھا۔ اگلے لمحے عالیہ کا جسم زمین سے ٹکرایا اور اس نے آخری سانس لی۔ جسم سے سانس یوں نکلی جیسے اس کے اندر نہ جانے کتنی ساری ہوا تھی۔ جب سانس کا آخری حصہ بھی نکل گیا تو جسم یک دم ٹھنڈا اور پُرسکون ہو گیا۔ پھر اس نے شور سنا جو بتدریج قریب آرہا تھا۔ یہ لوگوں کا ملا جلا شور تھا جو اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ دونوں اوپر سے گرے ہیں۔ کوئی تجویز کر رہا تھا کہ انہیں چیک کیا جائے۔ کوئی ہاتھ لگانے سے منع کر رہا تھا۔ کوئی ایمبولینس اور پولیس کو کال کرنے کو کہہ رہا تھا۔ بالآخر کسی نے ان دونوں کو چیک کیا اور اعلان کیا۔

"لڑکی مر چکی ہے مگر لڑکا ابھی زندہ ہے۔"

ثاقب اور شمس بھی نیچے آگئے تھے۔ عالیہ ان کی آوازیں سن رہی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ "میرے خدا! زوہیب کا حشر دیکھو...... لڑکی مر گئی ہے...... کسی نے ہمیں اوپر سے آتے نہیں دیکھا ہے...... اور نہ اندر جاتے دیکھا تھا...... ہمیں خاموشی سے کھسک لینا چاہیے۔"

وہ وہاں سے چلے گئے پھر اس نے دیا اور مومنہ کی آوازیں سنیں، وہ رو رہی تھیں۔ مومنہ اس کے پاس آئی تھی اور دیا شاید زوہیب کے پاس تھی۔ مومنہ نے جھک کر بھیگے ہوئے لہجے میں سرگوشی میں کہا۔ "شکریہ عالی! تم نے مجھے بچا لیا مگر اپنی جان دے دی۔"

یہ سن کر اسے تعجب ہوا تھا۔ وہ مر چکی تھی جبکہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ وہ سانس نہیں لے رہی تھی اور اسے تکلیف بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر وہ انسانوں کی آوازیں سن رہی تھی۔ انہیں اپنے آس پاس محسوس کر رہی تھی۔ اگر وہ مر گئی تھی تو یہ سب کیسے ممکن تھا؟ مرنے کے بعد آدمی کا رابطہ دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔ پھر پولیس اور ایمبولینس آئی۔ اسے چیک کرنے والے طبی عملے کے آدمی نے بھی اس کی موت کی تصدیق کی۔ پولیس اپنی کارروائیاں کرنے لگی۔ اس کی

تصویریں لی گئیں اور وہاں سے شواہد اٹھا لیے گئے۔ آخر میں اسے اسٹریچر پر ڈال کر اوپر سے سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ اس چادر سے اسے الجھن ہو رہی تھی مگر وہ مجبور تھی۔ اسے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اسے غلطی سے مردہ سمجھ لیا گیا ہے، وہ زندہ ہے مگر اسپتال میں اس کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹر نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''شی از ڈیڈ...... لک ہر اسکل بون...... اٹس ٹو کریک۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہاں، دماغ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ میرا خیال ہے یہ گرتے ہی مرگئی تھی۔''

اس کے دائیں بازو کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹی تھی۔ وہ سر اور دائیں پہلو کے بل گری تھی۔ اس لیے یہی حصے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ اس کی پسلیاں اور پاؤں فریکچر سے محفوظ رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اگر اس کے سر پر چوٹ نہ آتی تو وہ بچ سکتی تھی۔ پوسٹ مارٹم سے پہلے اسے عارضی طور پر ایک جگہ رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں سناٹا اور تنہائی تھی۔ اسے وقت کا احساس نہیں تھا پھر اس نے ظہیر کی آواز سنی اور جیسے تڑپ گئی۔ اس کا بھائی آیا تھا۔ وہ رندھے ہوئے لہجے میں کسی سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ پھر کسی نے کپڑا اٹھا کر اسے لاش دکھائی تو وہ بلند آواز سے رونے لگا تھا۔ دوسرا آدمی اسے تسلی دیتے ہوئے وہاں سے لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی گئی۔ اس کا لباس اتارا گیا تو وہ چاہنے کے باوجود اتارنے والوں کو نہ روک سکی۔ اس وقت اسے پتا چلا کہ موت انسان کو کیسے مجبور کر دیتی ہے اور وہ دوسروں کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتا ہے۔

اس مرحلے سے گزر کر اسے تدفین کے لیے تیار کیا گیا۔ ایک پیشہ ور غسال عورت نے اسے غسل دیا۔ کفن پہنایا اور پھر اسے ہلکے تابوت میں ڈال کر اس کی آخری آرام گاہ تک لے جانے کے لیے تیار کر دیا گیا۔ عمیر بھی آ گیا تھا مگر پولیس کارروائیوں اور کچھ دوسری وجوہات کی بنا پر اسے اگلے دن دوپہر سے پہلے گل پور نہیں لے جایا جا سکا تھا۔ ایمبولینس میں اس کے ساتھ دونوں بھائی تھے۔ وہ بات کر رہے تھے کہ پولیس نے شمس اور ثاقب کو گرفتار کر لیا تھا۔ انہوں نے اقرار جرم بھی کر لیا تھا۔ دیا اور مومنہ پہلے ہی پولیس کو بیان دے چکی تھیں۔ زوہیب کے موبائل ریکارڈ سے بھی تصدیق ہوئی۔ زوہیب کومے میں تھا اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندہ رہتا ہے یا نہیں اور کب وہ کومے سے باہر آئے گا۔ گل پور میں ایمبولینس گھر کے سامنے رکی تو اندر سے سلمٰی اور فاریہ دھاڑیں مارتے ہوئے نکلی تھیں۔

ظہیر اور عمیر انہیں روک رہے تھے اور اندر لے جا رہے تھے۔ بہ مشکل وہ اس میں کامیاب ہوئے اور واپس آ کر تابوت اتروا رہے تھے کہ اتنی دیر میں بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے مگر کسی نے عالیہ کے لیے افسوس نہیں کیا۔ اس کا تابوت اندر لایا گیا۔ اسے کھولا تو سلمٰی اس کا چہرہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ ماں کی حالت دیکھ کر بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ تدفین جلد از جلد کر دی جائے مگر جب انہوں نے نمازِ جنازہ اور تدفین کے لیے قبرستان کمیٹی سے رابطہ کیا تو انہیں بتایا گیا کہ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ عالیہ کی نہ تو نمازِ جنازہ پڑھائی جائے گی اور نہ اسے گل پور کے قبرستان کی حدود میں دفن ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایسی بدکار لڑکی کو جو یوں موت سے ہمکنار ہوئی ہو، اپنے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس تحریک کا محرک کوئی اور نہیں عالیہ کا سگا تایا رفیق احمد ملک تھا۔ جب سگا تایا ایسا کہہ رہا ہو تو دوسروں پر اثر کیوں نہیں ہوتا؟

سلمٰی تک یہ بات پہنچی تو وہ پھر تڑپ گئی۔ اسے شبیر کی بات یاد آئی کہ کوئی مسلمان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو اگر اس نے کفر یا شرک نہ کیا ہو یا اسلام سے مرتد نہ ہوا ہو تو اس کی نمازِ جنازہ اور مسلم قبرستان میں تدفین اس کا حق ہے۔ کوئی اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا ہے۔ شبیر آج زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ اس کی بے قصور بیٹی کو اس کے آخری حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔

ظہیر اور عمیر کا ارادہ عصر سے پہلے تدفین کا تھا مگر اس جھگڑے میں شام ہو گئی اور پھر اللہ کا خوف رکھنے والے کچھ افراد نے عالیہ کے بھائیوں کے ساتھ مل کر اس کا جنازہ پڑھا اور وہی تدفین میں شریک ہوئے۔ وہ اسے اوپر والے جنگل تک لائے جس سے عالیہ کو خوف آتا تھا اور اس نے باپ سے کہا تھا کہ اسد علی جیسے قاتل کو وہاں دفن ہونا چاہیے تھا اور آج وہ خود وہاں دفن ہو رہی تھی۔ اس کی قبر بھی جنازہ پڑھانے والوں نے کھودی تھی۔ یہ باقاعدہ قبر نہیں تھی۔ انہوں نے بس گڑھا بنا لیا اور اس میں اسے تابوت سمیت ڈال دیا۔ جب تابوت پر مٹی ڈالی جا رہی تھی تو اس کے اندر خوف بھرنے لگا اور یہ خوف دنیا کا نہیں بلکہ آنے والے وقت کا تھا کہ یہ آنے والا لمحہ اس کے لیے کیا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

لے کر آئے گا۔

☆☆☆

عالیہ کے گھر والوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ گل پور کے لوگ اتنے سنگ دل بھی ہوسکتے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، ثاقب اور شمس کا اعترافی بیان اور مومنہ کا عالیہ کے حق میں بیان سب منظر عام پر آچکا تھا۔ عالیہ بے گناہ تھی اور اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود گل پور والوں نے اس کے بارے میں جو سوچ اپنے ذہنوں میں بسالی تھی، اس پر قائم رہے۔ انہوں نے ایک طرح سے اس گھرانے کا بائیکاٹ کردیا تھا۔ اگرچہ عالیہ قصوروار ہوتی تب بھی پورے گھر کو سزا نہیں دی جاسکتی تھی۔ لوگوں کے رویوں سے تنگ آکر انہوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا۔ باقی خاندان ان کے ساتھ تھا سوائے رفیق کے گھرانے کے۔ ایک سال کے اندر انہوں نے باغ اور مکان فروخت کردیا اور خود صوبائی دارالحکومت منتقل ہوگئے۔ انہوں نے اسی کالونی میں گھر لیا جہاں نعیم اور عتیق بھی رہتے تھے۔ یہ کالونی خوب صورت، جدید اور تمام سہولتوں سے آراستہ تھی۔

ظہیر کا دل زمین سے اچاٹ ہوگیا تھا کیونکہ اس زمین نے اسے اور اس کے گھر والوں کو دکھ دیے تھے مگر وہ اپنی لائن بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے پانچ ایکڑ زمین لی اور اس پر نایاب پودوں اور درختوں کی نرسری بنالی۔ یہ پودے اور درخت پنیری کی صورت میں بھی خاصے مہنگے بکتے تھے۔ چند سال میں اس کا کام چل نکلا۔ انہیں گل پور سے نکلے چوتھا سال تھا۔ ظہیر اور عمیر کی شادی ہوگئی تھی۔ ظہیر نے جو گھر لیا تھا، وہ نصف کنال پر اور ایک منزلہ تھا، رفتہ رفتہ انہوں نے اسے تین منزلہ کرلیا۔ اب ایک ایک منزل پر دونوں بھائی بیوی بچوں سمیت تھے اور گراؤنڈ فلور پر سلمٰی اور فاریہ تھے۔ فاریہ گریجویشن کے آخری سال میں تھی۔ سلمٰی کا ارادہ اس کی شادی کے بعد عمیر کے ساتھ حج پر جانے کا تھا۔ عمرہ اس نے ایک بار شبیر کے ساتھ کیا تھا اور ایک بار ظہیر کے ساتھ جاکر کیا تھا۔ اس سال ظہیر اور اس کی بیوی حج کرکے آئے تھے اور اگلے سال عمیر کا ارادہ تھا کہ وہ ماں اور بیوی کے ساتھ حج کرے گا۔

اس سال مون سون میں بارشیں بہت شدید تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان پھٹ پڑا ہو، پانی کی چادر گر رہی ہو۔ ان ہی دنوں ظہیر کو گل پور سے اس کے بچپن کے ایک دوست کی کال آئی اور دو دن بعد ظہیر، عمیر، سلمٰی اور فاریہ گل پور جارہے تھے۔ ظہیر نے صرف یہ بتایا تھا کہ گل پور کا بند ٹوٹ گیا تھا اور پانی نے علاقے اور قصبے کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ جب وہ گل پور سے نکلے تو سارے ناتے توڑ کر نکلے تھے۔ صرف عمیر اور ظہیر، شبیر اور عالیہ کی برسی پر اس کی قبر پر جاتے تھے مگر وہ قبر سے ہوکر واپس آجاتے تھے۔ اس لیے سوائے ظہیر کے باقی سب حیران تھے کہ وہ وہاں کیوں جارہے تھے۔ عالیہ کی برسی میں بھی ابھی ایک مہینا باقی تھا۔ ہائی وے کا راستہ اچھا ہوگیا تھا۔ وہ دو گھنٹے بعد گل پور میں داخل ہوئے تو سیلاب کی تباہ کاریاں دور سے نظر آنے لگیں۔ کھیتوں، باغات اور مکانوں کو نقصان ہوا تھا۔ بہت سے مکان گر گئے تھے پھر انہوں نے دیکھا کہ بند ٹوٹنے کے بعد پانی کی چادر نے گل پور کے قدیم قبرستان کو ایک ہموار ڈھلان میں بدل دیا تھا۔ قبریں یوں غائب تھیں کہ ان کے نشان تک مٹ گئے تھے۔ دو حفاظتی دیواریں بھی قبرستان کو سیلاب سے نہیں بچا سکی تھیں۔ اوپر جانے والی سڑک کو بھی خاصا نقصان ہوا تھا مگر گاڑی کسی نہ کسی طرح اس پر چڑھ گئی۔ وہ اس جگہ پہنچے جہاں عالیہ کی قبر جنگل میں تھی۔ ظہیر نے گاڑی روکی تو سلمٰی نے بھیگی آواز میں کہا۔

"ظہیر! یہاں کیوں لایا ہے، اب تو بتادے؟"

"امی اتریں اور خود چل کر دیکھ لیں۔" ظہیر نے کہا تو وہ سب نیچے اتر آئے۔ قبر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ سلمٰی، فاریہ اور عمیر کے دل دھڑک رہے تھے کہ انہیں نہ جانے کیا منظر دیکھنے کو ملے۔ جب پانی نے نیچے قبرستان غائب کردیا تھا تو اوپر ایک غیر محفوظ قبر کہاں چھوڑی ہوگی۔ جب وہ قبر کے سامنے پہنچے تو کچھ دیر کے لیے ساکت رہ گئے۔ قبر اسی طرح موجود تھی۔ مٹی سجی ہوئی تھی۔ سرہانے کا پتھر اپنی جگہ قائم تھا۔ حد یہ کہ قبر کی مٹی گیلی تک نہیں تھی جبکہ آس پاس زمین گیلی تھی۔ سرہانے کے پتھر کے ساتھ ایک سنگل شاخ والا پودا نکلا ہوا تھا جس کی واحد ڈنڈی سے چھوٹی چھوٹی سبز پتیاں نکلی ہوئی تھیں اور سب سے اوپر ایک سرخ رنگ کا بہت انوکھا اور خوبصورت پھول کھلا ہوا تھا۔ وہ چاروں چند لمحے مبہوت کھڑے رہے اور پھر رفتہ رفتہ ان کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔